

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد
(۳)

افادہ

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی دام مجید

○

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

تیرھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب	معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۴۲ تا مکمل سورۃ) جلد ۳
ملاحظات	حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ
مرتب	الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شمال مارٹاؤن لاہور
تعداد طباعت	پانچ سو (۵۰۰)
سرورق	سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ
کتابت	محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ
ناشر	مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ
قیمت	۲۱۰/- دو سو دس روپے
تاریخ چودھواں ایڈیشن	ذی القعدہ ۱۴۲۸ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۷ء

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
- (۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور
- (۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور
- (۵) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- (۶) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی
- (۷) مکتبہ اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد
- (۸) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- (۹) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور
- (۱۰)

فہرست عنوانات

معالم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۳

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۲	اہم رومی اور قبلہ	۳۱	درس نمبر ۵۵ آیات ۱۴۲ تا ۱۴۳
۵۳	کتمان حق	۳۲	آیات اور ترجمہ
۵۵	درس نمبر ۵۷ آیات ۱۴۸ تا ۱۵۰	۳۳	تحویل قبلہ
۵۶	آیات اور ترجمہ	۳۴	تحویل قبلہ پر پہلا اعتراض
۵۷	رابط آیات	۳۵	اس کا جواب
۵۸	ہر امت کے لیے جہت مقرر ہے	۳۶	مقام تحویل قبلہ
۵۹	جہت فروعی چیز ہے	۳۷	افضل امت اور اس کی گواہی
۶۰	بنیادی چیز نیکی ہے	۳۸	تقریر قبلہ کی غایت
۶۱	استقبال قبلہ کے سہ گونہ احکام	۳۹	تحویل قبلہ پر دوسرا اعتراض
۶۲	قبلہ تکمیل نعمت ہے	۴۰	درس نمبر ۵۶ آیت ۱۴۴ تا ۱۴۵
۶۳	قبلہ ذریعہ ہدایت ہے	۴۱	آیات اور ترجمہ
۶۴	درس نمبر ۵۸ آیات ۱۵۱ تا ۱۵۲	۴۲	رابط آیات
۶۵	آیات اور ترجمہ	۴۳	تحویل قبلہ کی دوسری وجہ
۶۶	رابط آیات	۴۴	تحویل قبلہ کا حکم
۶۷	اتمام نعمت	۴۵	جہت قبلہ
۶۸	بعثت رسول	۴۶	مخالفت برائے مخالفت
۶۹	ملاوت اور تزکیہ	۴۷	استقبال قبلہ اور شعار اسلامی
۷۰	کتاب و حکمت کی تعلیم	۴۸	سرسوئی کا اعتراض
۷۱		۴۹	آریہ سماج اور تثلیث
۷۲		۵۰	استقبال قبلہ میں اختلاف
۷۳		۵۱	

۸۴	آیت اور ترجمہ	۶۴	ان جانی چیزوں کی تعلیم
"	صفا اور مروہ	۶۶	تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول
۸۵	تہذیب الاخلاق کا پانچواں اصول [شعار اللہ کی تعظیم ہے]	"	پہلا اصول ذکر الہی
۸۶	تفسیر عزیز ندی	۶۸	دوسرا اصول شجر الہی
۸۷	طواف و سعی	۶۹	درس نمبر ۵۹ آیات ۱۵۳ تا ۱۵۴
۸۹	چاہ زم زم	"	آیات اور ترجمہ
۹۰	صفا اور دعوت توحید	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	بیت اللہ شریف میں شرک	"	بہر عروج قوم کی پانچ منازل
"	سعی قدیم سنت ہے۔	۷۰	تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر
۹۳	درس نمبر ۶۲ آیات ۱۵۹ تا ۱۶۳	۷۲	تہذیب الاخلاق کا چوتھا اصول نماز
"	آیات اور ترجمہ	۷۳	شہادت فی سبیل اللہ
۹۴	کتمان حق	۷۴	شور کا فتنان
"	کتمان حق کی سزا	۷۶	درس نمبر ۶۰ آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷
۹۵	مولانا عبید اللہ سندھی	"	آیات اور ترجمہ
۹۷	تعلیم کی اہمیت	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بنیات اور ہدایت	۷۷	آزمائش مقتضائے ایمان ہے
۹۹	معافی کا پروانہ	"	ذرائع آزمائش - خوف
"	لعنت کے مستحقین	۷۸	بھوک
۱۰۰	معبود صرف ایک ہے	۷۹	جان و مال کا نقصان
۱۰۲	درس نمبر ۶۳ آیات ۱۶۴	۸۰	ثمرات کی کمی
"	آیت اور ترجمہ	۸۱	صابروں کے لیے بشارت
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۳	صلہ صبر
		۸۴	درس نمبر ۶۱ آیات ۱۵۸

۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۰۲	کسب معاش
۱۲۲	قانون کی پابندی	۱۰۳	آسمانی کھڑے
۱۲۳	حلال و حرام کی تمیز	۱۰۴	زمین
۱۲۵	شیطان کا نقش قدم	۱۰۵	رات اور دن کا تغیر
۱۲۶	ابو اجداد کا اتباع	۱۰۶	بحری جہاز
۱۲۸	صدقہ کا طریقہ	۱۰۷	پانی کا نزول
۱۲۹	کافروں کی مثال	۱۰۸	جانوروں کی نسل کشی
۱۳۰	درس نمبر ۶ آیات ۱۷۲ تا ۱۷۳	۱۰۹	ہواؤں کی گردش
"	آیات اور ترجمہ	۱۱۰	مسخر بادل
"	اکل حلال	۱۱۱	نشانات قدرت
۱۳۱	شکیر الہی	۱۱۲	درس نمبر ۶ آیات ۱۶۵ تا ۱۶۷
۱۳۲	محرمات اربعہ	۱۱۳	آیات اور ترجمہ
"	مردار	۱۱۴	مد مقابل
۱۳۳	خون	۱۱۵	محبت الہی
۱۳۵	خزیرہ کا گوشت	۱۱۶	محبت کی اقسام
۱۳۸	درس نمبر ۶ آیت ۱۷۲ تا ۱۷۳	۱۱۷	محبت کی مختلف وجوہات
"	آیت اور ترجمہ	۱۱۸	محبت کی کسوٹی
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۱۹	غیر اللہ کی محبت
۱۳۹	مسئلہ انتقال خون	۱۲۰	اہل ایمان کا طریقہ
۱۴۰	غیر اللہ کے نام پر	۱۲۱	اللہ ہی قادر مطلق ہے
۱۴۲	اھل کا مفہوم	۱۲۲	تابع اور متبع
۱۴۳	حالت اضطراب	۱۲۳	درس نمبر ۶ آیات ۱۶۸ تا ۱۷۱
۱۴۴	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۱۲۴	آیات اور ترجمہ

۱۶۰	درس نمبر ۱۷ آیت ۱۷۸ تا ۱۷۹	۱۴۶	درس ۶۸ آیت ۱۷۴ تا ۱۷۶
"	آیات اور ترجمہ	"	آیات اور ترجمہ
"	اسلام کا فوجداری قانون	"	گزشتہ سے پیوستہ
۱۶۱	اسلامی قانون بمقابلہ قانون جاہلیت	۱۴۷	کتمان حق پر حقیر مفاد
۱۶۲	قتل کی تین اقسام	۱۴۸	علم قرآن کی اشاعت
"	سزائے قتل	۱۴۹	اللہ تعالیٰ کی ناراضگی
۱۶۳	معافی کی صورت	۱۵۰	خارے کا سودا
"	دیت	۱۵۱	درس نمبر ۶۹ آیت ۱۷۷
۱۶۵	قصاص میں زندگی ہے	"	آیت اور ترجمہ
۱۶۷	درس نمبر ۱۸ آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۳	استقبال قبلہ فروعی مسئلہ ہے
"	حفاظت جان کا قانون	"	نیکی کیا ہے
۱۶۸	اسلام کا غنا بطہ دیوانی	۱۵۴	ایمان باللہ
"	اسلامی قانون حکمت پر مبنی ہے	"	ایمان بالآخرت
۱۶۹	تحفظ نفس	"	ایمان بالملائکہ
۱۷۰	تحفظ مال	۱۵۵	ایمان بالکتاب
۱۷۱	قانون وصیت	"	ایمان بالانبیاء
۱۷۲	انبیاء کی وصیت	"	الفاق فی سبیل اللہ
۱۷۳	وصیت کی اقسام	۱۵۷	نماز و زکوٰۃ
۱۷۵	وصیت میں تبدیلی گناہ ہے	۱۵۸	ایمانی عہد
۱۷۷	درس نمبر ۲۰ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴	"	صبر کی عظمت
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۹	سچے لوگ
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	مستحق لوگ

۱۹۵	آیت اور ترجمہ	۱۷۷	فرضیت روزہ
"	شان نزول	۱۷۸	روزہ کا مفہوم
"	رمضان اور دُعا	۱۷۹	سابقہ امتوں کے روزے
۱۹۷	آداب دُعا	"	روزہ باطنی عبادت ہے
۱۹۸	خاندان شاہ ولی اللہؒ	۱۸۰	روزہ کے جسمانی فوائد
۲۰۰	قرب خداوندی	۱۸۱	روزہ اور قانون کی پابندی
۲۰۱	قبولیت دُعا	۱۸۲	مریض اور مسافر کا روزہ
۲۰۴	درس نمبر ۵، آیت ۱۸۷	۱۸۳	روزہ کے بدلے فدیہ
"	آیت اور ترجمہ	۱۸۴	روزہ رکھنا ہی بہتر ہے
۲۰۵	گزشتہ سے پیوستہ	۱۸۶	درس نمبر ۳، آیت ۱۸۵
"	شان نزول	"	آیت اور ترجمہ
۲۰۶	فلسفہ لباس	"	گزشتہ سے پیوستہ
۲۰۷	سابقہ لغزش کی معافی	۱۸۷	ماہ رمضان اور قرآن پاک
"	حصولِ اولاد	۱۸۸	مختلف مہینوں کی وجہ تسبیہ
۲۰۸	تکمیل روزہ	۱۸۹	مسئلہ خلقِ قرآن
"	سحری کی بہکات	"	نزولِ قرآن
۲۰۹	صوم وصال	۱۹۰	تلاوتِ قرآن
"	اعتکاف فی المساجد	"	قرآن فدریجہ ہدایت ہے
۲۱۰	عورتوں کا اعتکاف	۱۹۲	واضح اور فیصلہ کن دلائل
"	حفاظت بہ حد درجہ شرعیہ	۱۹۳	روزہ لازم ہے
۲۱۲	درس نمبر ۶، آیت ۱۸۸	"	روزے کی قصاص
"	آیت اور ترجمہ	۱۹۴	اللہ آسانی چاہتا ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۹۵	درس نمبر ۴، آیت ۱۸۶

۲۲۵	حرمت والے مہلنے	۲۱۲	رابط آیات
"	اوقات کا تعین	۲۱۳	شیخ الہند کا ترجمہ قرآن
۲۲۶	چاند کی تقویم	"	مولانا سید عزیز گل
۲۲۷	حج کے لیے جلدی	۲۱۴	مولانا سید وحید احمد مدنی
۲۲۸	رسومات باطلہ	"	انگریز کی چال بازی
"	صراطِ مستقیم	۲۱۵	شیخ سعدی
۲۳۰	درس نمبر ۸ آیت ۱۹۰ تا ۱۹۳	۲۱۶	ترک سلطنت
"	آیات اور ترجمہ	۲۱۷	سپر پاورز
"	جہاد کی قسمیں	"	ہزارہ اور گلستان
۲۳۲	جہاد پر اعتراض	۲۱۸	زوال کے اسباب
"	اقدامی اور دفاعی جہاد	"	فرقہ بندی کی لعنت
۲۳۳	قتال کا حکم	۲۱۹	تحریک ریشمی رومال
"	کفار کی طرف سے پہل	"	تزکیہ مال
۲۳۴	زیادتی کی ممانعت	۲۲۰	اکل حرام
۲۳۵	جہاد کا مقصد	"	رشوت
"	جہاد کے اصول	"	غاصبانہ قبضہ
۲۳۶	فتنہ و فساد کی بیخ کنی	۲۲۲	درس نمبر ۹ آیت ۱۸۹
۲۳۸	درس نمبر ۹ آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵	"	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	رابط آیات
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	شان نزول
۲۳۹	حدیبیہ کا واقعہ	۲۲۳	امام بیضاوی
"	جنگ کی اجازت	"	سوالی و جواب میں اختلاف
۲۴۰	ادب کا یہ کہ	۲۲۴	چاند کی مختلف صورتیں

۲۵۶	۲۴۰	ربط آیات	خوف خدا
۲۵۷	۲۴۱	حج کے مہینے	اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا
"	۲۴۳	احرام کی پابندیاں	فقہ حنفی
۲۵۸	۲۴۴	بے حجابی	قانونِ صلح و جنگ
"	"	نافرمانی	الفاق فی سبیل اللہ
۲۵۹	۲۴۵	لڑائی جھگڑا	فضول خرچی
"	"	سخت تنبیہ	تبلیغ دین
"	۲۴۶	حج مبرور	احسانِ کرم
۲۶۱	۲۴۷	زاوہ راہ	درس نمبر ۸۰ آیت ۱۹۶
۲۶۲	"	گدگداری حرام ہے	آیت اور ترجمہ
۲۶۳	"	تقویٰ بہترین زاوہ راہ ہے	گزشتہ سے پیوستہ
"	۲۴۸	تجارت جائز ہے	حج اور عمرہ
۲۶۵	۲۴۹	درس نمبر ۸۲ بقیہ آیت ۱۹۸ تا ۱۹۹	اللہ کا مفہوم
"	۲۵۰	آیات اور ترجمہ	احصار کے مسائل
"	۲۵۱	ربط آیات	قربانی اور حلق
"	"	وقوفِ عرفہ	احرام کی جنایات
۲۶۷	۲۵۲	عرفات کے معانی	حج کی اقسام
۲۶۸	۲۵۳	عرفات کی مصروفیات	تمتع اور قربانی
"	۲۵۴	عرفات سے واپسی	قربانی کا بدلہ
۲۶۹	"	وقوفِ مزدلفہ	تمتع کی شرط
۲۷۰	۲۵۵	ذکرِ الہی	احکام کی پابندی
۲۷۲	۲۵۶	قریش مکہ کا تشخص	درس نمبر ۸۱ آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف
۲۷۳	"	استغفار کا حکم	آیات اور ترجمہ

۲۸۵	سعودی عرب میں اجرائے حدود	۲۷۴	درس نمبر ۸۳ آیت ۲۰۰ تا ۲۰۳
"	جان نثارین اسلام	"	آیات اور ترجمہ
۲۹۲	درس نمبر ۸۵ آیت ۲۰۸ تا ۲۱۰	۲۷۵	منیٰ کی مصروفیات
"	آیات اور ترجمہ	۲۷۶	طواف زیارت
"	مکمل اسلام	"	خانہ فی تقاخر
۲۹۳	شیخ المنہ اور ترجمہ قرآن	۲۷۷	ذکر الہی
۲۹۴	بدعات کی تردید	۲۷۸	دنیا کی خواہش
۲۹۶	ظاہر و باطن میں یکسانی	"	دنیا اور آخرت
۲۹۸	اسلام انقلابی مذہب ہے	۲۸۰	ذخیرہ آخرت
۲۹۹	شیطان کے نقش قدم	"	ایمان تشریق
"	وعید خداوندی	۲۸۱	قیام منیٰ میں تحفیف
۳۰۰	اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	"	قائدین کی پابندی
۳۰۲	درس نمبر ۸۶ آیت ۲۱۱ تا ۲۱۲	۲۸۲	تقویٰ کیا ہے
"	آیات اور ترجمہ	۲۸۳	درس نمبر ۸۴ آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷
"	واضح نشانیاں	"	آیات اور ترجمہ
۳۰۳	انبیاء نعمت الہی ہیں	"	ربط آیات
۳۰۴	انعامات کی ناقدری	۲۸۴	مخلص اور منافق
۳۰۶	حُب دنیا	۲۸۵	اصلاح قلب
۳۰۷	اہل ایمان سے کھٹکھٹ	"	فدا فی الارض
"	اہل تقویٰ	۲۸۶	تولی بمعنی حاکم
۳۰۸	رزق کی فراوانی	۲۸۷	جرم کی سرپرستی
۳۰۹	مال کے تین مصرف	۲۸۸	تجربہ نگاہ
۳۱۱	درس نمبر ۸۷ آیت ۲۱۳	۲۸۹	مسلمان مگر منافق

۳۳۱	درس نمبر ۸۹ آیت ۲۱۶ تا ۲۱۸	۳۱۱	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	گذشتہ سے پیوستہ
۳۳۲	گذشتہ سے پیوستہ	۳۱۲	امت واحدہ
۳۳۳	جہاد اور قتال میں فرق	۳۱۳	بعثتِ انبیاء
"	فرض عین اور فرض کفایہ	۳۱۵	کتابِ سماویہ
۳۳۵	خیر و شر اللہ کے علم میں ہے	۳۱۶	درجہ اختلاف
"	غالب اور مغلوب	"	حق و باطل میں تمیز
۳۳۶	حرمت والے مہینے	۳۱۸	صبر و استقامت
۳۳۷	شانِ نزول	"	ہدایت ربانی
۳۳۸	حرام فعل	۳۲۰	درس نمبر ۸۸ آیت ۲۱۴ تا ۲۱۵
۳۳۹	مرتہ اور اسکی سزا	"	آیات اور ترجمہ
۳۴۰	اہل ایمان کے لیے خوشخبری	"	گذشتہ سے پیوستہ
۳۴۱	درس نمبر ۹۰ آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰	۳۲۱	مشکلات کا سامنا
"	آیات اور ترجمہ	۳۲۲	سابقین کی مثالیں
"	گذشتہ سے پیوستہ	۳۲۳	نصرتِ الہی
"	موضوعِ آیت	۳۲۴	اشاعتِ دین
۳۴۲	شراب نوشی	۳۲۵	جانی اور مالی جہاد
۳۴۳	قمار بازی	۳۲۶	مجاہدہ ضروری ہے
۳۴۴	حرمت شراب کے مراحل	"	خرچ کی مدت (۱) والدین
۳۴۶	حرمت شراب پر تادمیں	۳۲۷	(۲) اقدار
۳۴۸	حرام چیز کی تجارت بھی حرام ہے	۳۲۸	(۳) یتیم و مسکین
"	خرچ کی مقدار	"	(۴) مسافر
۳۴۹	ذخیرہ اندوزی کی ممانعت	۳۲۹	اسلامی معاشرہ

۲۶۹	توبہ اور پاکیزگی	۳۵۰	عذرو فحک کی دعوت
۳۷۰	عورت بمنزلہ کھیتی	۳۵۱	درس نمبر ۹۱ آیت ۲۲۰ بقیہ
۳۷۱	نیک اولاد - صدقہ جاریہ	"	آیت اور ترجمہ
۳۷۲	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱ تا ۲۲۷	"	گذشتہ سے پیوستہ
"	آیات اور ترجمہ	۳۵۲	شان نزول
"	رابط آیات	۳۵۳	یتیم کی سرپرستی
۳۷۳	مسئلہ قسم	۳۵۵	مفسد اور مصلح
"	نا جائز قسم کی ممانعت	۳۵۷	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱
۳۷۴	قسم کی تین قسمیں	"	آیت اور ترجمہ
۳۷۵	قسم کا کفارہ	"	رابط آیات
۳۷۶	مسئلہ ایلاء	۳۵۸	مشرکین سے نکاح کی ممانعت
۳۷۹	درس نمبر ۹۵ آیت ۲۳۸	۳۵۹	ارتداد ناقض نکاح ہے
"	آیت اور ترجمہ	"	شُرک کیا ہے
"	رابط آیات	۳۶۱	اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے
"	نکاح اور طلاق	۳۶۲	دوزخ اور جنت کی طرف دعوت
۳۸۰	دوسرے مذاہب سے تقابل	۳۶۴	درس نمبر ۹۳ آیت ۲۲۲ تا ۲۲۳
۳۸۱	اسلام میں نظریہ طلاق	"	آیات اور ترجمہ
"	عدت	"	رابط آیات
۳۸۳	حیض یا طہر	۳۶۵	عورتوں کے مختص خون
"	کتمانِ حمل جائز نہیں	۳۶۶	مدت حیض
۳۸۴	طلاق رجعی	"	افراط و تفریط
۳۸۵	حقوق زوجین	۳۶۷	سوال و جواب
۳۸۶	مرد کی فضیلت	۳۶۸	حائضہ کے احکام

۴۱۱	نکاح ثانی میں رکاوٹ نہ بنو	۳۸۷	طلاق کا حق مرد کو ہے
۴۱۳	درس نمبر ۹۹ آیت ۲۳۳	۳۸۹	درس نمبر ۹۶ آیت ۲۲۹
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	مسئلہ رضاعت	"	ربط آیات
۴۱۴	مدت رضاعت	۳۹۰	نکاح سنتِ انبیاء ہے
۴۱۵	رضاعت اور خیرہ کی ذمہ داری	"	شرائط نکاح
۴۱۷	یتیم بچے کی رضاعت	۳۹۲	طلاق کی تین قسمیں
۴۱۸	مدت رضاعت میں رعایت	"	رجعی طلاقیں دو ہیں
"	اجنبی عورتوں سے رضاعت	۳۹۳	علاج کی کا طریق کار
۴۲۰	درس نمبر ۱۰۰ آیت ۲۳۲ تا ۲۳۵	۳۹۴	خلع کا بیان
"	آیات اور ترجمہ	۳۹۵	طلاق بالمال
۴۲۱	ربط آیات	۳۹۶	حدود اللہ کا احترام
"	عدت کی مختلف اقسام	۳۹۷	درس نمبر ۹۷ آیت ۲۳۰
۴۲۲	بیوہ کی عدت	"	آیت اور ترجمہ
"	غیر ذہاب میں قباہتیں	۳۹۹	حلالہ
۴۲۴	نکاح کی اجازت	۴۰۰	طلاق کی مختلف صورتیں
"	عدت میں اشارے کنائے کی اجازت	"	طلاق ثلاثہ کی تحقیق
۴۲۷	درس نمبر ۱۰۱ آیت ۲۳۶ تا ۲۳۷	۴۰۳	مشروط نکاح
"	آیات اور ترجمہ	۴۰۵	درس نمبر ۹۸ آیت ۲۳۱ تا ۲۳۲
"	ربط آیات	"	آیات اور ترجمہ
۴۲۸	حق مہر لازمی ہے	۴۰۶	طلاق بدائے ایذا و رسانی
۴۲۹	خاندان شاہ ولی اللہ	۴۰۸	تذکیر با احسان اللہ
۴۳۰	اوزنگ زیب عالمگیر	۴۰۹	نکاح میں عورت کی رضامندی
۴۳۱	حق مہر کا عدم تقرر	۴۱۰	مسئلہ ولایت

۴۵۱	درس نمبر ۱۰۲ آیت ۲۴۶	۴۴۱	مہر مثل
"	آیت اور ترجمہ	۴۴۳	نصف مہر
"	ربط آیات	"	معافی تقویٰ کی علامت ہے
۴۵۲	اسلام کا سیاسی نظام	۴۴۴	فضیلت کی پاسداری
"	بنی اسرائیل کا زوال	۴۴۵	درس نمبر ۱۰۲ آیت ۲۳۸ تا ۲۴۲
۴۵۳	حضرت یحییٰ علیہ السلام	"	آیات اور ترجمہ
"	آغاز واقعہ	۴۴۶	ربط آیات
"	لفظ ملک کی تشریح	"	صلوٰۃ و سطحی
۴۵۴	ملوکیت کا تصور	۴۴۸	نماز خوف
۴۵۶	جماعت کی اہمیت	۴۴۹	بیواؤں پر احسان
"	بنی اور قوم میں مکالمہ	۴۵۰	مطلقہ کے حقوق
۴۵۷	بنی اسرائیل کی رد گمردانی	۴۵۱	درس نمبر ۱۰۳ آیت ۲۴۳ تا ۲۴۵
"	ظالم اور عادل	"	آیات اور ترجمہ
۴۵۹	درس نمبر ۱۰۵ آیت ۲۴۷ تا ۲۴۸	"	ربط آیات
"	آیات اور ترجمہ	۴۵۲	اسلوب خطاب
۴۶۰	ربط آیات	۴۵۳	جہاد سے فرار اور موت
"	طاوت بطور بادشاہ	۴۵۴	دوبارہ زندگی
۴۶۱	امیر کی خصوصیات	۴۵۵	جہاد سے گمراہی حرام ہے
۴۶۲	خلیفہ کا انتخاب	۴۵۶	جہاد کا حکم
۴۶۳	مولانا عبید اللہ سندھی	۴۵۷	جہاد بالمال
۴۶۶	مشرائط خلافت	"	جہاد کی اہمیت
۴۶۷	تابوتِ سکینہ	۴۵۹	قرض حسنہ
۴۶۹	درس نمبر ۱۰۶ آیت ۲۴۹	۴۵۰	قبض و لبط

۴۹۰	انسان اپنے ارادہ کا خود ذمہ دار ہے	۴۶۹	آیت اور ترجمہ
۴۹۲	درس نمبر ۱۰۹ آیت ۲۵۴	"	رابط آیات
"	آیت اور ترجمہ	۴۷۰	شکر طاہر اور جاہلوت
"	رابط آیات	۴۷۱	شکر کی آزمائش سپاہی کے اوصاف
"	جان و مال کی قربانی	۴۷۳	اکثریت کی ناکامی
۴۹۳	الفتاح فی سبیل اللہ	"	تین گمراہ
۴۹۴	خروج میں اعتدال کی راہ	۴۷۴	تاریخی واقعات
۴۹۵	روز قیامت خرید و فروخت نہ ہوگی	۴۷۷	درس نمبر ۱۰ آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱
"	دستی کام نہ آئیگی۔	"	آیات اور ترجمہ
۴۹۶	عام سفارش نہیں ہوگی	"	رابط آیات
"	کفار ہی ظالم ہیں	۴۷۸	میدان جنگ میں دعا
۴۹۸	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۵۵	۴۸۰	جاہلوت سے مقابلہ
"	آیت اور ترجمہ	۴۸۱	حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ
"	رابط آیات	۴۸۲	مناقب حضرت داؤد علیہ السلام
۴۹۹	آیت الکہسی کی فضیلت	۴۸۳	فلسفہ جہاد
۵۰۲	توحید باری تعالیٰ	۴۸۵	درس نمبر ۱۰۸ آیت ۲۵۲ تا ۲۵۳
۵۰۴	مسئلہ شفاعت	"	آیات اور ترجمہ
۵۰۵	علم غیب خاصہ خداوندی ہے	"	رابط آیات
۵۰۷	عرش اور کرسی	۴۸۶	بعثت انبیاء کا مقصد
۵۰۹	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷	"	تصدیق رسالت
"	آیات اور ترجمہ	۴۸۷	انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت
"	رابط آیات	۴۸۹	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات
۵۱۰	دین میں جبر نہیں	"	روح القدس سے تائید

۵۳۲	گدھا کیسے زندہ ہوا	۵۱۲	شان نزول
۵۳۳	عالم بزرگ	۵۱۳	مضبوط کپڑا
۵۳۴	اجسام کی حفاظت	۵۱۴	نور اور ظلمت
"	یقین کے تین مدارج	۵۱۵	طاغوت کی دوستی
۵۳۶	درس نمبر ۱۱۴ آیت ۲۶۰	۵۱۷	درس نمبر ۱۱۲ آیت ۲۵۸
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	تمہید	"	رابطہ آیات
۵۳۷	پس منظر	۵۱۸	ابراہیم علیہ اور غرور میں مناظرہ
۵۳۸	انبیاء شک سے پاک ہیں	"	غرور کا شجرہ نسب
۵۴۰	چارہ پندے	۵۱۹	مناظرہ کب ہوا
۵۴۱	پہ و ندول کی موت و حیات	۵۲۰	مناظرے کا پس منظر
۵۴۲	کمال قدرت کا مشاہدہ	۵۲۲	اصل مناظرہ
۵۴۳	معجزہ اور کرامت	۵۲۳	غیر اللہ کو سجدہ
۵۴۵	درس نمبر ۱۱۵ آیت ۲۶۱ تا ۲۶۳	"	ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ
"	آیات اور ترجمہ	۵۲۴	ظالم ہدایت سے محروم ہیں
"	رابطہ آیات اتفاق فی سبیل اللہ	۵۲۶	درس نمبر ۱۱۳ آیت ۲۵۹
۵۴۶	اجرو و ثواب کے درجات	"	آیت اور ترجمہ
۵۴۸	معیار قبولیت	"	رابطہ آیات
۵۴۹	سائل کے ساتھ نرم رویہ	۵۲۷	متعلقہ شخص کون تھا
۵۵۱	درس نمبر ۱۱۶ آیت ۲۶۴ تا ۲۶۶	۵۲۸	تاریخی پس منظر
"	آیات اور ترجمہ	"	واقعہ پہ سطحی نظر
۵۵۲	ابطال صدقہ کی پہلی دو وجوہ	۵۳۰	تباہ شدہ بستی
"	تیسری وجہ ریاکاری	"	موت و حیات کا منظر

۵۷۳	چٹان کی مثال	۵۷۳	آیات اور ترجمہ	۵۷۳
"	کافر راہنمائی سے محروم ہیں	۵۷۴	ربط آیات	"
۵۷۴	رضا الہی کے لیے خرچ	"	ابدایا اخفا	۵۷۴
	باغ کی مثال	۵۷۵		
۵۷۶	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸	۵۷۷	غیر مسلم کے لیے صدقہ	۵۷۶
۵۷۷	آیات اور ترجمہ	"	حبیبی غیر مسلم محروم ہے	"
"	ربط آیات	"	ہدایت دہندہ صرف اللہ ہے	"
۵۷۸	قبولیت کی چوتھی شرط - پاکیزگی مال	۵۷۸	پورا پورا بدلہ	۵۷۸
۵۸۰	ذاتی کمائی میں سے خرچ	"	درس نمبر ۱۲ آیت ۲۷۳	۵۸۰
"	معدنیات میں سے خرچ	۵۷۹	آیت اور ترجمہ	"
"	خبیث مال قابل قبول نہیں	۵۸۱	ربط آیات	"
۵۸۱	شیطان کا بہکاوا	۵۸۱	فقیر و مسکین	۵۸۱
"	اللہ تعالیٰ کا وعدہ	"	محصور و فقراء	"
۵۸۳	درس نمبر ۱۱۸ آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰	۵۸۳	فقراء کی پہچان	۵۸۳
۵۸۵	آیات اور ترجمہ	"	گدا گندی حرام ہے	۵۸۵
۵۸۶	ربط آیات	"	دین کی خدمت	۵۸۶
۵۸۸	حکمت کا مفہوم	"	درس نمبر ۱۲۱ آیت ۲۷۴ تا ۲۷۷	۵۸۸
"	انفاق پر حکمت کا اثر	۵۸۷	آیات اور ترجمہ	"
۵۸۹	حکمت منہج حیات ہے	"	صدقہ بمقابلہ سود	۵۸۹
"	مسئلہ نذر	۵۸۹	صدقہ کے چار مواقع	"
۵۹۰	نذر معصیت	"	ایصال ثواب کے لیے تعین وقت	۵۹۰
۵۹۱	ظالم بے یار و مددگار ثابت ہونگے	۵۹۱	سود خوردگی حالت زار	۵۹۱
۵۹۲	درس نمبر ۱۱۹ آیت ۲۷۱ تا ۲۷۲	۵۹۲	جن کا سایہ	۵۹۲

۶۱۳	۵۹۲	تجارت بمقابلہ سود
"	۵۹۳	سابقہ سود کی معافی
۶۱۴	۵۹۵	حرمت سود کی حکمت
۶۱۵	۵۹۶	اہل ایمان کے لیے بشارت
۶۱۶	۵۹۷	درس نمبر ۱۲۲ آیت ۲۷۸ تا ۲۸۰
"	"	آیات اور ترجمہ
۶۱۷	"	ربط آیات
۶۱۸	۵۹۸	شان نزول
۶۱۹	۵۹۹	سود خوروں کے لیے تعزیر
۶۲۱	۶۰۱	تنگ دست مقرض کے لیے مہلت
"	"	معاف کردہ دنیا بہتر ہے۔
"	۶۰۲	حکومت وقت کی ذمہ داری
۶۲۲	۶۰۳	آخرت میں محاسبہ
۶۲۳	۶۰۴	درس نمبر ۱۲۳ آیت ۲۸۱ نصف اول
۶۲۴	"	آیت اور ترجمہ
"	"	دستاویز کی اہمیت
۶۲۶	۶۰۵	تحریر کے مسائل
"	۶۰۶	قرض اور دین میں فرق
"	۶۰۷	بیع سلم
۶۲۷	۶۰۸	ادائیگی قرض کا عجیب واقعہ
۶۲۸	۶۱۰	تحریر مدیون کا حق ہے
۶۳۰	۶۱۲	درس نمبر ۱۲۴ آیت ۲۸۲ نصف آخر
۶۳۱	"	آیت اور ترجمہ
		ربط آیات
		گواہی کی شرائط
		عورتوں کی گواہی
		شہادت اور قسم
		گواہ کی ذمہ داری
		جھوٹی گواہی
		تحریر کب ضروری ہے
		کاتب اور گواہ کا تحفظ
		خوف خدا
		درس نمبر ۱۲۵ آیت ۲۸۳
		آیت اور ترجمہ
		ربط آیات
		مستحقین
		رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں
		امانت کی پاسداری
		کتمان شہادت گناہ ہے
		شہادت کا معاوضہ جائز نہیں
		درس نمبر ۱۲۶ آیت ۲۸۴
		آیت اور ترجمہ
		اختتامی کلمات
		حاکمیت اعلیٰ
		محاسبہ کب ہوگا
		شان نزول
		اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے

۶۳۲	درس نمبر ۱۲۸ آیت ۲۸۶	۶۳۳	درس نمبر ۱۲۵ آیت ۲۸۵
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	دین آسان ہے	"	رابط آیات
۶۳۴	مُجْبُول اور خطا میں فرق	"	در مدح صحابہؓ
"	مُجْبُول اور خطا پر مؤاخذہ نہیں	۶۳۴	تصدیق بالقلب
۶۳۵	دعاۃ کلمات	۶۳۵	صفات الہی پر ایمان ایمان باللہ
۶۳۶	معافی کی درخواست	۶۳۶	فرشتوں پر ایمان
"	غلبۃ اسلام	۶۳۸	کتابلوں پر ایمان
۶۳۷	سورۃ بقرہ کی خصوصیت	۶۳۹	رسولوں پر ایمان
۶۳۸	فضائل آیات آخر سورۃ	۶۴۰	بخشش کی طلب
		"	قیامت پر ایمان

احکامِ عمرہ

مذہبِ اہل سنت مکتبۃ المکرمۃ و مدینۃ المنورۃ

مُرتب
مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

قیمت:
۱۵/-
روپے

ملنے کا پتہ:
مکتبہ دوس القرآن فائق گنج گوہر انوار

صفحات
۹۶

پیش لفظ

لَحْمَدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ
اَمَّا بَعْدُ

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا وہ آخری کلام ہے، جسے خود اللہ جل شانہ نے احسن الحدیث کا لقب دیا ہے۔ اللہ نَزَّلَ احْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیً عَرَبِیًّا مَّقُولًا ہے "کلام الملوک ملوک الکلام" جو کلام خود مالک الملک کا ہے، اس سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے جس کلام کی نسبت خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ کی طرف سے اس کی ہمہری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ اور جس کے متعلق وہ خود اعلان فرمائے کَلِمَةً اللّٰهُ هِیَ الْعَلِیَّیَا اُس سے اعلیٰ وارفع کلام کس کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود چیلنج کر دیا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا اُس خداوند قدوس کی بات سے سچی بات کس کی ہو سکتی ہے فرمایا اگر ان حقائق کے متعلق کوئی شک ہے۔ فَاتُّوا بِسُودَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ تُوَاسِ جِیسی ایک ہی سورۃ بنا کر لے آؤ۔ مگر یہ چیلنج آج تک تشنہ قبولیت رہا ہے۔

آئیے ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور ان سے پوچھیں کہ کیا ہم نے قرآن حکیم کو وہ مقام دیدیا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنے دلوں کی زمین کو پرکھنا ہوگا کہ وہ قرآن پاک کی برکات کو جذب کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي نَحَبُثُ لَا يَخْرِجُ إِلَّا نَجَسًا اچھی زمین اللہ کے حکم سے سبزیاں اُگاتی ہے مگر خراب زمین سے فضول چیزیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنے دلوں سے سوال کرنے سے پہلے آئیے قرآن پاک کے اولین مخاطبین کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں کہ

اُن پاکیزہ دلوں نے اس احسن الکلام کی بیکات کو کس طرح اپنے اندر سمیٹ لیا۔
 فاروق اعظمؓ کی شہ زوری کے قصے زبانِ زورِ عام تھے۔ آپ قلب و جسم اور ارادے
 کے مضبوط انسان تھے، دیگر مخالفین کی طرح اہل اسلام کو زک کہہ نے میں پیش پیش تھے۔
 ایک رات ناپاک ارادے سے نکلتے ہیں حضور علیہ السلام حرم شریف میں نماز ادا کر رہے
 ہیں، سورۃ الحاقۃؓ کی آیات زبان پر ہیں الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا
 أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝ کان میں آواز پڑی تو اس کی جلالت و شہرت سے متاثر ہوئے
 بغیر نہ رہ سکے۔ مخالفت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، قرآن کے نظم اور اسلوب بیان پر غور کیا۔ تو
 خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ کسی شاعر کا کلام ہے مگر اسی لمحہ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہ
 آیت تھی إِنَّهُ كَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا أَهْلُوا بِقَوْلِ شَاعِرٍ
 قَلِيلًا ۝ مَا تُوَمِّنُونَ ۝ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ پھر خیال آیا شاید یہ کسی
 کاہن کا کلام ہو مگر اس کا جواب تھا وَلَا يَقُولُ كَاهِنٌ ۝ یہ کسی کاہن کا کلام بھی
 نہیں۔ بلکہ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ یہ تو تمام جہانوں کے پروردگار
 کا نازل کردہ ہے۔ دل پہ چوٹ لگ چکی تھی۔ قرآن پاک کی حقانیت سے مغلوب ہو
 ہو چکے تھے۔ مگر ابھی مخالفت برائے مخالفت کا اثر باقی تھا۔

پھر ہی عمر فاروقؓ ایک دین ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے
 نکلتے ہیں کہ راستے میں بہن اور بہنوئی کے ایمان لانے کی خبر ملتی ہے۔ فوراً ادھر کا رخ
 کرتے ہیں۔ دونوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں مگر جوہنی سورۃ طہ کی آیات کان
 میں پڑتی ہیں طٰه ۝ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۝ إِلَّا
 تَذِكْرًا لِّمَن يَخْشَىٰ ۝ اے رسول اعظم! ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نازل
 نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ یہ تو ہر ڈرنے والے شخص کے لیے یاد دہانی ہے!
 فاروق اعظمؓ کی تمام شقاوت دور ہو چکی تھی۔ بچوں کی طرح بک بک کر رونے لگے، اشکوں
 کا سیلاب اُمڈ آیا، قلب نور ایمان سے منور ہو گیا، چنانچہ در اقدس پر حاضر ہو کر کلمہ پڑھ لیا۔
 طفیل دوسی بہت بڑے شاعر و ادیب اور اپنے قبیلے کے معززین میں سے تھے۔

مکے آتے ہیں تو قریش نے ہر چند سمجھایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں نہ پھنس جانا۔ پہلے تو کانوں میں روئی ٹھونس کر پھرتے رہے کہ کہیں حضور علیہ السلام کی آواز کان میں نہ پڑ جائے، پھر خیال آیا کہ میں بھی شعروادب پر عبور رکھتا ہوں، کیوں نہ اس کلام کا بھی جائزہ لیا جائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نماز میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ طفیل سنتا ہے اور سنتا ہی رہ جاتا ہے جب آپ نے نماز ختم کی تو ساتھ ہی سو لیا۔ اور اپنے آپ کو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ کا مصداق بنا دیا، خود کہا کرتے تھے ”خدا کی قسم آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مذہب کوئی دیکھا۔“

جبیر ابن مطعم نیک سیرت انسان تھے۔ مگر جاہلیت کی عصبیت قبول حق میں مانع تھی۔ جنگ بدر کے قیدی چھڑانے کے لیے دونوں مدینہ منورہ آئے، حضور بنی کریم نماز میں سورۃ طور کی تلاوت فرما رہے ہیں وَالطُّورُ ۝ وَكِتَابٌ مَّسْطُورٌ ۝ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۝ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۝ جبیر کہتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا قلب پھٹ جائیگا، پھر جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۚ نَّمَالَهُ مِنْ دَافِعٍ ۝ تو کچھ طاری ہو گئی۔ ایسا خوف پیدا ہوا کہ کہیں اسی وقت اللہ کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ جلد ہی ایمان لے آئے۔

حضرت عثمان ابن مظعون کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ سادہ طبیعت اور نیک انسان تھے، سورۃ نحل کی آیت سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيتَايْ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ خود بیان کرتے ہیں کہ ”یہی وہ وقت ہے جب ایمان میرے دل میں جاگنیں ہوا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔“

الغرض! خود قرآن پاک نے اپنے متعلق فرمایا۔ لَوْ اَنْزَلْنَاهُ هٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَاٰيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ بھی خوف الہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مگر ایک حضرت انسان

ہے، جو اسکی اثر انگیزی سے بیگانہ اور اس کی برکات سے محروم ہے۔ ہاں اس کا اثر وہ شخص قبول کرتا ہے۔ جس کے پاس سوچنے والا دماغ، سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ ہے۔ جس کی آنکھ میں روشنی نہیں اس کے لیے آفتاب کی روشنی بھی بیکار ہے۔ قرآن پاک قلب و ذہن کی کایا لپٹ لینے والا کلام ہے۔ اس میں دلوں کو کھینچ لینے والی مقناطیسیت ہے۔ اس نغمہ میں مدہ سرور ہے، جس کو سن کر انسان تو کجا شجر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ قلب کو گمراہ اور روح کو تڑپا دینے والا کلام ہے۔ اللہ نے اس کا نام ہدایت بھی رکھا ہے اور نور بھی۔ یہ بہان بھی ہے اور فرقان بھی۔ اس میں ہمت بھی ہے اور شفا بھی۔ کاش! ہم اس کی برکات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے سلسلہ دروس القرآن جاری ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لینے والی پوری ٹیم اور اس کے ساتھ دامن، درمے، سچنے تعاون کرنے والے حضرات کی استقامت اور کامیابی کی دعا کریں۔

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر — مختلف جلدوں کا مختصر تعارف ہر جلد کے ساتھ آچکا ہے۔ یہ جلد اس لحاظ سے اہم ہے۔ کہ اس کے ذریعے سورۃ بقرہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ کو دو حصوں میں شائع کیا گیا پہلا حصہ پہلے پارے پر مشتمل تھا، اب دوسرے حصے میں دوسرا مکمل پارہ اور تیسرا پارہ تا اختتام سورۃ شامل ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس کام کی توفیق بخشی۔ جیسا کہ گذشتہ جلد کی ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے۔ سورۃ ال عمران پر بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ جلد بھی جلد ہی زیر طباعت سے مزین ہو کر قارئین کے مطالعہ میں آجائے گی۔ انشاء اللہ

سورۃ بقرہ سے پہلے تیسویں پارے پر مشتمل بیسویں جلد شائع ہوئی تھی۔ قارئین کرام تیسویں پارے اور سورۃ بقرہ کے مضامین میں واضح فرق محسوس کریں گے۔ بیسویں جلد کی ۳۷ سورتوں میں سے ۳۴ مکی دور کی ہیں جب کہ صرف ۳ سورتیں مدنی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیسرا سالہ مکی دور میں قرآن پاک نے اپنے مخاطبین کو اسلام کی ابتدائی دعوت

دی چنانچہ مکی سورتوں میں کفر و شرک کا رد، ایمانیات اور معاد سے متعلق موضوعات ہیں
بر خلاف اس کے مدنی سورتوں کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو سب سے پہلے یہودیوں سے واسطہ
پڑا۔ یہ لوگ تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھ کر ان کی آمد کے منتظر
تھے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ اللہ کا آخری نبی بنی اسرائیل میں سے آئے گا، اور وہ
اُسے فوراً تسلیم کر لیں گے، ان کی توقع کے خلاف جب دعویٰ نبوت بنو اسماعیل کے ایک
فرد نے کیا، تو یہودی حسد کی آگ میں جل گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کر لیا تو ان کی ساری اجارہ داری اور دوسری اقوام پر
تفوق ختم ہو جائے گا، لہذا انہوں نے آپ کی رسالت کا سکر سے انکار ہی کر دیا، اور پھر
اس انکار پر اصرار کرتے ہوئے اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ دوسری طرف
کچھ یہودی ایسے بھی تھے، جو اسلام کا روشن مستقبل دیکھ کر بظاہر مسلمان ہو گئے، مگر ان کے
دل یہودیوں کے ساتھ منسلک ہے۔ اور اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے اندر سے ان پر
شب خون مار کر ان کی جمعیت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے یہ لوگ منافق کہلائے
چنانچہ سورۃ بقرہ کے بیشتر حصہ میں۔ اہل کتاب یہود اور منافقین کی سازشوں کا تذکرہ ہے۔
مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو
گئے تھے۔ اب انہیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے لیے قانون کی
ضرورت تھی چنانچہ اس طویل سورۃ میں ایمانیات کے علاوہ، نماز، روزہ، حج، قربانی،
انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ سے متعلق کچھ تفصیلات آگئی ہیں۔ عدت و حرمت کے مسائل
ہیں۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلق مسائل نکاح، طلاق، خلع، عدت، مہر، نان نفقہ
رضاعت وغیرہ کی بعض تفصیلات ہیں، معاشرتی مسائل میں والدین، اقربا، ہمسایوں اور
یتیموں وغیرہ سے حسن سلوک کی تلقین ہے۔ خیرات و صدقات کی بہکات، لین دین
کے معاملات، مقروض کے ساتھ نرمی، شہادت اور امانت جیسے مسائل بھی آگئے ہیں
صلح و جنگ کے قواعد، قصاص اور دیت کی بعض مبادیات بھی آگئی ہیں۔ اس سورۃ

میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے ساتھ مکالمہ اور ابلیس کا تذکرہ بھی مجلا ہو گیا
 حد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد میں منصب امامت کے قیام اور
 پھر اسی ضمن میں بیت اللہ شریف کی تعمیر اور دیگر شعائر اللہ کا مختصر بیان بھی آگیا ہے۔
 ہمیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ عرصہ
 لگ گیا ہے۔ کام کی رفتار بھی قدرے سست رہی، نیز اس عرصہ میں ادارہ کو حضرت
 مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی گہراں قدر تالیف ”نماز مسنون کلاں“ کی طرف بھی توجہ مبذول
 کرنا پڑی۔ بلاشبہ نمائندہ کے موضوع پر اس ضخیم کتاب نے باقی کتب سے بے نیاز
 کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم صوفی صاحب کی ایک دیرینہ خواہش اور عوام کی اہم ضرورت
 کو پورا فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی صاحب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کو دین کی مزید
 خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ آپ کی صحت اور درازی عمر
 کے لیے صدق دل سے دعا کریں۔
 امید ہے کہ سلسلہ دروس القرآن کی آئندہ جلد کم از کم وقت میں شائع ہو جائے گی۔
 وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

احق العباد

لعل دین

ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

سخنہائے گھنٹی

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ
الْكَرِيمِ خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَ
أَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ ۔ آمَّا بَعْدُ

مستند جامع، قرآن، احادیث اور مسلک سلف کے مطابق تفسیر، سادہ، دلپسند،
پُر مغز اور تصنع سے پاک انداز بیان، مختصر، عام فہم اور اغلاق سے مبرا مضامین، اسلام کے
بنیادی عقائد کی توضیح و تبیین، کفر، شرک اور بدعات کا احسن طریقے سے رد، مخالفین
پر تنقید میں اعتدال، اور تلخی درشتگی، سے گریز۔

مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی اور اس میں راہ عمل، باطل نظامہائے حکومت
پر بے لاگ تبصرہ، قصص کا سلسلہ مربوط اور دلکش، حکمت ولی اللہی، ضروری فقہی مسائل
سیاسی، اقتصادی، معاشی مسائل اور عصر حاضر میں ان کا حل اور اس طرح کی مفید بحثیں درمیں القرآن
کا خاص امتیاز ہے۔

ولی اللہی فکر اور قرآن کریم کی انقلابی روح کو پوری طرح ان دروس میں سمونے کی کوشش
کی گئی ہے، رواں دواں، سہل، مانوس، آسان اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔
مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی بد حالی کا پورا ٹھوس لگایا گیا ہے۔ اور قرآنی طریق کار کی
طرف ان کا رخ موڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ سائنسی اور جدید دور میں مشکل
حالات کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں قرآنی روشنی کی طرف راہنمائی
کی گئی ہے۔ لہو و لعب، عیاشی و فحاشی اور رفاہیت بالغہ کی پوری طرح حوصلہ شکنی
کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی فکری گمراہی اور ذہنی غلامی کے فساد کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

دروس القرآن صحیح معنوں میں اساتذہ و شیوخ سے حاصل کردہ اور حضرت صوفی صاحب
دام مجدہم کی زندگی بھر کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کا پتھر ہے۔
زیر نظر جلد پارہ ۱ کے شروع سے سورۃ بقرہ کے آخر تک کے حصہ پر مشتمل
ہے اس جلد میں دعوت الی التوحید و الرسالت، فرائض خمسہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ
ایمانیات، خلافت کبریٰ کے تمام اہم اصولوں، نظام سلطنت، سیاست مدن
قانون خانہ داری، جہاد فی سبیل اللہ، صداقت قرآن، علم القصص اور بہت سی مثالوں
اور دیگر بہت سے مضامین کا ذکر ہے۔

قرآن پاک کا انتشار سمجھنے اور افہام کو قرآن پاک کے قریب تر کرنے اور سلف صالحین
کی تفاسیر سے صحیح آگاہی کے لیے دروس القرآن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔
آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب
دام مجدہم اور انجمن مجاہدان اشاعت قرآن کے جملہ اراکین اور خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب
ایم، اے علوم اسلامیہ اور اسکی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور
بخشش کا ذریعہ بنائے، ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو
اس سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد اشرف

(فاضل مدرسہ نصرت العلوم و دفاق المدارس العربیہ)

(۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ بمطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۷ء)

پیش لفظ

طبع ششم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ !

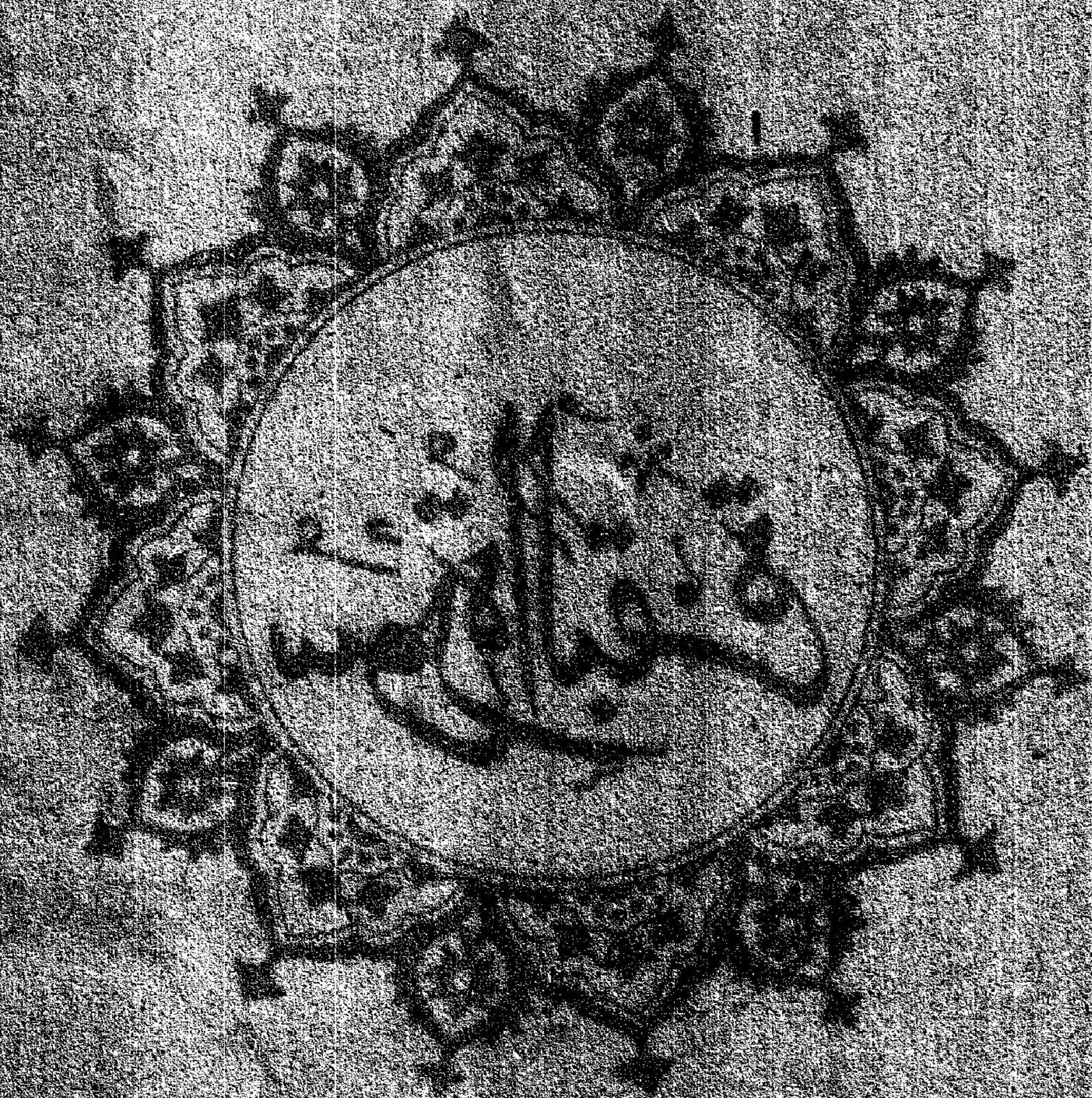
تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد طبع ششم قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ رب العزت نے اس تفسیر کو اپنی خصوصی عنایات سے بے شمار شرف قبولیت سے نوازا ہے جس کا منہ بولتا ثبوت ایک قلیل عرصہ میں اسکے متعدد ایڈیشنوں کا طبع ہو کر چار دانگ عالم پھیل کر دوا تحسین حاصل کرنا، تفسیر رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں بیس ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اندرون ملک اور بیرونی ممالک سے کثیر خطوط اور ٹیلیفون کے ذریعہ عوام الناس نے اس کے مکمل ہونے پر مبارک بادیں پیش کی ہیں اور اس بات کا برملا اقرار کیا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سہل مفصل اور عام فہم تفسیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اہل سنت والجماعت حنفی دیوبندی مسلک کی صحیح ترجمانی اور اکابر علماء دیوبند کے جابجا مفید ذکر نے اس کی افادیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ وہ اس تفسیر کو صاحب تفسیر کے لیے اور تمام معاونین اور قارئین کے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے اور دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اور قرآن کریم سے تعلق قائم کرنے کا سبب بنائے۔ آمین۔

طبع ششم میں کتابت کی جو اغلاط رہ گئی تھیں انھیں بھی کافی حد تک درست کر دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے۔ آمین۔

احقر:

محمد فیاض خان سواتی

ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق اگست ۱۹۹۹ء





سورة البقرة

سَيَقُولُ ۲

درس پنجاہ و پنج (۵۵)

الْبُقَرَةُ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

۲
ماہنامہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبَلِهِمُ
الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ط قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي
مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۱۴۲ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ
أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ط وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى
الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ط وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ
إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرُءُوفٌ رَحِيمٌ ۝۱۴۳

ترجمہ : عنقریب لوگوں میں سے بیوقوف لوگ کہیں گے کہ ان کو کس چیز نے ان کے
قبلہ سے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر یہ تھے۔ آپ کہہ دیجئے، اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق
اور مغرب۔ وہ جس کو چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے ۝۱۴۲ اور
اسی طریقہ سے ہم نے تمہیں ایک افضل امت بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہی
دینے والے بنو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور نہیں بنایا، ہم نے اس قبلہ کو
جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے
ان لوگوں میں سے جو اپنی اٹھریلوں پر پھرتے ہیں۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے
مگر ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع کرنے والا
نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفیق اور نہایت ہی مہربان ہے ۝۱۴۳

تحوّل قبلہ

اس سے پہلے ملت ابراہیمی اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کا قبلہ رہا۔ قیام مکہ کے دوران حضور علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں ہی تھے بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آپ اور ان نماز بیت اللہ شریف کی طرف اس طرح رخ کرتے تھے کہ یہ رخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کیا۔ اور تمام مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، اس میں بھی مصلحت تھی۔ بیت المقدس بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اور اسی طرح بہت سے انبیاء کا قبلہ بیت اللہ شریف بھی رہا ہے، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو ہی قبلہ مقرر فرمایا، جو تا قیام قیامت قائم رہے گا۔

ہجرت کے ابتدائی عرصہ میں بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا ایک مقصد یہودیوں کی تالیف قلبی بھی تھا۔ تاکہ وہ مسلمانوں سے قریب نہ ہو کہ اسلام کی برکات سے فیضیاب ہوں۔ اور اس طرح دین حق کو قبول کر لیں۔ مگر یہ لوگ انتہائی متعصب اور ضدی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی رواداری سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔ تاہم حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ بیت اللہ شریف کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر فرمادیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو پذیرائی بخشی اور جیسا کہ اگلی آیات میں آئیگا، بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ پکڑنے کا صریح حکم نازل فرمادیا۔

اہل کتاب چونکہ ضدی، عنادی اور ہٹ دھرم تھے۔ اللہ رب العزت جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر یہ لوگ اعتراض کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کریں گے لہذا انہوں نے تحوّل قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی اہل اسلام کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ اس تبدیلی پر معترض ہوں گے۔ لہذا تم ان کے

تحوّل قبلہ پر پہلا اعتراض

پراگینڈ اسے متاثر ہو کر کسی قسم کے شک یا تردد میں مبتلا نہ ہونا۔ چنانچہ اہل کتاب کے پہلے اعتراض کا تذکرہ اس انداز میں بیان فرمایا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ عَنَّا قُرْبُ اٰہل کتاب کے بیوقوف لوگوں میں سے بعض یوں کہیں گے مَا وَلَّهُمْ عَنَّا قُرْبًا اَلَّذِي كَانُوا عَلٰیہَا مُسْلِمًا لوں کو ان کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر وہ پہلے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسلمان ہجرت نبوی کے بعد سورہ یاسرہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور اس کے بعد بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے کا حکم نازل ہوا۔ تو یہودیوں نے اعتراض پیش کر دیا۔ کہ کیا اللہ تعالیٰ کو اس قبلہ کا پہلے علم نہ تھا۔ جواب نیا حکم دے دیا۔ پہلے قبلہ میں کیا خرابی تھی۔ وہ بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اب اس کی تبدیلی کی کیا ضرورت پیش آئی۔ یہاں پر اہل کتاب کے لیے سفہاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو کہ سفیہ کی جمع ہے۔ جس کا معنی بیوقوف ہے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ملت ابراہیمی سے اعراض کرتا ہے، وہ بیوقوف ہے۔ وَمَنْ يُرِغِبْ عَنْ صَلٰتِہِیْ سَ وَاَلَمْ یَلْمِہُ نَفْسَہُ۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الفطرت آدمی ملت ابراہیمی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ یہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین ہی ہیں، جو ایسا کرتے ہیں۔ لہذا یہ بیوقوفوں میں داخل ہیں۔ جو دین فطرت اور دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اہل کتاب کے اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا قُلْ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ فرمادیں۔ کہ یاد رکھو، مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ مشرق اللہ کا ہے اور مغرب کسی دوسرے کا۔ لہذا ہر جہت اُسی کی ہے تو پھر اُسی کی اطاعت لازم ہے۔ وہ جس طرف کو منہ کرنے کا حکم دے مانتا پڑے گا۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا، اُس کی خوشنودی کو پالے گا۔ اور جو اُس کے کسی حکم پر معترض ہوگا، اُس کی تعمیل میں لیت و لعل کرے گا۔ وہ ملعون اور مردود و مٹھڑے گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ عبادت کے لیے کسی قبلہ یا جہت کا مقرر کرنا انسان کے محض جہانی

تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے روح کی توجہ تو ہمیشہ
تجلی الہی کی طرف رہتی ہے، اس کا بظاہر رُخ کسی طرف بھی ہو، اس سے کچھ فرق
نہیں پڑتا۔ بیت المقدس یا بیت الشریف کی جہت کا تقرر تو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد
کی ایک علامت ہے کہ تمام عبادت گزاروں کا رُخ ایک ہی جہت میں ہوتا ہے
وگرنہ جس طرف بھی منہ کر لو، عبادت اسی کی ہوگی۔ پہلے گزر چکا ہے فَاَیْتَمَا
تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ۔ تم جدھر بھی رُخ کر دو گے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی
اُدھر ہی پاؤ گے۔ اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ دوران سفر اگر قبلہ کا تعین نہ ہو سکے۔ تو
جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھو گے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ قبلہ معلوم
ہو جانے کے بعد نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دونوں قبلوں میں صرف
اس قدر فرق ہے کہ بیت المقدس اس لحاظ سے قومی قبلہ ہے کہ یہ خاص خاص
پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ اور بیت اللہ شریف بن الاقوامی قبلہ ہے۔ کہ یہ تمام
انبیاء بشمول حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ ہے۔

مقام تحویل قبلہ

آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نبی سلمہ کی مسجد میں ظہر یا عصر کی نماز ادا فرما رہے تھے۔ کہ دوران نماز
ہی قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔ آپ نے ادھی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے
پڑھی اور بقیہ نصف بیت اللہ شریف کی جہت میں صحیح حدیث میں آتا ہے کہ
نزدول حکم پر جب حضور علیہ السلام نے پلٹ کر رُخ پھیر لیا۔ تو تمام صحابہ کرام بھی پلٹ
گئے کسی کو کچھ تردد نہیں ہوا۔

اگلے روز قبا کے لوگ اپنی مسجد میں فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اُن کا رُخ
حسب معمول بیت المقدس کی طرف تھا۔ اسی دوران میں کسی نے آکر خبر دی کہ قبلہ
کا حکم تو بدل چکا ہے۔ تم ابھی تک بیت المقدس کی طرف رُخ کیے ہوئے ہو۔ یہ
سننے ہی لوگوں نے نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت اللہ شریف کی طرف پھیر
لیا۔ کسی شخص نے حیل و حجت نہ کیا۔ یہ صرف اہل کتاب تھے۔ جو تحویل قبلہ پر اعتراض

کر رہے تھے۔ اُن کے یہ اعتراضات آگے در تک چلے گئے ہیں اَلَمْ تَرَ
اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ تَحْمِلُ يَوْمَئِذٍ وِجْرَتَهُمْ بِمَوْقِعٍ مَّلَآئِكَةٌ سِدْرٌ
نَّصَارَىٰ كَايَ شَكْوٰهٍ بَارِبَارٍ مِنْظَرٍ عَامٍ پَر آتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی
ملتِ ابراہیمی پر قائم ہوتے تو اس قسم کے اعتراضات پیش کرنے کی بجائے
اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے تسلیم خم کر لیتے۔

فرمایا مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل ہونی چاہیے
مگر بات یہ ہے کہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلَى صَوَابٍ مُّسْتَقِيْمٍ وہ جسے
چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اہل کتاب اپنی صند کی
وجہ سے اس ہدایت سے محروم رہے حالانکہ اُن کی اپنی کتابوں میں بیت اللہ شریف
کے افضل اور بین الاقوامی قبلہ ہونے کے احکام موجود تھے اور یہ پیش گوئی بھی پائی
جاتی تھی کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ بیت اللہ شریف یعنی خانہ کعبہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ افضل بنایا ہے۔ اسی طرح
ہم نے تمہیں (اے اہل اسلام) امت بھی افضل بنایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ
جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَسَطًا وَّسَطُ کے لفظی معنی درمیان کے ہیں۔ یعنی تمہیں
درمیانی امت بنایا۔ اور ظاہر ہے کہ درمیان والی چیز ہی عدل و انصاف پر
مبنی اور افراط و تفریط سے پاک ہوتی ہے۔ لہذا یہی چیز افضل ہوتی ہے۔ گویا اللہ
تعالیٰ نے امت محمدیہ کو وَسَطًا کا لقب دیکر اسے افضلیت کے مقام پر فائز فرمایا
ہے اور اس امت کے افضل ہونے کی غرض و غایت یہ ہے لَتَكُوْنُوْا شٰهَدًا
عَلَى النَّاسِ تاکہ تم دو سکر لوگوں پر گواہ بن جاؤ وَیَكُوْنُ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ
شَہِیْدًا اور رسول اکرم علیہ التحیۃ والسلام تم پر گواہی دینے والے بن جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دوہری گواہی کا مظاہرہ قیامت والے
دن میدانِ محشر میں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؓ اپنی کتاب الزہد
میں حدیث لائے ہیں جس سے مذکورہ گواہی کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

افضل امت
اسکی گواہی

بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز جب سب لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں
 پیش ہوں گے۔ اور مقدمہ چلے گا۔ تو سب سے پہلے اللہ رب العزت اسرافیل
 سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے میری امانت ادا کر دی۔ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں
 گے کہ ہاں باری تعالیٰ میں نے وہ امانت جبرائیل علیہ السلام کو پہنچا دی۔ پھر جبرائیل کو
 کو طلب کر کے پوچھا جائے گا۔ کہ کیا اسرافیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔
 وہ اقرار کریں گے کہ ہاں اسرافیل علیہ السلام نے وہ امانت مجھ تک پہنچا دی۔ چنانچہ
 اسرافیل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جبرائیل سے مزید سوال ہو گا۔ کہ تم نے میری امانت
 کے ساتھ کیا کیا، وہ عرض کریں گے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تیری امانت تیرے
 رسولوں تک پہنچا دی۔ اب رسولوں کو طلب کر کے پوچھا جائے گا کیا جبرائیل نے
 میری امانت تم تک پہنچا دی۔ تو رسول بھی عرض کریں گے، ہاں مولا کریم! جبرائیل علیہ
 السلام نے تیری امانت ہم تک پہنچا دی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے اس
 امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ رسول عرض کریں گے کہ ہم نے تیرا پیغام اپنی اپنی
 امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر امتوں کو طلب کیا جائے گا۔ اور پوچھا جائے گا۔ کیا میرے
 نبیوں نے میری امانت تم تک پہنچائی۔ **فَسِنْهُمْ الْمُصَدِّقُ وَمِنْهُمْ لَمُكَذِبٌ**
 پھر ان میں سے بعض امتیں تصدیق کریں گی۔ کہ اے اللہ! تیرے نبیوں نے تیری
 امانت ہم تک پہنچائی۔ اور بعض امتیں انکار کریں گی۔ کہ ہم تک وہ امانت نہیں پہنچی۔
 انکار کرنے والی امتوں کے نبیوں سے کہا جائے گا کہ وہ اس بات پر
 گواہ پیش کریں کہ واقعی انہوں نے امانت اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ تو انبیاء
 کریم اپنی گواہی کے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا نام پیش
 کریں۔ امت محمدیہ کو طلب کر کے پوچھا جائے گا تو وہ لوگ اس بات کی گواہی دیں
 گے کہ انبیائے کریم نے اپنی امانت اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ وہ امتیں
 اس گواہی کا انکار کریں گی کہ مولا کریم۔ یہ لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں تھے، ہم ان کو
 بالکل نہیں پہچانتے لہذا یہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

پھر دریافت فرمائے گا کہ اے امت محمدیہ کے لوگو! تم ان کی گواہی کیسے دیتے ہو جبکہ تم تو ان کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوتے تھے۔ تو لوگ عرض کریں گے۔ یا اللہ! تو نے ہماری طرف آخری رسول بھیجا۔ اور کتاب نازل فرمائی۔ تیرے خاتم النبیین علیہ السلام اور تیری کتاب نے بتایا اَنْ قَدْ اَبْلَغُوا رِسَالَتِ رَبِّهِمْ کہ تمام انبیاء نے اللہ کا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ لہذا ہم اس یقین کے ساتھ گواہی دیتے ہیں۔ کہ واقعی تیرے انبیاء نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔

اس کے بعد اپنی امت کے تزکیہ کے لیے اللہ تعالیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کرے گا۔ آپ اپنی امت کا تزکیہ کریں گے کہ یہ لوگ صحیح گواہی دے رہے ہیں۔ اسی کے متعلق فرمایا جَنَّتْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ اِشْهَادًا وَجَنَّبَكِ عَلٰی هَؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ یعنی ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔ اور پھر ان سب پر آپ کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔

تقریر قبلہ کی
غایت

فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر پہلے آپ تھے یعنی بیت المقدس کو اِلَّا لِنَعْلَمَ مَكَرًا کہ ہم جان لیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز کا جاننا لازمی ہے یہاں نَعْلَمَ سے مراد ہے ظاہر کر دیں مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبْ عَلٰی عَقْبَيْهِ کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون اپنی ایڑیوں پر پھرتا ہے یعنی انکار کرتا ہے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلٰی الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ اور بیشک یہ چیز بھاری ہے یعنی یہود و نصاریٰ پر اپنے قبلہ اول کو چھوڑنا بڑا دشوار ہے، سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے۔ ایسے لوگ ہی ملت ابراہیمی کے پابند ہیں اور یہی لوگ اللہ رب العلمین کی فرمانبرداری کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نئے حکم کی تعمیل بالکل دشوار نہیں۔ وہ ہمیشہ تعمیل حکم میں پیش پیش رہتے ہیں پہلے گزر چکا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کہا کہ

فرمانبردار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العالمین کا فرمانبردار ہو گیا۔ جو ارشاد ہو اس کی تعمیل کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔ اس قسم کے اصول پر چلنے والے لوگوں کے لیے تحویل قبلہ جیسی چیز کیسے بھاری ہو سکتی ہے۔ نماز کے متعلق بھی پہلے پارہ میں گزر چکا ہے وَلَا تَهَاجِلُوا فِيهِ إِلَّا عَلَى الْخُشْعَيْنِ۔ یہ نماز منافقتین پر بڑی بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں، جن میں عاجزی اور خشیت الہی جیسی صفات موجود ہو ان کے لیے تو نماز راحت کا ذریعہ ہے کیونکہ اس سے تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے۔ تو یہاں پر بھی فرمایا کہ تحویل قبلہ کا حکم اہل کتاب کے لیے سخت گراں ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں ہے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔

تحویل قبلہ پر
دوسرا اعتراض

تحویل قبلہ سے متعلق اہل کتاب کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جو لوگ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ انہیں تو اس طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تو بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرتے رہے۔ لہذا اس نئے حکم کی روشنی میں ایسے لوگوں کی نمازوں کی کیا حیثیت ہوگی۔ وہ مقبول ہوں گی یا نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ نے فرمایا وَكَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ ط اللَّهُ ایسے لوگوں کے ایمان ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان سے مراد نماز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نمازیں ضائع نہیں کرے گا۔ جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ وَرَحِيمُ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ سابقہ لوگوں نے جو نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ اپنے اپنے انبیاء کے حکم کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کی ہیں۔ لہذا ان کی نمازیں مقبول ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس قسم کا معاملہ شرابیوں کے متعلق سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ جن لوگوں نے حرمت شراب سے پہلے شراب نوشی کی تھی اور وہ فوت ہو گئے، ان کا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ جس

وقت ایک چیز حرام نہیں تھی، اُس وقت اس کے استعمال سے گناہ لازم نہیں آتا۔ ہاں جو شخص حرمتِ شراب کے حکم آجانے کے بعد اُسے پئے گا، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔ اس مقام پر بھی اعتراض کا جواب یہی دیا کہ جن لوگوں نے تبدیلی قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ اُن کی نمازیں بالکل درست اور اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے وہ بڑے شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
 قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
 وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
 رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٢﴾ وَلَئِنْ
 أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا
 قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ
 بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنْ أَتَيْتَ أَهْوَاءَ هُمٍ مِّنْ
 بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٣﴾
 الَّذِينَ اتَّيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ
 وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٤﴾
 الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١٤٥﴾

وقف لا ازم

وقف منزل

ج

ترجمہ: تحقیق ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف (بار بار) پلٹنا دیکھتے ہیں۔ پس ہم آپ
 کو الی بنا دیں گے اُس قبلے کا جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ پس اب پھیر دیں آپ
 اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔ پھر جہاں بھی آپ ہوں، پس پھیر دیں اپنے چہروں کو اُسکی
 طرف۔ اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ البتہ جانتے ہیں۔ کہ یہ حق ہے، اُن کے
 رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے، جن کو یہ کہتے
 ہیں ﴿۱۴۲﴾ اور اگر آپ اُن لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی ہے، ہر قسم کی نشانی

بھی لائیں۔ تو وہ پھر بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ بھی

ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں سے بعض، بعض کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کا اتباع کیا اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو بے شک آپ اس وقت نا انصافوں میں سے ہوں گے (۱۳۵) وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، وہ اس کو اس طرح جانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ اور بیشک ایک گروہ ان میں سے البتہ حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں (۱۳۶) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک نہ خیالوں میں سے نہ ہوں (۱۳۷)

رہنمائی

بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جا چکی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ امتحان لے کر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ کون اللہ کے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون ہے جو تعصب اور عناد پر مٹھرا رہتا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ کیونکہ وہ لوگ قتل انبیاء، ضد اور عناد میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کو تبدیل کر دیا تھا اور برائیوں میں منہمک ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔ مگر عملی طور پر ان میں نسبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

تخیل قبلہ کی
دوسری وجہ

بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ تحقیق ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھتے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔ مگر آپ کی ولی خواہش یہ تھی۔ کہ بیت اللہ شریف قبلہ مقرر ہو جائے۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کے لیے وحی کا انتظار کرتے تھے۔ اور اپنا چہرہ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی عام عادت مبارکہ یہ تھی۔

نَظَرُهُ إِلَى الْأَرْضِ أَكْثَرُ مِنْ نَظَرِهِ إِلَى السَّمَاءِ یعنی آپ کی نگاہ مبارک اکثر زمین کی طرف رہتی ہے

مگر انتظارِ وحی میں آپ اپنی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔
 سابقہ کُتب میں اس بات کی پیشین گوئی موجود تھی۔ کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ وہی
 ہوگا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا یعنی خانہ کعبہ۔ نیز یہی جذبہ آپ کے قلب
 مبارک میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔ لہذا آپ کی خواہش تھی۔ کہ بیت اللہ شریف کی طرف
 منہ کرنے کا حکم نازل ہو جائے۔ اور آخری نبی کی آخری امت کا قبلہ قومی کی بجائے
 بین الاقوامی مقرر ہو جائے۔ مسلمانوں کو اُسی قبلہ (بیت اللہ شریف) کی طرف منہ
 کرنے کا حکم ہو۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ لہذا آپ اسی شوق
 میں نگاہ مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا اور تحویل قبلہ کا حکم
 نازل فرمادیا۔ فَلَنُؤَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا اب ہم آپ کو اس قبلے کا
 والی بنا دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ لہذا حکم ہوا۔ قُولِ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ آپ اپنا چہرہ اور مسجدِ حرام کی طرف پھیر دیں۔ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ اور آپ لوگ جہاں بھی ہوں۔
 اپنے چہروں کو اُسی کی طرف پھیریں۔

تحویل قبلہ
کا حکم

تاریخی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی سلمہ کے محلہ میں
 بشر ابن براہ بن معرورؓ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ سے چار میل
 کے فاصلہ پر ہے۔ نمازِ ظہر کا وقت ہوا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع دیگر صحابہ محلہ
 کی مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے گئے آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ کہ اسی
 دوران میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی قُولِ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ آپ دو رکعت ادا فرما چکے تھے۔ نزول وحی پر فوراً آپ نے اپنا رخ مبارک
 بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف پھیر لیا۔ آپ کی اقتداء میں
 مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے رخ تبدیل کیا۔ تو امت
 صحابہؓ نے بھی اپنی صفوں کو پلٹ دیا۔ اسی لیے بنی سلمہ کی اس مسجد کو مسجدِ قبلتین

یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ شطر تفصیل طلب ہے۔ اس میں ایک حکم تو یہ ہے کہ **قَوْلٌ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** یعنی آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔ دوسری بات یہ فرمائی وَخَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ط تم جہاں کہیں بھی ہو، اس کی طرف منہ کرو۔ لفظ شطر مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی

”نصف“ آتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے۔ اِنَّحِیْ اَرْجُو اَنْ تَكُوْنُوْا شَطْرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ یعنی مجھے امید ہے کہ جنت میں جانے والے کل لوگوں میں نصف تعداد تمھاری ہوگی۔

شطر کا دوسرا معنی اجز و بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اِنْ الْفَرَائِضَ شَطْرَ الْعِلْمِ یعنی فرائض اور وراثت علم کا جزو ہے۔ مگر اس آیت کریمہ میں شطر جہت کے معنی میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز شروع کرتے وقت جس شخص کو کعبہ شریف نظر آ رہا ہو۔ اُسے عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہے۔ اور جس کو کعبہ نظر نہ آتا ہو، اُسے عین کعبہ کی بجائے اُس کی طرف یا اُس کی جہت میں رُخ کرنے کا حکم ہے۔

اس آیت میں عین کعبہ کی بجائے مسجد الحرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا قدرے مشکل ہے۔ لہذا پوری مسجد حرام کو کہ جہت کو وسعت دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے عین کعبہ جہت ہوگی۔ جو لوگ حدود حرم کے اندر رہنے والے ہیں۔ ان کے لیے مسجد الحرام جہت ہے۔ اور جو لوگ حدود حرم سے باہر دروازے کے پہننے والے ہیں۔ ان کے لیے پورا حرم جہت ہے۔ مقصد یہ کہ جوں جوں لوگ خانہ کعبہ سے دور ہوتے جائیں گے ان کے لیے جہت میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک دوسری حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ اور یہاں اس کو ہم یوں کہیں گے کہ شمال اور جنوب کے درمیان قبلہ ہے بمقصد یہ کہ اگر عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوتا تو یہ دشوار تھا۔ اور جہت عام ہے۔ حتیٰ کہ جب تک کعبہ کی طرف بالکل پشت نہ ہو جائے۔ نماز درست ہے۔ اس کے لیے زاویہ قائمہ ضروری نہیں ہے اگر زاویہ حادہ کے ساتھ رُخ کر کے بھی نماز پڑھی جائے گی، تو وہ درست ہوگی۔ البتہ اگر آسانی کے ساتھ جہت کا تعین ہو سکے، تو ضرور کرنا چاہیے۔

ایک زمانہ میں عنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنی تحقیق کے مطابق عام مسجدوں کے رُخ غلط بتائے تھے۔ وہ ایک ریاضی دان تھے۔ ان کے نزدیک صرف بادشاہی مسجد کا رُخ درست تھا، باقی سب غلط تھے ان کے بقول نمازیوں کا رُخ عین قبلہ کی طرف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نمازیں باطل تھیں۔ ان کا یہ نظریہ غلط تھا کیونکہ قبلہ کا تعین اللہ تعالیٰ نے ریاضی کے اصولوں پر کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ فطری اصول پر جہت کعبہ یا جہت مسجد حرام کا حکم ہے۔

اگر عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی پابندی لازمی ہوتی تو واقعی یہ بڑا مشکل کام تھا بعض مقامات پر جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بڑی بڑی لمبی قطاریں بن جاتی ہیں ایسی صورت میں ہر نمازی کا رُخ عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی طرف ہونا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صرف جہت کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بدن، کپڑا اور مکان کی طہارت نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی طرح استقبال قبلہ بھی نماز کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ نماز شروع کرتے وقت جہت قبلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ریل گاڑی یا جہاز پر بھی سفر کر رہا ہے۔ تو قبلہ کا تعین کر سکتا ہے۔ تاہم اگر دوران نماز سواری پر پہنچی وجہ سے رُخ تبدیل بھی ہو جائے، تو کوئی عرج نہیں، نماز درست ہوگی۔ البتہ جہاں تعین قبلہ ممکن نہ ہو، وہاں تحرسی کا حکم ہے۔ یعنی اپنی طرف سے استقبال قبلہ کی

پوری کوشش کرے۔ اور نماز شروع کر لے۔ اور پھر اس طرح سے متعین کیا ہو
 رُخ غلط بھی ہوگا، تو نماز درست ہوگی۔ کیونکہ یہ نمازی کے اختیار سے باہر تھا
 اس کے متعلق آیت گزر چکی ہے۔ **فَاَيْنَا تَوَلَّوْا فَشَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ** ایک
 موقع پر رات کے وقت صحابہ کرامؓ سے یقین کے ساتھ تعین قبلہ نہ ہو سکا۔ ہر ایک
 نے اپنی اپنی کوشش اور سمجھ کے مطابق قبلہ کا تعین کیا۔ اگرچہ ان کے استقبال
 قبلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن سب کی
 نمازوں کو شرف قبولیت بخشا۔ اور اس آیت کے ذریعے نماز کی درستگی کی تصدیق فرمائی
 استقبال قبلہ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ہٹ دھرمی کا ذکر
 کیا ہے۔ کہ یہ لوگ اہل ایمان کی مخالفت محض مخالفت کی بنا پر کرتے ہیں۔ ورنہ
 ان پر حق تو واضح ہو چکا ہے۔ فرمایا، **وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ** اور وہ لوگ جن
 کو کتاب دی گئی ہے۔ **لَيَعْلَمُونَ أَنَّ الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ** وہ جانتے ہیں
 کہ یہ حق ہے اُن کے رب کی طرف سے، مگر دیدہ دانستہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔
 انہیں علم ہے کہ اُن کی اپنی کتابوں کے مطابق بیت اللہ شریف کی حبت بالکل
 درست ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ یہی ہے۔ اس کے باوجود
 مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہؓ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کا باپ
 اور چچا یہودی عالم تھے اور خیبر میں رہتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام مکہ مکرمہ سے
 ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ تو یہ دونوں بھائی آپ کو ملنے کے لیے
 آئے۔ آپ سے بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے بعد جب واپس خیبر پہنچے تو
 دونوں بھائیوں نے حضور علیہ السلام کے متعلق آپس میں کچھ بات چیت کی
 جسے ام المؤمنینؓ نے بھی سن لیا۔ آپ کے چچا نے آپ کے باپ سے پوچھا،
 کہ سچ سچ بتاؤ کہ کیا یہ وہی نبی ہیں۔ جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔
 صفیہؓ کے باپ نے تصدیق کی کہ ہاں یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں۔ جن کی نشانیاں ہمارے

مخالفت
 بمقابلہ مخالفت

پاس موجود ہیں۔ اس پر چپانے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر ہمیں اُن پر ایمان لے
 آنا چاہیے۔ مگر باپ کہنے لگا کہ جب تک میری جان میں جان ہے۔ میں اسکی
 مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور آپ کے پروگرام میں رکاوٹ بنا رہوں گا۔ مقصد
 یہ ہے کہ محض عناد کی وجہ سے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے ساتھ مخالفت
 ان کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ حضرت صفیہؓ کا باپ جنگ خیبر میں قتل ہوا۔ آپ
 لونڈی کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ حضور علیہ
 السلام نے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ خود حضرت صفیہؓ
 نے سنایا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُن کی ضد اور عناد کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد
 فرمایا کہ یہ لوگ حق کو چھپانے کی جتنی بھی کوشش کریں مگر وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
 عَمَّا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں بلکہ ان کی ایک ایک
 حرکت کو خوب جانتا ہے۔

فرمایا، اے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَلَکِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
 بِکُلِّ اٰیَةٍ اَکْثَرُ اَہْلِ کِتَابٍ کے پاس ہر قسم کی نشانی بھی لے آئیں۔ اور دلائل کے
 ساتھ ثابت کر دیں۔ کہ بیت اللہ شریف ہی صحیح قبلہ ہے۔ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ
 پھر بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ چیز انجیل میں بھی موجود ہے
 کہ جب مسیح علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے جائے تھے۔ تو اس سے
 کچھ عرصہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ بھائی! میں تمہاری طرف اپنے خداوند
 کی جانب سے اُس موجود کو بھیجتا ہوں جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر اے لوگو!
 جب تک تمہیں عالم بالا سے قوت حاصل نہ ہو جائے تم پر وِشْلَم میں ہی ٹھہرنا
 یعنی تمہارا قبلہ یہی ہو گا، اور پھر جب تمہیں قوت حاصل ہو جائے گی، تو تمہارا قبلہ
 بھی تبدیل ہو جائیگا۔ اس کے باوجود یہودیوں نے بیت اللہ شریف کو قبلہ
 تسلیم نہ کیا۔

اشاہجہان کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ بہت بڑے عالم ہوئے

ہیں۔ انہوں نے بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب کی پیش گوئیاں بعض صریح الفاظ میں ہیں۔ اور بعض کنایہ کی زبان میں ہیں۔ اس آیت میں کنایہ بتایا گیا ہے۔ کہ موعود سے مراد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور انجیل کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو جائے۔ اور انہیں قوت یعنی تسبیح اور غلبہ حاصل ہو جائے گا تو قبلہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ وشم قبلہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ قبلہ ہونے کی وجہ سے یہ وشم یعنی بیت المقدس اب بھی محترم اور معزز ہے۔ مگر وہ قبلہ نہیں رہا۔ اس طرف رخ کر کے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

استقبال قبلہ اور
شعار اسلامی

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز کی حالت میں نمازی کے سینے کا جہت قبلہ ہونا فرض ہے۔ اور چہرے کا اُس رخ پر ہونا سنت ہے۔ چنانچہ اگر نماز کے دوران سینہ جہت قبلہ سے منحرف ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ چہرے کے منحرف ہونے سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ محض مکروہ ہوگا۔ استقبال قبلہ سے متعلق ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ ملت ابراہیمی کو ماننے والوں میں سے مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَكَلَّ ذَبِیْ حَتَّىٰ فَذَلِكَ الْمُؤْمِنُ یعنی جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ اور ہمارا ذبیح کھایا، تو وہ مؤمن ہے۔ اگرچہ یہودی بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارا قبلہ کہہ کر ان کے قبلہ کی نفی کر دی۔ اسی طرح وہ ہمارے طریق نماز نہیں پڑھتے اور مسلمانوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے لہذا وہ ملت اسلامیہ میں شامل نہیں گویا حضور علیہ السلام نے استقبال قبلہ کو شعار اسلامی میں شامل کیا۔

مروجی کا
اعتراض

دیانند سرسوتی آریہ سماجی ہندوؤں کا مشہور لیڈر گزرا ہے۔ اس نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ یہ لوگ ہندوؤں کو توبت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مگر خود ایک مکان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جو پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ہے۔ کیا یہ بت پرستی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دو حصوں پر مشتمل کتاب لکھی اس کے ایک حصہ میں سرسوتی کے اہل اسلام پر دس عام اعتراضات کے جوابات لکھے، اور دوسرے حصہ میں صرف قبلہ پر اعتراضات کا جواب دیا۔ قبلہ نما نامی یہ کتاب

بڑی دستیق اور نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عجیب اعتراض ہے۔ کجا ہمارا استقبال قبلہ اور کجا تمہاری بہت پرستی۔ تم تو بتوں کو نافع اور ضار سمجھ کر انکے سامنے سجدہ کرتے ہو، اُن کی پوجا کرتے ہو۔ مگر ہم تو خانہ کعبہ کا صرف استقبال کرتے ہیں۔ لفظ استقبال خود بتلارہا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف صرف توجہ کرتے ہیں۔ اسکی پوجا ہرگز نہیں کرتے۔ لہذا تمہاری بہت پرستی اور ہمارے استقبال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہت تمہارے مقصود ہیں۔ مگر ہمارا صرف رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے مقصود تو ذاتِ خداوندی ہوتی ہے۔

پھر دیکھئے عبادت کے لیے نیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت قبول نہیں۔ مگر استقبال قبلہ کے لیے نیت ضروری نہیں ہے۔ محض اس طرف رُخ کر لینا ہی کافی ہے۔ مشرکین بتوں کی پوجا نہایت اور ارادے سے کرتے ہیں لہذا محض استقبال قبلہ عبادت کے زمرے میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اول سے آخر تک نماز کے کسی لفظ سے بھی تعظیم کعبہ کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہاں تو ایک ایک لفظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا اور تعظیم بیان ہوتی ہے۔ لہذا کعبہ شریف کی عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذرا اور آگے چلیے خانہ کعبہ کی دیواریں یا اس کے پتھر مسلمان کا مقصود و منشاء نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کسی وقت کعبہ کی دیواریں مہندم بھی ہو جائیں۔ العیاذ باللہ، تو پھر بھی مسلمان نماز پڑھتے وقت اسی طرف رُخ کریں گے۔ گویا اُن کے نزدیک اینٹوں اور پتھروں کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اس جگہ کو مرکز تجلیاتِ الہی سمجھ کر اس طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر نو کے سلسلے میں جب ساری دیواریں گرا کر اس جگہ پر قناتیں کھڑی کر دی گئیں تو نماز کے وقت رُخ اُسی طرف ہی کیا جاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف صرف جہت ہے، وہ معبود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے بہت پرستی ہر اس طرف کو رُخ کر کے عبادت کریں گے۔ جس طرف بت رکھے ہوں گے کیونکہ

بت اُن کے معبود ہیں۔ اور بتوں کی منتقلی پر اُن کا رخ بھی اُسی طرف منتقل ہو جائیگا۔
لفظ بیت اللہ سے خود بخود واضح ہے کہ اس سے مراد اللہ کا گھر ہے، نہ کہ
خود اللہ رب العزت۔ اور یہ مکان یا جگہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کا مرکز ہے،
یہ بذاتِ خود معبود نہیں ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ کہ جب کوئی کسی مکان کی طرف
جاتا ہے۔ تو اس کا مقصود مٹی اور پتھر کا بنا ہوا مکان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود وہ
مطلوب اُس مکان کا سکین ہوتا ہے۔ لہذا استقبال قبلہ سے ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ
ہوتا ہے نہ کہ خانہ کعبہ۔ اور یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ کہ مستحق عبادت وہ ذات
ہو سکتی ہے۔ جو خود بخود ہو۔ اور جس چیز کا قیام و بقا دوسروں کا مرہونِ منت ہو، وہ
عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس خانہ کعبہ کو تو فرشتوں نے بنایا۔ آدم علیہ
السلام نے تعمیر کیا، پھر ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچا، یہ کیونکر معبود ہو سکتا۔
مولانا نانوتویؒ نے آخری بات یہ فرمائی۔ کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا عکس
یا تجلی اُس چیز کا عین ہوتا ہے۔ اور یہ تصویر یا تجلی اُسی چیز کی سمجھی جائیگی جس کی وہ فی الواقع
ہے۔ تو بھائی ہم کعبہ کو معبود نہیں مانتے بلکہ تجلی گاہِ معبود مانتے ہیں۔ اور اس طرف
رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ تو گویا عین معبود حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔
خانہ کعبہ کے مرکز تجلیات ہونے کو ایک دوسرے طریقے سے سمجھیے۔ اور وہ
یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی مثال ایسی ہے، جیسے سورج کی تجلی جو پوری کائنات
پر پڑی ہوئی ہے۔ اور کائنات کیسے۔ یہ زمین ہے۔ اس کے اُپر کچھ فضا ہے
اور پھر عدم ہے۔ یعنی آگے کچھ بھی نہیں۔ جب سورج کی تجلی عدم پر پڑتی ہے۔
تو زمین کی طرف واپس پلٹتی ہے۔ اور زمین پر بیت اللہ شریف مثل آئینہ کے
ہے آپ دیکھتے ہیں۔ کہ جب سورج کی شعاعیں آئینہ پر پڑتی ہیں۔ اور اس میں سورج
کی چمک نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی تجلیات خانہ کعبہ پر پڑتی ہیں۔ تو
اس میں آکر ٹپک جاتی ہیں۔ اور اسے مرکز تجلیات بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے اس مرکز خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ

کی طرف رخ کرنے سے خشوع اور اخبات پیدا ہوتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے، جس طرح خداوند تعالیٰ جہت سے پاک ہے۔ اسی طرح روح جیسی لطیف چیز کو بھی جہت کی ضرورت نہیں۔ بہ خلاف اس کے جسم انسانی مادی چیز ہے۔ اور مادی چیز کا رخ جس چیز کی طرف متعین کیا جائے گا وہ مادی ہوگی۔ لہذا مادی چیز ہونے کی بنا پر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اس کے اندر ایک قسم کا جماؤ اور استقرار ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہم اُس تجلی الہی کی طرف رخ کھتے ہیں۔ اور اُس مالک الملک کی عبادت کرتے ہیں، جس ذات کی تجلی خانہ کعبہ پر پڑ کر اُس کی صفت بنتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلی اسی مقام پر پڑ رہی ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پوری زمین کی ابتداء اسی مکہ مکرمہ کے مقام سے ہوئی تھی۔ یہ جگہ ساری زمین کی ناف ہے۔ سب سے پہلے اسی مقام سے پانی کا ایک ببلہ اٹھا تھا جو پھیل کر زمین جیسی بڑی چیز میں تبدیل ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو مقسم بلاد بھی کہا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلیات اسی مقام پر پڑتی ہیں۔ لہذا یہ ہمارا قبلہ ٹھہرایا گیا۔

مسلمانوں کے قبلہ سے متعلق اعتراضات کے جواب حضرت مولانا نانوتویؒ کے علاوہ بعض دیگر علمائے کرام نے بھی دیے ہیں۔ ان میں دہلی کے مولانا ابوالمنصورؒ ہیں۔ اور پھر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہیں۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مدرسہ صولتہ کی بنیاد رکھی۔ جو گذشتہ ایک صدی سے دینی طلبہ کی آبیاری کے علاوہ حجاج کرام کی خدمات بھی سرانجام دے رہا ہے۔ آپ نے عیسائیت کے رد میں ایک مدلل کتاب لکھی۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے سنڈے ٹائمز اخبار نے لکھا تھا۔ کہ اگر دنیا میں اس کتاب کو پڑھا گیا۔ تو عرصہ تک عیسائیت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

آریہ سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے۔ ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بت پرستی کے خلاف اعتراضات کا جواب نہ دے سکے اور گھبرا گئے طاب

آریہ سماج اور
تشریفات

ہے۔ کہ بت پرستی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ لوگ بحث مباحثے میں مار کھا جاتے چنانچہ انہوں نے تمام بتوں کا انکار کر کے تثلیث کا ایک نیا عقیدہ وضع کیا۔ اور کہا کہ بت وغیرہ کچھ نہیں، صرف تین چیزیں قدیم ہیں یعنی خدا، مادہ اور روح، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ مادہ اور روح حادث ہیں یہ بد بخت بت پرستی کو ترک کرنے کے باوجود بھی مشرک ہی ہے، جس طرح نصاریٰ باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث میں مبتلا ہوئے، اسی طرح آریہ سماج بھی خدا، مادہ اور روح کی تثلیث کے قائل ہوئے۔

استقبال قبلہ
میں اختلاف

الغرض! فرمایا اے نبی علیہ السلام، اگر آپ ان کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے آئیں، تو اہل کتاب آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ قبلہ ہے۔ اور یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ صخرۃ پتھر کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے قبلہ پہ مہمکن ہے۔ یہ لوگ اس قدر تعصب میں مبتلا ہیں۔ فرمایا جس طرح یہ لوگ آپ کے قبلہ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قَبْلَتِهِمْ آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک اللہ کا حکم تھا۔ آپ اُس طرف رخ کرتے تھے جب خداوند تعالیٰ کا دوسرا حکم آگیا۔ تو آپ نے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ اور بیت اللہ شریف کی طرف رخ کر لیا۔ اور اُن کا اپنا حال بھی یہی ہے۔ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قَبْلَتِهِ بَعْضٌ طوہ بھی بعض بعض کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے وَلَٰكِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ اور اگر آپ نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی علم آچکا ہے۔ اِنَّكَ اِذَا لَمِيسَ الظَّالِمِينَ تو پھر آپ نا انصافیوں میں سے ہوں گے دوسرے مقام پر شرک کے متعلق فرمایا لَیْسَ اَشْرَکَ لِعِبَادَتِیْ عَمَلٌ وَلَٰکُمْ مِّنَ الْحَسَنِیْنَ یعنی فرض کرو اگر آپ شرک سرزد ہو گیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے آپ نقصان اٹھائیوں میں ہو جائیں گے

اس مقام پر فرمایا کہ اگر آپ نے لوگوں کو راضی کرنے کے لیے انکی بات مان لی بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی حکم آچکا ہے۔ تو پھر آپ کے لیے یہ بڑی نا انصافی کی بات ہوگی۔

اس آیت کی روشنی میں کہ بعض لوگ بعض لوگوں کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتے مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں قبلہ سے متعلق بڑے نکات پیدا کیے ہیں۔

اہم رومیؒ
اور قبلہ

فرماتے ہیں :-

بادشاہوں کا قبلہ تاج و تخت ہوتا ہے
وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ
سنہری ٹیکا انہیں کے پاس ہے اور
دنیا دار لوگوں کا قبلہ سونا چاندی یعنی
مال و دولت ہوتا ہے۔

قبلہ شاہاں بود تاج و کمر
قبلہ ارباب دنیا سیم و زر

سورج پرستوں کا قبلہ پانی اور مٹی کا
بنا ہوا پتلا ہوتا ہے اور وہ اُسی بت
پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر معافی سے
واقف حال لوگوں کا قبلہ جان اور
دل ہے۔ وہ ہمیشہ جان، دل،
روح اور قبر کی صفائی کے لیے کوشاں
ہوتے ہیں

قبلہ صوت پرستاں آب و گل
قبلہ معنی شناساں جان و دل

عابد و زاہد لوگوں کا قبلہ قبولیت کا
محراب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس فکر
میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی نیکیاں
قبول ہو جائیں اور بدکردار لوگ فضول کاہلوں
میں منہمک ہیں۔ ان کا قبلہ وہی ہے

قبلہ زہاد محراب قبول
قبلہ بدسیرتاں کار فضول

قبلہ تن پر وراں خواب و خورش
قبلہ انساں بدانش پر وورش

پیٹ کے پجار یوں کا قبلہ کھانے پینے
اور سونے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اسی فکر
میں بہتے ہیں۔ مگر انسان بحیثیت انسان
عقل و دانش کی پورکوش کرتے ہیں۔ وہ
اسی تک دو میں بہتے ہیں۔

قبلہ عاشق وصال بے زوال
قبلہ عارف جمال ذوالجلال

عاشق کا قبلہ وصل لازوال ہوتا ہے۔ یعنی وہ
ایسی ملاقات کا خواہشمند ہوتا ہے
جس کو کبھی زوال نہ آئے۔ اور عارف
لوگوں کا منتمائے مقصود حق تعالیٰ
کا دیدار ہے وہ ہمیشہ وہاں تک کی
رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔
منصب پر فائز لوگوں کا قبلہ مال و
دولت اور عزت و عظمت ہوتا ہے
جب کہ خدا تعالیٰ کے راستے پر چلنے
والے لوگوں کا قبلہ اُس راستے کے
اسباب ہوتے ہیں جن کے ذریعے
وہ مطلوب منزل حاصل کرتے ہیں۔

قبلہ اصحاب منصب مال و جاہ
قبلہ اہل سلوک اسباب راہ

حرص اور آرزو والے لوگوں کا قبلہ ان
کی خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اور غنا
کرنے والوں کا قبلہ اللہ تعالیٰ پر
اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔

قبلہ حرص و امل باشد ہوا
قبلہ قانع توکل بہ خدا

فرمایا الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے
یعنی یہود و نصاریٰ۔ لَعَلَّكُمْ تَعْرِفُونَ اَبَتُوهُمْ طوہ اس

کتاب حق

کو یعنی پیغمبر اسلام علیہ السلام یا قرآن پاک کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو
 جانتے ہیں۔ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ اور بے شک ان میں ایک
 گروہ حق کو چھپاتا ہے۔ وَهُمْ يَعْلَمُونَ حالانکہ وہ سب کچھ جانتے ہو جتھے ہیں
 شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ پیغمبر اور کلام پاک کو بیٹوں کی طرح
 جاننے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح بیٹا گود میں ہونے کی وجہ سے اس پر شک
 نہیں گزرتا، اسی طرح اہل کتاب حضور علیہ السلام کو اپنی ہی کتابوں میں موجود نشانیوں کے
 پہچانتے ہیں۔ کہ یہ آخری نبی ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ
 بن سلامؓ کا مقولہ ہے۔ کہ مجھے اپنے بیٹے کے متعلق شک ہو سکتا ہے۔ کہ شاید
 اس کی ماں نے خیانت کی ہو۔ مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے بارے میں تردد نہیں
 ہو سکتا۔ فَرَمَا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ یہ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ فَلَا
تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ۔ آپ شک اور تردد کرنے والوں میں نہ ہوں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۴۸ تا ۱۵۰

درس پنجاہ و ہفت (۵۷)

وَقَفَّيْنَا عَلَى الْبَيْتِ وَبَنَيْنَا الْكُوفَةَ عَلَيْهِ وَاللَّهُ وَسَّيْلُهُ

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَثَبُّوا الْخَيْرَ ط
 اِنَّ مَا تَكُونُوا يَاتِ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيعًا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
 شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۴۸ وَمَنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
 شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَاِنَّكَ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ط وَمَا
 اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۱۴۹ وَمَنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
 فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا
 كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَهُ ۝ اِلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
 حُجَّةٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۝ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ
 وَلَا تَمْنَعْنِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۰

ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے، وہ اس کی طرف اپنا رخ
 کرنے والا ہے۔ پس سبقت کر دیکھو کی طرف۔ تم جہاں بھی ہو گے، تم سب کو
 اللہ تعالیٰ اکٹھا کر کے لائے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۝۱۴۸
 اور جس جگہ بھی آپ کہیں نکلیں۔ پس اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بیشک
 یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے غافل نہیں
 ہے، جو تم کرتے ہو ۝۱۴۹ اور جہاں بھی آپ نکلیں پس اپنا رخ مسجد حرام کی
 طرف پھیر دیں۔ اور جس جگہ بھی تم ہو (اے اہل ایمان) پس پھیرو اپنے چہروں کو اس
 کی طرف، تاکہ نہ ہو لوگوں کو تمہارے اوپر الزام اور حجت، مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم
 کیا ان میں سے۔ پس ان سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور تاکہ میں تم پر اپنی
 نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ۝۱۵۰

تحويل قبلہ کا حکم نازل کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ یہ قوف
لوگ یعنی متعصب یہود و نصاریٰ یہ ضرور اعتراض کریں گے کہ تحويل قبلہ
کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مگر اے نبی کریم آپ ان کے اعتراضات کو خاطر
نہیں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ بیت المقدس کا استقبال عارضی
حکم تھا۔ اور کسی خاص مصلحت کے تحت دیا گیا تھا۔ مستقل قبلہ تو بیت اللہ شریف ہے
جس کا حکم حضور نبی کریم علیہ السلام کی دلی خواہش کے پیش نظر دیا گیا۔ یہ تقرر کوئی
نیا نہیں ہے، بلکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا۔ کہ آخری دور اور آخری نبی کا قبلہ
وہی خانہ کعبہ ہوگا، جو ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اور اس میں اہل کتاب کے
لیے آزمائش کا سامان بھی تھا۔ کہ ان میں سے کون ہے۔ جو اللہ کے نازل کردہ
احکام کی پیروی کر کے ابراہیمی قبلہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لہذا حضور علیہ السلام کو تسلی
بھی دی گئی کہ آپ ان کے یہودہ اعتراضات کی پروا نہ کریں۔ بلکہ آپ صراطِ مستقیم
پر گامزن رہیں۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیئے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔

ہر امت کیلئے

جہت مقرر ہے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جِهَةٌ ۚ هُوَ مَوْلَاهَا ۚ يَعْنِي ہر امت کیلئے ایک جہت ہوتی ہے جس
کی طرف وہ رخ کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں ہوگی جس کی جہت مقرر نہ
ہو۔ اب یہ جہت صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اور محرف بھی ہو سکتی
ہے۔ تاہم ہر امت کا قبلہ ضرور مقرر ہے۔ اور پھر آخری امت کے لیے اللہ تعالیٰ
نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر فرمایا۔ جب یہ ایک اصول موجود ہے تو پھر اہل کتاب
کو مسلمانوں کے قبلہ پر معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا کہ تاسخت نا انصافی کے
مترادف ہے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ استقبال قبلہ اللہ تعالیٰ کے
احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اور فرعی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی ایسا بنیادی
مسئلہ نہیں ہے۔ جس پر انسان بہت اصرار کرے لہذا اس قسم کی معمولی بات پر جھگڑنا

جہت فرعی
چیز ہے

انصاف پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ اصل مقصد تو عبادت الہی ہے۔ جہت کا تعین تو محض توجہ کے لیے ہوتا ہے وگرنہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جہت کی وجہ امت میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبادت کے لیے وسیلہ یا شرط ہے

بنیادی چیز
نیکی ہے

فرمایا اصل اور بنیادی چیز نیکی ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ لہذا نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اَيِّنَّمَا تَكُونُوا تَمَّ جہاں بھی ہو گے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا جَمِيعًا اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر آخرت میں بھی سب کو اکٹھا کر کے سب کا مہربان کرے گا۔ یہ توجہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے سب کا رخ ادھر مقرر کر دیا۔ اور سب کو اس پر جمع کر دیا۔ فرمایا آگے چل کر نیکی ہی تمہارے کام آئے گی۔ لہذا نیکی میں سبقت حاصل کرو۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو فرمایا، اے علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو۔ "الصَّلَاةُ إِذَا آتَتْ" یعنی نماز کا وقت ہو جائے تو تاخیر نہ کرو۔ "وَالْحَنَازَةُ إِذَا أَحْضَرَتْ" اور جب جنازہ تیار ہو جائے تو عجلہ نہ ہو، تاخیر نہ کرو۔ "وَالْأَيْمُنُ إِذَا وَجِدَتْ لَهَا كُفُوًا" اور جب بے نکاح (مرد یا عورت) کا ہمسر مل جائے تو نکاح میں تاخیر نہ کرو۔ یہ سب نیکی میں سبقت کرنے والی باتیں ہیں۔

فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب کو ایک قبلہ پر اکٹھا کر دیا، اسی طرح آخرت میں بھی سب کو جمع کر دے گا۔ اور یہ اُس کے لیے قطعاً محال نہیں کیونکہ اِنَّ اللہَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اُس کے احاطہ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔

استقبال قبلہ
کے نہ گونہ
احکام

اگلی دو آیات میں استقبال قبلہ کا تین دفعہ حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَهَنَ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جس جگہ نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔

فرمایا۔ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ اور بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے
جو تم کرتے ہو۔ دوسری بار پھر ارشاد فرمایا وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف
پھیر لیں۔ اسی آیت میں پھر آگے فرمایا وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ اور آپ لوگ جس مقام
پر بھی ہوں فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ اپنے چہروں کو اسی کی طرف پھیر لیں۔
ایک ہی مقام پر تین بار استقبال قبلہ کا حکم دینے کی مختلف توجہات ہیں۔
بعض فرماتے ہیں کہ استقبال قبلہ کا پہلا حکم ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو حدود
حرم کے اندر رہتے ہیں۔ اور دوسرا حکم اُن کے لیے ہے جو ملک عرب میں اقامت
پذیر ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تیسرا حکم عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا کے
سہنے والوں کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلا حکم اس لیے دیا گیا کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی اور خواہش تھی۔ کہ قبلہ ابراہیمی ہی ہمارا قبلہ مقرر ہو۔ لہذا یہ حکم
دیا گیا۔ فرمایا دوسرا حکم اس واسطے دیا گیا کہ سابقہ حکم میں اسکی پیش گوئیاں موجود
تھیں۔ اور ان کی تصدیق کے لیے یہ دوسرا حکم نازل کیا گیا۔ پھر تیسری دفعہ استقبال
کا حکم اس لیے دیا کہ لوگوں کو الزام کا موقع نہ ملے۔ کہ دیکھو! مسلمان ہمارے قبلہ کی طرف
رخ کرتے ہیں۔ لہذا ہمارا دین سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ کہ یہ عنادی اہل
کتاب اس قسم کے اعتراض کریں گے۔ لہذا ان کو دفع کرنے کے لیے فرمایا
لِيَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ تاکہ آپ پر لوگوں کا الزام یا کوئی حجت
باقی نہ رہے۔ کبھی یہ نہ کہنے لگیں کہ جب قبلہ ہمارا تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہمارا باقی دین
کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

فرمایا اس اتمام حجت کے باوجود بعض لوگ حجت بازی سے باز نہیں آتے
گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا إِنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ یہ اہل کتاب

میں سے ظالم لوگ ہونگے جو اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور تحویل قبلہ پر یہودہ قسم کے اعتراض کرتے ہیں چکیا ہٹ محسوس نہیں کریں گے فرمایا کہ اہل کتاب تو صرف تحویل قبلہ پر ایک اعتراض کریں گے مگر مشرکین ہر دو صورتوں میں معترض ہونگے یعنی بیت المقدس کو قبلہ پکڑنے پر بھی اعتراض کریں گے اور اس کے بیت اللہ شریف کی طرف پلٹنے پر بھی معترض کے معترض رہیں گے۔
 فرمایا اس قسم کے حجت بازوں کی آپ بالکل پرواہ نہ کریں۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ
 آپ ان سے خوفزدہ نہ ہوں وَ اخْشَوْنِي بلکہ آپ مجھ سے ہی خوف کھائیں۔ یہ
 لوگ محض تعصب کی وجہ سے حق کو چھپاتے ہیں۔ اور آپ پر طرح طرح کے اعتراض
 کرتے ہیں ان کے اعتراضات سے گھبرالے کی کوئی بات نہیں۔ صرف اور
 صرف اللہ تعالیٰ کا خوف جانگزیں ہونا چاہیے۔ جب اللہ کا خوف پیدا ہو جائیگا
 تو باقی تمام خوف خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

قبلہ تکمیل
 نعمت

اللہ تعالیٰ نے قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی وَ لِأَنَّكُمْ
 نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں گویا بیت اللہ کا تقرر
 نعمت خداوندی کی تکمیل ہے۔ وہی بیت اللہ شریف جو تمام قبلوں سے
 افضل ہے۔ تجلی گاہ خداوندی اور پوری دنیا کے لیے مرکز ہدایت ہے وہاں پر
 کیے جانے والے عمل کا اجر و ثواب لاکھ گناہ زیادہ ہے۔ اسی لیے یہ حضور علیہ
 الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اگلی
 آیتوں میں کتاب، نبی اور عبادت خانے کا ذکر بھی آئے گا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا
 بہت بڑا احسان ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بے مثال
 قبلہ مقرر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب بھی بے مثال دی ہے۔ اور دین بھی جامع اور
 کامل عطا کیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت اس آخری امت کے لیے اٹھا
 رکھی ہے۔ منجملہ ان کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خلافت بخشی ہے۔ یہ
 بھی بہت بڑا انعام ہے۔ جو اولاد آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہوا

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِلٰیْ جَاعِلٍ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۖ خَلَّافَتِ نِیَابَتِ اللّٰہی ہے۔ اس میں تقویٰ کا اظہار ضروری ہے۔ اور عدل و انصاف قائم کرنا بہت بڑی بات ہے۔ پھر یہ ہے۔ کہ خلافت کے لیے قانون اور شریعت کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ یہ خلافت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی عطا کی یٰۤاٰدُ وُدْرٰاۤنَا جَعَلْنَاكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ ۚ مَقْصِدِیْ ہِیَ ہ۔ کہ وَلَاقِمْ فِیْہِمْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ تاکہ تم پر تکمیل نعمت ہو جائے۔ بیشک اللہ نے خلافت جیسی نعمت عطا کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنی نالائقی کی وجہ سے اسے خراب کر دیا۔ اور ملکیت میں مبتلا ہو کر برائیاں اختیار کر لیں۔ ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ تاہم اللہ نے اپنی نعمت مکمل کر دی۔ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ ہے

اللہ تعالیٰ نے تقریر قبلہ کی ایک اور وجہ یہ بیان فرمائی وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے تمام ہی سامان مہیا کر دیے ہیں۔ جیسا کہ دُعائیں درخواست کی جاتی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ اسی طرح ابتدائے سورۃ میں فرمایا ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ یہ متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ گویا کتاب اللہ بھی ذریعہ ہدایت ہے۔ یہ کتاب تقویٰ اور عدل و انصاف اختیار کرنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی واللّٰہُ لَا یُہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کی رہنمائی راہ راست کی طرف نہیں کرتا وہ اندھیروں میں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔

قبلہ ذریعہ
ہدایت ہے

الغرض! جس طرح بعض دوسری چیزیں ذریعہ ہدایت ہیں۔ اسی طرح قبلہ کو بھی ذریعہ ہدایت فرمایا وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے یہ سارے سامان مہیا فرما دیے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا
وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمُ
مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِيْ
وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

مُحَافَظَةُ
۲۵۱
۲۵۲

ترجمہ: جس طرح کہ ہم نے تم میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، جو تم پر ہماری
آیتیں پڑھتا ہے، اور تم کو پاک کرتا ہے۔ اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور تمہیں وہ
سکھاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔
اور میرا شکر یہ ادا کرو۔ اور تم ناشکر گزار نہ بنو ﴿۱۵۲﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمت قبلہ کے متعلق فرمایا کہ تم جہاں کہیں
ہو، اپنا رخ بوقت نماز بیت اللہ شریف کی طرف کر لو۔ مگر یہود و نصاریٰ جو ظالم لوگ
ہیں اور بات بات پر بے جا اعتراض کرتے ہیں، اُن سے خوفزدہ نہ ہوں۔ اُن کے طعن
و تشنیع اور اعتراضات کی پروا نہ کریں۔ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم منسوخ
ہو چکا ہے۔ لہذا آپ ہر قسم کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بیت اللہ شریف کو اپنا
قبلہ اپنالیں۔ فرمایا اس کی غایت یہ ہے کہ وَلَا تُقِرُّوْا نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ تاکہ میں تم پر اپنی
نعمت پوری کر دوں۔ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ مقصد یہ
کہ قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔
اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو زیادہ فضیلت والا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔ جو کسی خاص
قوم اور علاقے کے لیے نہیں بلکہ اقوام عالم کے لیے بین الاقوامی نوعیت کا قبلہ
ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس خطہ کو یہ شرافت بخشی ہے۔ کہ اس

رابطہ آیات

جگہ عبادت اور ریاضت کا اجر و ثواب دوسرے کسی بھی مقام کی نسبت بہت زیادہ ہے
یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور پھر اس انعام کے دو حصے ہیں یعنی مادی اور
روحانی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک مادی انعام ہے اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ
کا روحانی انعام ہے۔

اتمام نعمت

اتمام نعمت کے متعلق حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ انسان کے لیے اتمام نعمت یہ ہے مَنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مقام ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے اتمام نعمت یہ ہے کہ انسان کا خاتمہ ایمان پہ ہو جائے۔ کیونکہ صحیح معنوں میں مومن وہی ہے جس کا خاتمہ بالا ایمان ہو۔ اسی لیے خود انبیائے کرام بھی یہی دعا کرتے ہیں۔ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ۔ یعنی اے مولا کہیم مجھے اسلام اور ایمان کی حالت میں موت دینا اور میرا حشر صالح لوگوں کے ساتھ کرنا۔ اسی طرح خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عطا فرماتا ہے

بعثت رسول

فرمایا کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ حَسْرَةً لِّمَنِ هِيَ تَحْمِلُ الْإِثْمَ
تمہاری طرف ایک رسول بھیجا۔ یہاں پر لفظ کَمَا تشبیہ کے لیے آیا ہے۔ یعنی جس
طرح ہم نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے تم کو فضیلت بخشی اور اتمام نعمت
کیا۔ اسی طرح ہم نے تمہاری طرف عظیم الشان رسول بھیج کر تم پر احسان کیا اور اپنی نعمت
کو کامل بنایا۔ رسول کا بھیجنا بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہے
دوسری جگہ قرآن پاک نے حضور علیہ السلام کے وجود مبارک کو نعمت سے تعبیر کیا ہے ۔
الْحُسْبَانُ إِلَى الَّذِينَ يَكْفُرُوا بِاللَّهِ كَفَرًا كَيْفَ آتَى الْقَوْمَ الَّذِي كَذَّبُوا عَنْكَ
مشرکین عرب کو نہیں دیکھا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعام کی ناقدری کی۔ گویا
نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کیا۔ مراد یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام جن کا وجود پاک اللہ
کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی ناقدری کا مقصد یہ کہ جس طرح ہم نے تمہاری طرف

تمہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

کما کا یہ کاف علت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کما سے مراد یہ ہوگا۔ تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت کے راستے پر قائم رہو۔ اور اس طرح یہ کاف تشبیہ کا نہیں بلکہ تعلیل کا ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک عظیم الشان رسول اس لیے بھیجا تاکہ اتمامِ نعمت ہو جائے اور ہدایت کا راستہ بھی واضح ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ کما بالکل اسی طرح ہے جس طرح حضور علیہ السلام نے دعائیں سکھایا اللہُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کَمَا كَسَوْتَنِي کہ جب لباس پہنو تو یوں کہو کہ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ کہ تو نے ہمیں لباس پہنایا۔ یہ لباس بھی تو نے ہی عطا کیا ہے گویا اس لحاظ سے یہ کاف تشبیہ کی بجائے تعلیل کے لیے ہے یعنی جو علت کا معنی دیتا ہے۔

یہاں یہ بھی لفظ رسول بطور اسم نکرہ آیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ بڑا رسول بھیجا ہے۔ جو کہ ہُنْکُمْ تم میں سے ہی ہے۔ اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں بھی گزر چکا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ یعنی اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے امت مسلمہ برپا کر اور پھر ان کے اندر ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔ فرمایا ایک ایسا رسول بِشَلُّوا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھتا ہے۔ لفظ آیت مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ اس سے مراد معجزہ، نشانی، حکم یا فرمان ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا مبعوث کردہ رسول ہماری آیات یعنی ہمارا کلام جو بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے وہ پڑھ کر سناتا ہے۔

وَمِنْ كُنُیْكُمْ اور تمہارا تذکرہ کرتا ہے یعنی پاک صاف کرتا ہے۔ روزیل اور گندے اعتقادات سے بچا کر تمہارے اندر اچھے اخلاق اچھے اعمال اور اچھے عقائد قائم کرتا ہے۔

یہ ایسا عظیم الشان رسول ہے جو تلاوت و تذکرہ کے ساتھ ساتھ وَعِلْمُكُمْ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس تعلیم کا ذکر حضرت

تلاوت اور تذکرہ

کتاب و حکمت کی تعلیم

ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں بھی آپ کا ہے وہاں بھی انہوں نے یہی دُعا کی تھی۔ کہ اے
 ہمارے رب اس امت مسلمہ میں ایسا رسول بھیج جو انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے
 اور ان کا تزکیہ کرے۔ وہاں یہ تزکیہ کا ذکر کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد کیا تھا۔
 مگر یہاں پہ اس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تقدم و تاخر میں
 بھی نکتہ پنہاں ہے۔ وہاں یہ دُعا کا مقام تھا۔ کہ مولا کریم! ایسا رسول مبعوث فرما جو ان
 کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کا تزکیہ ہو جائے وہ ظاہری اور
 باطنی طور پر ہر لحاظ سے پاک صاف ہو جائیں اور یہ مقام عمل کا مقام ہے۔ تعلیم کتاب
 و حکمت کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کا تزکیہ ہو جائے۔ اب جب کہ امت
 مسلمہ پیدا ہو چکی، عظیم الشان رسول مبعوث ہو چکا۔ تو اب کتاب و حکمت کی تعلیم کی اصل
 غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان فرمایا کہ جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول
 مبعوث فرمایا جو ہماری آیات پڑھتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت
 کی تعلیم دیتا ہے۔

الغرض! ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مقام تعلیم اور پیش گوئی کا مقام تھا۔ اور یہ
 عمل کا مقام ہے۔ لہذا کتاب و حکمت کی تعلیم کی غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان
 فرمایا جب تک مقصد حاصل نہ ہو، عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ تعلیم اسی وقت مفید ہوگی۔
 جب اس کا مقصد تزکیہ حاصل ہو جائے۔ تعلیم مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات
 تزکیہ ہے۔ جس کا تذکرہ اس مقام پر پہلے کیا ہے۔

فرمایا کتاب و حکمت کی تعلیم کے علاوہ ہمارا رسول وِعَلِّمُكُم مَّا لَمْ
 تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ تمہیں وہ چیزیں بھی سکھاتا ہے۔ جو تم نہیں جانتے تھے۔ مثلاً
 لوگ وضو اور طہارت کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں پیغمبر علیہ السلام کی تعلیم کے ذریعے سکھایا۔ لوگ غسل جنابت
 کے طریقہ سے ناواقف تھے۔ انہیں تعداد رکعات معلوم نہ تھیں۔ نماز اور دیگر عبادات
 کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ حلال و حرام کی تمیز نہ تھی۔ یہ سب چیزیں اللہ نے نبی کے ذریعے

ان جانی
 چیزوں کی
 تعلیم

سکھائیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہمارا رسول تمہیں وہ چیزیں سکھاتا ہے۔ جو تمہارے علم میں نہ تھیں۔

حضرت جعفرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جب کچھ مسلمان قریش مکہ کی ایذا رسائیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور کفار نے وہاں بھی مسلمانوں کا پیچھا کیا تو حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی اُس کا لب لباب یہ تھا کہ اے بادشاہ! ہم بت پرستی کرتے تھے۔ ہمارے اندر ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ ظلم و جور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ حق و انصاف کے تقاضوں سے نا آشنا تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں نبی آخر الزماں مبعوث فرما کر سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا، بت پرستی سے باز آجاؤ۔ صرف اُسی وعدہ لا شرک کی عبادت کرو۔ حلال و حرام میں تمیز پیدا کرو۔ کسی کو ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ اللہ کے نبی نے ہمیں عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا۔ تہذیب و تمدن کے اصول بتلائے اور معیشت کے نکات سمجھائے۔

آپ نے عہد کی اصلاح کے اصول بتائے۔ اور پھر پیش آنے والے واقعات کو بیان فرمایا۔ مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ قبر کی زندگی، قیامت کو دوبارہ جی اٹھنا، پل صراط پر سے گزرنا اور آخر میں محاسبے کی منزل، میزانِ عدل کا قیام اور پھر رب العزت کا آخری فیصلہ، یہ سب باتیں حضور علیہ السلام نے امت کو بتلا دیں گویا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوا دیا اے لوگو! آؤ میں تم کو نہ بتلاؤں کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کس کس چیز کو حلال اور کس کس کو حرام قرار دیا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں، جو تم نہیں جانتے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے مظالم سے بچنے کا طریقہ بتلایا۔ مولانا علیؒ نے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام یہ ہے کہ اُس نے بہترین نظام حکومت قائم کرنے کے اصول بتلائے اور پھر انہی اصولوں کے مطابق نظام خلافت قائم ہوا۔ عرب

کے لوگ ہزاروں سال تک نظام حکومت سے نابلد رہے، حالانکہ دیگر اقوام مثلاً رومی اور ایرانی نظام حکومت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا۔ کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے نظام حکومت کی تعلیم دی۔ جسکی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں پرچم اسلام آدھی دنیا پر لہرانے لگا۔ یہ سب چیزیں **وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ مَا تَكُونُوا تَعْلَمُونَ** کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ان العامات کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جب میں نے اتنے بڑے بڑے العامات تم پر کیے ہیں۔ تو پھر تمہارا بھی فرض ہے کہ **فَاذْكُرُونِي** مجھے یاد کرو۔ گویا یہاں سے تہذیب کا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی قباحتیں بیان کیں۔ پھر ملت ابراہیمی کی بنیاد کا ذکر کیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت ہونے کا بیان ہوا۔ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کتاب کا بیان آیا۔ اور اب یہاں سے تہذیب اخلاق یا تہذیب نفس کے احکام شروع ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں تہذیب اور شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اس مقام پر دو اصول بیان ہوئے ہیں۔ اور باقی تین اصول آئندہ رکوع میں بیان ہوں گے۔

تہذیب اخلاق کے
پانچ اصول
ذکر، شکر، صبر
و عظیم شاعر نے

تہذیب نفس کا پہلا اصول جو یہاں بیان ہوا، وہ ذکر الہی ہے۔ گویا ہمارا نصاب تعلیم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبان، عمل، قلب اور روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذکر کا عام فہم طریقہ زبان کے ذریعہ سے ہے۔ انسان زبان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ تلاوت کلام پاک کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کی زبانی صورتیں ہیں۔ ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا، حضور! **أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ** کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا **لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ** یعنی تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا افضل عمل ایمان باللہ ہے۔ کہیں فرمایا کہ نماز سے افضل عمل ہے اور کہیں جہاد فی سبیل اللہ کو افضل عمل قرار دیا تاہم یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان کی زبان ہر وقت ذکر الہی سے تر رہنی چاہیے۔ ذکر الہی ایک

پہلا اصول
ذکر الہی

ایسی عبادت ہے۔ جسکی کوئی حد نہیں، نماز، روزہ، جہاد وغیرہ سب محدود ہیں مگر ذکر الہی غیر محدود ہے اسی لیے فرمایا اذکرہ واللہ ذکرًا کثیرًا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو، ذکر الہی میں اتنے محو رہو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں۔ اور پھر ذکر الہی کا صلہ یہ ملیگا کہ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ الغرض ذکر الہی کثرت سے کرو، کیونکہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔

اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر اخلاص، نیک نیتی اور اچھی کیفیت کے ساتھ کرتا ہے تو اس کا رُوحِ حَظِیرۃ القدس کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا تعلق روحِ عظم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو کہ حَظِیرۃ القدس میں ایک بڑی روح ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ چھوٹی چھوٹی روحیں بڑی روح کے اعضا و جوارح ہیں۔ اس طرح گویا ذکر الہی کرنے والے کا تعلق براہِ راست خدا تعالیٰ کی تجلی عظم کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذکر کی اغسیانی کیفیت جس قدر روح عظم کے مطابق ہوگی اسی قدر اس کو قرب الہی حاصل ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان کے اندر شائستگی پیدا ہوگی، جس کے بغیر وہاں داخلہ ممکن نہیں۔ اگر جسم، روح، قلب یا نفس میں کسی قسم کی نجاست ہوگی تو قرب الہی نصیب نہیں ہو سکتا یہ ملک ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔ جس سے انسان کو تہذیب نصیب ہوتی ہے۔

الغرض! فرمایا اذکرہ فاذکرہ فاذکرہ یعنی اذکرہ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ یعنی میں تمہیں اس ذکر کی بدولت اجر و ثواب عطا کرتا رہوں گا، تقرب نصیب کرتا رہوں گا حدیث شریف میں آتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص مجھے اپنے جی میں یاد کریگا میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ شانہ اپنے جی میں یاد کرے اسکی عظمت فوقیت کس قدر قابل رشک ہوگی پھر فرمایا جو مجھے کسی مجمع میں یاد کرے گا، میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کروں گا۔ جو شخص میری طرف چل کر آئے گا، میں اُس کی طرف دوڑ کر آؤں گا۔ یہ سب ذکر الہی کی برکات ہیں حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا، اے معاذ! جب بھی

ماند بہو۔ تو اس کے بعد یوں کہا کرو اللہمَّ اعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ یعنی اے اللہ! مجھے اپنا ذکر کرنے، شکر کرنے اور اچھے طریقے سے عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا اصول
شکر الہی

تہذیب نفس کا دوسرا اصول یہاں پر یہ بیان فرمایا وَاشْكُرُوا لِي اور میرا شکر یہ ادا کرو وَلَا تَكْفُرُوا اور میرے شکر گزار نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کی مختلف صورتیں میں شکر یہ نہ بان سے بھی ادا ہوتا ہے اور عمل سے بھی ادا ہوتا ہے مثلاً جب کوئی انسان کھانا کھاتا ہے۔ تو زبان سے الحمد للہ کہتا ہے۔ گویا اللہ کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے اولاد دی ہے۔ تو انسان عقیدہ کہ اللہ کا شکر گزار بننا ہے۔ اللہ کی نعمت کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔ اگر انسان کو حج نصیب ہو، تو قربانی کر کے شکر یہ ادا کرتا ہے۔ اگر انسان کو نیا لباس میسر آجائے تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ پُرانا لباس فی سبیل اللہ دیدے۔ جھنور علیہ السلام کی عادت مبارک یہی تھی۔ جب نیا کپڑا پہنا، دعا کی اور پُرانا کپڑا کسی محتاج کو دے دیدے اگر کسی کو اللہ نے دودھ دینے والا جانور دیا ہے۔ تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ اس کا دودھ کبھی کبھی محتاجوں کو بھی دے دیا کرے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر جانور نے کسی دین دودھ نہیں دیا تو پیر آدم کرانے کے لیے لے آتے ہیں۔ بھائی! تم نے اس کا دودھ محتاج کو دیکھ اس کا شکر یہ تو ادا ہی نہیں کیا۔ کرنے کا اصل کام تو وہ تھا۔ الغرض زبان۔ جوارح، مال اور عمل سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنا تہذیب نفس کا دوسرا اصول ہے۔

فرمایا وَلَا تَكْفُرُوا ناشکر گزار نہ بنو۔ ظاہر ہے کہ اگر حصول نعمت پر شکر یہ ادا نہیں کیا تو گویا انسان نے اللہ تعالیٰ کی ناشکر ہی کی۔ ایسا شخص اتصالِ حظیرۃ القدس سے محروم رہ گیا۔ لہذا اگر کامیابی کی خواہش ہے تو ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور کسی صورت میں بھی ناشکر گزار نہ بنو۔

سَيَقُولُ ۲

البقرة ۲

درس پنجاہ ونہ (۵۹)

آیت ۱۵۲ تا ۱۵۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۝ اور نہ کہو ان لوگوں کے بارے میں مردہ جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے ۝

بنی اسرائیل کا شکوہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کیا۔ پھر حضور علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور ”کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ“ اور ملت ابراہیمی کا ذکر فرمایا اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے پر یہودیوں کے اعتراضات کا تذکرہ ہوا۔ اس کا مزید بیان آگے بھی آئے گا۔
”فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ“ سے ایک نیا باب شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے اپنی حکمت میں تہذیب الاخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس باب میں تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول بیان ہوئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق کوئی بھی قوم ترقی کی پانچ منازل طے کیے بغیر یہ سرعروج نہیں پہنچ سکتی۔ ترقی یافتہ قوم کی پہلی منزل تہذیب الاخلاق ہے۔ اور دوسری تدبیر منزل۔ تدبیر منزل کے آگے چار قانون ہوتے ہیں۔ پہلا قانون شادی بیاہ سے متعلق ہے۔ جس میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض آتے ہیں۔

یہ سرعروج قوم کی پانچ منزل

ہیں، دوسرا قانون والدین اور اولاد کی اصلاح سے متعلق ہے۔ تیسرا قانون مالک اور مملوک کے تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور چوتھے قانون میں اقربا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی اصلاح کی تدبیر ہوتی ہے۔

تہذیب الاخلاق اور تدبیر منزل کے بعد ترقی یافتہ قوم کی تیسری منزل تدبیر مدنی ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے شہر، بستی یا محلہ کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے بعد چوتھی منزل اصلاح ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اور پانچویں منزل خلافت کبریٰ کی ہے جس کے ذریعے تمام جہاں کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اہ تفیق رابع کے اصول کے مطابق مبعوث فرمایا۔ اور اس سے مراد بین الاقوامی یعنی تمام عالم کی اصلاح ہے۔ الغرض جو قوم ترقی کے باوجود پہنچتی ہے، اُسے بہر حال یہ پانچ منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ ترقی کے آخری زینہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اس قدر صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ حظیرہ القدس یا بہشت بریں کا ممبر بن جائے۔ یہ انسان کی انتہائی ترقی کا مقام ہے۔ اگر وہ حظیرہ القدس کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

گزشتہ درس میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصولوں کا تذکرہ اجمالاً اچکا ہے۔ ان میں سے دو اصول ذکرِ الہی اور شکر کا بیان گزشتہ رکوع میں آچکا ہے ظاہر ہے کہ ان پانچ اصولوں پر عمل کیے بغیر کوئی شخص مہذب نہیں کہلا سکتا موجود زمانے میں جس شخص کے لیے مہذب کا ہم معنی لفظ کلچرڈ (CULTURED) بولا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں کلچرڈ یا مہذب اُسے کہیں گے جو اسلام کے قائم کردہ ان پانچ اصولوں پر پورا اترے گا۔

تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر بیان کیا گیا ہے ارشاد

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ
ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ استعانت پکڑو۔ صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول

ہئے۔ کنز العمال میں یہ حدیث موجود ہے، جسے اہم غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور
دوسرے علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ صبر کا معنی
کسی چیز سے رُک جانا یا کسی شے کو برداشت کرنا ہے اور اس کے تین مادے
ہیں، صبر علی المصیبت، صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصیۃ۔

صبر علی المصیبت یہ ہے کہ اہل ایمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے۔ کوئی
حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ اسے من جانب اللہ سمجھ کر اُس پر صبر کرتے ہیں اور
اس کے جواب میں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کہتے ہیں، ایسے شخص کا
تعلق باللہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لیے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔

وَمِنَ الْيَقِينِ مَا تَهْوُونَ بِهِ عَلَيْنَا مَصَائبُ الدُّنْيَا حضور علیہ السلام نے
امت کو یہ دُعا سکھائی۔ کہ اے اللہ یقین میں اس قدر درجہ عطا کر کہ دنیا کی مصیبتیں
ہلکی ہو جائیں۔ ایسا شخص ہر تکلیف پر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔

اسی کا ارادہ اور مشیت کام کر رہی ہے۔ وہ ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت
کرے گا، اُس پر جزع فزع نہیں کرے گا۔ نہ چیخے چلائے گا اور نہ کوئی وادلا
کرے گا۔ یہ اس کے تعلق باللہ کی نشانی ہے۔ اس کی مزید تشریح یوں بیان فرمائی
اَلصَّبْرُ عِنْدَ صَدْمَةِ الْاُولٰی کسی مصیبت کی ابتداء میں صبر کرنا ہی صبر
کی علامت ہے۔ وگرنہ جب تکلیف کا سامنا کرتے ہوئے انسان تھک جاتا
ہے اور تمام وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے، تو پھر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت پر صبر کرنا صبر علی الطاعة کہلاتا ہے ظاہر
ہے کہ کوئی کام بھی بغیر حوصلہ اور برداشت کے انجام نہیں پاسکتا۔ گرمی سردی
میں وضو کے لیے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بہت بڑی مشقت
کا کام ہے۔ حج و عمرہ میں تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ غرضیکہ اطاعت کا
کوئی بھی کام صبر کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

صبر عن المعصیۃ یہ کہ جب نفسانی خواہشات سامنے آئیں تو

انسان اُن پر کنٹرول کرے۔ اور اپنے نفس کو معصیت سے روکے۔ جو شخص حرص و ہوا کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر نفسانی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے۔ اور اس طرح معصیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے۔ جب انسان صبر عن المعصیت کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اور کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتُمْ كَالْوُفَى الصَّابِرُونَ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بغیر حساب اجر عطا کرے گا۔

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ الصَّابِرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ صبر نصف ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے الصَّابِرُ مِنْ الْاِيْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّاسِ مِنَ الْجَسَدِ صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ ایسا ہے جیسا سر کا تعلق جسم کے ساتھ ہے جسم سے سر علیحدہ ہو جائے تو جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر صبر کا مادہ مفقود ہو جائے۔ تو ایمان کا کوئی فائدہ نہیں صبر ایسا قیمتی ہول ہے کہ اس کے متعلق فرمایا لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَهُ جس نے صبر کا دامن چھوڑ دیا، اُس کا ایمان باقی نہیں رہا۔ اس کا ایمان ڈالواں ڈول ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اے ایمان والو! صبر کے ساتھ مدد حاصل کرو، یعنی اس پر کاربند ہو جاؤ۔ کوئی مشکل درپیش ہو، اطاعت کا محل ہو یا معصیت سے رکنے کا موقع ہو، ہر حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھو۔ تہذیب الاخلاق کا یہ تیسرا اصول ہے۔

فرمایا اے ایمان والو! استعانت حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں نماز کی روح پیدا ہوگی اس میں توحید کا اعلیٰ مقام پیدا ہوگا۔ ایسے شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہو جائے گا۔ اُس کو بلند مقام حاصل ہوگا۔ نماز کے متعلق اللہ نے فرمایا اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي میری یادآوری کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے اخبات حاصل ہوگا۔ فرمایا وَرَبِّكَ فَكُنْ اپنے رب کی تکمیل بیان کرو وَرَبِّكَ فَكُنْ اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو طہارت قائم رکھنا فرشتوں سے مشابہت رکھنا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے

تہذیب الاخلاق
کا چوتھا اصول نماز

بمنزلہ شرط کے ہے۔ ”اَتُحِبُّوْا اِلٰی رَبِّہُمْ“ نماز میں اجبات پایا جاتا ہے۔ جو کہ بہت بڑی صفت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے۔ نماز افضل العبادات ہے۔ جب انسان دنیوی امور میں پڑ کر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو نماز اس کا تعلق اللہ سے پھر قائم کر دیتی ہے۔ انسان کا تعلق خلیفۃ اللہ سے جڑ جاتا ہے۔ نماز کو بار بار قائم کرنے سے انسان کی غفلت دور ہو جاتی ہے اور تعلق باللہ قائم رہتا ہے۔

فرمایا اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا، خوشنودی اور اعانت صابرین کے ساتھ ہے الغرض! ذکر، شکر، صبر، دعا اور تعظیم شعاۃ اللہ تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول ہیں۔ ان میں سے ہر اصول اہم ہے۔ فرمایا یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کی پروا نہ کریں ”فَلَا تَحْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ“ آپ ان سے خوف نہ کھائیں۔ بلکہ صرف میرا خوف دل میں رکھیں۔ ان کے باطل اعتراض پر صبر سے کام لیں۔ ”وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ“ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی حاصل ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ ”اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا اَکْرَمُ صَبْرٍ کَرُوْکَ“ اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو گے ”اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزِیْمِ الْاُمُوْرِ“ یہ پختہ بات ہے۔ فلاح نصیب ہو جائیگی۔ جس شخص یا جماعت میں صبر کی روح پیدا ہو جائے گی۔ نماز پر استقامت ہو جائیگی وہ شخص یا جماعت کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب دشمن سے ٹکرا لینے کا موقع آئے گا۔ تو جذبہ جہاد کام آئے گا۔ اور اس موقع پر اگر جان بھی چلی جائے، تو انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ اُسے دائمی حیات نصیب ہو جاتی ہے۔ انسان اس خلفشار کی زندگی سے نکل کر بلند تر زندگی میں داخل ہو جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی تقویت کے لیے مارا گیا، وہ شہید ہو گیا۔ اور کامیاب ہو گیا۔

شہادت
بیل اللہ

اسی لیے فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط اللہ

کے راستے میں جان دینے والوں کو مردہ ست کہو قبل اُحیاء بلکہ وہ زندہ ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کا ظاہری جسم تو مر جاتا ہے۔ اس کی مادی حیات ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شہید کو اگلے جہان میں اعلیٰ تر زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ انہیں انبیاء علیہم السلام جیسی اعلیٰ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی زندگی تو بہر حال ختم ہونے والی ہے۔ یہ تو مصائب و آلام کی زندگی ہے اس کے مقابلے شہید کو جو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ نہایت فائق اور اعلیٰ تر ہوتی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی جسم اگرچہ بالطبع فانی ہے۔ مگر بعض اوقات شہدا کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور ان پر زمانے کے تغیر و تبدل اور مٹی کا اثر نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کے متعلق تو واضح طور پر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھا جائے۔ مگر بعض اوقات شہدا کے جسم بھی اللہ کے حکم سے محفوظ رہتے ہیں۔ چند سال پہلے تاتاریوں کے علاقہ میں چھ سات سو سال پرانے شہدا کے جسم بالکل صحیح و سالم برآمد ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ چاہے تو شہدا کے اجسام کو بھی آبیج نہ آنے دے۔ تاہم یہ کلی اصول نہیں ہے۔ البتہ عالم برزخ میں شہدا کو اعلیٰ درجے کی زندگی نصیب ہوتی ہے، برزخ کی زندگی تو ہر نیک و بد اور مومن و کافر کو حاصل ہے۔ مگر شہدا کی زندگی نہایت اعلیٰ و ارفع ہے سورۃ آل عمران میں آتا ہے کہ شہدا کو عیش کے سامان نصیب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خوراک حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں مردہ مرت کہو۔ انہیں اعلیٰ درجہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ مادی زندگی کے اعتبار سے انہیں مردہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اپنی اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کی بنا پر وہ زندہ جاوید ہیں۔

شعور کا فقدان

فرمایا وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ اے لوگو! تم شہدار کی زندگی کا شعور نہیں

دیکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں جو دائمی زندگی حاصل ہوئی ہے وہ اس جہاں سے

الگ ایک دوسرا جہان ہے جو تمہارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔ آپ اس

مادی جہاں کی چیزوں سے واقف ہیں۔ اس کی اشیاء آپ آنکھ سے دیکھ سکتے

ہیں کان سے سُن سکتے ہیں، عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اگلے جہان کی چیزوں کو نہ تم دیکھ سکتے ہو، نہ تمہارے کان اس کی سماعت کی تاب لاسکتے ہیں اور نہ تمہاری عقل انہیں سمجھنے کے قابل ہے اُس جہان کی چیزوں کو وہاں جا کر ہی دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

اہم غزالیؒ فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ عذاب قبر سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ یہ آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ عالم ملکوت کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ یہ تمام چیزیں اگلے جہان میں موجود ہیں، مگر ہمیں نظر نہیں آتیں۔ ان کا ادراک وہاں پہنچ کر ہی ہوگا اب تو صرف آسمان نظر آتا ہے مگر قیامت والے دن اوپر کی تمام اشیاء نظر آنے لگیں گی، اوپر کے تمام پرے کھول دیے جائیں گے، عرش الہی نظر آجائے گا۔ جن اور فرشتے بھی نظر آئیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہاری مادی نظریں اور دماغ اگلے جہان کی چیزوں کے ادراک کا شعور نہیں رکھتے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۖ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ (۱۵۵) الَّذِينَ
إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
۝ (۱۵۶) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ (۱۵۷)

ترجمہ: اور البتہ ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ خوف، بھوک، مالوں —
جانوں — اور — کھلوں کے گھائے سے۔ اور آپ صبر کرنا والوں
کو خوشخبری سنائیں ۝ (۱۵۵) وہ لوگ جب انکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ کہتے ہیں
کہ بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانوالے
ہیں ۝ (۱۵۶) یہی لوگ ہیں کہ ان پر عنایتیں ہیں — ان کے رب کی
طرف سے اور مہربانی ہے۔ اور یہی لوگ ہیں — ہدایت پانے

والے ۝ (۱۵۷)

ترقی کے لیے جن منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے، اس میں تہذیب اخلاق
اور اس کے اصولوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کے ذکر اور شکر کا تذکرہ
ہوا۔ اور پھر تیسرے بڑے اصول صبر کا بیان ہے، جو تھا اصول۔ دُعا ہے جس کا
ذکر انا للہ وانا الیہ راجعون میں اجمالی طور پر کیا گیا ہے دراصل دُعا اور نماز کا تعلق بھی اسی سلسلہ میں
اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صبر کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے

گذشتہ
سے
پیوستہ

صبر کی قوت

اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ اس کے
بعد اللہ اور اس کے دین کی خاطر قتل ہونے والے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ

اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں۔ یہ صبر کی عظمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں موت جیسی بڑی مصیبت کو بھی بخوبی برداشت کرتا ہے۔ تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ بڑی راحت والی زندگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہید کے لواحقین بھی یہ صدمہ برداشت کرتے ہیں جس کے بدلے میں انہیں زندگی میں عزت حاصل ہوتی ہے اور وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ گویا تہذیب الاخلاق کے ضمن میں صبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق موت جیسی بڑی مصیبت کو برداشت کیا وہ تہذیب الاخلاق کا مالک بن گیا۔

آزمائش مقتضائے ایمان ہے

موت جیسی بڑی مصیبت کے تذکرہ کے بعد یہ درس آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کا ذکر فرمایا کہ ہم ان کے ذریعے بھی تمہیں آزمائیں گے فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ۖ هُمْ تَعْلَمُونَ ضرور آزمائیں گے اور یہ آزمائش مقتضائے ایمان چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے مومن لوگ یہ تصور کرو کہ یہ وہ محض کلمہ پڑھ کر بغیر امتحان کے کامیابی حاصل کر لیں گے۔ بلکہ فرمایا ہم ضرور انہیں امتحان سے گزاریں گے۔ جھنور علیہ السلام کا بھی ارشاد مبارک ہے۔ يُبْتَلَى الرَّجُلُ بِقَدَرٍ دِينِهِ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر اس کا دین مضبوط ہوگا اُسی قدر اُس کی آزمائش بھی کڑی ہوگی۔ اور اگر دین کمزور ہے۔ تو آزمائش بھی کمزور ہوگی، مگر آزمائش سے خالی کوئی نہیں۔ بہر حال ایمان کا تقاضا ہے کہ آزمائش آئے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ کہ وہ کسی شخص کی آزمائش کس طریقہ سے کرتا ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ۖ هُمْ تَعْلَمُونَ کسی نہ کسی چیز سے ضرور آزمائیں گے۔ اور وہ کون سی چیزیں اور کون سے ذرائع ہیں جن سے آزمائش ہوتی ہے فرمایا مِنَ الْخَوْفِ مَبْخَلَةٌ اُن ذرائع کے ایک ذریعہ خوف ہے۔ یعنی تم پہ خوف

طاری کر دیں گے۔ جس سے انسان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ خوف بالعموم بیرونی اسباب سے ہوتا ہے مثلاً کسی بیرونی دشمن کا خوف مسلط کر دیں گے۔ جس سے زندگی کا لطف برباد ہو جائے گا۔ اہل مکہ کے متعلق سورۃ قریش میں فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قریش پر اتنا احسان فرمایا کہ **أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ** یعنی انہیں بھوک سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ انہیں خوف سے بھی مأمون رکھا۔ وہ لوگ نہایت امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی بنا پر نہایت باعزت مقام حاصل تھا۔ اور وہ ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ تھے۔

خوف ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی موجودگی میں زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت ہر چیز خوف کی زد میں آ کر اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دیکھ لیں۔ دھیان ہر وقت اُسی طرف رہتا ہے۔ کہیں گولہ باری کا خطرہ ہے کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ن بچ رہے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم ہوتا ہے پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس سے ملکی معیشت تباہ ہو جاتی ہے زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ اور لوگ ہر آن نئی مصیبت کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہم **خوف** کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے۔

وَالْجُوعُ آزمائش کا دوسرا ذریعہ بھوک ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار اس کی خوراک پر ہے۔ غذا کا حصول انسان کا طبعی اور فطری حق ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات، کیڑے مکوڑے، چمندر، پند، خشکی اور پانی کے تمام جانداروں کی زندگی خوراک سے وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جیسی مقدس ترین ہستیوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لَّا يَأْكُلُونَ** **الطَّعَامَ** یعنی ہم نے انبیاء کے جسم بھی ایسے نہیں بنائے جنہیں غذا کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کو بھی بھوک کا احساس ہوتا ہے بھوک کی

بھوک

وجہ سے بعض اوقات وہ بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ غزوہ خندق کے موقع پر خود تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے ہم نے حضور علیہ السلام کو بے چین ہوتے ہوئے بھی دیکھا بعض اوقات بھوک کا اتنا غلبہ ہوتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے بلکہ ٹیک لگاتا پڑتی۔ الغرض چونکہ خوراک ہر ذی جان کے لیے لازمی ہے۔ لہذا اس کے بغیر اس کا اضطراب بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بسا اوقات ہم انسان و حیوان کی خوراک روک کر اور اسے بھوک میں مبتلا کر کے اسکی آزمائش کرتے ہیں مفسرین کرامؓ فرماتے ہیں کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک اضطراری اور دوسری اختیاری۔ پانی اور خوراک کی قلت اضطراری بھوک ہے، اور اس کا مظاہرہ دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ قحط سالی کی وجہ سے خوراک پیدا ہی نہیں ہوتی یا کوئی بیرونی آفت مثلاً طوفان یا زلزلہ وغیرہ کے ذریعے اس کے ذخائر تباہ ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خوراک کا حصول ممکن نہیں رہتا اور لوگ آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قریبی زمانہ میں بنگال کا مشہور قحط واقع ہوا۔ آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل اس قحط کی وجہ سے نوے لاکھ انسان لقمہ اجل بنے۔ چھوٹے چھوٹے سیلاب تو اکثر ساحلی علاقوں میں آتے رہتے ہیں۔ جس سے سینکڑوں اور ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ یہ اضطراری بھوک ہے اور آزمائش کے لیے وارد ہوتی ہے۔ بھوک کی دوسری صورت اختیاری ہے جیسے۔ اہل ایمان کے لیے ماہ رمضان میں روزوں کی فرضیت مہمان خود اس بھوک کو اختیار کر کے آزمائش خداوندی پر پورا اترتے ہیں۔

جان و مال
کا نقصان

فرمایا آزمائش کی تیسری صورت وَفَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ یعنی مال و جان کا نقصان ہے۔ انسانی معیشت کا دار و مدار انہی دو چیزوں پر ہے۔ انسان مال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ تجارت، حرفت یا زراعت کرتا ہے اور یہ امور انجام دینے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ لہذا اگر جان یعنی افرادی قوت اور مال یعنی روپیہ پیسہ، گلے بیل، بھینس، اونٹ بکری وغیرہ

میں کبھی آجائے گی تو انسانی معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جان و مال میں کبھی کبھے بھی لوگوں کا امتحان لیتے ہیں۔ آفاتِ ارضی و سماوی مال و جان میں نقصان کا ذریعہ ہیں۔ بسا اوقات مملکت و بانیِ امراض مثلاً طاعون، ہیضہ، تپ محرقہ وغیرہ انسانی زندگی کے اٹلانے کا سبب بنتی ہیں۔ یا پھر زلزلہ، طوفان اور سیلاب وغیرہ کے ذریعہ جانی و مالی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

ثمرات کی کمی

آزمائش کا چوتھا ذریعہ فرمایا وَالْثَّمَرَاتِ پھل ہیں۔ کہ بعض اوقات پھلوں میں کمی کے ذریعے بھی آزمائش آتی ہے۔ کسی سال فصلوں میں غلہ یا درختوں پر پھل زیادہ آتا ہے، کسی سال کم آتا ہے۔ اور کسی سال بالکل نہیں آتا۔ غلہ اور پھلوں کی فراوانی یا کمی قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے۔ بھوک سے مراد اختیاری بھوک یعنی عبادت، ریاضت اور روزہ کا حکم ہے۔ اور مال و جان کی کمی سے مراد راس المال کی کمی ہے۔ جس کے ذریعے انسان کام کاج کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پھلوں میں کمی سے مراد انسانی اولاد میں کمی ہے۔ اولاد انسان کا ثمرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات افزائش نسل انسانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پھل سے مراد درختوں کا پھل بھی ہے۔ اسمیں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم امام شافعیؒ نے پہلی تاویل کو اختیار کیا ہے۔ یعنی ثمرات میں کمی سے مراد نسل انسانی میں کمی ہے۔ اور اس کی تصدیق حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے کہ جب کسی کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ قَبِضْتُ رُوحَ ابْنِ عَبْدِي کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا مولا کریم ہم نے تیرے حکم کے مطابق ایسا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَخَذْتُ مَرَّةً قَلْبَهُ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ ہاں ہم نے لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر

پوچھتے ہیں کہ ایسا کرنے پر میرے بندے نے کیا کہا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ بندے نے **حَمْدٌ وَاسْتَوْجَعٌ** تیری تعریف کی اور انا اللہ کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو کر کہتا ہے کہ اس کے لیے بہشت میں ایک خاص کوٹھی اور ایک جگہ بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ یہ اُس بندہ مومن کا انعام ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرہ سے مراد اولاد بھی ہے

صابر بن کحیل
بشارت

اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قسم کی آزمائشوں کا ذکر فرمایا اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ان آزمائشوں میں پورا اتمہ یعنی ہر مصیبت پر صبر و شکر کا دامن تھامے رکھنا ہی انسانیت کی معراج ہے جو شخص تکلیف آنے پر اُسے برداشت کرتا ہے ہجر و فرار یا کوئی خلاف شرع حرکت نہیں کرتا، صبر کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَكَبِيرُ الصَّابِرِينَ** ایسے صابر و شاکر لوگوں کو خوشخبری سنا دو کہ فلاح و کامیابی ان کے مقدر میں ہو چکی ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جنہیں یہ بشارت دی جا رہی ہے۔ **الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا كُوْنِي تَكْلِيفٌ يَنْجِيهِمْ** جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے **فَقَالُوا كُوْنِي تَكْلِيفٌ يَنْجِيهِمْ** اور پھر لوٹ کر اُسی کے پاس جاتا ہے مقصد یہ کہ ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں ہماری جانیں اور مال اللہ ہی کا دیا ہوا ہے یہ سب اُسی کی مہربانی کا سرہون منت ہے، اور نہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے دوسری جگہ فرمایا **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی عطا کردہ ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی ہمارا تو صرف وہم و گمان ہی ہے۔ باقی ہر چیز اللہ کی ہے وہ مالک و مختار ہے اپنی ملکیت میں جب اور جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ **اِنَّ لِلّٰهِ مَا عَظٰی وَلٰكِنْ مَا آخَذَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى** سب کچھ اُسی کا ہے۔ جب چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے زندگی ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ وہ جب اور جتنی چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ جسم و جان اور موت و حیات کا مالک تو وہی ہے

لہذا جب کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ کہہ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہ مال و دولت اُنسی کا عطا کردہ ہے، وہ جب چاہے لے لے۔ لہذا وہ کسی قسم کے نقصان پر چیخ و پکار یا واویلا نہیں کرتا، بلکہ صبر سے کام لیتا ہے۔ اور ایسے ہی صابرین کے لیے اللہ تعالیٰ نے بشارت دی ہے۔

مصیبت کے وقت رونا پیٹنا، نوحہ کرنا، بالوں کو نوچنا یا گالیں پیٹنا ہرگز ایمان کا جزو نہیں ہے حضور علیہ السلام نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت عہد لیا تھا کہ رونا پیٹنا ناجائز ہے، نوحہ کرنا حرام ہے، ایسا ہرگز نہ کرنا، البتہ غم و اندوہ سے کسی کے آنسو بہ نکلیں تو یہ ایک فطری امر ہے اور درست ہے مگر چیخ و پکار کرنا خلاف طبع اور ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

مصیبت کے وقت صبر کرنا اور اِنَّا لِلّٰہِ کہہ دینا گویا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر رضا مندی کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو بھی پسند فرمایا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اللہ ہم سے راضی ہو گیا، تو یہ اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اور وہ ناراض ہو گیا۔ تو ہم یقیناً تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہے اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے اس کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں چنانچہ صبر کا قانون بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں آسمان سے گر جاؤں، زمین پر ہلاک ہو جاؤں یہ بات میرے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ خدا تعالیٰ کے کسی فیصلہ کے متعلق میں یوں کہوں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ بلکہ اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ جو خدا کے فیصلے پر راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے راضی ہوگا۔ اور جو شخص خدا کے کسی فیصلہ پر ناراض ہوگا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ناراض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے اللہ ناراض ہوگا، اُس کا حشر کیا ہوگا۔ اہم البو بکر حصاصؓ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے واضح ہے کہ رضا بالقضا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ اور صبر کا دامن نہیں

چھوڑنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات سے وہ احکام مترشح ہوتے ہیں یعنی فرض اور نفل۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا فرض حکم ہے اور ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہنا نفلی حکم ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ دعا کھائی اَللّٰهُمَّ اَحْبِنِيْ فِيْ مُصِيبَتِيْ وَاخْلُقْنِيْ خَيْرًا مِّنْهَا۔ یعنی اے اللہ! مصیبت میں مجھے اجر عطا فرما اور اس کا مجھے بہتر بدلہ عطا کر۔ یہ ایمان والوں کی نشانی ہے کہ وہ ہر مصیبت پر اس طرح کے کلمات کہہ کر راضی برضا ہو جاتے ہیں تکلیف خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس پر صبر کرنا اور کلمات خیر کہنا ایمان کی نشانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے یا کھڑکھرا لگ جائے تو اس پر بھی اِنَّا لِلّٰهِ پڑھنا چاہیئے تاکہ اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی سند حاصل ہو جائے۔

علم صبر

فرمایا صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا پر راضی ہونے والے لوگوں کا صلہ یہ ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ اِلٰیہِ ہي لوگ ہیں جن پر رب تعالیٰ کی عنایتیں اور مہربانی ہے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد خاص رحمت اور مہربانی ہے۔ اور رحمت سے مراد عام مہربانیاں ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عنایتیں اور مہربانیاں ہیں جو انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے پہنچتی ہیں۔ اور رحمت وہ مہربانی ہے جو انسانوں کو اللہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے مطابق صلوٰۃ جیسی بلند پایہ رحمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کا اتصال حظیرۃ القدس جیسے بلند پایہ مقدس مقام سے ہو جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلی عظم ٹپکتی ہے۔ اس طرح گویا اس کا رابطہ خدا تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے اور اُسے بڑی بلندی اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْتَخِرُونَ اور یہی لوگ ہریت یافتہ ہیں۔ انہیں یہ مقام اسی لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ صراطِ ستقیم کے راہی ہوتے ہیں۔ اور اسی سیدھے راستے پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و یک (۶۱)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۵۸

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ
أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ
تَطَوَّعَ خَيْرًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جس شخص
نے بیت اللہ شریف کا حج کیا یا عمرہ کیا، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں
کا طواف کرے۔ اور جس شخص نے خوشی سے نیکی کا کام کیا، تو بیشک اللہ تعالیٰ
قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

صفا اور مروہ

تہذیب الاخلاق کے تین اصول پہلی آیات میں بیان ہو چکے ہیں اور وہ
ہیں ذکر الہی، شکر الہی، صبر اور دعا اس آیت میں ایک اور اہم اصول شعار اللہ
کا بیان ہے۔ منجملہ دیگر شعار کے اس آیت میں صفا اور مروہ کو خاص طور پر شعار اللہ کہا گیا
ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ
بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں (شعار) میں سے ہیں۔ یہ دونوں پہاڑیاں
بیت اللہ شریف سے متصل واقع ہیں۔ زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی
یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ بس ارد گرد کے خطے سے ذرا ابھری ہوئی تھیں۔ اب
تو جغرافیہ ہی بدل چکا ہے۔

بیشتر حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ اور نشان کے طور پر تھوڑی تھوڑی چھوڑ دی گئی ہیں ان
دونوں پہاڑیوں کی درمیانی جگہ پست ہے۔ جہاں پر سعی کی جاتی ہے اور حجاج و عمرہ
کے ارکان میں سے ہے۔ لغوی طور پر صفا سخت قسم کی چکنی چٹان کو کہتے ہیں اور مروہ
سفید رنگ کے پتھروں کو کہا جاتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بنا پر ان پہاڑیوں

کو یہ نام دیے گئے۔

تہذیب اخلاق کا
پانچواں اصول
شعارِ اللہ کی
تعظیم ہے

یہاں پر صفامرودہ کو شعارِ اللہ کہا گیا ہے قرآن کریم کے دوسرے مقام پر شعارِ اللہ کی عظمت کے بیان میں فرمایا لَا تُحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ یعنی اللہ کے شعار کی بے حرمتی مت کرو۔ بلکہ ان کی تعظیم کرو۔ اس کو شعیرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کی علامت اور نشانی ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ شعارِ اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کی یادآوری کا ذریعہ ہیں ان کو بت پرستی یا شرک اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان چیزوں کی تعظیم ان کی ذات کی وجہ سے نہیں کہتے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہے۔ جن کو دیکھ کر اسکی عظمت اور یاد دل میں آتی ہے۔ شعارِ اللہ میں مکان کے علاوہ کئی قسم کے افعال بھی داخل ہیں مثلاً اہم شاہ ولی دہلوی فرماتے ہیں کہ مِنْ أَعْظَمِ شَعَائِرِ اللَّهِ چار چیزیں اللہ کے شعار ہیں سب سے بڑھی ہیں اور ان میں خانہ کعبہ، حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ، نماز اور قرآن پاک شامل ہیں اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ شعارِ اللہ میں عرفات بھی داخل ہے۔ جہاں نود و اچھ کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کا وقوف ہی حج کا رکن اعلیٰ ہے۔ لوگ غروب آفتاب تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ اور خوب گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی طرح مشعر الحرام جسے مزدلفہ کہا جاتا ہے وہ بھی شعارِ اللہ میں شامل ہے۔ منیٰ میں رمی جمار بھی شعارِ اللہ میں داخل ہے۔ صفامرودہ کا ذکر کہ تو خود قرآن پاک نے فرمایا۔ علاوہ ان میں تمام مساجد رمضان کا مہینہ، اور اشهر الحرام (حرمت والے مہینے) یعنی رجب، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام یہ سب شعارِ اللہ ہیں۔ یہ سب واجب الاحترام مہینے ہیں۔ اور ان میں گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔ ان میں عبارت کا اجر و ثواب بھی بڑھ جاتا ہے اور گناہ کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ، عید الفطر، جمعہ، ایام تشریق، اقامت، ختنہ

نماز باجماعت، رمل، طواف، ہدی قربانی اور صفامروہ کی سعی سب شعار اللہ میں داخل ہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُعْظِمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ یعنی شعار اللہ کی تعظیم دلوں کے تقوی کی بنا پر ہے جس کے دل میں خدا کا تقوی ہوگا، وہی شعار اللہ کی تعظیم کرے گا۔

تفسیر عزیزی

تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مشہور تفسیر ہے جو کہ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ آپ کے والد ماجد امام شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام مستح الرحمن رکھا۔

اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کابل سے لے کر برما تک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ ساتھ ساتھ عربی کو بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس وقت اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور محدود تھی۔ البتہ مرہٹی اور تامل ناڈ زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں مروج تھیں۔ ہندی کا بھی عام چرچا تھا۔ تاہم ان دو بزرگوں نے فارسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ امام شاہ ولی اللہ کی کتابیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور عالم تصنیف اصول تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ازالۃ الخفا بھی فارسی میں ہے موطا کی شرح ایک فارسی میں ہے اور ایک عربی میں بمقصد بہر حال ابلاغ دین تھا جس میں آپ کے خاندان کو کما حقہ کامیابی حاصل ہوئی۔

الغرض! آپ کے زمانہ میں رائج الوقت زبان فارسی تھی۔ دفتری خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی، جس طرح آج کل سکولوں، کالجوں، دفتروں اور بیرون ملک انگریزی زبان کا چرچا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے میں فارسی مروج تھی۔ لہذا آپ نے زیادہ فارسی کے ذریعے ہی دین کی اشاعت کا کام کیا۔

شاہ ولی اللہ کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں بڑا نورانی خاندان گنرا ہے آپ تمام مسلمانوں کے پیرو مرشد اور مربی تھے۔ برصغیر میں دینی تعلیم کا بیڑا آپ نے ہی اٹھایا۔ آپ وقت کے فقیہ تھے۔ ان لوگوں نے تعلیم کے مراکز اور مدارس

قائم کیے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنے والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ حج کے لیے حجاز مقدس گئے تو وہاں دو سال تک قیام کیا اور وہاں کے علمائے علمی استفادہ کیا۔ واپس آکر پھر درس و تدریس کے سلسلہ میں متہمک ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے لمبی عمر پائی ہے۔ آپ ساری عمر تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ فتویٰ بھی دیتے رہے۔ آپ نے سنت جہاد کو دوبارہ زندہ کیا اور بڑے بڑے مجاہد پیدا کئے۔ آپ کے زمانہ میں برصغیر میں انگلیزین کا حمل دخل ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے یہ تفسیر عزیزی لکھی۔ تفسیر عزیزی کے آخری دو پارے یعنی پارہ ۲۹ اور ۳۰ دو مختلف جلدوں میں ہیں۔ ابتداء میں سورۃ بقرہ کی نصف تک تفسیر لکھی تھی۔ کہ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور یہ کام وہیں رہ گیا۔ یہ عظیم تفسیر حکیمانہ فہم کے ساتھ لکھی گئی ہے جس میں اسلام کے حقائق کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ قرآن پاک کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اس وقت اس تفسیر کی صرف تین جلدیں موجود ہیں۔ تاہم یہ کمال درجہ کی چیز ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

طواف سعی

امام ابن جریرؒ نے مفسر قرآن حضرت قتادہؒ سے روایت نقل کی ہے۔ کہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے کہ صفا مروہ کی سعی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کی میراث ہے۔ اُن سے یہ چیز بطور وراثت نقل ہوتی چلی آ رہی ہے حضرت ہاجرہؓ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ائمہ المؤمنین حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف، صفا مروہ کی سعی اور رمی جمار اللہ کے ذکر کے اقامت کے لیے ہے۔ طواف کو بجائے خود نماز کی مانند ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلَاةِ یعنی بیت اللہ شریف

کے گہر و طواف کرنا نماز کی مثل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نماز کے دوران گفتگو کی قطعاً اجازت نہیں جب کہ طواف کے دوران حسب ضرورت بات چیت کی جاسکتی ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ کلام سے اجتناب کرے اور اللہ کے ذکر میں منہمک رہے۔ ذکر الہی کے لیے مختلف کلمات موجود ہیں۔ حضرت لاہوریؒ کے بڑے فرزند مولانا حبیب اللہؒ طواف کے ساتھ چکمدل میں پورا قرآن پاک ختم کر لیتے تھے۔ اللہ نے اس قدر توسیع بخشی تھی۔ آپ بڑے ہی عبادت گزار تھے۔ طواف میں دو تین گھنٹے صرف کرتے تھے۔ اور شدید تہین گہمی میں بھی طواف کرتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حج کے لیے آتے تو صفا و مروہ کے درمیان بیک پکاتے ہوئے دوڑتے اور اللہ کی طرف سے بھی بیک بخدی کی آواز سنتے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے کہ تمہاری پکار یہ میں بھی موجود ہوں۔ سعی کے دوران پڑھی جانے والی مشہور دعا رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یعنی اے اللہ معاف فرما دے اور رحم فرما۔ تو عزت والا اور بڑے کرم والا ہے۔ اس کے علاوہ سعی کی اور بھی دعائیں منقول ہیں جن میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے۔ اس کے علاوہ ایمان پر ثابت قدمی کی دعا ہے۔ یعنی اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ كَمَا هَكَذَا نَبِيٌّ لِلدِّيمَانِ أَنْ لَا تُنْزِعَ مِنِّي حَتَّى تُؤَفِّيَنِي عَلَى ذَلِكَ۔ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے ایمان اور اسلام کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اسے مجھ سے نہ چھیننا یہاں تک میری موت آجائے۔

صفا و مروہ کی سعی کی حیثیت کے متعلق مختلف آراء ہیں مشہور روایت یہ ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک سعی سنت ہے البتہ امام شافعیؒ اسے رکن کہتے ہیں۔ اگرچہ حج میں سعی نہیں کی تو حج نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اسے واجب کہتے ہیں

اگر سعی نہ ہو سکے تو دوم دینا پڑے گا۔ جس سے اس کی تلافی ہو جائے گی واجب بھی بہت بڑا درجہ ہے۔ فرض کے بعد اسی کا منبر ہے۔ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اَيُّهَا النَّاسُ اسْعَوْا لِيْ كُوْنُوْا صَفَا و مَرُوْهَ كَے درمیان سعی کرو اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَیْكُمْ الْمَسْعٰی اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو ضروری قرار دیا ہے حضور علیہ السلام جب سعی کے لیے تشریف لاتے تو فرماتے اَبْدَأْ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ تَعَالٰی میں وہیں سے شروع کر تا ہوں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے ابتداء فرمائی ہے یعنی صفا سے۔ کیونکہ آیت زیر درس میں اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَرِیَا گِیَا ہے گویا صفا سے ابتداء کی گئی ہے۔ الغرض! حضور علیہ السلام سعی صفا سے شروع کر کے مروہ پر ختم کرتے تھے اپنی یہ سنت مبارکہ آج تک جاری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جسے محبوب سے محبت ہوتی ہے اسے اس کے متعلق سے بھی محبت ہوتی ہے حج کے تمام شعائر منیٰ، عرفات، قربانی وغیرہ محبوب کے متعلقات ہیں۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگنیں ہوتی ہے۔ تو پھر وہ اس کے شعائر سے بھی محبت کرے گا ان کی تعظیم کرے گا۔ صبر اور شکر ادا کرے گا، یہی چیزیں تہذیب نفس کے حصول کی علامتیں ہیں

چاہ زم زم کے اجر کا واقعہ مشہور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بے آب و گیاہ چاہ زم زم وادی میں حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ گئے۔ حقوڑی بہت کھجوریں اور چھپا گل میں پانی تھا۔ جب پانی ختم ہو گیا تو مالی صاحبہؑ نے ادھر ادھر پانی کی تلاش شروع کر دی آپ کبھی صفا پر جاتیں اور وہاں سے مایوس ہو کر مروہ پہاڑی پر پہنچ جاتیں کچھ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ جب آپ کی پریشانی انتہا کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت نامہ سے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنا پر زمین پر مارا، تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔ یہ بڑا متبرک پانی ہے فاسی نے تاریخ مکہ میں روایت بیان کی ہے کہ یہ پانی کوثر اور سلسبیل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ پانی کے اس چشمہ کو کئی حوادث بھی آئے مگر بالآخر

اُسے کنواں کی صورت حال ہو گئی۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ کئی دفعہ بند ہوا اور کھولا گیا اب اس کنواں سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ زائرین حرم خوب سیر ہو کر یہ پانی پیتے ہیں۔ اور جاتے وقت دنیا کے اکابر و اطراف میں یہ تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر آج تک اسکی آبپاشی جاری ہے۔ اور انشاء اللہ تاقیامت جاری رہے گی۔ اس کا ذائقہ بھی عام پانیوں سے مختلف ہے۔ یہ پانی بیک وقت دوا، شفا اور غذا کا قدرتی مجموعہ ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم کے لیے اس سے بہتر کوئی پانی دنیا بھر میں موجود نہیں ہے۔

صفا اور
دعوتِ توحید

صفا کی یہ وہی تاریخی پہاڑی ہے۔ جس پر چڑھ کر حضور علیہ السلام نے قریش کو دعوتِ توحید دی۔ عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا۔ کہ کسی سخت خطرے کے وقت بلند جگہ پر چڑھ کر وَاصْبِحَاہُ کا نعرہ لگاتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ دشمن آگیا ہے یا اور کوئی خطرہ ہے۔ لہذا سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفا پر چڑھ کر یہی نعرہ لگایا۔ قوم کے لوگ اکٹھے ہو گئے کہ کوئی خطرے کی بات ہوگی۔ جب سارے لوگ آگئے تو آپ نے فرمایا اگر میں تم سے یوں کہوں کہ صبح کے وقت اس پہاڑ کے پیچھے سے تمہارا دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا تم میری بات کو تسلیم کر لو گے۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا ہاں حَبْرَبْنَا عَلَیْكَ کَذِبًا ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ فرماتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ اے لوگو میں تم کو اس بات سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو میری بات مان لو فُوقُوا لَہُ اللّٰہُ اللّٰہُ کلمہ طیبہ کا اقرار کر لو، فلاح پا جاؤ گے۔ ان لوگوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب بھی تھے۔ وہ اس بات سے بڑے سینخ پا ہوئے اور کہا تَبَّالَکَ یَا مُحَمَّدُ اے محمد! آپ کے لیے ہلاکت ہو اَلْہٰذَا جَمَعْتَنَا کیا تو نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ کوئی خاص بات

ہوگی، مگر تو نے یہی ایسی بات بتادی۔

فتح مکہ کے روز بھی آپ اسی صفا پر کھڑے ہوئے اور فرمایا الْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَوَحَّدَهُ
یعنی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد فرمائی
اور اس وعدہ لاشریک نے اکیلے ہی ان سب کو شکست دی۔ یہاں پر اللہ کے
وعدے سے مراد وہی وعدہ ہے۔ جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو طرح طرح
کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ اور آپ کو مکہ میں رہنے نہیں دیتے تھے۔ تو اللہ
نے وعدہ فرمایا کہ یہ مکہ ایک دن فتح ہوگا اور یہ سب لوگ مغلوب ہو جائیں گے۔
بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ وہی ابراہیم
علیہ السلام جنہوں نے بت خانے کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔
مگر انہیں کے نام نہاد پیر و کاروں یعنی مشرکین مکہ نے اسی کعبہ شریف میں
جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کے سامنے بت تھے۔ اس کی دیواروں
پر بت تھے۔ چاہے زم زم کے پاس بت رکھے تھے۔ صفا اور مروہ پر بت موجود تھے۔
عزیزیکہ مشرکین نے ہر چیز کو بگاڑ دیا تھا۔ اور اس طرح خود خانہ کعبہ میں شرک کے ترکیب
ہو رہے تھے۔

مشہور روایت کے مطابق صفا اور مروہ پر جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں
سے آساف مرد کا بت تھا اور وہ صفا پہاڑی پر تھا اور نائلہ عورت کا بت تھا اور وہ
مروہ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ مرد و زن مشرک تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ میں برائی کا ارتکاب
کیا تھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پتھر کی صورت میں مسخ کر دیا۔ لوگوں نے
ان پتھروں کو اٹھا کر باہر رکھ دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ برائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے
وقت گزرنے کے ساتھ ان بتوں کی پوجا ہونے لگی اور یہ لوگوں کے معبود بن گئے پھر لوگوں
ان میں سے ایک کو صفا پر رکھ دیا اور دوسرے کو مروہ پر۔

جب اسلام کا دور آیا تو مسلمانوں کو صفا و مروہ کی سعی کرنے میں ہچکچاہٹ

بیت اللہ شریف
میں شرک

سعی قدیم
سنت ہے

محسوس ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ سعی شاید ان بتوں کی وجہ سے ہو۔ اُس دور میں اس سے ملتی جلتی اور بھی مثالیں موجود تھیں۔ مثلاً اوس اور خزرج قبیلہ کے لوگ جب حج کے لیے آتے تھے۔ تو منات نامی بہت کے نام پر احرامِ مدینہ سے باندھتے تھے یہ بہت کسی بزرگ کے نام سے موسوم تھا۔ اور سمندر کے کنارے مثل کے مقام پر پر رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے تھے مگر صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے نظریات اُس وقت موجود تھے۔

مسلمانوں کے اس شک کو دور کرنے کے لیے قرآن پاک نے فرمایا اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ صفا اور مروہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم سلسلہ سے منسلک ہیں۔ ان کے درمیان دوڑنا ان بتوں کی تعظیم کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ چنانچہ ان بتوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ خطہ غرب کے تمام بتوں کو توڑ دیا گیا۔ بیت اللہ شریف کو ان کی نجاست پاک و صاف کر دیا گیا۔ اور اس طرح مرکز اسلام سے ایک دفعہ پھر توحید کی صدا بلند ہونے لگی۔

اسی لیے فرمایا کہ صفا و مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ
اَوْ اعْتَمَرَ پس جو کوئی حج یا عمرہ کرے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اس پر کوئی حرج نہیں ہے اَنْ يَّطُوفَ بِهِمَا کہ ان دونوں کا طواف کرے سعی احکام حج میں سے ہے اور قدیم سنت ہے۔

فرمایا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا جَسَّ نَ غُشًی سے نیکی کا کام کیا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ تو اللہ تعالیٰ قدرتِ دان اور جاننے والا ہے۔ یاد رہے کہ شکر سے فاعل کا صیغہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا معنی قدرتِ دانی ہوتا ہے یعنی اللہ بڑا قدرتِ دان ہے۔ اگر معمولی سی نیکی بھی خلوص نیت سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی بڑے سے بڑا اجر عطا کرتا ہے اور علیم سے مراد یہ ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں حتیٰ کہ وہ انسان کی نیت اور باطنی ارادہ کو بھی جانتا ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شخصیت دوم (۶۳)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۵۹ تا ۱۶۳

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ
 بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۚ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ
 وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ۝۱۵۹ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا
 فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۱۶۰ إِنَّ
 الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ
 وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۱۶۱ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ
 عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝۱۶۲ وَاللَّهُ كُفَرًا لَهُ
 لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝۱۶۳

۵۰۳

ترجمہ: تحقیق وہ لوگ جو اُس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے واضح باتوں اور
 ہدایت کے ساتھ اتارا ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اُسے لوگوں کے لیے کتابیں بیان کر
 دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے
 والے بھی لعنت کرتے ہیں ۝۱۵۹ مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوایا۔
 اور انہوں نے بیان کیا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر میں رجوع کرتا ہوں۔ اور میں رجوع
 کرنے والا مہربان ہوں ۝۱۶۰ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسی
 حالت میں کہ وہ کفر کرنے والے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ فرشتوں اور
 لوگوں کی لعنت سب کی ۝۱۶۱ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے عذاب
 میں تخفیف نہیں کی جائیگی۔ اور نہ اُن کو مہلت دی جائیگی ۝۱۶۲ اور تمہارا معبود
 بدعتی ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ۝۱۶۳

کھانا حق

گزشتہ آیات میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول بیان ہو چکے ہیں۔ سابقہ درس میں منجملہ اُن کے تعظیم شعار اللہ کا ذکر تھا۔ تہذیب نفس کے جملہ مسائل جس بات پر متفرع ہوتے ہیں، وہ مسئلہ توحید ہے۔ اس درس میں اسی مسئلہ کو بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے پہلے مسئلہ کتمان حق کا بیان ہے۔ جیسا کہ گزشتہ دروس میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہودیوں میں کتمان حق کی بیماری بدرجہ اتم موجود تھی۔ پہلی آیات میں اچھا ہے وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یعنی اے اہل کتاب تم جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہو۔ اسی طرح تخیل قبلہ کے متعلق فرمایا یَعْرِفُونَ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ یعنی یہ لوگ اس حقیقت کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنی اولاد کو مگر اس کے باوجود انکار کرتے ہیں۔ یہ اُن کے کتمان حق کی واضح مثالیں ہیں یہ ظالم لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اس کی بجائے لوگوں کے سامنے غلط سلط باتیں بیان کرتے تھے تو رات میں رجم کا حکم موجود تھا۔ مگر یہودیوں نے اُسے چھپایا۔ اس کی تفصیل سورۃ مائدہ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ لَقَبِیْسُتُّکُمْ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ کہ تم لوگوں کے سامنے حقیقت حال کی پوری پوری وضاحت کرو گے اور اُسے چھپاؤ گے نہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا قَبْذُوهُ وَرَأَوْا ظُهُورِهِمْ ان لوگوں نے حقائق کو پس پشت ڈال دیا۔ کَاتِبُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ گویا کہ وہ بالکل نہیں جانتے۔

کھتانِ حق کی بیماری صرف یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے
یہاں پر عام قانون کے طور پر اعلان فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ یُكْفُرُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا
مِنْ الْبَیِّنَاتِ وَالْهُدٰی جَوَلَوْکَ بِهٰی اللہ تعالیٰ کی واضح باتوں اور ہدایت کو چھپاتے
ہیں مِنْ اَعْدٍ مَا بَدِیْتُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتَابِ بعد اس کے کہ ہم نے
اسے کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُہُمْ
اللّعٰنُوْنَ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔ اور دیگر لعنت کمنے

کتمانِ حق
کی سزا

والوں کی بھی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ میں تمام لوگ شامل ہیں جو اس آیت کے مصداق ہیں خواہ وہ کسی سابقہ امت سے ہوں یا نبی آخر الزمان کی موجودہ امت سے متعلق ہوں۔ ہر وہ شخص اس آیت کرمیہ کا نشانہ ہے۔ جو حق بات کو چھپاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے مَنْ سَئَلَ عِلْمًا جَسَّ مِنْهُ لُحْمًا یَوْمَ الْقِیَمَةِ یعنی جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا ہے۔ مثلاً کسی عقیدہ سے متعلق سوال ہے یا حلال و حرام کی وضاحت طلب کی گئی ہے فکتمک، تو صاحب علم شخص نے اُسے چھپا دیا۔ معاملہ کو ظاہر نہ کیا۔ یا اُس کی کماحقہ وضاحت نہ کی، وجہ خواہ کچھ بھی ہو اُسے کوئی نقصان کا خطرہ تھا یا اس کی مالی منفعت متاثر ہوتی تھی یا کوئی اور فاسد مقصد کار فرما تھا جس کی وجہ سے اس نے حق کو چھپا دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلْجِسمَ یَوْمَ الْقِیَمَةِ یَلْجِئُ مِنْ نَارٍ۔ قیامت کے دن اُسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ چونکہ دنیا میں اُس شخص نے اپنی زبان سے حق کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس لیے قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائیگی۔ اتنی سخت سزا دی جائیگی کہ اُس نے حق کو چھپایا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ہمارے دور کے عظیم مفسر قرآن ہوئے ہیں آپ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھ ماہ میں قرآن پاک سے کماحقہ واقف کرا دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا کیا تھا۔ حضرت مولانا لاہوری، مولانا سلطان محمود کھیلے والے حکیم فضل الرحمن وغیرہم نے آپ ہی سے قرآن پاک پڑھا تھا۔ آپ شیخ السنہ حضرت مولانا محمود الحسن کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ انگریزوں سے بہت خوفزدہ تھا۔ ہندوستان میں آپ کا داخلہ بند کر دیا تھا بلکہ سخت سزا رکھی تھی، لہذا آپ نے ۲۵ سال کا عرصہ جلاوطنی میں بسر کیا۔ آپ اپنے استاد محترم کا اشارہ پا کر کابل ہجرت کر گئے اور کابل کو انگریزوں کے پنجہ سے آزاد کر لیا۔ مگر انگریزوں نے وہاں بھی آپ کو جمنے نہیں دیا۔ اور آپ کو روس جانا پڑا۔ وہاں پر صرف ایک سال کا عرصہ گزارا۔ اس کے بعد آپ ترکی چلے گئے اور چار سال وہاں

قیام کیا۔ آپ نے ترکوں کو خواب غفلت سے جگایا اور انہیں باور کرایا کہ تم بے دینی کی آغوش میں جا رہے ہو۔ قرآن پاک کی چند سورتوں کا مطلب سمجھ لو تو بے دینی سے بچ جاؤ گے۔ مگر ان لوگوں نے آپ کی دعوت کا خاطر خواہ جواب نہ دیا، لہذا آپ ترک کی سے حجاز مقدس چلے گئے۔ آپ بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ انگریز آپ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہاں بھی آپ کی جاسوسی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ طواف کے دوران آپ نے دیکھا کہ جاسوس آپ کے پیچھے پیچھے آرہا ہے آپ نے اسے پہچان لیا اور سخت ڈانٹ پلائی۔ فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہو۔ خدا کا خوف کرو، کم از کم حرم پاک کا ہی احترام کرو۔ آپ زبردست انقلابی ذہن کے مالک تھے اسی لیے تو انگریز آپ سے ڈرتا تھا۔ آپ نے قیام پاکستان سے تین سال قبل وفات پائی۔ آپ نے زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا کہ میں نے انگریز کی جڑوں کو ہندوستان سے اکھاڑ دیا ہے اگر یہ چند سال کے اندر اندر اس ملک سے نہ بھاگا تو میری قبر پر آکر لات مارنا اور کہنا کہ عبید اللہ نے جھوٹ بولا۔ چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور انگریز تین سال کے اندر اندر ہندوستان کو خیر باد کہ گیا۔

کسی زمانہ میں برطانیہ، ہرطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس پر کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ مقصد یہ کہ اس سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ کسی نہ کسی حصے پر سورج موجود ہوتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ سب کمزور تھے۔ مگر اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ نے اتنی بڑی حکومت چھین لی اور اب یہ اپنے اصل ملک میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ تو یہی وہ انگریز تھا جس نے مولانا عبید اللہ سندھی کو جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا دینی طور پر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے آپ خود فرماتے ہیں کہ قبول اسلام کے بعد ہم نے اٹھارہ سال تک شیخ الہند مولانا محمد الحسن کی خدمت میں رہ کر سیاست بھی سیکھی ہے اور دین بھی حاصل کیا ہے۔ آپ

امام شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے بڑے ماہر تھے۔ نہایت نیک سیرت انسان تھے۔
 نو مسلم ہو کر اتنا شعور حاصل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔ جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ
 آٹھ دس میل کا سفر پیدل طے کر کے نماز جمعہ کیلئے آتے تھے۔ جب کہ یہ نہیں ہونا
 تھا پیدل ہی چل جیتے۔ ایک دفعہ ملتان کے لیے سفر شروع کیا۔ منظر گڑھ کے ریلوے
 سٹیشن پہنچے تو پاس صرف اتنے ہی پیسے تھے۔ جس سے ملتان کے لیے ٹکٹ
 خرید لیا۔ اتنے میں ایک اور مسافر نے سوال کیا کہ سخت لاچار ہوں، ملتان جاننا ہے
 مگر ٹکٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ نے خریدا ہوا ٹکٹ اس سائل کو دیدیا اور
 خود پیدل ہی ملتان کے لیے چل دیے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ آخر میں اشتراکی ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے
 البتہ آپ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں اشتراکیت کے
 سخت خلاف لکھا ہے۔ کیونکہ اس دور میں اسلامی نظام سے ٹکڑے لینے والا اشتراکی
 نظام ہی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اشتراکی نظام کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔
 ایک وقت ضرور آئے گا جب انہیں قرآنی پروگرام کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔
 اسلامی پروگرام سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ملیگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو بھی قوم قرآنی
 پروگرام سے اعراض کرے گی وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔ نہ دینی اعتبار سے کامیاب
 ہو سکتی ہے اور نہ ہی دنیوی لحاظ سے درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔

یہی مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ جنہوں نے آیات زید درس کے متعلق
 فرمایا کہ میں ان آیات سے یہ اصول اخذ کرتا ہوں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیئے
 تاکہ تعلیم حاصل کر کے ترقی کی منازل طے کی جاسکیں، یورپی ممالک میں جہاں دنیوی
 تعلیم جبری ہے۔ وہاں مرد و زن کسی کو تعلیم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا۔ سب
 کو لازماً تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اقوام دنیوی اعتبار سے ترقی
 یافتہ ہیں۔ مگر کہہ لیں ہاں تعلیم پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ دینی تعلیم
 تو ویسے ہی بالکل کمزور ہے۔ صرف ایک دو فیصد لوگ ہی دینی تعلیم حاصل

تعلیم کی
 اہمیت

کرتے ہیں، دنیوی طور پر بھی ہمارے پاس فیصد لوگ گنتی تک نہیں جانتے۔ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور نہ ہی حساب کے کچھ واقفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسلمان حصول تعلیم کے اصول پر عمل پیرا تھے، اور ترقی کی منازل بھی طے کرتے تھے۔ لہذا لازم ہے کہ کسی مرد اور عورت کو ضروریات دین کی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیے۔

اس مقام پر کتمان حق کے متعلق یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جس قوم کے پاس باہم عروج تک پہنچانے والی تعلیم موجود ہو، وہ اُسے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی بجائے اُسے چھپائے تو ایسا شخص لعنت کا مستحق نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اس وقت دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے۔ جرائم کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس وہ تعلیم اور وہ پروگرام موجود ہے جس سے جرائم کی سیخ کنی ہو سکتی ہے۔

فہمی ترقی ہو سکتی ہے اور جس سے تہذیب الاخلاق پیدا ہو سکتا ہے مگر ہم اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ سخت ضرورت کے باوجود جب اس تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا تو اس کا وبال لعنت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لیے مولانا عبد اللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ ضروریات دین میں سے سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے۔ اُسے جبری طور پر نافذ کرنا چاہیے۔

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں یعنی بینات اور ہدایت کا ذکر کر کے فرمایا کہ جو لوگ ان دو چیزوں کو چھپاتے ہیں، وہ اللہ اور لوگوں کی لعنت کے سزاوار ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بینات سے مراد وہ واضح باتیں ہیں جو معمولی توجہ سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی نعمتوں کا شکریہ اور صبر وغیرہ شامل ہیں اور ہدایت سے مراد ایسی باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے استاد کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی چیزیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں ان میں شعاۃ اللہ کی تعظیم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان تمام

بینات اور
ہدایت

چیزوں کو ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص انہیں چھپانے کی کوشش کرے گا، تو وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

کتمان حق کی بیماری مسلمانوں کے لیے بھی ویسی ہی خطرناک ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کے لیے مہلک ہے۔ اہل کتاب نے کتاب اللہ سے اعراض کیا، اور دیگر خرافات میں لگ گئے لہذا ناکام ہوئے۔ اِدھر بھی یہی حال ہے مسلمانوں نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ٹوٹنے ٹوٹکوں، بدعات اور شرک پر گزارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

معانی کا پرانہ

فرمایا لعنت کی اس تعزیر سے وہی بچ سکیں گے اَلَّذِينَ تَابُوا جُہنوں نے توبہ کر لی، وَاصْلَحُوا اپنے آپ کی اصلاح کر لی۔ یعنی خود کو سنوار لیا۔ سابقہ فرائض و حقوق ادا کئے اور آئندہ کے لیے مستعد ہونے کا عہد کیا وَبَيَّنُّوا اور جس چیز کو چھپا ہے تھے اُسے واضح طور پر بیان کر دیا۔ فسر مایا فَاُولَٰئِكَ اَتُوبُ عَلَيْهِمْ میں ایسے ہی لوگوں پر رجوع کرتا ہوں۔ وَاَنَا التَّوَابُ الرَّحِيمُ اور میں رجوع کرنے والا مہربان ہوں۔ مطلب یہ کہ جب کوئی شخص سابقہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر راہِ راست پر آجائے تو میں اس کی تمام سابقہ لغزشیں معاف کر دیتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر معاف کرنے والا رحیم و کریم اور کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ میں کفر و شرک جیسے اکبر الکبائر کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔

لعنت کے مستحقین

فرمایا اس کے برخلاف اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جُہنوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کا انکار کر دیا۔ اور پھر اسی حالت میں وَمَاتُوا اُن کو موت آگئی وَهُمْ كُفَّارٌ اور وہ کافر ہی ہے۔ اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس لعنت میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ اُن کے لیے تخفیف عذاب کا بھی کوئی

امکان نہیں وَلَآ هُمْ يُنْظَرُونَ اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملیگی۔ مقصد یہ کہ جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر جائیں گے وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ نہ تو ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی اس عذاب کو کچھ دیر کے لیے مؤخر کر کے انہیں مہلت دی جائے گی۔ لعنت کا عذاب اس قدر سخت ہوگا۔

مسئلہ لعنت کے متعلق مفسرین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ کسی پر لعنت نہیں کرنی چاہیے سوائے اس کے کہ یہ ثابت ہو جائے۔ اُس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے۔ کسی کافر پر بھی اس کی زندگی میں لعنت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ موت پہلے نائب ہو جائے۔ ابلیس پر لعنت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اُس کا کفر معلوم ہے۔ اس کے علاوہ برائی پر لعنت درست ہے، جیسا کہ صحابہ کرام کو بڑا بھلا کئے والوں کے متعلق فرمایا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى شَرِّكُمْ مَثَلُ شَرِّهِ خَدَا کی لعنت یا مثلاً بُرَا کام کرنے والے پر لعنت ہے لَعْنَةُ اللَّهِ — السَّارِقُ یعنی چور پر اللہ کی لعنت ہو۔ یا لَعْنَةُ اللَّهِ — مَنْ سَبَّ وَالِدَيْهِ اپنے ماں باپ کو گالی دیتے والے پر خدا کی لعنت ہو۔ اسی طرح فرمایا لَعْنَةُ اللَّهِ مَنْ خَيَّرَ مَنَارَ الْأَرْضِ مُشْتَرِكِ زَمِينِ کے نشانات مٹانے والے پر اللہ کی لعنت ہو۔ لَعْنَةُ اللَّهِ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ غَيْرَ اللَّهِ کے تقرب کے لیے ذبح کر کے نیوالے پر اللہ کی لعنت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَلِلَّهِ كُفْرُ اللَّهِ وَالْحِدْجُ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ کوئی اور معبود حق نہیں ہے۔ لہذا عبادت صرف اُسی کی کر دو، کفر و شرک سے باز آ جاؤ۔ لفظ اللہ میں محبت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور اس کا معنی فریفتہ ہونا بھی ہے۔ اس لیے اللہ کا معنی اولہر یا بھی کیا جاتا ہے۔ شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی نے اس کا ہندی ترجمہ من مومن بھی کیا ہے۔ غرضیکہ لفظ اللہ میں محبت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور محبوب حقیقی خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا اس کی وحدانیت پر ایمان لانا چاہیے اور خالص اسی کی عبادت کرنی چاہیے اس کے سوا کسی چیز کو شریک نہیں بنانا

معبود صرف
ایک ہے

چاہیے۔ یہ تمام مسائل کی بنیاد ہے۔ اگر تہذیب اخلاق اس بنیاد پر قائم ہوگا، تو درست ہوگا، ورنہ نہیں۔ لہذا معبود وہ ہو سکتا ہے۔ جو مختار کل، قادر مطلق، علیم و خیر نافع اور ضار ہو، جو مشکل کشائی کرے تو والا ہو۔ ہمہ بین، ہمہ دان اور ہمہ توان ہو، وہ جو چاہے کرے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اور جن کے حکم کو کوئی ٹال نہ سکے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور وہ ایسا معبود ہے الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ جو رحمن اور رحیم ہے۔ رحمن سے مراد بے حد مہربان ہے اس کا بڑا فیضان ہے اور رحیم سے مراد خصوصی رحمت کرنے والا ہے، اہل ایمان کے لیے خصوصی رحمت کا اظہار قیامت کے روز ہوگا۔

اہم شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ رحمن و رحیم کا تعلق تجلی عظم سے ہے۔ جیسے
الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی یعنی رحمن کی تجلی عرش پر بیٹھتی ہے۔ اور
جب شخص کا تعلق اس تجلی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ کامیابی کی منزل پالیتا ہے۔
اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تہذیب اخلاق یا تعظیم شعار اللہ کا واحد
مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

یہ بڑی اہم آیت ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ان دو آیتوں میں اسمِ عظیم ہے یعنی وَلِلّٰهِ الْاَلْوَاحُ وَالْجَبَابِہُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۔ اور اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اسمِ عظیم اللہ جل جلالہ کا وہ اسم پاک ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اُسے پکارا جائے تو وہ بندے کی دعا کو سنتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و سہ (۶۳)

الْبُقْرَةِ ۲

آیت ۱۶۴

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۖ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

فقہاء و شیک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے
اختلاف میں، اور کشتیوں میں جو لیکر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے فائدہ کی چیزیں اور جو پانی
اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے اتار رہے تھے جس کے ذریعے زمین کو خشک ہو جانے کے بعد
دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور اس زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے ہیں۔ اور ہواؤں کے
پھیرنے میں، اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان سفر کیے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں
میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں ﴿۱۶۴﴾

گزشتہ سے
پیوستہ

پہلے خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت اور قبلہ ہونے کا بیان ہوا۔ اس کے بعد ملت
اسلام کے اہم ترین اصول یعنی ذکر اللہ، شکر اللہ، صبر اور تعظیم شعار اللہ کا ذکر ہوا۔ پھر
کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے، ان لوگوں
پر وبال کا ذکر کیا۔ جو تعلیم کو چھپاتے ہیں۔ اور پھر آخر میں ان تمام چیزوں کی بنیاد
توحید الہیہ کا ذکر کیا۔ ﴿وَاللَّهُ وَاحِدٌ﴾ کا بیان ہوا۔ اور پھر آگے توحید کے دلائل کے
طور پر دس چیزوں کا ذکر فرمایا ہے

تہذیب الاخلاق کے بعد سوسائٹی کا دوسرا اہم مسئلہ کسب معاش ہے۔
یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ گزر اوقات

کسب معاش

کے لیے معاش کا کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے، اس سے کوئی انسان لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں اپنا ناسب مقرر کیا۔ اور تمہارے لیے معیشت کے مختلف سامان پیدا کیے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث پاک میں بھی آیا ہے کہ رزق حلال کی طلب فَرِيضَةٌ مِّنْ بَعْدِ الْفَرَائِضِ اللہ کے مقرر کردہ فرائض کے بعد یہ بھی ایک فریضہ ہے اور چونکہ وسائل معاش اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ رزق حلال کی تلاش کے ساتھ ساتھ عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ" روزی اللہ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی رزاق ہے اور نہ کوئی معبود ہے۔ آیت زیر در کس میں اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر کیا ہے جنہیں اللہ نے وسائل معاش بنایا ہے۔ اور انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ جب اللہ جل جلالہ نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے ہیں کہ جن کے بغیر تمہاری گذراوقات ہی ممکن نہیں، بلکہ زندگی کا دار و مدار ہی ان چیزوں پر ہے تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کیسے معبود بناتے ہو وسائل معاش کے ان انعامات میں تمہارے لیے تو حید الہی کے واضح دلائل موجود ہیں

آسمانی کُتُبے

اس آیت میں بیان کردہ دس احسانات میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تخلیق آسمان کا ذکر فرمایا "إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ یعنی آسمانوں کو پیدا کرنے میں صاحب عقل لوگوں کے لیے واضح نشانات موجود ہیں۔ تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احسانات جملائے ہیں جو آسمان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں وہ تمام کمرے شامل ہیں جو آسمان کی فضاؤں میں موجود ہیں اور باقاعدہ گردش کر رہے ہیں۔ پورا نظام شمسی جس سے کہہ ارض والے مستفید ہو رہے ہیں۔ آسمانی نظام کا ایک حصہ ہے۔ آسمانی کمروں میں سورج، چاند اور زمین بڑے اہم کمرے ہیں۔ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

نہ صرف انہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ انہیں ایک خاص رفتار سے گردش میں لاکر نسل انسانی کی تمام ضروریات زندگی فراہم کر دہی ہیں۔ نوع انسانی کے لیے روشنی اور حرارت سورج کی مرہونِ منت ہے۔ اگر انسان کو یہ چیزیں میسر نہ ہوں۔ تو نہ کوئی کام ہو سکے اور نہ خوراک کے لیے غلہ، سبزیاں اور پھل پک سکیں۔ اور پھر یہ ہے کہ سورج ۳۶۵ دن میں ایک خاص رفتار سے اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ جس سے موسموں کا تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان گرم، سرد، بہار اور خزاں ہر موسم سے مستفید ہوتا ہے۔ پورے چوبیس گھنٹے کا چکر بھی دن اور رات کی تخلیق کا باعث ہے جسکی وجہ سے انسان کی روزمرہ زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج اور چاند زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے بلکہ زمین ان کے گرد چکر لگاتی ہے اور خود بھی اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ تاہم جس طریقہ سے بھی ہے آسمانی کمروں کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر انسان پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا انحصار اس نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔

زمین کے بعد چاند اپنی منزل ۲۸ یا ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ بعض سیارے دو سال میں اپنا چکر پورا کرتے ہیں۔ ماہرینِ فلکیات کا کہنا ہے کہ ثابت سیارے ایسے ہیں جو اپنا چکر ۳۵ یا ۳۶ ہزار سال میں مکمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کے متعلق خاص طور پر فرمایا کہ یہ ضیا ہے۔ اسی طرح چاند کی دھیمی دھیمی روشنی کے ذریعے اللہ تعالیٰ پھلوں میں رس پیدا فرماتے ہیں۔ اسی طرح سمندر کے درجہ سبز کا تعلق بھی چاند کے بڑھنے گھٹنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آسمانی کا ذکر کر کے اس سے وابستہ نظام اور اس سے انسانی مقام بیان فرمایا ہے۔

ان فی تخلیق السموات والارض میں اللہ تعالیٰ نے جس دو کمرہ احسان کا ذکر کیا ہے وہ تخلیقِ زمین ہے۔ زمین کے ساتھ انسانی زندگی کی بقا کس حد تک وابستہ ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز زمین سے پیدا

ہوتی ہے۔ غلہ، سبزی، پھل، نباتات، ہر چیز کا منبع زمین ہے۔ انسانی زندگی کی اہم ترین چیز پانی بھی زمین کے کھونے سے نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ معدنیات کے وسیع ذخائر مثلاً سونا، چاندی، کوئلہ، تانبہ، نمک، گندھک، تیل وغیرہ سب زمین کی پیداوار ہیں۔ لوسہ کا تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر قرآن پاک میں تذکرہ کیا ہے "وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ" ہم نے بے حد زور والا لوہا پیدا کیا۔ اس میں لوگوں کے لیے بڑے بڑے فائدے لکھے ہیں۔ اس زمانے کو تو لوسہ کا زمانہ (ARON AGE) بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھ لیجئے آج کی دنیا میں لوہا کتنا اہم عنصر ہے۔ ریل، موٹر، جہاز بحری ہو یا ہوائی، چھوٹے چھوٹے اوزار سے لے کر بڑی بڑی مشینری تک تمام کے تمام لوسہ کے محتاج ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ذخائر بھی زمین ہی میں لکھے ہیں۔ اس کو کالم میں لانے کے لیے اسے نرم کر نیکی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ایندھن بھی کوئلے کی صورت میں زمین ہی سے پیدا کیا ہے۔

قرآن پاک میں پہاڑوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ بھی انسانی زندگی کے بہت سے مفاد وابستہ ہیں۔ جن میں پتھر، چٹان، جڑی بوٹیاں اور معدنیات شامل ہیں۔ اور یہ پہاڑ بھی اللہ تعالیٰ نے زمین پر ہی پیدا کیے ہیں۔ کہیں فرمایا "جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ" زمین میں بوجھل پہاڑ جگہ جگہ رکھ دیے کہیں فرمایا۔ "وَالْجِبَالِ أَوْتَادًا" پہاڑوں کو زمین میں مسخوں کی طرح گاڑ دیا۔ الغرض پہاڑ بھی زمین ہی کا حصہ ہیں اور زمین ہی سے تمام ضروریات زندگی وابستہ ہیں اور بالآخر مرنے کے بعد زمین ہی اسے اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

رات اور
دن کا تغیر

شب و روز کے تغیر و تبدل کے متعلق فرمایا۔ "وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" یعنی دن رات کے تغیر میں بھی قدرت الہی کے واضح نشانات موجود ہیں۔ عقلمند لوگ سمجھتے ہیں کہ دن رات کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کس قدر منفعت رکھی ہے۔ دن کے وقت انسان کام کاج کر کے اپنی

روزی پیدا کرتا ہے۔ اور پھر جب دن بھر کے کام سے تھک جاتا ہے تو آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے آرام کے لیے رات بنادی تاکہ وہ آرام و سکون حاصل کر کے اگلے دن کی مشقت کے لیے پھر سے کمر بستہ ہو جائے اگر ہمیشہ دن ہی رہتا یا ہمیشہ رات ہی چھپائی رہتی تو گزراوقات میں کس قدر مشکلات آتیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا ذرا دیکھو تو سہی اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ اللَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاۡتِیْكُمْ بِضِیَاقٍ اَکْثَرٍ اِذَا لَمْ تَرَ اِلَّا السَّمَاءَ وَہَا سَحَابٌ مِّمَّنْ لَّیْسَ بِہَا فَاۡیَۃٌ لِّمَنْ یَّزِیُّہُ ۚ اِنَّ اللّٰہَ لَیَّ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے دن ہی قائم رکھتا، تو تمہارے سکون و آرام کے لیے رات کو کون لاسکتا تھا۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں اختلاف پیدا کر کے انسان پر احسان عظیم کیا ہے

بحری جہاز

اس کے بعد فرمایا وَالْفُلَّکِ الَّتِیْ تُجَسِّرُ فِی الْبَحْرِ دریا اور سمندر میں چلنے والی کشتیاں اور جہاز بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں یہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن میں عقل و شعور رکھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ دریائی اور سمندری راستے زمانہ قدیم سے نقل و حمل کے معروف راستے ہیں۔ جہاں جہاں دنیا نے ترقی کی ہے۔ ان ذرائع میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ بادبانی کشتیوں کی جگہ بڑے بڑے مال بردار جہاز معرض وجود میں آئے ہیں۔ جن کے ذریعے لاکھوں ٹن مال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ خشکی اور ہوائی ذرائع کی نسبت بحری ذرائع سے نقل و حمل آج بھی سستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک کونے میں پیدا ہونے والی چیز دنیا کے دوسرے کونے تک باسانی پہنچ رہی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کشتی نوح کا ذکر کر کے اسے ہمیشہ کے لیے نمونہ بنا دیا ہے

لاکھوں ٹن وزنی بحری جہاز جدید ٹیکنالوجی اور علم ریاضی کے مرمون منت ہیں مگر ان فنون کی حقیقی ایجاد دراصل حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی انکو اخنوخ کہا گیا ہے تفسیر مہرکِ ولے نے لکھا ہے کہ قلم کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا، کپڑے سینے کا ہنر اور مٹینری بھی ان کے ہاتھوں سے ایجاد ہوئی۔

ستاروں سے متعلق معلومات، علم حساب اور ناپ تول کے اوزان بھی انہوں نے رائج کیے مختلف مواقع پر استعمال ہونے والا اسلحہ بھی حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ظہور میں آیا۔

پانی کا نزول

نشاناتِ قدرت ہی کے بیان میں فرمایا وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ أَوْ يَرِيهِ اللَّهُ تَعَالَى کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے فَكَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا جس کے ذریعے مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ انسان اور جانوروں کے لیے خوراک کی پیداوار کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ آسمان سے نازل آب سے مراد بارش ہے۔ قرآن پاک میں بار بار آتا ہے کہ دیکھو ہم کس طرح بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ چلاتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے خشک زمین پر بارش برسالتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم کھیتیاں اُگاتے ہیں اور تمہارے جانوروں کے لیے خوراک بنتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کھیتی باڑی کا کام جدید طرز پر ہونے لگا ہے۔ آلاتِ زراعت میں ترقی ہوئی ہے۔ ذرائع آبپاشی کی سہولتیں میسر آئی ہیں۔ نئی قسم کی کھادیں دریافت ہوئی ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی معیشت سے متعلق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں عقل مند لوگوں کے لیے واضح نشانات ہیں۔

جانوروں کی نسل کشی

نمزل آب کے بعد فرمایا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ یہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل میں سے ہے کہ اُس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلادیے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے اتنے جانور پیدا فرمائے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی زندگی کا جانوروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے خصوصاً وہ مویشی جن کا گوشت، دودھ، کھال اور ہڈیاں لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں انسانی معیشت میں بڑا عمل دخل ہے اونٹ گائے، بھینس، بھیر بکریاں، نہ صرف دودھ مہیا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ انسانی خوراک کا بھی حصہ ہیں۔ اسی طرح گھوڑے، اونٹ اور گدھے وغیرہ بار برداری

اور سواری کے کام آتے ہیں۔ مرغ، بیڑ، اور مچھلی خوراک کا حصہ ہیں۔ مرغی کے انڈے انسانی خوراک کا اہم جزو ہیں۔ شکاری جانور بھی انسان کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔ اب تو صید الحیوانات ایک مستقل سلسلہ اور پیشہ بن گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسباب معاش میں داخل ہیں اور اللہ نے انہیں نشانات قدرت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اور نشانی ہوا کا ذکر ہے۔ فرمایا وَتَصْرِيفِ

ہواؤں کی گردش

الْوَيْحِ ہواؤں کی گردش بھی صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانِ راہ ہے۔ ہر ذی جان کے لیے ہوا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان و حیوان چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہوا ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے، کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے۔ کبھی اس کا رخ شمالاً جنوباً ہوتا ہے۔ جو انسانوں اور جانوروں کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ جب ہوا کی گردش رک جاتی ہے۔ تو لوگ گرمی میں تڑپ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہوا کے ذریعے بادبانی کشتیاں چلتی تھیں، اسی کے ذریعے لوگ بھوسے سے غلہ علیحدہ کرتے تھے۔ ہوا ہی بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کا باعث بنتی ہے اور دُور دُور تک بارش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر ہوا کا قانون بھی انسان کو سمجھایا۔ پانی سے بھاپ بنتی ہے جس سے ریل گاڑیاں چلتی ہیں اور ملکوں میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ بڑھنی سے بڑھی مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ذریعے انسانی مفاد کی بے شمار چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ دغانی جہاز بھی بھاپ سے چلتے ہیں۔ یہ سب تسخیر ہوا کے کمرے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تیز ہوا یعنی آندھی کے وقت کے لیے دعا سکھائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِهَا وَخَيْرِ مَا فِيْهَا اے اللہ میں ہوا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی خیر مانگتا ہوں۔ وَاعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اور میں تیری ذات

کیساتھ ہوا کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ دوسری جگہ فرمایا **اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رِيحًا وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا** اے اللہ! ہو کہ وہ ریح یعنی خوشگوار بنا اور اس کو ریح یعنی عذاب نہ بنا۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں لفظ ریح استعمال ہوا ہے تو وہاں سزا کا ذکر ہے۔ جیسے فرمایا کہ ہم نے قوم عاد پر پانچ قسم کی ہوا بھیجی **إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ** یہی ہوا بعض اوقات بڑی نرم اور خوشگوار ہوتی ہے۔ فرمایا **نُصْرَتٌ بِالصَّبَا** میری مشرق سے چلنے والی خوشگوار ہوا سے مدد کی گئی ہے۔ اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی ہے۔ اسی تند و تیز ہوا نے غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے خیمے اکھاڑ دیے، سامان درہم برہم کر دیا اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اسی طرح قوم عاد مغرب کی طرف سے چلنے والی گرم ہوا کا شکار ہوئی اور تباہ و برباد ہو گئی **وَأَمَّا عَادُ فَاهْلَكُوهَا** یہ صریح عاتبہ تو بہر حال ہواؤں کا چلنا بھی نشانات قدرت میں سے ہے اور عقلمند لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔

فرمایا **وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ** زمین و آسمان کے درمیان تسخیر شدہ بادل بھی **لَا يَتْلُونَ** صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانات ہیں۔ بادلوں کی تسخیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے، ان سے کام لیتا ہے جس رُخ پر چاہے انہیں موڑ دیتا ہے۔ اور جہاں اسکی مشیت ہوتی ہے۔ ان سے بارش برسا دیتا ہے۔ جس سے فصلوں میں بہار آجاتی ہے۔ کھیتیاں ہری بھری ہو جاتی ہیں، مگر جب انہیں بادلوں سے وافر پانی بہا دیا جاتا ہے۔ تو بڑے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ تو انہی سے اس تسخیر سے اونے برسنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصلیں کوڑے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ لہذا یہ بھی نشانات قدرت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سفید، سیاہ اور سرخ بادلوں کے ذریعے

اپنی منشاء کے مطابق مختلف قسم کے کام لیتا ہے

یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسکی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ یہ تمام چیزیں ممکنات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنے جسم، مفاد، اغراض اور ہمتوں میں خود محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسباب معاش بھی سمجھائیے۔ یہ تمام چیزیں اس کی قدرت کے نشان ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو صاحب عقل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں۔ مگر جو لوگ غور و فکر کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انہیں قدرت کے یہ بڑے بڑے نشان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا یَسْرُونَ عَلَيْكُمْ وَأَهْمُ عَنْهُمْ مَعْصُوتُونَ کہ لوگ اللہ کی نشانیوں سے گزر جاتے ہیں مگر وہ اُن سے غافل رہتے ہیں۔ قدرت کی دلیلیں اُن پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اَلْهٰكُمْ بِاللّٰهِ وَاجِدُ پر یہاں دس دلائل بیان فرمائے ہیں اور ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی کہ تہذیب اخلاق کے بعد دوسرا مسئلہ کسب معاش کا آتا ہے۔ اور معاش کے تمام اسباب خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں لہذا عبادت بھی صرف اُنہی کی کرنی چاہیے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و چہار (۶۴)

آیت ۱۶۵ تا ۱۶۷

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ
 كَحُبِّ اللَّهِ ط وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ط وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ
 ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ لَا أَنَّهُ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۖ وَأَنَّ
 اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝۱۶۵ اذ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ
 اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝۱۶۶
 وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا كُنَّا نَدْرِكُهُ فَنُتَبَرَّأُ مِنْهُمْ كَمَا
 تَبَرَّءُوا مِنَّا ط كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ
 عَلَيْهِمْ ط وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝۱۶۷

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدا کا شریک بناتے
 ہیں۔ ان سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہیے اور جو
 ایمان دار ہیں وہ اللہ کے لیے محبت میں زیادہ شدید ہیں اور اگر دیکھیں وہ لوگ
 جہنوں نے ظلم کیا جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ بیشک ساری قوت اللہ ہی
 کے لیے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے ۝۱۶۵ جب کہ پیروار ہو جائیں گے
 وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جہنوں نے پیروی کی اور وہ عذاب
 کو دیکھ لیں گے اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے ۝۱۶۶ اور وہ لوگ
 جہنوں نے پیروی کی کہیں گے کہ کاش اگر ہم سے

یہ دنیا میں پلٹنا ممکن ہو تو ہم بھی ان کی پیروی کا اعلان کریں۔ جیسا کہ یہ آج ہم سے
 پیڑا ہوئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دکھلائے گا ان کو ان کے اعمال حسرت
 دلانے کے لیے اور وہ دوزخ کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے ۝۱۶۷

گذشتہ آیات کرمیہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر فرمایا جو اسباب
مغیشت کی صورت میں بنی نوع انسان پر کیے۔ اس احسان کا تقاضا یہ تھا کہ
لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے اور خالص اسی کی عبادت کرتے۔ مگر
ایسا نہیں ہوا بلکہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا
بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو نہ یعنی برعکس بناتے ہیں۔
دوسرے لفظوں میں اللہ کا شریک مٹھراتے ہیں۔ نہ کی ہمت میں پہلے بھی آپ کا
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔
اللہ تعالیٰ کے برعکس اور شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ خالق، مالک
اور رازق صرف وہی ہے۔ مسبب الاسباب بھی وہی ذات ہے۔ لہذا
دوسروں کو اللہ کا شریک مٹھرانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

فرمایا جب لوگ غیروں کو اللہ کا مد مقابل تسلیم کر لیتے ہیں۔ تو پھر کہتے
یہ ہیں کہ يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ اُن سے اُس درجہ کی محبت کہتے
ہیں جس درجہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے۔ اور یہی غرابی کی جڑ ہے
یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے
ستجا رز کر جاتی ہے۔ یا اُس کے برابر آجاتی ہے تو پھر تمام وہ صفات غیر اللہ میں
بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور پھر غیر اللہ سے بھی
اُسی طرح حاجت روائی اور مشکل کشائی کا مطالبہ ہوتا ہے جو اللہ جل جلالہ سے
ہونا چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض بد بخت ایسے بھی ہیں۔ جو اللہ کا شریک مٹھراتے
ہیں۔ اور پھر اُن سے ایسی ہی محبت کہتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ کی ذات
پاک سے ہونی چاہیے۔

محبت الہی

فَرَّمَا شُرَكَاءَ رَبِّكَ أَنَّ بَخِلْتُمْ کے برخلاف وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ
حُبًّا لِلَّهِ اہل ایمان کا گروہ الیا بھی ہے۔ جن کے دل میں شدید ترین محبت صرف
اللہ ہی کی ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو مد مقابل مٹھرا کر اُن کو اللہ کی محبت

میں برابرہ کا شریک نہیں بنتے۔
 قیامت تو ابھی دُور کی بات ہے۔ قرآن پاک شاہد ہے کہ مشرکین بعض اوقات
 دنیا میں ہی اپنے معبودوں کی محبت کو ترک کر دیتے ہیں، جب ان کی کشتی
 طوفان میں پھنس جاتی ہے، تو قرآن پاک کہتا ہے ”دَعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ“
 تو جعلی معبودوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے لگتے ہیں۔ اور پھر آخرت میں
 تو بیزاری کا اعلان کر ہی دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔ اس کے برخلاف
 اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ انہیں خواہ
 تنگی ہو یا راحت خوشحال ہوں یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوں، تندرست ہوں یا بیمار
 ان کی محبت الہی کسی حالت میں بھی زائل نہیں ہوتی۔ باقی رہی انبیاء، اولیاء اور بزرگانِ
 دین کی محبت تو ایسی محبت اللہ ہی کے حکم سے ————— ہوتی ہے، ان
 ہستیوں سے محبت بالذات نہیں ہوتی بلکہ محبت بالذات صرف خدا تعالیٰ
 سے ہی ہوتی ہے۔

محبت کی مختلف قسمیں ہیں جیسے طبعی محبت، عقلی محبت اور شرعی محبت وغیرہ محبت کی اقسام
 طبعی محبت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے عاشق اپنے معشوق کی محبت کرتا ہے
 یا خاوند کو بیوی سے اور والدین کو اولاد اور دیگر اقرباء سے محبت ہوتی ہے۔
 عقلی اور شرعی محبت کی مثال حضور علیہ السلام کی دعا سے ملتی ہے اَللّٰهُمَّ
 اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیْ اِلَیْ حُبِّكَ
 یعنی اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبت عطا کر جو تجھ سے محبت کرتا
 ہے اور ایسے عمل کی محبت عطا کر جو مجھے تیری محبت قریب کر دے۔ اور آخر میں یہ بھی
 آتا ہے وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَاهْلِیْ وَمَالِیْ —————
 وَ مِنْ الْمَاءِ الْبَارِدِ اور اے اللہ! اپنی محبت کو میرے نفس، میرے اہل،
 میرے مال اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے یہاں پر ٹھنڈے
 پانی کا بطور خاص ذکر فرمایا، ٹھنڈا پانی گرم فحالت ایک عظیم نعمت ہوتا ہے جس کے ذریعے انسان راحت

حاصل کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی تمام چیزوں سے زیادہ ہوگئی، اُس کا ایمان کامل ہو گیا لیکن قرآن پاک نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اللہ اور رسول کی محبت کے مختلف مروج ہیں۔ اللہ کی محبت اصالتاً اور بالذات ہے اور رسول کی محبت اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔ بنی کے ساتھ امتی کی محبت کو نیچی کے ساتھ مشروط کر دیا۔

گیا ہے۔ سورۃ ممتحنہ میں جہاں عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر آتا ہے فرمایا: اُن سے عہد لیں کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔ چوری اور زنا کا ارتکاب نہیں کریں گی، اولاد کو قتل نہیں کریں گی، بہتان نہیں باندھیں گی وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ اَوْ نَجْيٍ کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی اور بعض مقامات پر مطلق رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دے دیا جیسے مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی۔ دوسری جگہ فرمایا: اطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ تاہم اطاعت اور عبادت میں فرق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ اور اطاعت رسول کی بھی اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی فرض ہے۔

ترمذی شریف کی حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اَحِبُّوا اللَّهَ لَسَا يَفْذُكُمْ مِنْ نَفْسِهِ لوگو! اللہ سے محبت کرو کہ اُس نے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہ منعم حقیقی ہے۔ تمہارا اپنا وجود اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں لہذا اُس سے محبت کرو۔ پھر فرمایا: اَحِبُّوا رَجُلِي اللہ خدا تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے میرے ساتھ بھی محبت کرو۔ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ اور اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کا کلام اور اس کی شریعت تم کو دی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ میری وجہ سے میرے اہل بیت کے ساتھ بھی محبت کرو۔ کسی کے ساتھ محبت کرنے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جمال

محبت کی
مختلف وجوہات

کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہے لہذا اصلی اور ذاتی محبت اُسی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حسن و جمال خود خدا کی صفات میں سے ہے۔ اس لیے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اصلی محبت اُسی سے ہو۔ محبت کی ایک وجہ کمال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے۔ اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ لہذا اس لحاظ سے بھی محبت کے لائق ذات خداوندی ہی ہے اسی طرح محبت کی وجہ احسان بھی ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، وہ محبت کرتا ہے اور سب سے بڑا محسن خود خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت لے سکھے۔

بعض اوقات محبت کا معیار نفع اور نقصان ہوتا ہے کسی نے نفع پہنچایا ہے یا نفع کی توقع ہے تو اُس سے محبت پیدا ہوگئی۔ کسی سے اس لیے بھی محبت کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر نقصان کا خطرہ ہے۔ حقیقی نفع اور ضرر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا اس وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیے۔

محبت کا ایک اور معیار ضروریات زندگی کی تکمیل بھی ہے۔ انسان کا مال و متاع، گھر بار، زن و اولاد سب ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ لہذا ان سے بھی محبت کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت بھی محبت بالذات نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے محض ذرائع پیدا کیے ہیں۔ امیر ہو یا حاکم، رئیس ہو یا دوست، برادری ہو یا کوئی ادارہ، یہ تو محض اسباب ہیں، ورنہ ضروریات کا حقیقی بہم پہنچانے والا اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ لہذا محبت بالذات اُسی کو سزاوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اختیار کی بے کو ایک سطح پر لے آئے گا۔ تو شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے اس کے ساتھ محبت باقی تمام مخلوق کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے۔ غیر اللہ کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی بھی درجہ نہیں دیا جاسکتا ورنہ یُحِبُّوْهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ

محبت کی
کسوٹی

کی زد میں آجائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص **اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ** یعنی اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کا دعویدار ہو تو اس کی جانچ کے لیے کوئی کسوٹی ہے۔ کہ اُس کا دعوے درست ثابت ہو جائے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کسی کی محبت کی کسوٹی اطاعت ہے۔ جب اطاعت کا وقت آئے گا تو پتہ چلے گا۔ کہ محبت کا دعویدار اپنے محبوب حقیقی کی اطاعت کرتا ہے یا کسی اور کی ظاہر ہے کہ جس شخصیت کی اطاعت کریگا، اُس کی محبوب ترین ہستی وہی ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک طرف خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور دوسری طرف والدین، پیر یا استاذ کا حکم ہے۔ تو ان میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مقام پر شرعی محبت کا تقاضا یہ ہے۔ وہ اپنے اللہ کی اطاعت کر کے اُس کے ساتھ شدید ترین محبت کے دعوے کو سچ کر دکھائے۔ اور اگر اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم کو ترجیح دی۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کا دعوئی باطل قرار پائے گا۔ اور اس کی شدید ترین محبت اُسی کے ساتھ ثابت ہوگی۔ جس کی اُس نے اطاعت کی۔ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں جو کوئی بھی ملک، آباؤ اجداد یا برادری کے رسم و رواج کی پیروی کرے گا۔ مشرک ہو جائے گا۔ بعض لوگ انبیاء، اولیاء، ملائکہ یا ارواح کی محبت کو خدا کی محبت کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اُن سے ایسی محبت کہتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اسی لیے نذرِ نیاز اور قربانی پیش کرتے ہیں یا نیاز مندی بجالاتے ہیں۔ یا اُن کی یادگار بناتے ہیں تو ایسے لوگ بھی مشرک میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی اجازت ہے مگر ایسی محبت جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور اس کی محبت سے کم تر نہ ہو۔ محبت دراصل ایک میلان، تعلق اور خواہش کا نام ہے۔ طبعی محبت میں دنیاوی غرض کارفرما ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ عبادت، اطاعت اور اس کی رضا کے لیے ہو۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ محبت کا دعوے کرے گا، وہ اس کے محبوبوں کے ساتھ بھی محبت رکھے گا۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت کرے گا۔ محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ محب کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے میں روح کا کامل نشاط حاصل ہوگا۔ وہ خوشی کے ساتھ عبادت الہی میں منہمک ہوگا اور مصیبت سے گریز کرے گا۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر جان و مال کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اب دیکھ لیجئے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ کس طرح غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ عیسائی مذہب نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے مقابلے میں بڑے خوش خدا کے بیٹے، کنواری ماں اور روح القدس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ یہی مشرکانہ محبت ہے۔ ہندو مت والے بھی محبوب حقیقی کی بجائے جنہیں وہ پر مانتا یا لشور کہتے ہیں، درگاد یوہی اور لکشمی ماما کی محبت میں مبتلا ہیں۔ سادھو اور رشیوں سے محبت کی پیٹنگیں بڑھا رہے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اسی طرح کلمہ گو مسلمان بھی غیر اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ یا علی مدو اور یا غوث اعظم کے نعرے لگاتے جا رہے ہیں۔ کبھی پیر بابا کو مدد کے لیے پکارا جا رہا ہے اور کبھی خواجہ سرمد دہلوی کی جا رہی ہے یہ لوگ تو اللہ کے پیارے، محبوب اور صالح لوگ ہیں۔ ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے غیروں کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی قرار دے لیا ہے اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے "فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ خَالِصَةً لِلَّهِ" کو پکارو کہ وہی حاضر و ناظر مالک و مختار اور مدد کرنے والا ہے مگر یار لوگ غیر اللہ کو بھی اللہ ہی کے ہم پلہ بنا کر شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ والوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں ہے۔

غیر اللہ کی
محبت

اہل ایمان کا طریقہ

اہل ایمان کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کہ انہیں سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے۔ وہ کسی غیر اللہ

اللہ ہی قادر
مطلق ہے

تالچ اور
مقبوع

میطیع اُن کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر لیتے تھے، آج وہی پادری، ریشی اور بیر اپنے
 مریدوں کو صاف جواب دے دیکھتے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا شریک
 ٹھہراؤ۔ یہ یہودہ کام تو تم اپنی مرضی سے کرتے تھے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمیں
 اللہ کا بیٹا بناؤ، اس کا اوتار بناؤ یا مشکل کشا اور حاجت روا بناؤ۔ حتیٰ کہ جب حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام سے بھی سوال ہو گا کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو
 الہ بناؤ۔ تو آپ جواب دیں گے۔ اے مولا کریم! یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ میں کوئی ایسی
 بات کہوں مگر ایسا لیٰ بحق جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ غرض کہ تمام مطاع
 اُس دن انکار کر دیں گے۔ وَرَأَوْا الْعَذَابَ سَلْسَلَةً لِّمَن لَّا يَرْجُوَ
يَوْمَ يُبْعَثُونَ اور تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا
أَوْسَرَ وَكَارِهِينَ گے، افسوس کا اظہار کریں گے۔ لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةٌ اگر ہمیں ایک
 دفعہ پھر دنیا میں پہلنے کی اجازت مل جائے فَنَتَّبِعُكَ يَا رَبُّ تو ہم بھی ان راہنماؤں
 سے اسی طرح بیزار ہو جائیں۔ کس بات پر وَأَمَّا جِبَا کہ یہ آج ہم سے بیزار ہو گئے
 ہیں یعنی اب ہمیں حقیقت حال کا علم ہو گیا ہے اب انگریز ہیں دنیا میں مل جائیں تو ہم ہرگز انکی
 تابعداری نہیں کریں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورہ احزاب میں آتا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ عَنْ عَمَلِكُمْ وَأَنْتُمْ سَاهُونَ اور تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو
 ہمیں سیدھے سستے سے بھٹکا دیا۔ کاش کہ ہم نے تیرے رسولوں کا اتباع کیا ہوتا ہم نے تو اپنے
 بزرگوں کی بات مانی اے مولا کریم رَبَّنَا إِنَّهُمْ جُفُوا بِكَ آج ان کو دو گنا عذاب
 دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی
 فرمایا تھا کہ تم نے دنیوی اغراض کے لیے معبود بنا رکھے ہیں، قیامت کے دن یہ سارا
 سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور آج کے تمام دوست اُس دن دشمن بن جائیں گے۔ پیار
 محبت اور الفت صرف وہی کام آئے گی، جو اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی۔ اس کے علاوہ
 تمام ذرائع کٹ جائیں گے فرمایا کہ كَذَلِكَ يُبْرِئُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَنَاتٍ
مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ اس طرح اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال ان کو حسرت بنا کر دکھائے گا وہاں پر

ان کا بیزار می کا اعلان کچھ کام نہ آئے گا۔ بلکہ اُن کے عذاب میں اضافہ ہی ہو گا وہاں
 مَخْرُجًا مِّنَ النَّارِ اُن کے لیے جہنم سے نکالی کی کوئی صورت نہ
 ہوگی، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ وجہ بیان ہو چکی ہے کہ انہوں نے غیر اللہ
 کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیا، شرک میں مبتلا ہوئے اور باطل
 پرست لوگوں کا اتباع کیا۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و پنج (۶۵)

الْبُقَرَةُ ۲

آیت ۱۶۸ تا ۱۷۱

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا
تَتَّبِعُوا خُطُوتَ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾
إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ
كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً
وَنِدَاءً ط صُمُّ أَبْكُمْ عُمًى فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾

ترجمہ: اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ۔ اور شیطان
کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے صریح اور کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾
بے شک شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ
پر وہ چیزیں کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۹﴾ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اُس
چیز کی پیروی کرو، جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ بلکہ ہم اُس چیز کی پیروی
کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کسی
چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ وہ سیدھی راہ پر ہوں ﴿۱۷۰﴾ اور ان لوگوں کی مثال جہنم نے
کفر کیا، اُس شخص کی سی ہے، جو آواز دیتا ہے۔ اُس کو کہ نہیں سنا مگر بلانا

اور پکارنا، یہ برے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے ﴿۱۷۱﴾

گزشتہ پیوستہ

گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل اور شرک کا رد تھا اور یہ

بتلایا گیا تھا کہ جو لوگ دوسروں کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ
کمرنی چاہیے، وہ لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب
کے مستحق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بُرے انجام سے خبردار کیا ہے
اور بتلایا ہے کہ اُن کے اعمال اُن کے لیے حسرت کا باعث بنیں گے۔ قیامت
کے دن ایسے لوگ افسوس کا اظہار کریں گے۔ مگر وہ افسوس اُن کے لیے کچھ مفید نہیں
ہوگا اور نہ وہ کبھی دوزخ کی آگ سے باہر نکل سکیں گے۔

قانون کی
پابندی

قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے کہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی
خطاب عام ہوتا ہے۔ جیسے "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان۔ اور
کبھی خطاب خاص ہوتا ہے۔ جیسے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" یا اے
الْمُكْتَبِ وغیرہ وغیرہ۔ آیت زیر درس میں خطاب عام ہے۔ اور تمام بنی نوع
انسان کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ "يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ
حَلَالًا طَيِّبًا" اے لوگو! زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ
الشَّيْطَانِ اور شیطان کے نقش قدم پرست چلو، إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُبِينٌ۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

در اصل یہاں پر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی
نوع انسان کو قانون کی پابندی کا درس دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار
دہی ہیں صرف انہیں استعمال کرو اور حرام خوردی سے بچ جاؤ اگر تم اللہ کے قائم
کرو وہ اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے، تو اصل راستے سے بہک کر شیطان کے
نقش قدم پر چلنے لگو گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ترقی کے مقام خطیرۃ القدس
میں پہنچنے کی بجائے ظلمت کی انتہا گہری ٹول میں پہنچ جاؤ گے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باب باندھ
کر بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف ہے۔ اور مکلف سے مراد قانون
کی پابندی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں ملکیت

اور بہیمیت دونوں مانے رکھے ہیں اور ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان قانون کی پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا، تو اس کے حصے میں ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

نسل انسانی تمدن نسل ہے۔ اور یہ دیہات، قصبوں اور شہروں میں مل جل کر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی قانون کی پابندی اُس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اجتماعی صورت میں نہ ہو۔ قانون پر عملدرآمد بھی اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ لوگوں کو قانون سے واقفیت ہو۔ اور اس کے لیے قانون کی تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے کا کوئی فرد قانون کے جاننے سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ جب یہ حجت پوری ہو جائے گی تو پھر قانون شکنی کرنے والے کے خلاف کارروائی بھی لازم ہو جائیگی، تاکہ معاشرہ اس قسم کے فساد سے محفوظ رہ سکے۔ قانون شکن کوئی فرد واحد ہو یا جماعت وہ قانون کی مقرر کردہ تعزیر کی زد میں ضرور آئے گا۔ اور اگر کوئی دوسری باہر کی جماعت قانون کے نفاذ میں کاؤ ڈالنے کی کوشش کرے گی، تو اس کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہوگا، تاکہ فتنہ و فساد کا دروازہ فوراً بند کیا جاسکے۔

حلال و حرام
کی تمیز

حلال چیز وہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شرعاً حلال قرار دیا ہے۔ اور پاکیزہ وہ چیز ہے جو بذاتہ لذیذ بھی ہو۔ کیونکہ بدبودار چیز کو کوئی شخص کھانا پسند نہیں کرے گا، خواہ شریعت کے نزدیک وہ حلال ہو۔ کسی چیز کی پاکیزگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہ ہو۔ اگلی آیات میں حلال و حرام کی حکمت اور ان اشیاء کی تفصیل آ رہی ہے۔ مثلاً بکری حلال ہے۔ مگر خنزیر حرام ہے۔ اسی طرح اونٹ حلال ہے مگر شیر حرام ہے۔ بکری اور اونٹ وغیرہ کی حلت کے باوجود اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ شرعی طریقے سے مذکور ہو۔ ورنہ ایسے جانور کا گوشت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں حکم موجود ہے ”وَلَا تَأْكُلُوا“

مَمَّا لَمْ يَذْكُرِ اللَّهُ عَلَيْهِ یعنی چیرا اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے مرت کھاؤ، وہ حرام ہے۔ اس طرح جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ سردار بھی حرام ہے۔ ایسی چیزوں کا استعمال جسمانی یا روحانی صحت کے لیے مضر ہوگا کیونکہ جن چیزوں کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، ان میں کوئی نہ کوئی حشرابی ضرور ہوگی۔

”أَحِلَّ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ كَيْ حَكَمَتْ اُكَلِ اَيَتُوں ميں آرہي ہے۔ جو چیز غير اللہ کے نام پر دی جاتی ہے، خواہ وہ مسٹھائی ہو یا فروٹ، چاول ہوں یا گوشت، ان میں بظاہر تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر اس میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے، جو روح کو پلیدہ کندہ کرتی ہے۔ لہذا ایسی چیز روحانی طور پر مضر ہوگی، ترمذی شریعت میں ہے کہ طافی یعنی ایسی مچھلی جو خود مر کر پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہے۔ وہ مکروہ ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ جسمانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جو کوئی کھائے گا بیمار ہو جائے گا۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ ایک شخص نے ایسی مچھلی کا گوشت کھایا اور اور چوبیس گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گیا۔ یہ گوشت اتنا زہراؤ تھا کہ اس کا سارا خون پیپ میں تبدیل ہو گیا۔ ایسے ہی حوادث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا، وہ کسی نہ کسی طور انسانی جسم کے لیے مضر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

حرمیت کی ایک اور صورت دوسرے کی حق تلفی بھی بیان ہوتی ہے۔ ایک شخص چوری کی بکری لاکھ ذبح کر تا ہے۔ وہ حلال جانور ہے۔ اس پر اللہ کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر چوری کے فعل نے اس میں خباثت کو جنم دے دیا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے شخص کا حق تھا۔ جو ضائع ہو گیا۔ اس لیے اس کا کھانا حرام ٹھہرا۔ رشوت اور سود کا مال بھی اسی زمرہ میں آتا ہے کہ ایسا مال طیب نہیں رہتا بلکہ خبیث ہو جاتا ہے۔ اس لیے حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی نوریع انسان کو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قانون

کی پابندی کرنا چاہیے۔ جن چیزوں کو اللہ نے حلال اور پاکیزہ کہا ہے انہیں کھانا چاہیے اور حرام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنائے یعنی اللہ میری ہر دعا کو قبول فرمائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے سعید! أَطَبُّ مَطْعَمَكَ اپنی خوراک کو پاک بنا لو۔ یعنی طیب غذا استعمال کرو تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعَوَاتِ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کوئی شخص حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے۔ تو چالیس دن تک اس کی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کے قانون کی پابندی لازمی ہے اس کے برخلاف کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

شیطان کا
نقش قدم

حضرت مسروقؓ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے رشتہ دار اور شاگرد ہیں۔ آپ تابعین میں سے ہیں، کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ اگر کسی نے بچے کو ذبح کر نیکی منت مانی ہو، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا بچے کی بجائے بکری ذبح کر دے تو اس کی نذر پوری ہو جائیگی کیونکہ بچے کو ذبح کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنے والی بات ہے اور شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اور قیامت تک اپنی دشمنی کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس کے عزائم واضح ہیں اَلْخَمَایِدُ مَحْوُوحَاتُ حِزْبِهِ لِيَكُونُوا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِيرِ وہ اپنے لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اُس کے گروہ میں شامل ہو کر جہنم میں داخل ہو جائیں۔ ابلیس کا انسانوں کے متعلق گمان تھا کہ یہ اندر سے کھوکھلے ہیں، میں ان کو ہر طریقے سے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ لوگوں کی اکثریت اس کے تابع ہو گئی اَلْاَقْلِيَّةُ سَوَّاءٌ اَبَدًا ایک چھوٹی جماعت کے جنہوں نے شیطان کا اتباع نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے قانون کی پابندی کی۔ وہ شیطان کے فریب سے محفوظ رہے۔

فرمایا شیطان کا کام یہ ہے کہ اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَةِ
 وہ تمہیں بُرے باتوں اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ بُرے باتوں سے مراد فسق و فجور اور
 گناہ کے کام ہیں اور فحش سے مراد شہوت رانی کی باتیں ہیں شیطان چاہتا ہے کہ
 اس قسم کی لغویات میں پٹے رہیں۔ اور خدائے عز و جل کے قانون کی طرف نہ آسکیں
 وہ یہ بھی چاہتا ہے۔ **وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ** کہ تم خدا تعالیٰ کے
 کے متعلق ایسی باتیں کہو، جو تم نہیں جانتے۔ یعنی بغیر جاننے کے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے
 ساتھ ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو اس کی شان کے شایان نہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے
 یہ مشرک اور بدعتی لوگ اپنی تمام خرافات اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ کہ
 یہ افعال اس کے حکم سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ
 کی ذات پر افتراء باندھنا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا۔ کہ لوگ بیت اللہ شریف
 کا طواف بالکل بے ہنہ حالت میں کرتے تھے۔ اُن کی توجیہ بھی یہی تھی **وَاللَّهُ أَمَرَنَا**
بِهَذَا یعنی اللہ نے ہمیں ایسا حکم دیا ہے حالانکہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ**
اللَّهُ تَعَالَى بے حیائی کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ شیطان نے اُن کے دل میں یہ بات
 ڈال دی کہ جن کپڑوں کے ساتھ ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اُن کے ساتھ
 طواف نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا انہوں نے مادرِ زانو نیچے طواف شروع کر دیا۔ سورۃ
 اعراف میں بھی آتا ہے۔ **اتَّقُوا اللَّهَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ** کیا تم اللہ کے
 ساتھ ایسی باتیں منسوب کرتے ہو، جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔

ابنی لوگوں کے متعلق فرمایا **وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ**
اللَّهُ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کی اتباع
 کرو یعنی اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قانون پر چلو **فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا**
الْفَيْتَنَّا عَلَيْهِ اباء نا تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم
 نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کہہ دیجئے تھے ہم تو اپنے بڑوں کے راستے کو
 نہیں چھوڑیں گے، ہم اُن کے عقیدے اور رسم و رواج کی پابندی کریں گے،

اباؤ احبار
 کا اتباع

وہ بھی تو آخر عقل و شعور رکھتے تھے، کوئی بیوقوف تو نہ تھے اگر ان لوگوں کے آباؤ اجداد واقعی سمجھ بوجھ کے مالک ہوتے تو ان کے راستہ پر چلنا نیکی کی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی تو کہا تھا۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي میں اپنے آباؤ اجداد کی ملت پر ہوں۔ یعنی میں اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے طریقے پر ہوں۔ جو کہ صحیح راستے پر تھے۔ اس کے برخلاف اگر آباؤ اجداد غلط راستے پر چل رہے ہوں تو پھر ان کی پیروی کرنا کس قدر حماقت اور بیوقوفی کی بات ہوگی۔ اسی لیے فرمایا اَوْ لَوْ كَانَ اَبَاءُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ کہ اگر ان کے آباؤ اجداد نہ تو عقلمند ہوں اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کے راستے پر چلیں گے۔ مقصد یہ کہ معروف میں تو کسی کی پیروی کی جاسکتی ہے، مگر منکرات میں ایسا کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

بعض چیزیں ہماری سوسائٹی کو ورثے میں ملی ہیں مگر یہ خدا کے قانون اور پیغمبر علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہیں، محرم کے مہینے میں بعض لوگ پان نہیں کھاتے۔ مگر خلیج لباس نہیں پہنتے، کالا لباس پہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ اظہار غم ہو۔ یہ سب شیطانی طریقہ اور آباؤ اجداد کے راستے پر چلنے والی بات ہے بعض لوگ حضرت فاطمہؓ کے نام کی نیاز دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کوئی مرد اس میں سے نہ کھائے۔ اسی طرح ۲۲ رجب المرجب کو حضرت ام جعفر صادقؑ کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے کوڑے کا نام دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نیاز کا کھانا گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ اور یہ سورج طلوع ہونے سے پہلے کھالینا چاہیئے اس قسم کے تمام مفروضات پر عمل درآمد آباؤ اجداد کی پیروی کے مترادف ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالحقؒ کا توشہ حلوا ہوتا ہے مگر حقہ پینے والا یہ توشہ نہیں کھا سکتا۔ اسپر پابندی ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی نیاز میں سویاں پکائی جاتی ہیں۔ عید کے موقع پر لوگ اس کی بھی پابندی کرتے اصحاب کھف کی نیاز گوشت ریزہ کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر

نیا زاد اہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز کے لیے گیارہویں تاریخ کی پابندی کی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ غلط عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ پر گیارہویں نہ دی تو مال میں نقصان ہو جاتا ہے یا بھیتس کا دودھ کم ہو جاتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں اَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی زد میں آتی ہیں۔ مگر اَنْزَلَ اللّٰهُ میں تو حکم یہ ہے کہ اموات کے لیے دعا کرو، اَنْ کے لیے ایصال ثواب کرو، یہ ملکیت ابراہیمی کا اصول ہے۔ ان کے لیے صدقہ اور استغفار کرو، اس میں کوئی پابندی نہیں، جب چاہو اجازت ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسی چیزوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر اسے بدعات میں شامل کر دیا ہمارے ہاں صدقہ کے بہت سے خود ساختہ طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ کئی ایک پابندیاں عائد ہو چکی ہیں۔ کہتے ہیں کہ صدقہ کے لیے کالے جانور کی بھری ہوئی چلہیے۔ اس کے بغیر صدقہ ادا نہیں ہوتا۔ حضور علیہ السلام کا تو واضح ارشاد ہے تصدق بدينار و درهم و درہم کے پاس درہم ہے وہ درہم دے دے اور جس کے پاس دینار کی گنجائش ہے، وہ دینار صدقہ کر دے بمقصد یہ کہ جو چیز بھی میسر ہے اس میں صدقہ دیا جاسکتا ہے مثلاً غنہ اجناس، کھجوریں، کپڑا کتاب وغیرہ ہر چیز صدقہ میں دی جاسکتی ہے۔ گوشت اور سری کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تو شیطانی شریعت ہے۔

صدقہ کا طریقہ

حضرت ابو طلحہؓ حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور! میرا یہ بہترین بارغ ہے، میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرے قرابت داروں میں جو غریب لوگ ہیں انہیں تقسیم کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح آپ نے حضرت سعدؓ کو صدقہ میں کنواں لگوانے کا حکم دیا۔ آج بھی صدقہ کے طور پر نلکہ یا ٹوبہ دے لے لگوا یا جاسکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ دین کی تبلیغ پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ نادار طالب علموں کی تعلیم کے

لیے صدقہ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ پریشان حال مسافر کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ایسی ہی بہت سی مدت ہیں جن پر صدقہ کا مال خرچ ہو سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے کالے جانور کی کالی سری کو ہی صدقہ سمجھ لیا ہے۔ اس خول سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ اس لئے فرمایا کہ جو شریعت اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ اس کا اتباع کرو، باپ دادا کے غلط اقدام کی اتباع مت کرو۔ کتنی بیوقوفی کی بات ہے۔ کہ بے عقل اور بے ہمت آباد اجداد کے نقش قدم کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے

کافروں کی مثال

آگے اللہ تعالیٰ نے شیطان کے نقش قدم پر چلنے والے کفار کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الذِّئْبِ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً کافروں کی مثال اُس چرواہے کی ہے۔ جو اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ جو اُس کی چیخ اور پکار کو سننے تو ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے اسی طرح کافر بھی اللہ کے نبی کی آواز تو سننے ہیں مگر جانوروں کی طرح انکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ فرمایا صُمْ بُكُمْ عُمًیٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ وہ برے، گونگے اور اندھے ہیں، یہ لوگ عقل و شعور سے بھی عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین بڑی نعمتیں عطا کی ہیں یعنی قوت سماعت، قوت گویائی اور قوت بہرہ مگر لوگ ہیں۔ کہ ان قوتوں کو استعمال نہیں کرتے اور گونگے، برے اور اندھے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کی ان نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ تو حق بات سننے کی تاب لا سکتے ہیں، نہ حقیقت کو دیکھ کر پرکھتے ہیں۔ اور نہ حق کی بات پوچھنے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و شش (۶۶)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
اشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ
لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ
عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں۔ اور

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے ہو (۱۴۲) بیشک اللہ

تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے، مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ

کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔ پس جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی

کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی کرنے والا ہے، پس اس پر کچھ گناہ نہیں

ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربان ہے (۱۴۳)

گذشتہ آیات میں "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" کہہ پوری نوع انسانی کو خطاب کیا گیا تھا

اب ان آیات میں خاص طور پر مومنوں سے خطاب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ اے ایمان والو!

پاک چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے

کہ اکل حلال کا یہ وہی حکم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دیا ہے، جو اس نے اپنے

نبیوں اور رسولوں کو دیا ہے۔ یعنی "يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِن الطَّيِّبَاتِ

وَأَعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ" یعنی اے رسولوں کی جماعت پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال

کرو۔ غرضیکہ تمام انبیاء اور اہل ایمان کو پاک چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا

اکل حلال

ہے۔ کیونکہ ایسی چیزیں کھانے سے انسان میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پاک اشیاء کا کھانا اور ناپاک چیزوں سے پرہیز ایک ایسا عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے غیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ وہ ایسا رسول ہے کہ ”مُحَمَّدٌ لَّهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ مُحَرَّمٌ عَلَيْهِمُ الْحَبَائِثُ“ لوگوں کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو خبیث قرار دیا ہے۔ اُن کے استعمال سے یا تو جسمانی طور پر خرابی پیدا ہوگی یا روحانی طور پر۔ پاک چیز وہ ہے جس میں کوئی خباثت نہ ہو، خباثت ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی ہوتی ہے۔ ظاہری خباثت تو یہ ہے کہ کوئی چیز ظاہری طور پر گندی ہو اور باطنی گندگی میں مالِ حرام از قسم چور می اور خیانت وغیرہ آتا ہے۔ اسی طرح روحانی گندگی یہ ہے کہ اس میں کسی غیر کا حق شامل ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے کہ اکل حلال اور صدق مقال دین کی گرہ اور راز ہے مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے۔ جسم اور لباس گندہ اور دھسے، بڑھی تکلیف پاتا ہے وہ دعا کرتا ہے یَا رَبِّ یَا رَبِّ اے مولا کریم! میری دعا قبول کر لے مگر حضور فرماتے ہیں فَاَنِّیْ یُسْتَجَابُ لَکَ، اس کی دعا کیسے قبول ہوگی جب کہ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ جب کہ اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ وَ عَزِیْ بِحَرَامِ حُرَامِ نَدَاتِ پرورش پاتا ہے۔ مقصد یہ کہ دعا کی قبولیت کے لیے اکل حلال بمنزلہ شرط کے ہے اسی طرح عبادت کی قبولیت کے لیے بھی لازم ہے کہ عابد حلال اور طیب چیزیں استعمال کرے

شکر الہی

فرمایا اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَ اشْكُرُوا لِلّٰہِ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اِنْ كُنْتُمْ اَیَّاهُ تَحِبُّوْنَ۔ اگر تم خالص اسی کے عبادت گزار ہو شکر ادا کرنے کے کسی طریقے ہیں مثلاً زبان سے شکر ادا کرنا یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثناء بیان کرے۔ اعضا کا شکر یہ ہے کہ ایسے اعمال انجام دیے جائیں جن سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار ہو۔ اور دل سے شکر ادا کرنا یہ ہے

کہ دل میں یہ اعتقاد رکھے کہ مستحق تعظیم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنوں اور انسانوں کی ایک حالت یہ بھی ہے کہ اَخْلُقُ وَيُعْبَدُ غَيْرِي پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت دوسروں کی کرتے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا اَرْزُقُ وَيُشْكِرُ غَيْرِي رزق میں دیتا ہوں، روزی میں پہنچاتا ہوں مگر شکر دوسروں کا ادا کرتے ہیں۔ اس مضمون کو امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین نے بھی نقل کیا ہے۔

محرمات اربعہ

اکل حلال کا قانون بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر محرمات اربعہ یعنی چار حرام چیزوں کا تذکرہ کیا۔ جن کا استعمال انسان کے لیے قطعاً جائز نہیں۔ فرمایا لَا مَحْرَمَ عَلَيْكُمْ السَّيِّئَاتِ وَالِدَمِّ وَلَحْمَ الْخَنَازِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ بیشک تم پر حرام ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی غیر کا نام پکارا گیا ہو،

مردار

محرمات میں پہلا نمبر مردار کا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد ہے جو حلال ہو اور ذبح کرنے کے قابل ہو، مگر بغیر ذبح کیے مر جائے۔ ایسا جانور حرام کی فہرست میں آجائے گا، اس کا کھانا قطعاً ناجائز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ وہاں پر بھی مذکورہ بالا چار محرمات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ محرمات میں مردار کی یہ صورتیں بھی شامل ہیں وَالْمُخْنَقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّدَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصَبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَمِ یعنی وہ حلال جانور جو کلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مر ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ سوائے اس کے کہ جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ یا جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو، یا یہ کہ پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔ ایسی چیزوں کا کھانا مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ مردار کے حرام ہونے میں حکمت یہ ہے

کہ اس کے گوشت کھانے سے انسان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی عبادت اور نیکی کے کام میں نشاط حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں پر جس خون کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ بہتا ہوا خون ہے۔ جو رگوں میں چلتا ہے اور ذبح کرتے وقت بہ جاتا ہے۔ سورۃ النعام میں اسے دھامسفوحاً یعنی بہلیا ہوا خون کہا گیا ہے۔ یہ قطعی حرام ہے۔ اور اس کا استعمال جائز نہیں۔ البتہ رگوں کا خون بہ جانے کے بعد جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے، وہ حرام نہیں ہے اگر گوشت بغیر دھوئے بھی پکا کر کھالیا جائے تو وہ پاک ہے۔ تاہم نظافت کا تقاضا ہے کہ اسے دھولیا جائے، مگر اس کی حلت میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو، اس کو ذبح کرنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ اسے اللہ کا نام لے کر زخمی کر دینا ہی کافی ہے۔ بھاگ جانے والے جانور کو اگر تیر چلاتے وقت یا نیزہ بھالا وغیرہ مارتے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو وہ جانور حلال ہوگا، خواہ اسے زخم جسم کے کسی بھی حصہ پر آیا ہو۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ کہ مردار وہ جانور ہے جو خود بخود مر جائے، یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ سورۃ النعام میں موجود ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرْ اِسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اس کو مست کھاؤ۔ ہاں جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے گا، وہ اس نام کی برکت سے پاک ہو جائے گا۔ اور جس جانور کو شرعی طریقہ کے خلاف شکار یا ذبح کیا جائے وہ بھی مردار تصور ہوگا۔ مثلاً کسی جانور کو ذبح کرنے کی بجائے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، تو ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا اَبَيْنَ مِنَ الْحَيِّ فَهُوَ مَيِّتٌ زندہ جانور کا کوئی حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو وہ مردار ہی تصور ہوگا۔ اسی طرح لکڑی، غیل یا بندوق سے مارا جائے اور ذبح نہ کیا جائے۔ تو وہ مردار ہوگا ایک موقع پر مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ بندوق کا شکار بغیر ذبح

کیے ہوئے جائز ہے، حالانکہ تمام فقہائے کرام اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں تاہم بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا صحیحین اور نسائی شریف کی روایت کے مطابق صرف وہ جانور بغیر ذبح کے حلال ہے۔ جو تیر کے نوکدار حصہ سے زخمی ہوا ہو۔ اگر ویسے ہی تیر کی چوٹ سے مر جائے تو ایسا جانور موقوفہ شمار ہوگا اور حلال نہیں ہوگا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عام چوٹ از قسم لکڑی پتھر وغیرہ کے لگنے سے موت واقع ہو جائے۔ بندوق کی گولی بھی بھٹوس ہوتی ہے۔ نوکدار چیز نہیں ہوتی، اس لیے بندوق کے ساتھ شکار کیا ہوا جانور بغیر ذبح کیے حلال نہیں ہوتا۔

لَوْ يَذْكُرُ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ میں وہ جانور آئے گا۔ جس پر بوقت ذبح قصد اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ ہاں اگر ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے۔ تو وہ مردار نہیں ہوگا، اس کا کھانا جائز ہوگا۔ اگر قصد تکبیر کو ترک کیا ہے۔ تو ایسا جانور مردار تصور ہوگا۔ البتہ حدیث شریف کے مطابق دو جانور اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا کھانا جائز ہے۔ فرمایا أَجَلَّتْ لَنَا مَيِّتَتَانِ ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں اَلْسَمَكُ وَالْجُرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی۔ ان کا شکار کر کے بغیر ذبح کیے کھایا جاسکتا ہے۔ حضور نے انہیں جائز قرار دیا ہے۔

خون کی ایک قسم لبتہ یعنی جما ہوا خون ہے۔ اسے شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ فرمایا أَجَلَّتْ لَنَا دِمَاجَانِ ہمارے لیے دو خون حلال ہیں اَلْكَبِدُ وَالطَّحَالُ یعنی جگر اور تلی۔ یہ دونوں اعضاء منجمد خون ہیں مگر حلال ہیں۔ دم مسفوح یعنی رگوں سے نکلنے والے خون کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ اسے استعمال کرنے والے آدمی میں درندگی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شیر، بچہ وغیرہ جو شکار کا خون پی جاتے ہیں۔

— اس لیے ان میں درندگی کی صفات پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان بھی ایسا ہی خون استعمال کرے گا۔ تو اس میں بھی ایسی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ لہذا دم مسفوح کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر چیز کا خاتمہ ہوتا ہے جو شخص سورج نکلنے تک

سوتا رہیگا وہ دن بھر خبیث النفس اور کسلان یعنی سست رہے گا۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا شخص نیکی کے کاموں میں بے حد سست ہوگا۔ مگر بُرائی کے کاموں میں بڑا چست ہوگا۔ یہ زیادہ سونے کا خاصہ ہے۔ فرمایا اسی طرح مردار کھانے کا خاصہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اچھائی کے کاموں میں نشاط نہیں ہوگی۔

حلال و حرام جانوروں کی حکمت شاہ ولی اللہؒ یوں بیان کرتے ہیں کہ بھیمۃ الانعام میں سے جو مویشی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے حلال قرار دیے ہیں، وہ انسان کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتے ہیں، انسان کے قریب رہتے ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، لہذا ان کا گوشت اور دودھ بھی انسانی طبیعت کے موافق ہے۔ جیسے بکری، گائے بھینس اونٹ وغیرہ، ان کا گوشت کھانے اور دودھ پینے سے انسان میں اچھی خصلت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً شیر، بچہ، کتا، بندر وغیرہ انسان سے مناسبت نہیں رکھتے، لہذا ان کا گوشت کھانے سے ان جیسی خصلتیں پیدا ہوں گی۔ بلی اور کتے — کا گوشت کھانے سے انسان میں ویسی ہی صفات پیدا ہو جائیں گی لہذا شریعت نے ان سے منع فرمایا ہے۔

فرمایا و بکیر حرام جانوروں کی طرح وَلَحْمِ الْخَنَازِيرِ خنزیر کا گوشت بھی قطعی حرام ہے۔ یہاں پر ذکر صرف گوشت کا کیا ہے۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب اس کا گوشت حرام ہے تو اس کی ہر چیز کا استعمال حرام ہے اس کی ہڈیاں، بال، چربی، لعاب وغیرہ۔ سورۃ النعام میں خنزیر کے متعلق آتا ہے اِنَّہٗ رِجْسٌ یَّہْدٰی بِالْکُلِّ نَافَاکٌ ہے۔ اس کا استعمال بالکل حرام ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ قریب قیامت جب مسیح علیہ السلام کا ظہور ہوگا تو آپ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ ان دونوں کاموں سے عیسائیوں کی تذلیل مقصود ہے۔ مسیح علیہ السلام صلیب کو توڑ کر یہ ثابت کر دیں گے کہ ان کے نام نہاد پیروکاروں کا یہ عقیدہ باطل تھا کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکا دیا ہے۔ اسی طرح عیسائی خنزیر کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں، خنزیر کو قتل کرنے کا مقصد بھی عیسائیوں کی اس بات پر تذلیل ہے کہ وہ خنزیر کے گوشت کو بکری کی طرح حلال سمجھ

کہ کھاتے ہیں۔

امام شاہ دلی الشرف فرماتے ہیں کہ خنزیر کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس جانور میں ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ اولاً یہ گندگی کھانے والا جانور ہے اور حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جلالہ جانور یعنی گندگی کھانے والا جانور کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر حلال جانور مثلاً گائے بھینس اونٹ، بکری وغیرہ بھی گندگی کھانے لگ جائے تو اسے باندھ کر دس دن تک گھاس کھلاؤ ورنہ اس کا دودھ اور گوشت مکروہ ہوگا۔ بعض اوقات گندگی کھانے کی وجہ سے جانور میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے جانور کا ذوق بھی بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ خنزیر گندگی کھاتا ہے۔ لہذا اس کا اثر اس کے گوشت بلکہ ہر عضو میں سرایت کر جاتا ہے اس واسطے اس کا کھانا قطعی حرام ہے۔

خنزیر میں ایک اور قبیح خصلت بھی پائی جاتی ہے۔ جو کسی اور جانور میں نہیں ملتی یہ اس قدر بے غیرت جانور ہے کہ اس کے متعدد تر بیک وقت ایک مادہ سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور جانور نہیں ہے۔ جو دوسرے کی موجودگی میں مادہ سے جھتی کرے۔ اگر کوئی دوسرا موجود ہوگا تو جب تک اسے بھگا نہیں دے گا، نفاتی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ مگر خنزیر یہی ایک ایسا جانور ہے۔ جس کو دوسرے جانور کی موجودگی قطعاً ناگوار نہیں گذرتی اور یہ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ چنانچہ اس جانور کا گوشت کھانے والی اقوام میں بھی اس خصلت کا بیدار ہو جانا لازمی امر ہے۔ انگریز اور سکھ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں، دیکھ لیجئے دونوں قومیں اس قسم کی بے غیرتی کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

اگرچہ خنزیر کی ہر چیز حرام ہے۔ تاہم اس مقام پر صرف گوشت کی حرمت دو وجوہ کی بنا پر بیان کی گئی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے چونکہ یہاں پر ذکر کھانے کا ہو رہا ہے۔ کہ اے مومن! حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، تو کھانے کی مناسبت سے گوشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جانور کی باقی اشیاء یعنی ہڈیاں۔ چمڑا۔ چربی

لے مرغی تین دن، بکری چار دن اونٹ گائے دس دن (درمختار ص ۵۲۸) (فیاض)

وغیرہ حرام تو ہیں مگر یہ کھانے کے کام نہیں آتیں بلکہ بعض دوسرے طریقوں سے انسانی استعمال میں آتی ہیں۔ گوشت کے ذکرہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا گوشت ہر حالت میں حرام ہے۔ خواہ وہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ حلال جانور کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ خود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو مگر خنزیرہ کی حرمت ہر صورت میں قائم رہی خواہ اسے شرعی طریقہ پر ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ جس طرح باقاعدہ ذبح کرنے سے کتے کا گوشت جائز نہیں ہو جاتا، اسی طرح خنزیرہ کا گوشت بھی حلال نہیں خواہ اسے شرعی طریقہ سے ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ اس کا گوشت ہر صورت میں حرام ہی ہے گا۔ اسی لیے اسے نجس العین کہتے ہیں۔

اہم ابو حنیفہؒ کا فتویٰ ہے کہ ہر جانور کی کھال رنگ دینے کے بعد پاک ہو جاتی ہے خواہ وہ جانور حلال مگر مردار ہو یا جانور ہی سرے سے حرام ہو، سوائے خنزیرہ کی کھال کے کہ یہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔ رہی انسان کی کھال، تو وہ احتراماً استعمال میں نہیں لائی جاتی مگر دباغت سے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ خنزیرہ یا جانور ہے۔ جس کی کوئی چیز بھی کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہوتی۔ انسانی اخلاق پر اس کی غذا کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان جس قسم کی غذا استعمال کرے گا، اس کے اخلاق کی تعمیر اس کے مطابق ہوگی۔ اگر کوئی شخص خنزیرہ یا کوئی دوسری حرام چیز استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا اثر اس کے اخلاقیات یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت پر پڑے گا اور وہ شخص اپنے مقام کو قائم نہیں رکھ سکیگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا قانون نافذ کر کے انسانی اخلاقیات کی تعمیر کی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و ہفت (۶۷)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
 اشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ
 عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ
 لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَمن اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
 إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں اور اللہ کا
 شکر ادا کرو اگر تم خاص اُسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۴۲﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے
 تم پر حرام کیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا
 گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی
 کرنے والا، پس اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

گزشتہ سے
پیوستہ

گزشتہ درس میں حلال و حرام کی بحث اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو
 حلال قرار دیا ہے اور انہیں کھانے کی اجازت دی ہے۔ اور حرام چیزوں سے منع فرمایا۔
 حلال اشیاء کی تفصیل قدسے بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے
 أَطْيَبُ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ پاکیزہ چیز وہ ہے۔ جو انسان اپنے ہاتھ
 سے کما کر کھاتا ہے۔ یعنی جو چیز محنت کر کے حاصل کی جائے۔ وہ پاکیزہ ہے۔
 انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا وَلَئِنَّ مِنْ كَسْبِهِ یعنی اولاد بھی انسان کی کمائی کا ایک
 حصہ ہے۔ لہذا ماں باپ کے لیے اولاد کی کمائی سے کھانا بالکل درست اور جائز ہے
 حرام اشیاء میں سے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا ذکر ہو چکا ہے اور ان
 کی وضاحت بھی گزشتہ درس میں ہو چکی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے

انسان کے کسی عضو کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

انسان کا خون اگرچہ اعضا کی مانند تو نہیں ہے۔ مگر اعضا کی طرح محترم ضرور ہے لہذا اس کا استعمال بھی دوسرے اعضا کے استعمال کی طرح ناجائز ہے۔ اور عام حالات میں ایک شخص کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں ایک اضطراری حالت ایسی ہے جس میں وقتی طور پر حرام چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر آیت کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔ چونکہ انسانی اور حیوانی جسم و روح کا تعلق خون کے واسطے سے قائم رہتا ہے۔ اس لیے جب جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم ہو جائے کہ جان بچانا مشکل نظر آئے تو ایسی مجبوری کی حالت میں انتقال خون کی اجازت ہوگی۔ اور وہ بھی اس مقدار تک کہ اس سے کم پر جان کو خطرہ ہو۔ بلاوجہ کئی کئی بوتل خون لگا کر جانا جائز نہیں ہوگا۔ لہذا اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ انتقال خون دوائی سے بڑھ کر خوراک کی حد میں داخل نہیں ہوتا چاہیے۔

خنزیر کی حرمت کا بیان بھی گذشتہ درس میں آچکا ہے۔ یہ جانور کھچلی ساری امتوں میں حرام رہا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ عیسائیوں نے اسے بھیسٹر بکری کی طرح استعمال کیا حالانکہ تو رات کے سفر الاخبار میں صاف موجود ہے کہ خنزیر نہ تو جگالی کہہ سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا پاؤں پھٹا ہوا ہے لہذا یہ قطعی حرام ہے۔ مفسر استثناء میں بھی خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

محرمات اربعہ میں سے پہلے تین کا بیان گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب یہاں پر چوتھے حرام کا بیان آئے گا۔ اور وہ ہے وَمَا أَهْلَ بِهِ لَفِیْرِ اللّٰهِ یعنی تہائے لیے وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ کے سوا غیر کا نام پکارا جائے۔ یعنی ایسا جانور یا کوئی دوسری چیز جسے غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نامزد کیا جائے ایسی چیزیں مردار سے بھی زیادہ خباثت برکت کر جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ لَوْ قَصَدَ

غیر اللہ کے
نام پر

بِذَٰلِكَ يَجْهَرُ الْمُتَّقِبُ إِلَىٰ غَيْرِ اللَّهِ بِشَخْصٍ غَيْرِ اللَّهِ كَتَقَرُّبٍ أَوْ خَوْشَنُودِي كَلِے
لِے جَانُورِ ذَبْحِ كَرِے صَارَ مُرْتَدًّا وَهُوَ مُرْتَدٌّ هُوَ جَانُورِ كَرِے۔ اور اس کا مذبح بھی
مردار کی طرح حرام ہو گا۔ مثلاً کسی بہت لات، عزیزی کے نام پر ذبح کیا ہے یا فرشتوں
جنوں، انبیاء، بزرگ، پیر، فقیر کے نام پر ذبح کیا ہے، سب حرام ہو گا۔ اس میں مجبوی
بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی آگ کے نام پر تقرب حاصل کرتے ہیں۔

ذبح کے بارے میں مسلم شریف کی روایت موجود ہے۔ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ
لِغَيْرِ اللَّهِ حَوْلَ اللَّهِ كَلِے سوا کسی غیر کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت
ہے۔ فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص حاکم کی آمد پر اس کی تعظیم
کے طور پر جانور ذبح کرے گا، تَوَدَّ مَا أَهْلُ بِلَدِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ مِیں داخل ہو کر حرام
ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر بوقت ذبح بِسْمِ اللَّهِ اللَّهُ اکبر بھی کہ دیا، تو وہ حلال
نہیں ہو گا، بلکہ مردار ہی ہے گا، وجہ یہی ہے کہ اس نے ایک جاندار کی جان حاکم
کے تقرب اور اس کی خوشنودی کے لیے لی ہے۔ حالانکہ جان کا لینا صرف
اللہ ہی کے نام پر ہو سکتا ہے۔ اور اگر جانور ذبح کرنے سے مقصود مہمان کی ضیافت
کرنا ہو، تو پھر یہ جائز ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تقرب اور ضیافت میں
تفریق کرنا آسان ہے۔ کسی شخص سے کہا جائے کہ بھائی یہ جانور مت ذبح کر و بلکہ
اس کی بجائے اتنی ہی مقدار میں گوشت لے کر پکا لو اور مہمان کی مہمان نوازی کر لو۔
اور اگر وہ شخص مان جائے تو یہ ضیافت ہو گی۔ اور اگر وہ کہے کہ میں تو جانور ہی ذبح
کر دوں گا، تو اس کی نیت ضیافت کی نہ ہو گی بلکہ تقرب کی ہو گی اور یہی چیز حرام ہے
مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ذبح کرتے وقت جو بسم اللہ اللہ اکبر کہتا ہے
اس میں اللہ اکبر کی بالکل وہی حیثیت ہے، جو نماز شروع کرتے وقت اللہ اکبر کی
ہے اگر نماز میں ریاکاری کا مادہ ہو گا، تو وہ نماز حرام ہو گی، اسی طرح بوقت ذبح اگر
نیت تقرب غیر اللہ کی ہو گی، تو وہ ذبح بھی مردار کی طرح حرام ہو گا۔ ہاں اگر نفلی
نماز تقرب الی اللہ کے لیے ادا کرے اور اس کا ثواب کسے دے کہ اللہ

کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ذبح تقرب الی اللہ کے لیے کرے، اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچا دے، تو اس کی ممانعت نہیں۔

مَا أَهْلٌ بِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ كَامَرَّةٌ بَطْنُ الْأَهَمِّ مَسْلُكٌ هُوَ - شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا نانوتویؒ نے اس کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس سلسلہ میں مولانا نانوتویؒ کا ایک مکتوب بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذبح کے حلال ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، اور اس کے حرام ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو غیر اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ زمانہ جاہلیت کے مشرک نیت سے بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لیتے تھے۔ مومنوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نیت سے بھی تقرب الہی چاہتے ہیں اور بوقت ذبح بھی اللہ اکبر کہتے ہیں۔ البتہ اس دور میں مبتدعین کا ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو ذبح کرتے وقت تو اللہ ہی کا نام لیتے ہیں مگر نیت غیر اللہ کی خوشنودی کی ہوتی ہے۔ یہ شرک اور نفاق ہے۔ داتا صاحبؒ کی نیاز کے طور پر ذبح کیے گئے جانور پر اگر اللہ اکبر بھی کہ دیا جائے گا، تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ یہاں پر نیت میں فسور ہے یہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص خنزیر کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، یا یہی عمل کتے پر دہرائے، تو وہ حرام ہی رہیگا۔ ہاں کوئی شخص غیر اللہ کی نیاز سے تو بہ کرے، اور پھر اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، تو جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل لغیر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اور اگر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے تو ذبح حلال ہے۔ یہ غلطی ہے۔ اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا یا شہرت دینا ہے اسی لیے چاند نظر آ جانے کو اہلال کہتے ہیں۔

اہل کا مفہوم

اب اگر کسی جانور یا چیز کے متعلق شہرت دی جائے کہ یہ چیز پیران پیر یا فرشتوں یا پیغمبر کی نیاز ہے۔ تو یہ اہل لغیر اللہ میں داخل ہو کر شرک کا ارتکاب ہوا اور چیز حرام ہو گئی۔

تابعین کے زمانہ میں ایک مسئلہ پیدا ہوا تھا، جسے امام قرطبی نے نقل کیا ہے مسئلہ یہ تھا کہ بچوں نے کھیل کھیل میں گڑیا اور گڈے کی شادی طے کی اور اس خوشی میں اونٹ ذبح کیا، تو اس اونٹ کا کیا حکم ہے، وہ جائز ہو گا یا ناجائز۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ اونٹ گڑیا گڈے کے مجسمے کے نام پر ذبح کیا گیا ہے جو بت کی مثال ہے۔ ہاں اگر یہی ذبح کسی مرد و عورت کے اصل نکاح کے لیے ہوتا تو درست تھا۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں طعام متبایین کا مسئلہ پیدا ہوا۔ دوسرا درول میں اس بات پر مقابلہ ہو گیا۔ کہ ان میں سے کون مہمان نواز ہے۔ ایک سردار نے مہمانوں کے لیے دس اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے بیس کر دیے۔ پہلے نے سو اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے چار سو ذبح کر دیے۔ اسی طرح ایک سردار نے مہمان نوازی کے لیے دس من آٹا گوندھا تو دوسرے نے بیس من گوندھ دیا۔ پھر پہلے نے حوض بھر آٹا گوندھا تو دوسرے نے اتنی زیادہ مقدار میں آٹا گوندھا کہ جب اس میں گھوڑا دوڑایا گیا تو وہ پھنس گیا۔ حضرت علیؑ کی خدمت میں مسئلہ پیش ہوا کہ آیا اس قسم کا کھانا جائز ہے یا نہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ریاکاری کی بنا پر ہوا ہے۔ لہذا ایسا کھانا حرام ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا تقرب مطلوب نہیں بلکہ غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے۔

بعض لوگ مکان بناتے وقت اس کی بنیادوں میں جانور کا خون ڈالتے ہیں اس ذبح سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنات کے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی نیا کے طور پر جانور ذبح کر کے فقرار کو کھلایا جائے تو درست ہے۔

چار محرمات کو بیان فرمایا کہ یہ سب النان کے لیے حرام ہیں البتہ — ایک صورت ایسی بھی ہے کہ یہ حرام مباح ہو جاتے ہیں فَمِنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ط جو کوئی اضطراری حالت میں ہو، مثلاً بھوک سے مر رہا ہے اور صرف محرمات میں سے کوئی چیز میسر ہے۔ تو ایسی صورت میں جان

حالت اضطرار

بچانے کی خاطر ان اشیاء کا کھانا درست ہوگا۔ فرمایا یہ اس حد تک ہی جائز ہے۔ کہ نہ تو بغاوت پر آمادہ ہے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد یہ ہے کہ اضطراری حالت میں مباح چیز سے نہ لذت طلب کرے اور نہ اس کو حلال سمجھے۔ اور تعدی سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز کم از کم مقدار میں استعمال کرے جس سے اس کی جھوک دور ہو سکتی ہو۔ اور ضرورت سے زیادہ کھائے گا، تو عادی میں داخل ہو جائے گا۔ بعض دو سکر آمہ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد بغاوت کرنے والا ہے اور عادی سے مراد معصیت کرنے والا ہے مثلاً ایک شخص چوری کی نیت سے جا رہا ہے اور اس پر اضطراری حالت وارد ہو گئی تو ایسے شخص کے لیے مباح نہیں ہوگا۔ وہ گناہ میں مبتلا ہے۔ اور ایسی حالت میں اگر اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو کوئی پروا نہیں۔ بہر حال فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اضطرار تین حالتوں میں ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حالت وارد ہو جائے، تو حرام کا کھانا مباح ہو جائیگا، اور جان بچانے کی حد تک جائز ہوگا۔ شدید جھوک لگ رہی ہو یا سخت بیماری ہو اور حرام کردہ چیز استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہ ہو۔ تیسری حالت اضطرار یہ ہے کہ کوئی غالب مغلوب کو ایسی چیز کھانے پر مجبور کر دے، اور عدم تعمیل کی صورت میں جان کا خطرہ ہو، تو ایسی حالت میں بھی حرام چیز مباح ہوگی۔ فرمایا مجبوری کی حالت میں حرام کو استعمال کرنے پر کوئی مواخذہ نہیں إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے وہ کسی مخلوق پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

اس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر نامزد کی ہوئی چیز، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے جانور مثلاً کتا، بلی، رتھچھ، بندر، لنگور، گدھا، کوا، چھپکلی، کیرٹے، مکورٹے وغیرہ حرام ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ یہاں

ایک شیعہ اور
اس کا ازالہ

صرف ان چیزوں کا نام لیا گیا ہے، جو عام طور پر استعمال میں آتی ہیں۔ اور مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کو کبھی حلال نہ جانا، یہ قطعی حرام ہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی حرام ہیں جن کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقامات پر آتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی بعض اشیاء کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ لہذا ان چار کے علاوہ باقی سب چیزوں کو حلال سمجھنا درست نہیں۔

صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ شرک لوگ چار حلال چیزوں کو حرام سمجھتے تھے۔ ان کا ذکر سورہ مائدہ میں موجود ہے۔ کہ وہ لوگ بکھر، سائبہ، وحیدہ اور حام کو حرام سمجھتے تھے، مگر اللہ نے فرمایا، کہ ہم نے تو ان چیزوں کو حرام نہیں کیا، تم نے ان کی حرمت کس شریعت سے نکالی ہے۔ ان چار حلال چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چار چیزیں قطعی حرام ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و ہشت (۶۸)

الْبُقَرَةُ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۶

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتُرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۴۲﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالسَّغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۴۳﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ طَوَّانَ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۴۴﴾

تَرْجُمہ

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں، جس کو اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے، اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت خریدتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نہیں کھاتے (بھرتے) اپنے پیٹوں میں مگر آگ۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا۔ اور نہ اُن کو پاک کرے گا۔ اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا ﴿۱۴۲﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خریدا ہے۔ یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں ﴿۱۴۳﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، البتہ وہ صند میں دو درجا پڑے ہیں۔ ﴿۱۴۴﴾

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے طہیات اور محرمات کا قانون بیان کیا ہے مشرکین کا رد کیا ہے۔ اور توحید کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کردہ قانون کی پابندی کا حکم دیا ہے اس سے پہلے

گذشتہ پیر

ملت ابراہیمی کے اہم اصول ذکر، شکر، صبر نماز، توحید پر یقین اور شعاۃ اللہ کی تعظیم کا بیان بھی آچکا ہے۔ ذرائع معاش کا بھی تذکرہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین و آسمان کے درمیان مختلف ذرائع معاش پیدا فرمائے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے توحید پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اور گزشتہ دو دروسوں میں حلال و حرام پر بھی کافی گفتگو ہو چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا
وَالْعَنَتُ كَمَا يَسْتَحِقُّونَ

وہاں لعنت کے مستحق ہیں

کستانِ حق پہ
حقیر مفاد

آیاتِ زبورِ درج میں کتمانِ حق کا دوبارہ بیان آرہا ہے۔ اور پھر اس سے حاصل ہونے والے حقیر مفاد کا تذکرہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ بِشَكٍّ وَّهٗ لَوْ كُنَّ لَوَّاعًا نَّارًا ۚ وَكَيْشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ وَكَانَ اَسْكُوْنًا ۚ فِىْ بُطُوْنِهِمْ ۚ اِنَّ النَّارَ اِلٰیہٗ لَمُنَادٍ يَّجْعَلُ فِىْ اُذُنِہٖ اُكْرٰہًا ۚ وَّكَانَ اَسْكُوْنًا ۚ فِیْ بُطُوْنِہٖمْ ۚ اِنَّ النَّارَ اِلٰیہٗ لَمُنَادٍ یَّجْعَلُ فِیْ اُذُنِہٖ اُكْرٰہًا ۚ وَّكَانَ اَسْكُوْنًا ۚ فِیْ بُطُوْنِہٖمْ ۚ اِنَّ النَّارَ اِلٰیہٗ لَمُنَادٍ یَّجْعَلُ فِیْ اُذُنِہٖ اُكْرٰہًا ۚ

یہود و نصاریٰ کی طرف سے کتمانِ حق کے متعلق پہلے پارہ میں بھی بیان ہو چکا ہے وہ دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر خدا تعالیٰ کے احکام کو چھپاتے ہے کتمانِ حق ایک ایسا سنگین جرم ہے، جسکو اللہ تعالیٰ بتکرار بیان فرماتے ہیں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ بیماری اہل کتاب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہی بیماری مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔ معمولی دنیوی نفع کی خاطر عاقبت کو بہ بادِ کر لینے میں اب مسلمان بھی شریک ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں عقائدِ حقہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ دو سکر مقام پر آتا ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تَبٰیٰنًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ۚ یَعْنِیٰ ہم نے ایسی کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اہم باتیں ہیں۔ جن کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔ اور پھر ان باتوں کی تفصیل اور تشریح اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام

کے سپرد فرمائی۔ لَتَبَيْنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ میں یہ حکم موجود ہے۔

شاہ رفیع الدین اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلے پائے میں کتمان حق کا جو بیان ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب حضور نبی علیہ السلام کی بعثت کے متعلق جو پیشین گوئیاں موجود تھیں انہیں چھپاتے تھے۔ اور اس مقام پر کتمان حق کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام بابت حلال و حرام وغیرہ کو چھپاتے تھے۔ کتمان حق بلاشبہ کفر ہے۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان مرد و زن کے لیے تعلیم جبری ہونی چاہیے، تاکہ وہ حقوق و فرائض اور حلال و حرام کو پہچان سکیں۔ اسی لیے فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ ضروریات دین کا یکھنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کو پورا نہیں کریں گے، تو جہالت کی بنا پر کتمان کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔

علم قرآن کی
اشاعت

حضرت مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا علم ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں تک نہ پہنچانا ایسا ہے۔ جیسے کسی جنگل بیابان میں پانی کا چشمہ یا کنواں ہو، اور کوئی شخص اس پر زبردستی قابض ہو جائے۔ لوگ پیاس بجھانے کے لیے چشمے پر جاتے ہیں مگر وہ قابض شخص انہیں پانی نہیں پینے دیتا۔ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کتنا بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح قرآن پاک کا عالم اگر دوسرے لوگوں کی آبیاری نہیں کرتا، تو وہ غاصب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ہم فلاں بستی میں گئے، وہاں پر پانی موجود تھا، مگر ان لوگوں نے ہمیں پینے کے لیے پانی نہ دیا، جس کی وجہ سے ہمیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تو حضور علیہ السلام کے صحابی نے فرمایا ہَلَّا وَضَعْتُمْ فِيهِمُ السِّيفَ تم نے میانوں سے تلواریں کیوں نہ نکال لیں۔ یہ تو بڑا جرم ہے۔ کہ لوگ پانی کے بغیر مر رہے ہیں اور کوئی شخص پانی سے روکتا ہے۔

الغرضیکہ! قرآن پاک کا علم دوسروں تک نہ پہنچانا بہت بڑا جرم ہے۔

آج دنیا قرآنی تعلیم کے بغیر ہلاک ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے علمائے عام کرنے کی بجائے بے چھپا ہے ہیں اور اس کے بدلے میں بدعتا جاری کر رہے ہیں۔ سائل سے پیسے لے کر غلط ملط فتوے جاری کر رہے ہیں، کہیں نذرانہ اور شکرانہ وصول کیا جا رہا ہے کہیں رسومات باطلہ کو رواج دیا جا رہا ہے۔ مردوں کو بخشوانے کی فیس وصول کی جاتی ہے۔ تبرکات کے نام پر لوٹا جا رہا ہے۔ کہیں ہشتی دروازہ بنا دیا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا سیدھا جنت میں جائیگا۔ کہیں تسبیح پڑھتی ہو رہی ہے۔ چمٹھاوے چمٹھائے جاتے اور وصول کیے جاتے ہیں۔ کہیں گیارہویں منائی جا رہی ہے، کہیں عرس ہو رہا ہے اور کہیں میلاد منایا جا رہا ہے۔ کہیں تیسرے اور دسویں کا ختم اور کہیں چالیسویں کا ختم ہے۔ لوٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے دین کے ابتدائی اصول کہاں کھو گئے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس کون دیگا، مقام رسالت کو کون بیان کرے گی، احوال و عہد کی تمیز کون بتائے گا، علما نے ان بنیادی چیزوں کو چھپا لیا ہے اور خرافات کی تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ کمان حق نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کو چھپاتے ہیں۔ اور اس سے حقیر مفاد حاصل کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّامُوسَ وَهُوَ لَدَىٰ آيَاتِهِمْ خَالٍ فَهُمْ لَا يَتَذَكَّرُونَ۔ کہ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ انہما یجربون فی بطنہ نار جہنم۔ اسی طرح یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں۔ لہذا باطل رسوم کے ذریعہ لوگوں کا مال کھانا، شرک اور بدعات کا اجر یہ سب پیٹ میں آگ بھرنے والی بات ہے۔

فرمایا ایسے لوگوں پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہونگے

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی

ان کی طرف مہربانی کے ساتھ توجہ کرنا تو درکنار وَلَمْ يَكْلَمْهُمْ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کلام کرنا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی طرف غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَلَمْ يَزَكَّهُمْ اللَّهُ اُن کا تزکیہ بھی نہیں کریں گے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ان الموحدین لا یخلد فیہا خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھنے والے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ گنہگار ہونے کی صورت میں دوزخ میں جائیں گے مگر تزکیہ کے لیے۔ جب اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اُن کو پاک کر دیں گے اور وہ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے مگر یہاں یہ کتمان حق کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی پاک نہیں کرے گا، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ہیں گے وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور وہاں ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

فرمایا اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَالْعَذَابِ بِالْمَغْفِرَةِ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا ہے۔ اگر یہ لوگ حق کو چھپانے کی بجائے اُسے ظاہر کرتے۔ خود بھی حق پر عمل کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی عمل پیرا ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی، ان کو گناہوں کی معافی ملتی اور یہ قیامت کے دن سرخرو ہوتے۔ مگر یہ لوگ تو خود دوزخ کو اختیار کر رہے ہیں۔ فَمَا أَصْبَرُہُمْ عَلٰی النَّارِ یہ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں۔ ان کا بڑا حوصلہ ہے جو دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے مگر ان لوگوں نے اُسے چھپا لیا ہے۔ حق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوا فِی الْكِتٰبِ اور جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا۔ یعنی اپنی مرضی کا مطلب بیان کیا، جیسا کہ یہودیوں کا شیوہ ہے۔ کہ وہ مطلب بھی غلط بیان کرتے ہیں اور تشریح بھی غلط کرتے

خوار کاٹو

ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں
 ایسے لوگوں کے راہِ راست پر آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی، وہ سزا کے
 مستحق ہیں۔ یہ حکم تاکیداً دوبارہ فرمایا۔ اس کے قوانین آگے بھی آئیں گے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقَرَةُ ۲

درس شصت و نہ (۶۹)

آیت ۱۷

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُؤْا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَاسْتَكْبَرَ
وَالنَّبِيِّنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: جو نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھيرو۔
بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور قیامت کے دن پر اللہ کے
فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر۔ اور دیا اُس نے مال
اُس کی محبت پر قربت داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، اور مسافروں کو اور محتاجوں کو
اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرنا جاری۔ اور اپنے
وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب کہ عہد کرتے ہیں۔ اور سختی اور تکلیف میں صبر کرنے
والے ہیں اور لڑائی کے وقت بھی یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷﴾

بنی اسرائیل کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم
علیہ السلام کا ذکر کیا تھا۔ اور ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر کا بیان تھا۔ اور اس کو قبلہ مقرر کیے جانے
کی وجہ بیان فرمائی تھی۔ اس پر اہل کتاب کے اعتراض کا بھی ذکر ہوا۔ اس کے
بعد اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کے اہم ترین اصول بیان فرمائے جن پر ہر شخص کا
کاربند ہونا ضروری ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، شکر، صبر اور تعظیم شعار اللہ

گزشتہ
پیوستہ

شامل ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر فرمایا، اور مشرکین کا رد فرمایا، حلال و حرام کا قانون بیان فرمایا۔ پہلے پوری نسل انسانی کو تلقین فرمائی، اس کے بعد اہل ایمان کو خصوصی طور پر حلال و حرام کے قوانین اور محرمات کی تفصیل بیان فرمائی۔ اور پھر اللہ جل جلالہ نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا، کہ اہل کتاب نے تحویل قبلہ کی سخت مخالفت کی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرنے کا کیوں حکم دیا۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے بتلا دیں۔

استقبال قبلہ
فروعی مسئلہ ہے

اہل کتاب نے تجویز قبلہ کے خلاف سخت پراسپیکٹڈ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنا ہی اصل نیکی ہے۔ اور اگر اس طرف رخ نہ کیا جائے تو کوئی نیکی اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگی۔ اُن کے مطابق جب مسلمانوں نے قبلہ تبدیل کر لیا تو اُن کی ساری نیکیاں ضائع ہو گئیں۔ اہل کتاب نے قبلہ کو اس قدر اہمیت دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اہل کتاب کے اس زعم کی تردید فرمائی ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ استقبال قبلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک فروعی مسئلہ ہے۔ جسے اہل کتاب ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم بیت المقدس کی طرف رخ کرنا ہے۔ اور جب اُس نے پسند فرمایا تو رخ بیت اللہ شریف کی طرف ہو گیا۔ اس میں ایسی اچنبھے کی کون سی بات ہے

نیچا کیا

اس آیت پاک میں اسی چیز کو واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لَيْسَ الْبِرُّ
 اَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ نیکی صرف یہ نہیں کہ مشرق
 یا مغرب کی طرف رخ کر لیا جائے۔ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بلکہ اصل نیکی اسی کی ہے
 جو ایمان لایا اللہ پر قیامت پر فرشتوں پر کتابوں پر اور نبیوں پر، اور آگے نیکی کی
 دوسری باتیں بھی بیان کی ہیں۔ مفسر قرآن امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآن
 پاک کی جامع ترین آیت ہے۔ کیونکہ اس ایک آیت میں کئی ایک مسائل آگے
 ہیں۔ دینی مسائل کا زیادہ تر تعلق اصلاح عقیدہ، اخلاق یا تہذیب نفس سے ہے
 اور یہ سارے مسائل اس آیت میں موجود ہیں۔ گویا یہ آیت تمام دینی مسائل کا خلاصہ ہے۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ ایمانیات کا ہے۔ جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا، کوئی عمل مقبول نہیں۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین صحیح اعتقاد سے محروم ہیں اُن کا عقیدہ مشرکانہ ہونے کی بنا پر باطل ہے۔ لہذا یہ سب نیکی سے یکسر محروم ہیں، مگر قبلہ کے مسئلہ پر جھگڑا کرتے ہیں۔

ایمان باللہ

تو فرمایا نیکی یہ ہے کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کی ذات اور اُسکی صفات پر ایمان لانا نیکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ضروری ہے اسی طرح اُسکی صفات کو ماننا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار بھی اُسی طرح کفر ہے جس طرح اُس کی ذات کا انکار دہریت ہے۔ مثلاً مقدر کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہوا۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی شخص احد پیارے کے برابر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا خرچ کرتا ہے مگر تقدیر پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی اتنی بڑی خلیت بھی مقبول نہیں۔

ایمان بالآخرت

ایمان باللہ کے بعد فرمایا، نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا وَالْيَوْمِ الْآخِرِ آخرت کے دن پر۔ قیامت کے دن پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان دہریہ یا کافر ہوگا۔ اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ ایمان بالآخرت میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یا جنہیں حضور نبی کریم رُوف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنا، حجاب کتاب کا منعقد ہونا، نیکی بدی کا امتیاز، پلصراط سے گزرنا، دوزخ، جنت وغیرہ یہ سب چیزیں ایمان بالآخرت میں داخل ہیں۔ لہذا نیکی اُس شخص کی ہے جو ان سب چیزوں پر ایمان لایا۔

ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ وَالْمَلَائِكَةِ یہ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہے، جسے اللہ جل شانہ نے زمین و آسمان اور اس کائنات کی تخلیق سے لاکھوں سال پہلے پیدا فرمایا۔ اور یہ بھی نوع انسانی کی مصلحت کی خاطر اہتمام فرمایا۔ فرشتوں کی آگے دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ملا اعلیٰ والے فرشتوں کی ہے، جو حظیرۃ القدس میں ہیں۔ اور دوسرے ملا سافل والے ہیں، جو ملا اعلیٰ والوں کے معاون ہیں یہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے پر مستعد رہتے ہیں اور کائنات تک فیضانِ ہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں چنانچہ ایمان بالملائکہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

ایمان بالکتاب

ایمان کے چوتھے جزو کے طور پر فرمایا وَالْكِتَابِ یعنی کتاب پر ایمان لانا بھی مکمل ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کتاب سے مراد عیسٰی کتاب ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی کتابیں نازل فرمائی ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اَمَّا اَنْتَ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ لِّعَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی نے نوح انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جو کتاب بھی اتاری ہے۔ اس پر میرا ایمان ہے۔ کہ وہ برحق ہے۔ اور پھر کتبِ سماویہ کے سلسلہ کی آخری کتاب قرآن حکیم پر تفصیلی ایمان لانا ضروری ہے۔ پہلی کتابوں پر صرف ایمان لانا ضروری ہے، ان پر عمل کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان میں سے بعض احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ البتہ آخری کتاب قرآن پاک پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے احکام قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہیں۔ وَالنَّبِیِّنَ اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالانبیاء

دیگر اجزائے ایمان کی طرح انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی رسول اور نبی مبعوث ہوئے ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لحاظ سے لَا تَفْرِقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِمْ کسی رسول میں فرق نہیں کرتے۔

الغرض ایمان کی تمام جزئیات کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا انکار یا کسی چیز میں شک کہ ناگہمی کے مترادف ہے، اس کے بعد نیکی کے باقی اجزاء کا بیان ہے، جن کا تعلق تہذیب نفس سے ہے یا مال کے ساتھ ہے یا انسان کے بدن سے ہے۔

اتفاق فی سبیل اللہ

فرمایا مال کے لحاظ سے نیکی یہ ہے کہ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ کوئی شخص

مال کے ساتھ محبت ہونے کے باوجود اُسے خرچ کرے۔ انسان کی مال کے ساتھ محبت ایک فطری امر ہے۔ دوسرے مقام پر خود قرآن پاک نے بیان کیا اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ انسان مال کی محبت میں سخت ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اگر مال صرف کرتا ہے۔ تو یہ نیکی کا کام ہے۔ اس سے انسانی ہمدردی اور اجتماعیت کا سبق ملتا ہے علیٰ حُبِّہ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی بناء پر اس کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کو کس جگہ خرچ کرنا ہے۔ تو فرمایا ذَوِی الْقُرْبٰی اپنے قرابت داروں پر خرچ کرنا ہے۔ اِنْفَاقٌ فِیْ سَبِيلِ اللّٰہِ کی یہ اولین مد ہے۔ اپنے عزیزوں پر خرچ کرنے پر دوسرا اجر ملتا ہے۔ ایک اجر صلہ رحمی کا حاصل ہوتا ہے اور دوسرا صدقہ کا۔ قرابت دار اگرچہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ مستحق ہے۔ تو اس پر خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہے۔

خرچ کی دوسری مد کے متعلق فرمایا وَالْمَسٰکِیْنِ یَتِیْمُوْنَ اور مسکینوں کی حاجت براری بھی نیکی ہے۔ نابالغی کی حالت میں ہو اور باپ فوت ہو گیا ہے۔ کھانے والا کوئی نہیں رہا۔ یتیم ہو گیا ہے، اس کی سرپرستی ضروری ہے۔ اس پر مال خرچ کرنا چاہیے اور مسکین وہ ہے۔ جو محنت مزدوری کرتا ہے۔ مگر کوٹشش کے باوجود اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، وہ بھی مستحق ہے ایسے شخص کی مالی اعانت یقیناً نیکی کا کام ہے۔ فرمایا وَابْنُ السَّبِيلِ اور وہ مسافر بھی امداد کے مستحق ہیں۔ جو دوران سفر محتاج ہو جائیں، زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔ یا چوری ہو گئی ہے یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تو ایسے شخص پر خرچ کرنا بھی نیکی ہے۔ خرچ کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ فرمایا وَالسَّائِلِیْنَ محتاج بھی اعانت کے مستحق ہیں۔ ان پر مال خرچ کرنا بھی نیکی کا کام ہے۔ سائل کے لفظی معنی مانگنے والے کے ہیں۔ مگر مراد محتاج ہیں۔ کیونکہ سوال برائے سوال درست نہیں ہے۔ جب تک کہ سائل

واقعی مستحق نہ ہو۔ بلا ضرورت سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور پیشہ وارانہ گدگری کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ شرعی سائل وہ ہے جو ہر لحاظ سے محتاج ہو۔ اور اس کیلئے سوال کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہ ہے۔ ایسے شخص کو سوال کرنا جائز ہوگا، اور اس سوال کو پورا کرنا نیکی کا کام ہوگا۔

انفاق کی ایک اور مدنی السرقاب یعنی گردنوں کا آزاد کرنا ہے اس کا عمومی مضموم غلاموں کی آزادی ہے۔ غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے یا کسی مکاتب کا زمرہ مکاتبت ادا کر کے اسے آزادی دلائی جائے۔ اس کی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ کسی مقروض کا قرض معاف کر کے یا اس کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑائی جائے۔ اس آیت پاک کے مطابق ایسا کرنا بھی نیکی ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔ فرمایا نیکی۔

صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نہیں بلکہ اصل نیکی ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ ہے پھر فرمایا کہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے قَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ نماز کے ذریعے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوتا ہے۔ اور اُسکی توجہ حظیرۃ القدس کی طرف ہو جاتی ہے۔ گویا فوز و فلاح کا اہم ترین ذریعہ نماز ہے، جو کہ بدنی عبادت ہے۔ اور بہت بڑی نیکی کی بات ہے۔

زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور یہ فرائض میں شامل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے اِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سَوَى الزَّكَاةِ یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ صرف زکوٰۃ کے ادا کر دینے سے مال کا مکمل حق ادا نہیں ہو جاتا، یہ تو فرض ہے اور صاحب نصاب ہر سال ادا کرتا ہے جب کوئی شخص نصاب کو نہیں پہنچ پاتا تو زکوٰۃ فرض نہیں رہتی۔ البتہ سال کے دیگر حقوق باقی رہتے ہیں جیسے فرمایا۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْضُرِّ یعنی اس میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔ اس میں اہل و عیال اور قرابت داروں کا حق ہے۔

والدین کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو اکٹھا بیان فرمایا ہے۔ ایک بدنی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیس^{۳۲} مرتبہ اَقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اتنے اہم فرائض ہیں۔ جن کے ذریعے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف مخلوق خدا کے ساتھ روابط بڑھتے ہیں۔ لہذا ان دونوں امور کو نیکی میں شامل فرمایا۔ کہ نیکی اُس شخص کی ہے جو نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔

ایمانی عہد

نیکی کی ایک اور قسم ہے وَالْمُؤْمِنُونَ بَعَثُوا إِذَا عَاهَدُوا۔ یعنی نیکی اُن لوگوں کی ہے کہ جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ ایمانی عہد حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کا ایک بنیادی اصول ہے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا۔ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ اپنے عہد کو پورا کیا کرو۔ نیز تم ہیہب کے انداز میں فرمایا اَوْفُوا بِالْعَهْدِ لوگو! اپنے وعدہ کا پاس کیا کرو۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا قیامت کے دن اس کی باز پرسی ہوگی۔ وعدہ خواہ اللہ تعالیٰ سے ہو یا اُس کی مخلوق سے، اس کی وفا لازم ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَوَاللَّهِ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ تیرے احکام کی تکمیل کروں گا۔ مگر پھر جب اس وعدے کو پورا نہیں کرتا تو اس میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق سے وعدہ خلافی بھی نفاق کی علامت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی اُن لوگوں کی ہے جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

صبر کی عظمت

اس کے بعد فرمایا نیکی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرِّ أَوْ جَوْ سَخْتٍ اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں۔ بَأْسَاءِ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان پر باہر سے وارد ہو۔ مثلاً کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے۔ زلزلہ یا طوفان آجائے اور ضرر وہ تکلیف ہے جو انسانی جسم کے اندر پیدا ہوا جیسے بیمار ہو گیا، بھوڑا نکلا۔ جسم کے کسی حصے میں درد ہونے لگا، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض فرمایا کہ نیکی ان لوگوں کی ہے

جو اندرونی یا بیرونی پریشانی میں مبتلا ہو کر صبر کرتے ہیں وَحَسْبُكَ الْمُبَاسِ اور وہ لوگ بھی نیکی والے ہیں کہ میدان جہاد میں پہنچنے والی تکلیف کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے صبر کی یہ تین مختلف صورتیں یہاں بیان کی ہیں۔ اور صبر ایسے بھی ہمارے دین کا بنیادی اصول ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ اُسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی صبر اور نماز کے ساتھ امداد حاصل کرو۔ تو یہاں پر صبر کا بیان بھی آگیا۔

فرمایا جن لوگوں میں مذکورہ اوصاف پائے جائیں، نیکی ان لوگوں کی ہے۔ سچے لوگ اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا یہی سچے لوگ ہیں۔ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ایفائے عہد ان کا شیوہ ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ فرمایا اصل نیکی کے کام تو یہ ہیں۔ مگر یہود و نصاریٰ نے قبلہ کے مسئلہ کو جھگڑے کا سبب بنا رکھا ہے اصل نیکی کے کام کرنے والے ہی فائز المرام ہوں گے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے ان کے بیگانے بھی اپنے بن جائیں گے۔ اور اگر ان کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ مال کی محبت میں مبتلا ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز سے عاری ہیں، تو وہ سچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ رشوت اور سود خواہ کیسے سچا ہو سکتا ہے۔ وہ تو ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ قربت داروں، محتاجوں اور غریبوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ نیکی کے راستے پر گامزن نہیں ہے۔

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ جو کفر اور شرک سے پاک ہیں۔ معاصی سے بچتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں گزر چکا ہے۔ کہ یہ کتاب ہُدًی لِّلْمُتَّقِينَ یعنی تقویٰ پکڑنے والوں کے لیے ہدایت ہے اور متقین وہی لوگ ہیں جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں اور لمبے چوڑے دھوے کھکے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا نہیں شروع کرتے۔ جن لوگوں کا نہ اخلاق اچھا ہے اور نہ وہ تہذیب نفس کے حامل ہیں مال کی محبت میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں ان کا تعلق بالشر درست نہیں ہے حقوق و فرائض ادا نہیں کرتے وہ متقی کیسے بن سکتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد (۷۰)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۷۸، ۱۷۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ وَالْحَرْبِ
 بِالْحَرْبِ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ
 مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبِعْهُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدِّ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ
 ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ
 ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ
 يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے اوپر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے مقتولوں میں آزاد
 کے بدلے میں آزاد آدمی، غلام کے بدلے میں غلام، عورت کے بدلے میں عورت
 پس جس کو معاف کیا گیا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق پیچھے
 لگنا ہے، اور اس کی طرف سے نیکی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور مہربانی ہے۔
 پس جس شخص نے اس کے بعد تعدی کی، اس کے لیے عذاب الیم ہے ﴿۱۷۸﴾ اور تمہارے
 لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل مندو! تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۱۷۹﴾

اسلام کا
فوجداری قانون

گذشتہ آیت میں نیکی کی تعریف بیان کی گئی تھی کہ نیکی کیا ہے۔ اور کیا نہیں ہے
 نیکی والے لوگوں کے متعلق کہا گیا تھا کہ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔ اب ان آیات میں
 بعض تقویٰ والی باتوں کا ذکر ہے۔ اور ان میں سے ایک مقتولوں کے معاملہ میں
 مساوات ہے اور دوسرا مال کا قانون ہے۔ اور پھر اس کے بعد روزہ کا قانون بھی
 بیان ہوگا۔ ان سب کا تعلق تقویٰ سے ہے آیات زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے
 اسلام کا فوجداری قانون بیان فرمایا ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی جان

ایک محترم چیز ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی جان تلف ہو جائے تو اس کے لیے قصاص کا قانون بتلایا گیا ہے۔ جس کا اجراء اور پھر اس کی پابندی لازم ہے۔ اگر قصاص نہ ہو سکے، تو پھر خون بہا کا مسئلہ آئیگا۔ جسے دیت کہا جاتا ہے۔ اس مالی معاوضہ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

اسلام کا قانون
بمقابلہ قانون جاہلیت

زمانہ جاہلیت میں قصاص کے معاملہ میں عدم مساوات اور نا انصافی پائی جاتی تھی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ خاندان کے مقتول کا قصاص بھی مختلف تھا۔ اگر کوئی کمزور اور ادنیٰ خاندان کا آدمی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کے ورثہ دوسرا قصاص طلب کرتے ایک مقتول کے بدلے میں دو افراد قتل کرتے یا عورت کے بدلے میں مرد کا قصاص لیتے یا غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس مقام پر یہ بھی تحریر کیا ہے قرابتے ہیں زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب کا دستور تھا کہ عورت کے بدلے میں مرد کو، غلام کے بدلے میں آزاد کو اور ایک آزاد کے قصاص میں دو کو قتل کیا جاتا، یہ زیادتی اور ظلم تھا۔ جو زبردست زبردستوں پر روا رکھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے اونچ، نیچ، شریف اور ذلیل، غلام اور آزاد اور عورت اور مرد کو قصاص کے معاملہ میں برابر قرار دیا۔ اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان حامل دیوار کو گرادیا اور قصاص کے معاملہ میں مساوات کا درس دیا، اسلام نے عالم اور جاہل، بچے، جوان اور بوڑھے، تندرست اور بیمار، صحیح الاعضا اور لنگڑے، اپاہج اور اندھے کے امتیاز کو یکسر ختم کر دیا اور سب میں مساوات قائم کر دی۔ اسلام نے انہیں بتلایا کہ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے۔ لہذا قصاص کے معاملہ میں کسی انسان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔ یہ قانون قانون قصاص کہلاتا ہے

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ اے اہل ایمان! تمہارے اور پرمقتولوں کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر کی کو فرض کیا گیا ہے۔ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے اور قتلی مقتول کی جمع ہے مطلب یہ کہ ایک آزاد مقتول کے بدلے میں ایک ہی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔

ایک کے بدلے میں دو کو تختہ مشق نہیں بنایا جائے گا۔ اسی طرح غلام کے عوض میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو مرد کے بدلے میں مرد ہی قتل ہوگا۔ قصاص کے معاملہ میں کسی قسم کی عدم مساوات روا نہیں رکھی جائے گی۔ قرآن پاک کے الفاظ میں الْحَرِّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَلَا نَفْسٌ بِالنَّفْسِ فرمایا گیا ہے۔

قتل کی تین اقسام

حدیث اور فقہ کی کتب میں قتل کی تفصیلات موجود ہیں۔ قتل کی تین قسمیں ہیں، یعنی قتل عمد، شبہ عمد، قتل خطا، قتل عمد ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو قتل کیا تو اراداً مار ڈالے۔ مثلاً بندوق یا پستول سے فائر کر دے، چھرا یا نیزہ مار دے یا کوئی اور ایسا کہ استعمال کر دے جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قتل کی یہ واحد صورت ہے جس میں قصاص ہے۔ باقی دو صورتوں یعنی قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں خون بہا ہے قصاص نہیں۔ پھر قصاص میں بھی بعض استثناء ہیں۔ مثلاً باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو قصاص نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ معاوضہ اور تعزیر ہوگی۔ جس میں سزائے قید بھی ہو سکتی ہے اسی طرح اگر ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو یا پوتے پوتی کو یا نواسے نواسی کو ہلاک کر دے تو بھی قصاص نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

قتل شبہ عمد یہ ہے کہ کوئی شخص قتل تو اراداً کرتا ہے۔ مگر ایسے آئے کے ساتھ جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً لاکھی، پتھر یا کوئی اور ایسی چیز ماری جس سے قتل واقع ہو گیا۔ تو ایسی صورت میں قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے عوض خون بہا یا دیّت ہوگی۔

قتل کی تیسری صورت قتل خطا ہے۔ جس میں ارادہ قتل نہیں ہوتا بلکہ قاتل کی سہو سے کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً شکاری نے شکار کو نشانہ بنایا مگر وہ کسی آدمی کو لگ گیا اور اس سے قتل واقع ہو گیا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس کا مفصل بیان آگے قرآن پاک میں آئے گا۔

قتل کی تین اقسام میں سے پہلی قسم یعنی قتل عمد میں قصاص یعنی جان کا بدلہ جان ہے

سزا قتل

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرے گا، تو اس کے بدلے میں وہ بھی قتل کیا جائے گا۔
 باقی دو صورتوں یعنی قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں دیت ہے قصاص نہیں۔ اب قصاص
 لیتے ہیں بھی بعض پابندیاں ہیں۔ مثال کے طور پر مقتول کے چار وارث ہیں۔ اور قصاص
 لینا ان کا حق ہے نہ کہ حکومت کا۔ حکومت کا کام تو صرف حق دلانا ہے۔ اس کے
 لیے انتظام کرنا ہے۔ اصل حق تو ورثا کا حق ہے۔ جو کہ حکومت دلائیگی۔ فرمایا
 فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيٍّ سُلْطَانًا ہم نے مقتول کے ولی کے لیے حق رکھا ہے
 برخلاف اس کے انگریزی قانون میں مستغیث حکومت ہوتی ہے۔ اور پھر جرمانہ کی رقم
 بھی اپنے خزانہ میں داخل کرتی ہے۔ اسلامی قانون میں معاوضہ حاصل کرنے کا حق صرف
 وارثوں کو پہنچتا ہے۔

اسلامی قانون قتل میں یہ ایک اہم شق ہے۔ کہ قصاص صرف اسی صورت میں
 لیا جائے گا، جب کہ تمام وارثان مقتول اس پر رضامند ہوں۔ چار بیٹوں میں سے اگر ایک
 نے بھی قصاص سے دست برداری اختیار کی، تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور قاتل کو دیت
 ادا کرنا ہوگی۔ اور اگر مقتول کے وارث نہ قصاص لیں اور نہ دیت طلب کریں بلکہ
 بالکل ہی معاف کر دیں تو بات ختم ہوگئی۔ اس کی جزا انہیں آخرت میں ملے گی۔ اور اگر
 وارثان قصاص کی بجائے خون بہالینا چاہیں۔ تو قتل عمد کی صورت میں قاتل کو پورا معاوضہ
 ادا کرنا ہوگا۔ اس کی برداری پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ البتہ قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں جب
 دیت ادا کرنا ہوگی، تو قاتل کی ساری برداری ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔ اگر کسی سرکاری
 ملازم سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے۔ تو اس کے معاوضہ کی ادائیگی اس کے دفتر والے
 یا محکمہ والے کریں گے۔ اسے دیت علی العاقلہ کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
 کہ دیت عاقلہ پہ ہوتی ہے اور یہ تین سال کے اندر اندر قسطوں میں واجب الادا ہوتی
 ہے۔ اس میں سارے متعلقین شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے حصے کی قسط ادا کرنا
 پابند ہوتا ہے۔ قاتل کی برداری کو تاوان ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین
 کی تربیت اس طرح کریں کہ اس طرح کے ناخوشگوار واقعات پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

فرمایا قصاص کا قانون تو یہی ہے البتہ فَمَنْ عَفَىٰ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ جَوْزِیٰ پانے
 بھائی کی طرف کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول کے ورثہ خیال کریں کہ قاتل بھی ہمارا دینی بھائی
 ہے۔ اس کی وجہ سے قتل تو ہو گیا۔ مگر برادرانہ تعلقات ختم نہیں ہونے چاہئیں۔ لہٰذا
 اگر ورثہ میں سے کسی ایک نے بھی معاف کر دیا تو مقتول پر قصاص ساقط ہو جائے گا۔
 اور اس کے بدلے میں کیا ہو گا فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ پھر مالی معاوضہ ہے دستور
 کے مطابق کہ لاؤ بھائی معاوضہ ادا کرو وَاذْكُرُوا الْيَوْمَ بِالْحُسْنٰی اور قاتل کو نیکی کے
 ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ معاوضہ ادا کرنا ہی ہے۔ تو لڑ جھگڑ کر نہیں بلکہ نیکی اور بھلائی کے
 ساتھ دستور کے مطابق ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس کا پیچھا کرنا چاہیئے کہ صحیح طریقے
 سے ادا ہو جائے۔ اس میں کوئی مزید خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طریقے سے شریعت
 نے جانوں کی حفاظت کا قانون مقرر فرمایا ہے۔

فرمایا ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ یعنی اس میں تمہارے رب کی
 طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ مطلب یہ کہ پہلی امتوں میں قتل کا بدلہ صرف قتل
 تھا دیت کا قانون موجود نہیں تھا۔ مگر نبی آخر الزمان علیہ السلام کی امت کے لیے
 اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی فرمائی۔ اور قاتل کی سزا میں تخفیف کر کے قصاص کے
 ساتھ ساتھ دیت کا قانون بھی نازل فرمایا۔ چنانچہ شریعت محمدیہ میں تین صورتیں مقرر
 کی گئی ہیں، مقتول کے ورثہ قصاص طلب کر لیں یا مالی معاوضہ قبول کر لیں یا
 بالکل ہی معاف کر دیں، یہ ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔ بہر حال یہ تخفیف اور اللہ کی مہربانی ہے۔

دیت

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار ایک سو اونٹ مقرر فرمائی ہے
 اگر اونٹوں کا تبادلہ نہ ہو سکے تو پھر دس ہزار درہم جو چاندی کا سکہ ہے یا ایک ہزار
 دینار جو سونے کا سکہ ہے، اس کا بدل ہو گا۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جا
 سکتا۔ البتہ اگر فریقین اجناس یا کپڑے کے لین دین پر رضامند ہو جائیں تو مقررہ
 مقدار سے زیادہ بھی لے سکتے ہیں۔ یہ خون بہا کا قانون ہے اور اس کے بعد
 فَمَنْ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ جَوْزِیٰ کوئی زیادتی کا مرتکب ہو۔ یعنی مالی معاوضہ

ٹے کر کے وہ بھی لے لیا۔ اور پھر بعد میں قتل بھی کر دیا، تو ایسی صورت میں قُلُّہ عَذَابِ
 اَلْیَمِّنِ تو ایسا کرنے والا دردناک عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس سے مراد تو آخرت کا
 عذاب ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والے کے لیے
 کوئی معافی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے قصاص ہی لیا جائے گا اس دنیا میں بھی اُسے سزا
 ملیگی اور اگلے جہان میں بھی وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

قصاص میں
 زندگی ہے

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے قصاص کا فلسفہ بھی بیان فرمایا وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ
 حَیْوةٌ یَّٰۤاُولِیْ الْاَلْبَابِ۔ یعنی اے صاحب عقل و خرد قصاص میں تمہارے لیے
 زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا اور جب قصاص
 میں قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا، تو ایک اور جان ضائع ہو گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی
 سے تعبیر فرماتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قصاص کی عدم موجودگی میں لوگ
 بلا خوف و خطر قتل کے مرتکب ہوں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ چھوٹی موٹی سزا
 بھگت لیں گے، جان تو بچ ہی جائے گی۔ برخلاف اس کے جب قصاص کا قانون
 موجود ہوگا۔ اور لوگوں کو علم ہوگا کہ قتل کے بدلے میں قاتل بھی قتل کیا جائے گا، تو وہ
 قتل جیسا بڑا جرم کرتے وقت سو دفعہ سوچے گا۔ اولیٰے افتدائم سے
 باز آجائے گا۔ انگریز کے بنائے ہوئے قانون میں یہی خامی ہے۔ ہر روز کتنے
 قتل ہو رہے ہیں۔ مگر چونکہ قاتل کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی، ایک قتل کے بعد
 اُسے مزید شہ ملتی ہے۔ اور وہ بلا خوف و خطر وارداتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ چوری کا بھی
 یہی حال ہے اگر لوگوں کو حد جاری ہونے کا یقین ہو، تو پھر چوری کرنا اتنا آسان نہ
 ہو۔ سعودی عرب میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہاں حدود اللہ
 جاری ہیں۔ قاتل اور چور بلا دھڑک جرم نہیں کر سکتے جب سے خاندان ابن سعود نے
 حدود نافذ کیں ہیں، چوری کی کتنی سزائیں ہوئی ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں ایک
 سو لوگوں کے ہاتھ بھی نہیں کٹے ہوں گے۔ سزا کی دہشت ہی ایسی ہے کہ سرعام
 سونا پڑا ہو یا ریال کی بوری رکھی ہو، کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ اسلامی قانون

پر عمل درآمد کی برکت ہے۔ اسی طرح اگر زنا کی حد سنگساری ہوگی اور مجرم کو سر عام سزا دی جائیگی، وہاں یہ جرم کیے ہوگا۔ برخلاف اس کے جہاں ایسی عبرتناک سزائیں نہیں ہیں۔ وہاں جہانم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ چند ایک کو قصاص میں قتل کرنے سے عام لوگوں کی جانیں بچ جائیں گی۔

عربی ادب کی کتاب "حماسہ" میں صحابہ کرام کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ کوئی شخص قتل ہو گیا قاتل با اثر آدمی تھا۔ اس کے بہت سے سفارشی تھے حضرت سعید بن العاص بھی انہیں میں شامل تھے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مقتول کا بیٹا قصاص کی بجائے دیت لینے پر راضی ہو جائے کہ سات گنا دیت تک کی پیش کش کی گئی۔ مگر بیٹا یہی کہتا رہا کہ میں تو قصاص لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ ظاہر ہے کہ جب قصاص کا قانون جاری ہو گا تو پھر اس جرم کا ارتکاب کوئی اکاؤنٹ کا ہی کرے گا۔ اکثر لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے گی۔ اسی لیے قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا یہ قانون اس لیے جاری کیا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم متقی بن جاؤ اور ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہ کرو گویا اس قانون کا اجر اصول تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقَرَةُ ۲

درس ہفت دیک (۷۱)

آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا مِّمَّا
 الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى
 الْمُتَّقِينَ ۝ (۱۸۰) فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ
 عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۱۸۱) فَمَنْ
 خَافَ مِنْ مُّوَصٍّ جَنَافًا أَوْ إِثْمًا فَاصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا
 إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۱۸۲)

ترجمہ: فرض کی گئی ہے تمہارے اوپر جس وقت کہ آئے تم میں سے کسی کے
 پاس موت اگر اُس نے مال چھوڑا ہے، تو وصیت والدین کے حق میں اور قرابت داروں
 کے حق میں دستور کے مطابق یہ لازم ہے پڑھیں گارول پر ۝ (۱۸۰) پس جس
 شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سننے کے بعد، بیشک اس کا گناہ
 ان لوگوں پر ہے جو اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے
 والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے ۝ (۱۸۱) پس جس نے خوف محسوس کیا۔ وصیت
 کھسنے والے کی طرف سے ایک طرف مائل ہونے کا یا گناہ کا، پس اُس نے اُن کے
 درمیان صلح کرادی، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ
 بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۝ (۱۸۲)

مخاطبت جان
 کا قانون

گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ قصاص کا قانون تقویٰ کا ایک
 جزو ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری فرما کر انسانی جانوں کی حفاظت
 فرمائی ہے۔ اس کے بغیر انسانی جان کا ضیاع ایک معمولی چیز تھی مگر اللہ تعالیٰ
 نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ اگر عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھو گے، تو جانیں

محفوظ ہو جائیں گی اور تم کو صحیح زندگی نصیب ہوگی۔ اس کے ساتھ قانون دیت بھی حفاظتِ جان ہی کا ایک حصہ ہے۔ گو یا اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے قوانین نافذ کیے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قتلِ ناحق اکبر الجائزہ میں سے ہے۔ یعنی سات بڑے گناہوں میں سے پہلا نمبر شرک کا ہے اور دوسرا قتلِ ناحق کا ہے۔ قَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ حضرت عثمانؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک تو جہاد میں جان کا اٹلا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صرف تین صورتوں میں جان کو تلف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کی جان لے گا تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ پہلی صورت قصاص کی ہے۔ کسی شخص کو قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے، تو وہ جائز ہوگا۔ دوسرا قتلِ اُس مرد یا عورت کا جائز ہے جسے زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا ہو۔ اور تیسرا قتلِ اس شخص کا جائز ہے جو دینِ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔ الغرض گزشتہ درس میں حفاظتِ جان کا قانون بیان کیا گیا تھا۔

اسلام کا ضابطہ
دیوانی

ضابطہ فوجداری کی طرح اسلام نے ضابطہ دیوانی یعنی مال کا قانون بھی عطا کیا ہے جسکی تفصیلات قرآن و سنت میں موجود ہیں اس سے پہلے قصاص یعنی فوجداری قانون کا بیان آچکا ہے۔ دیوانی قانون کی بنیاد کے متعلق قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ خبردار کسی حرام یا مشکوک ذریعے سے مال مت حاصل کرو۔ اگر الیا کرو گے، تو کمال سے محروم ہو جاؤ گے اور جب مال جائز طریقے سے حاصل کرو، تو اس کو غلط اور ناجائز امور پر خرچ نہ کرو۔ اگر بیجا تصرف کرو گے تو ظالم اور گنہگار بن جاؤ گے۔ الغرض مالی امور کے متعلق بھی اسلام نے پورا ضابطہ عطا کیا ہے فوجداری قانون میں انسانی جان کے تحفظ کی ضمانت تھی، اس دیوانی قانون میں مال کے تحفظ کے اصول بتلائے ہیں۔ اور دونوں قوانین کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ اہم شاطبی کا تعلق اندس سے ہے۔ آپ مالکی مسلک کے بہت بڑے

اسلامی قانون
حکمت پر مبنی ہے

اہم گنہ سے ہیں۔ آپ نے ”موافقات“ نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کا سارا قانون حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی شق حکمت سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں بڑی بڑی باریکیاں اور حکیمانہ مصلحتیں رکھی ہیں۔ بھرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت میں اس قدر حکمتیں، مصلحتیں اور باریکیاں موجود ہیں۔ کہ دنیا کے تمام انسان مل کر سمجھیں، تو اس کے برابر نہیں سوچ سکتے۔ آپ ”فیوض الحریں“ میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں بعض آیات پر غور کرتا ہوں تو ان کی تہ میں مجھ پر بجزیراں جیسے وسیع انکشافات ہوتے ہیں۔ جو عام انسانوں کی سوچ و بچار سے باہر ہوتے ہیں۔

تخفظ نفس

اسلام نے جہاں دیگر تحفظات لیے ہیں، وہاں تحفظ نفس کی بھی ضمانت دی ہے۔ نسب بالکل محفوظ ہونا چاہیے۔ اس میں — غلط ملط نہیں ہونا چاہیے۔ برخلا اس کے غیر اقوام میں تحفظ نسب کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ڈاکٹر اسپنسر گزشتہ صدی کا بہت بڑا فلاسفر ہوا ہے۔ اب تو یورپ کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس وقت صرف چالیس پینتالیس لاکھ تھی وہ کہتا ہے کہ یورپی قانون پر لعنت ہو کہ پینتالیس لاکھ میں سے یقین کے ساتھ پینتالیس آدمی بھی حلال کے نہیں نکالے جاسکتے، یہاں کا قانون ایسا گندہ ہے مگر اسلام نسب کی حفاظت کرتا ہے قرآن و سنت میں اس کے متعلق بہت سے قانون موجود ہیں اسی طرح دین کی حفاظت کا قانون بھی اسلام میں موجود ہے۔ اگلی آیات آرہی ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دین کی حفاظت کے ہی قوانین تو ہیں۔ اہم شاطبی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کے تحفظ کا قانون بھی عطا کیا۔ شراب جیسی قبیح چیز کو حرام قرار دیکر اسلام نے عقل کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ شراب ایسی نشہ آور چیز ہے عقل و خرد کیسے قائم رہ سکتی ہے۔

الغرض! اسلام نے تو بہترین حکیمانہ قوانین عطا کیے ہیں۔ مگر یہ خود ہماری نالائقی ہے۔ کہ ہم ان سے استفادہ نہیں ہوتا چاہتے۔ ان سنہری اصولوں کو چھوڑ کر ہم غیر ذل کے گندے قوانین تلاش کر رہے ہیں۔ کبھی امریکہ کی طرف جاتے ہیں، کبھی یورپ

کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی ایشیا کا رخ کرتے ہیں۔ کہ کہیں سے اچھا دستور مل جائے
کوئی اچھا فوجی نظام حاصل ہو جائے یا کوئی اقتصادی نظام ہی میسر آجائے۔ مگر وہاں
پر لعنت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن و سنت جیسے اعلیٰ و ارفع قوانین کہیں سے
نہیں ملیں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں اسلامی تحریک کے خلاف
سب سے بڑھ کر روسی ذہن کام کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام کی مخالفت میں سب سے
زیادہ اشتراکی نظام کا فرما ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا جب یہ نظام بھی مجبور ہو کر
قرآنی قوانین کے سامنے ہتھیار ڈال دیگا۔ ان کے پاس محض دعوئے ہے، عملی طور
پر کچھ نہیں اس لیے بالآخر انہیں اسلام کے سامنے ٹھٹھکنے پڑیں گے۔

اسلام نے مال کا مکمل تحفظ عطا کیا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی خرابی موجود ہے
تو اسے درست کرنے کا قانون بھی موجود ہے۔ اسلام نے مال کو ضائع کرنے
سے منع فرمایا ہے۔ البتہ اسے احسن طریقے سے خرچ کرنے کے اصول بتلائے ہیں
اس کے متعلق مختلف قوانین گزر چکے ہیں۔ "وَالَّذِي الْمَالُ عَلَى حَبْنَةٍ" یعنی مال کی محبت
کے باوجود اسے خرچ کرو۔ زکوٰۃ کا مکمل قانون موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی "وَصَحَا
رَزَقْنَاهُمْ يَنْفِقُونَ" ہمارے دیے ہوئے مال سے خرچ کرو۔ اس سلسلے
میں مکاتب غلاموں کی آزادی کا قانون دیا ہے۔ سورۃ نور میں آتا ہے "وَالَّذِينَ
هٰذَا مَالُ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ" یہ مال اللہ کا دیا ہوا ہے اس نے ایسے ذرائع پیدا
کر دیے ہیں کہ تمہیں مال پہنچتا رہتا ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے۔ مگر تمہیں وراثت
میں سے نیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ہر انسان
فطری طور پر آزاد ہے اسے غلامی کے پھندے سے چھڑاؤ۔ ان پر اللہ کے دیے
ہوئے مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ اس مال کے حقیقی مالک تم ہو۔ اصلی
مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے تم پر مہربانی کی اور ایسے وسائل تمہارے سپرد
کیے۔ جن کے ذریعے مال تم تک پہنچتا ہے۔ پھر اس میں تصرف بھی وہ کرو جس کی

تحفظ مال

اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف خرچ کر دو گے، تو جہنم رسید ہو گے۔

قانون وصیت

ان آیات میں وصیت کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ أَنْ تَرَكَ خَيْرَ الْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جب کسی کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ مال چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ تو اس پر لازم ہے کہ وہ والدین اور قرابت داروں کے حق میں وصیت کر جائے۔ اور یہ وصیت ہو بھی بالمعروف یعنی دستور کے موافق۔ فرمایا ایسا کرنا حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی متقیوں کے لیے ضروری ہے۔

وصیت کا مکمل قانون قرآن پاک کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ یہ آیات اس قانون کی ابتدائی آیات ہیں، جنہیں سورۃ نسا کی آیات نے منسوخ کر دیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصے مقرر نہیں کیے تھے، آیات زیر درس کے ذریعے وارثوں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکہ انہیں بھی میریت کے ترکہ میں سے حصہ مل سکے۔ مگر سورۃ نسا کی آیات نازل ہونے سے ورثاء کے حصے مقرر ہو گئے اس لیے ان کے لیے وصیت کا قانون منسوخ ہو گیا۔ اب ورثاء کے لیے وصیت نہیں ہے۔ البتہ غیر ورثاء کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کر سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ورثاء یعنی مال باپ، بیوی، خاوند، اولاد وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ إِنَّ اللَّهَ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب لا وصیۃ لوارث کسی وارث کے لیے وصیت روا نہیں ہے۔ انہیں وراثت سے مقرر حصہ خود بخود مل جائے گا۔ بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ورثاء کے لیے وصیت والی یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ والدین کے لیے وصیت کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ خود ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا کہ انہیں ماں کے حق میں وصیت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ واقعی یہ ایت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ورثہ کے لیے بھی وصیت ضروری ہو جاتی ہے آپ خود نو مسلم تھے۔ آپ کی والدہ آخر تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ موت کی صورت میں میری ماں کو میرے ترکہ سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ وہ غیر مسلم تھی اور مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔ تو اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ماں کے حق میں وصیت کر دوں بہر حال یہ اُسی صورت میں ہوتا جب کہ ماں غیر مسلم ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار نہ تھی۔ کیونکہ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ نہ کافر مسلمان کا وارث ہے۔ اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہے۔ ایسی صورت میں وصیت ہی کے ذریعے ترکہ تقسیم ہو سکتا ہے۔

انبیاء کی وصیت

قرآن پاک میں وصیت کا قانون کی جگہ بیان ہوا ہے۔ جہاں بھی ورثہ کے حصص کا بیان آتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ فَلَإِنْ فُلَانٌ رَّشَتْ دَارَکَ لَیْسَ اَتَا حَصَّ مَقْرَرٌ کَیَا گِیَا ہے۔ مَکْرَمٌ مِّنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ تَوْصُوْنَ بِہَا اَوْ دِیْنٌ۔ یہ ترکہ وصیت شدہ مال اور قرضہ نکال کر باقی تقسیم ہوگا۔ منجملہ وصیت کی دیگر اقسام کے انبیاء علیہم السلام کی بھی وصیت ہوتی ہے۔ مگر وہ مال کے متعلق نہیں ہوتی۔ پوچھنے والے صحابہ کرام سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا حضور علیہ السلام نے کوئی وصیت کی ہے۔ صحابی جواب دیتے ہیں کہ آپ کے مال سے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی کیونکہ آپ کا ارشاد ہے مَا تَرَکْنَا صَدَقَةٌ یعنی نبی جو چیز چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے متعلق وصیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔ اُسے ورثہ میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

فرمایا البتہ نبی علیہ السلام نے وصیت ضرور فرمائی ہے۔ اور وہ قرآن پاک پر عمل کرنے کی۔ غلاموں کے متعلق حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ نماز پڑھنا اور

شکر سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى
یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے انبیاء کی قبراں کو سجدہ گاہ بنالیا
آپ نے امت کو تعلیم دی کہ تم میری قبر کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو یہود و نصاریٰ
نے اپنے انبیاء کی قبراں کے ساتھ کیا۔ مگر آج کل قبروں کے ساتھ جو کچھ معاملہ
ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ بیرون ملک سے آنے والا ہر سربراہ مملکت
سب سے پہلے جناح صاحب کی قبر پر چادر چڑھاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ کی قبر
کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کوئی ریشمی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی پھولوں کی
چادر لے کر آیا ہے۔ کوئی بچی پکائی دیکھ پیش کر رہا ہے۔ کوئی بکرا، چھتراندر
کر رہا ہے۔ کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی حاجت روائی کا طالب ہے۔ کوئی مشکل
کٹائی کے لیے دعائیں کر رہا ہے۔ یہ سب شرکیہ امور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے امت کو ڈرایا مَحْذَرٌ مِمَّا صَنَعُوا اِلَیْہِ کام امت کرنا، مگر ہم اللہ جل
ہے ہیں۔

وصیت کی
اقسام

وصیت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ منجملہ اُن کے مباح یا مستحب وصیت
کا ذکر حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ حضور نے
فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو
تو اُسے چاہیے کہ وہ دو راتیں بھی نہ گزارے مگر وصیت اس کے سر ہانے کے نیچے
لکھی ہوئی موجود ہونی چاہیے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے حضور علیہ السلام
کی زبان مبارک سے یہ بات سنی ہے۔ اس وقت سے میں نے وصیت لکھ
کر سر ہانے کے نیچے رکھ لی ہے۔ وصیت کی یہ مستحب قسم ہے۔

بعض اوقات وصیت فرض ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو یقین ہے کہ اُسکی
زندگی کے آخری ایام آ پہنچے ہیں اور اب اس کے بچنے کے کوئی آثار دکھائی
نہیں دیتے۔ نیز اُس کے ذمے ایک دو سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ تو ایسی
صورت میں اس کے لیے وصیت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مال سے

زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت کر جائے۔ وگرنہ عدم ادائیگی کی صورت میں فرض کا تارک ہو کر گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہو گا۔ اسی طرح کسی کی امانت موجود ہے۔ یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے۔ تو اس کے لیے لازم ہے۔ کہ مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ فلاں فلاں چیز کی ادائیگی کر دینا۔ اگر ایسا نہیں کرے گا۔ تو اس کا مال تو وراثہ ہضم کر جائے گا، اور وہ خود دوسروں کا مقروض رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے مرنے والے کے متعلق یہ قانون وضع کر دیا کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اس کے کفن و دفن کا انتظام کیا جائے۔ یہ بنیادی ضروریات ہیں داخل ہے اس کے بعد اگر مرنے والے کے ذمہ قرضہ ہے۔ تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر اگر کوئی وصیت ہے۔ تو کل مال کے ایک تہائی تک اسے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد بقیہ مال وراثہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ لوگ ان ضروری امور کی طرف تو توجہ نہیں کرتے۔ اس کی بجائے مرنے کے قتل، تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں کے چکر میں پڑ کر مرنے والے کا مال ضائع کرتے ہیں۔ جو کہ بالکل ناجائز ہے۔ اور اگر مرنے والے کے مال کی بجائے لواحقین اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔ تو بھی محض رسومات کی خاطر ایسا کرنا فضول ہو گا کیونکہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اگر خدا نخواستہ ایسی رسومات پر یتیموں کا مال صرف ہو رہا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے۔ کھانے والے حرام کھا رہے ہیں۔ اس سے بچنا چاہیئے۔ اور جن چیزوں کا شریعت نے حکم دیا ہے انہیں پورا کرنا چاہیئے۔

وصیت کی ایک قسم "ناجائز" بھی ہے۔ اگر مرنے والا کسی ناجائز کام کی وصیت کرتا ہے تو ایسی وصیت ناجائز ہی کہلائیگی مثلاً کوئی شخص وصیت کر جائے کہ میرے مال میں فلاں قبر پر چادر چڑھادینا یا فلاں مزار پر بکرا چڑھادینا وغیرہ وغیرہ ناجائز وصیت ہوگی۔ اور ایسی وصیت پر عمل کرنا روا نہیں ہے۔

بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کار خیر کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ تاکہ مرنے والے کو آخرت میں

اس کا حصہ ملتا ہے مثلاً مسجد تعمیر کر دے، مدرسہ بنو دے، غیر وارث، ارثہ داروں اور مستحقین میں تقسیم کر دینی وصیت کر جائے تو یہ جائز اور درست ہے اور اگر کوئی شخص ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو یہ وراثت کی اجازت پر موقوف ہو گا اگر وہ سب رضی ہو جائیں تو وصیت پر عمل ہو گا ورنہ صرف ایک تہائی پر عمل کرنا ہو گا اگرچہ اس کے لیے بھی وَالْثُلُثُ کَثِیْرٌ کے الفاظ آتے ہیں مگر اس حد تک جائز ہے، حضرت سعدؓ نے عرض کیا تھا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور حقدار صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ حضور! اگر اجازت دیں تو میں سارا مال صدقہ کر جاؤں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا اُدھا مال دے دوں، فرمایا نہیں انہوں نے تیسری دفعہ پوچھا کیا دو تہائی مال کی وصیت کر دوں آپ نے پھر بھی اجازت نہ دی جب آپ نے ایک تہائی مال کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اگرچہ یہ بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی اجازت ہے۔ مقصد یہ کہ وارثوں کو ترکہ سے زیادہ سے زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔

وصیت میں
تبدیلی گناہ ہے

فرمایا فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ، جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اسے سُننے کے بعد فَاِنَّمَا اِتُّمُّهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَبْدِلُوْنَہُ تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے۔ جو اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص وصیت کر کے فوت ہو جائے اور اس وصیت کو سُننے والے یا جاننے والے اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو اس کا وبال وصیت میں تحریف کرنے والوں پر ہو گا۔ کیونکہ وصیت کرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا۔ اب اس پر عمل درآمد کے وقت بھی بیشی کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

وصیت میں تبدیلی کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مرنے والا کسی ایسے شخص کو کوئی حصہ دے گیا، جسے وارث پسند نہیں کرتے۔ یا کسی کے کم حصے کو زیادہ یا زیادہ کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی طرف سے رد و بدل کرتے

ہیں۔ تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ جائز وصیت پر عمل نہیں کیا، وارثان کے حصص کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے بار بار تصریح کی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی وصیت کرنے والا وصیت صحیح طریقے سے نہیں کرتا۔ کسی کو حق سے زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو پورا حق بھی نہیں دیتا اور اس طرح پسماندگان میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا جو شخص ڈر گیا۔ وصیت کرنے والے کے ایک طرف جھک جانے سے یا کسی گناہ کے ارتکاب سے فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ پس اس شخص نے فریقین میں صلح کرادی فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں بعض اوقات کوئی بیٹا نافرمان ہوتا ہے اور وصیت کرنے والا اسے جائیداد سے محروم کرتا ہے۔ تو یہ بات غلط ہے۔ اور کبیرہ گناہ ہے۔ وارث بننا ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اور جو حصہ اللہ نے ورثا کو دیا ہے۔ وہ نیکی بدی یا فرمانبرداری اور نافرمانی پر موقوف نہیں ہے۔ اس کا اچھا یا بُرا صلہ کسی اور طریقے سے دیا جاسکتا ہے۔ مگر ورثہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ حق اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ایسی ہی صورت میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آکر صلح کر دے۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا۔ وارثان کو ان کا جائز حصہ مل جائیگا اور وصیت کرنے والا بھی سرخرو ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوگئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ کیونکہ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہفتاد و دو (۷۲)

آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ
أُخَرٍ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ط وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

ترجمہ : اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ ان لوگوں پر فرض
کیے گئے تھے، جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ تاکہ تم پر ہینر گاہ بن جاؤ ﴿۱۸۳﴾ چند گئے
ہوئے دن ہیں۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو پس وہ سکر دنوں میں
گنتی پوری کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک مسکین کا طعام فدیہ ہے
پس جو شخص خوشی سے نیچی کرے گا، وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزے
رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو ﴿۱۸۴﴾

گدشتہ پیوستہ

اس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی حفاظت کا قانون بیان فرمایا۔ پھر
مال کی حفاظت کا قانون بتلایا۔ اور مال کے بیجا تصرف سے منع فرمایا۔ حق تلفی کو
ناجائز قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات تقویٰ کے خلاف ہے۔ ایمانیات کے ذکر کے
بعد اللہ تعالیٰ نے اسلام کا قانون فوجداری بیان فرمایا، اور قصاص اور دیت کا تذکرہ
کیا اور فرمایا یہ اصول بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کہ تقویٰ
حاصل کرو۔

فرضیت روزہ

آیات زیر در س میں ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن روزہ کا بیان ہے

جس طرح اس سے پہلے اصولوں کو تقویٰ کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح روزہ رکھنے کی غرض و غایت بھی تحصیل تقویٰ ہی بیان کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُنْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ عِشًا مِّمَّنْ قَدْ خَلَتْ
رُزُؤُهُمْ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے۔ اور مقصد یہی ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
 تاکہ تم پر ہیزگاری اختیار نہ کرو۔

کُتِبَ کا لفظ فرضیت کے لیے آتا ہے۔ جیسے اس سے پہلے قصاص
 کے متعلق آیاتھا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ یعنی تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے
 اسی طرح وصیت کے متعلق آچکا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ
الصَّوْتُ أَنْ تَرَكَ خَيْرًا الوصیۃ اگر مال چھوڑا ہے۔ تو تم پر
 وصیت کرنا لازم ہے۔ اسی طرح یہاں پر روزوں کے متعلق كُتِبَ عَلَيْكُمْ
الصَّيَامُ یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

روزہ کے لفظی معنی رُک جانے کے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے اِمْسَاک
 کا لفظ بھی آتا ہے۔ تاہم صوم کا لفظ بھی رُک جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے
 مثال کے طور پر عرب کہتے ہیں۔

خَيْلٌ صِيَامٌ وَخَيْلٌ غَيْرُ صَائِمَةٍ تَحْتَ الْعِجَاجِ وَخَيْلٌ لَعَلَّكَ اللَّهُمَّ
 کچھ گھوڑے کے بونے ہیں یعنی خاموش ہیں کچھ حرکت کر رہے ہیں اور کچھ گدو غبار کے نیچے لگام چیا

ہیں۔ شریعت میں روزہ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ الْإِمْسَاكُ عَنْ
الْأَكْلِ وَالشَّرْبِ وَالْجَمَاعِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ
 طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور خواہشات نفسانی سے
 اپنے آپ کو روکے رکھنے کا نام روزہ ہے۔

روزہ نہاں شرعی کے اندر ہوتا ہے۔ اور شرعی دن سے مراد پوپھوٹنے
 سے لے کر سورج غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ اس دوران کھانے پینے
 لے احکام القرآن

اور نفسانی خواہشات سے باز رہنا اس نیت کے ساتھ کہ میرا روزہ ہے یہی صوم ہے اور اسلام کے ارکان میں سے تیسرا رکن ہے۔ ارکان اسلام میں توحید و رسالت پر عقیدہ کے بعد نماز، پھر زکوٰۃ اور پھر روزہ کا نمبر ہے۔ چوتھا نمبر حج کا ہے اسی ترتیب سے پانچواں رکن جہاد ہے۔ اور اس کا ذکر بھی بعد میں آ رہا ہے ان تمام ارکان کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں اسی ترتیب سے آ رہا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے عَلَیْكُمْ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَا عِدْلَ لَهُ رُوزَہ کو لازم پکڑو کیونکہ روزہ جیسی کوئی اور عبارت نہیں۔

سابقہ امتوں کے روزے

الغرض! فرمایا اے ایمان والو! یہ روزے صرف تم پر ہی نہیں فرض کیے گئے بلکہ تم سے پہلے گزرنے والے لوگوں پر بھی اسی طرح فرض تھے۔ البتہ ان روزوں کی مقدار اور تعداد مختلف امتوں کے لیے مختلف رہی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایام بیض یعنی ہر ماہ کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ روزے امت محمدیہ کے لیے مستحب کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرض تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی امت کے لوگ بڑے سخت مزاج اور اکھڑے تھے، ان میں بہیمیت کا عنصر زیادہ مقدار میں پایا جاتا تھا۔ اسے کم کرنے کے لیے اس امت کو سارا سال روزے رکھنے کا حکم تھا حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو دن روزہ رکھتے تھے۔ اور تیسرے دن افطار کرتے تھے اس امت آخر الزمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے۔ ان کے متعلق فرمایا آیات مَعْدُوذَاتِ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ یعنی تین سو ساٹھ دن میں سے اسیس یا تیس دن کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔

روزہ باطنی عبادت ہے

امام طحاویؒ اپنی کتاب مشکل الآثار میں فرماتے ہیں کہ ہر عبادت میں ریا کا امکان ہے۔ صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریاکاری کا کوئی مسئلہ

نہیں۔ یہ باطنی عبادت ہے۔ اور اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور دوسری طرف بندہ کے ساتھ۔ نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسی عبادت ہیں۔ جنہیں دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں، انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اور زکوٰۃ سے استفادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر روزہ کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آ سکتا۔ اس کا تعلق صرف روزہ دار کی ذات سے ہوتا ہے۔ دوسرا شخص نہ اسے دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص عام لوگوں کے سامنے تو نہیں کھاتا پیتا مگر درپردہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو اس کا روزہ کہاں ہو گا؟ وہ لاکھ اعلان کرتا پھرے کہ میں روزہ دار ہوں مگر اس کی حقیقت کو وہ خود جانتا ہے۔ یا اللہ رب العزت جانتا ہے کہ وہ روزے دار ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر عبادت کا بدلہ دیا جائیگا۔ مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے۔ جسکی جزا میں خاص طور پر خود عطا کروں گا۔ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں۔

الصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أَجْزِيْ بِهِ رَوْزَهٗ خَاصٌ مِّرْسِيْہِ ہے اور میں ہی اسکی جزا دوں گا۔

روزہ کے
جسمانی فوائد

روزہ کے روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے جسمانی فوائد بھی ہیں۔

صَوِّهُوْا تَصِحُّوْا روزہ رکھو تا کہ تمہیں صحت نصیب ہو۔ یورپ کے بہت سے نامور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسلام نے فاقہ کا جو طریقہ روزہ کی صورت میں مقرر کیا ہے، اس سے بہتر حفظانِ صحت کا کوئی اصول نہیں مختلف بیماریوں کے حملہ کی صورت میں بھی روزہ صحت مندی کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بلغمی مادہ کی زیادتی کا مریض ہو اور روزہ رکھنے سے بالکل تندرست ہو جائے گا۔ فاقہ کرنے سے بلغمی اور کئی دوسری رطوبتیں خشک ہو جاتی ہیں اور آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ روزہ رکھو، صحت نصیب ہوگی اور سفر کرو غنیمت حاصل ہوگی۔ بسا اوقات اقامت میں آدمی کامیاب نہیں ہوتا مگر سفر کرنے سے اللہ تعالیٰ الیہ وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور انسان تنگی سے نکل کر فراخی میں داخل ہو جاتا ہے۔

روزہ اور قانون
کی پابندی

فرضیت روزہ کے لیے خطاب اہل ایمان سے ہوا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ**
آمَنُوا گو یا روزہ ایمان کا تقاضا بھی ہے جو شخص ایمان دار ہونے کا دعویدار ہے۔ اُسے روزے
کی فرضیت پر ایمان لانا ہوگا۔ ورنہ وہ اہل ایمان ہونے کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ علمائے
کرام فرماتے ہیں روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ قانون کی پابندی سکھاتا ہے
روزہ کے ذریعے انسان ایک مقررہ وقت کے لیے حلال اکل و شرب سے بھی رُک
جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ انسان قانون کا پابند ہو جائے۔ جب وہ قانون
کی پابندی کے ذریعے حلال چیزوں سے رُک سکتا ہے۔ تو وہ حرام چیزوں سے
بھی رُک جائے گا۔ کھانے پینے اور نفسانی خواہش کی تکمیل سے انسان کا نفس
مزید پھلتا پھولتا ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے اسلام نے روزہ کا قانون نافذ
کیا۔ تاکہ نفس انسانی کو فاقہ کے ذریعے کمزور کیا جاسکے۔ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ**
کا یہی مطلب ہے کہ انسان میں تقویٰ جیسی اچھی خصلت پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ روزے کے ذریعے جب نفس کو مرغوبات
سے روکنے کی عادت پڑ جائیگی۔ تو پھر اسے شرعاً حرام چیزوں سے روکنا آسان ہو
جائے گا۔ جب روزہ کی وجہ سے قوت نفس اور شہوت میں ضعف آئیگا، تو تم متقی
بن جاؤ گے۔ روزہ میں یہ بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ کہ اس سے سرکش
نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور شریعت کے احکام پر پابندی ہونے لگتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تو چالیس روزے رکھنے کا ذکر آتا ہے۔ اور نصاریٰ
پر ایک ماہ کے روزے فرض تھے۔ مگر انہوں نے اس حکم میں تبدیلی پیدا کر لی۔
طبرقی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ عیسائیوں کا کوئی بادشاہ بیمار ہو گیا۔ گرمی کے
روزے تھے۔ اس نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی، تو ہم تیس کی
 بجائے چالیس روزے رکھیں گے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ بیمار ہوا۔ تو اس نے
کہا کہ تندرست ہو کر مزید ست روزے رکھوں گا۔ اس طرح انہوں نے روزوں کی تعداد
سینتالیس تک پہنچا دی۔ اس کے بعد عیسائی علماء کا اجتماع ہوا۔ اور انہوں نے

فیصلہ کیا کہ سینتالیس کی بجائے پورے پچاس روزے مقرر کر دینے چاہئیں۔ البتہ موسم گرما کی بجائے موسم بہار میں رکھ لیا کریں گے۔ تو اس طرح انہوں نے اپنی مرضی سے روزوں کی تعداد اور موسم میں تغیر و تبدل کر دیا۔

مولانا شیخ الحداد فرماتے ہیں۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ روزوں میں تبدیلی نہ کرنا بلکہ ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا خواہ وہ گہمی میں آئیں یا سردی میں۔ بہار میں آئیں یا خزاں میں۔ چنانچہ قمری سال کے مطابق رمضان المبارک مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے۔ متقی بننے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس اس کے تابع ہو جائے اور احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔ فرمایا أَيَّامًا صَعْدُودًا یہ گنتی کے دن ہیں یعنی پورے سال میں انیس یا تیس دن کے روزے ہیں۔ ان کو احکام الہی جانتے ہوئے خوشی خوشی سے پورا کرو اور اپنے اندر تقویٰ جیسی عظیم خصلت پیدا کرو۔

مریض اور مسافر
کا روزہ

فرمایا ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کا حکم تندرست اور مقیم کے لیے ہے، جسے روزہ رکھنے میں غیر معمولی مشقت نہ برداشت کرنی پڑے۔ البتہ ایسے لوگوں کے لیے روزے مؤخر بھی کیے جاسکتے ہیں۔ جو مقررہ ماہ میں روزہ رکھنے کے قابل نہ ہوں۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو۔ أَوْ عَلَى سَفَرٍ یا مسافر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ تو یہ گنتی دو سکر دنوں میں پوری کرے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو بخار آتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں خاص طور پر گہمی کے موسم میں وہ زیادہ دیر تک بھوک پیاس برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر روزہ رکھنے کی کوشش کرے گا تو بیماری میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اُسے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے بلکہ رمضان کے بعد چھوٹ جانے والے روزوں کے بدلے روزے رکھ لے۔

اسی طرح مسافر کو بھی روزے مؤخر کرینیکی اجازت ہے۔ سفر آرام و سکون کا ہو یا مشقت طلب، ہوائی جہاز کا ہو یا بحری جہاز کا، ریل گاڑی کا ہو یا بس کا، کسی

جانور کی سواری ہو یا پیدل سفر کر رہا ہے۔ اگر اس کا جی نہیں چاہتا تو اسے اجازت ہے کہ روزہ قضا کر لے۔ اس پر کوئی عرج نہیں۔ رمضان کے بعد روزے رکھ سکتا ہے تاہم یہ گنتی پوری کہنی پڑے گی۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ ایک قسم کا نصاب ہے جسے ہر حالت میں مکمل کرنا ہو گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی طالب علم کسی امتحان میں شریک ہوتا ہے۔ مگر کسی ایک یاد و پرچے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یا سرے سے وہ پرچے دیتا ہی نہیں۔ تو اسے وہ نصاب پلیمنٹری امتحان کی صورت میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اسے ڈگری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جب تک چھوٹے ہوئے روزے پورے نہیں کرے گا، اس فرض سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اسے تقویٰ کی سند نہیں مل سکتی۔

روزہ کے بدلے فدیہ

فَرَّأَوْ عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةُ طَعَامٍ حَسْبِ كَيْفٍ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان پر ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔ مفسرین کرام نے اس حصہ آیت کی مختلف تفاسیر کی ہیں۔ اہم ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حکم روزوں کا حکم آنے کے بعد ابتدائی ایک دو سال کے لیے تھا جب کہ لوگ اس مشقت سے ابھی مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اجازت تھی کہ جو کوئی روزہ نہ رکھے اور وہ اس قابل ہو کہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دن رات کا کھانا کھلائے، تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ جس سے اس کا روزہ ادا ہو جاتا تھا، اس کے بعد جب اگلی آیت نازل ہوئی، تو مریض اور مسافر کے سوا روزہ رکھنا لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے فوائد بھی سمجھائیے گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اس آیت يُطِيقُونَهُ سے پہلے لفظ لا محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ فدیہ ادا کرنے کی رعایت ان لوگوں کے لیے ہے۔ لَا يُطِيقُونَهُ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں دو قسم کے لوگ آتے ہیں، اولادہ لوگ جو بہت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ شیخ فانی یا مجوزہ فانیہ یعنی بہت بوڑھا مرد ہے۔ یا بہت بوڑھی عورت ہے

دو چار گھنٹے بھی بغیر کھانے پیئے نہیں رہ سکتے تو ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے کہ اگر وہ مالدار ہیں تو روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

ثانیاً، ایسے بیمار لوگ جو لمبی بیماری میں مبتلا ہیں، تندرست ہونے کی چنداں امید نہیں کہ تندرست ہو کر روزہ قضا کر لیں گے، تو ایسے لوگ بھی روزہ کے بدلے میں اُس کا فدیہ ادا کر سکتے

ہیں۔ البتہ اگر بعد میں تندرست ہو جائیں۔ تو انہیں روزہ رکھنا ہوگا، اس کے بغیر ان کی فرضیت ادا نہیں ہوگی، البتہ ادا شدہ فدیہ کا انہیں علیحدہ ثواب حاصل ہوگا۔ اسی طرح

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ روزہ کے بدلے میں فدیہ ادا کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھے جب

کہ پیٹ میں بچہ ہے۔ یا دودھ پینے والے بچے کی زندگی خطرہ میں ہے۔ تاہم مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ موجود ہے کہ ایسی عورتوں کو روزہ

معاف نہیں ہوگا۔ جب ان کی علت دور ہو جائے۔ تو روزہ قضا کرنا ہوگا۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یُطِيقُونَهُ لفظ اطاقہ سے ہے اور

یہ باب افعال سے ہے۔ اس کا معنی ہے جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی روزے سے مانوس نہیں ہیں۔ اس کے عادی نہیں ہیں۔ وہ روزے کے

بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی دوسری تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ یہاں پر فدیہ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ جو صاحب استطاعت پر واجب ہے۔ اور

یہ روزوں کا کفارہ بنتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی ایک مصلحتیں ہیں۔ بہر حال اسے صدقہ فطر پر محمول کیا گیا ہے۔ جسکی مقدار ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا ہے

یا ہر روزہ کے بدلے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کر دے۔ گندم کی بجائے اگر باجرہ وغیرہ ہے۔ تو ایک صاع یعنی چار سیر ادا کرنا ہوگا اور گندم ہے تو نصف

صاع یعنی دو سیر۔ فرمایا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ اور جو کوئی خوشی سے نیکی

کہہ یگا، تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یعنی اگر شرعی عذر کے باوجود روزہ رکھتا ہے
 تو یہ بہت اچھی بات ہے اور روزہ رکھنے والے کے لیے بہتر ہے۔ وَأَنَّ
تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے
إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ روزہ رکھنے میں بہت سے فوائد حاصل
 ہوتے ہیں۔ اسکے ذریعے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی کرنے کی عادت
 پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت کے جملہ احکام کی تعمیل آسان ہوتی ہے۔ اور
 انسان کے لیے بلند درجہ کا ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم سمجھ لو جہ
 رکھتے ہو، تو تمہارے لیے روزہ چھوڑنے کی بجائے روزہ رکھنا ہی بہتر اور فاضل ہے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۸۵

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و سہ (۷۳)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ
الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ ۖ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا
هَدَاكُمُ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ :- رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے اندر قرآن نازل کیا گیا ہے۔ وہ قرآن جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں اور فیصلہ کرنے والی بات ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو جائے پس اُس کو اسکا روزہ رکھنا چاہیے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو، پس دو سکر دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور تاکہ تم گنتی پوری کرو۔ اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔

اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ﴿۱۸۵﴾

انسان کے متقی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اصول بیان فرمائے ہیں۔ پہلا قانون قصاص کی پابندی ہے اور دوسرا اصول مال کے معاملہ میں عدم زیادتی ہے۔ تاکہ کسی شخص کی حق تلفی نہ ہو۔ تقویٰ کا تیسرا اصول مقررہ اوقات میں روزہ رکھنا ہے۔ یہ سب ایسے افعال ہیں، جن کی ادائیگی سے ایک مسلمان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

گذشتہ پیورے

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت بیان فرمائی۔ کہ ایمان والوں پر ایک ماہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہ چند گئے ہوئے دن ہیں۔ جو کہ پورے سال میں اکتیس یا تیس دن ہیں اور جن میں روزہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ یہ روزہ حضور نبی علیہ السلام نے بھی رکھا اور دوسرے لوگوں سے بھی رکھوایا گیا، بلکہ بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہو گئی۔ البتہ عاشورہ کے دو روزے رکھنے کی اب بھی بڑی فضیلت ہے۔ اور یہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یوم عرفہ کا روزہ بھی بڑے ثواب کا حامل ہے۔ مگر فرض نہیں ہے۔ اسی طرح ایام بیض یعنی ہر ماہ کے درمیانی تین روزے مستحب ہیں۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے بہت بڑے اجر کا موجب ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ اور اس کے بعد چھ روزے شوال سے ملا لیے، وہ شخص ایسا ہے۔ جیسے پورے سال کا روزے دار ہو۔ تاہم فرضیت صرف رمضان کے روزوں کی ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فرمایا۔

ماہ رمضان اور
قرآن پاک

اب آیت ذریعہ درکس میں ماہ رمضان کے ان گنے چنے دنوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي رَمَضَانَ كَامِهِيْنَه وہ مبارک مہینہ ہے۔ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ جس میں قرآن پاک نازل ہوا۔ یہ بڑی برکتوں والا مہینہ ہے۔ اور سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ مبجلہ ان کے یہ ہے۔ کہ اس ماہ میں قرآن کریم کو نقل کر کے لوح محفوظ سے بیت العزت میں رکھا گیا جو کہ آسمان دنیا یعنی پہلے آسمان پر واقع ہے۔ امام جعفر صادق کا قول ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے بڑی ہیں۔ ایک حضور علیہ السلام کا وجود مبارک اور دوسرا

قرآن پاک، کتابیں تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہیں۔ مگر قرآن حکیم کوئی اور ہی چیز ہے۔
 اِس کتاب نیست، چیزے دیگر است

ہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا حکم دوسرے کلاموں جیسا نہیں ہے۔
 لوگوں کا مقولہ ہے کلام الملوک ملوک، کلام بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے،
 مگر یہ کلام تو مالک الملک کا ہے۔ جو کہ شہنشاہ مطلق ہے، اس کا کلام کس قدر و
 منزلت کا حامل ہوگا۔ لہذا یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے بہت
 بڑا انعام ہے۔

انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے جس نے قرآن پاک جیسی بڑی نعمت کی قدر
 نہیں کی۔ جس قوم کے پاس یہ کلام ہو، وہ بھی بھٹکتی پھرے تو کتنی افسوس کی بات
 ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن پاک جیسی نعمت
 موجود ہو، وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں وہ بڑی عزت والا ہے
 مگر افسوس کہ حامل قرآن نے اغراض فاسدہ اور غفلت کی وجہ سے اس کی کوئی قدر
 نہیں کی، خود تو اس سے استفادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ باقی دنیا کو بھی محروم رکھا ہوا
 ہے۔ مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت موجود ہے۔ مگر پھر بھی یہ
 ناشکر گزار ہیں۔

شہر کے معنی مہینہ کے ہیں اور اس کی جمع شہور آتی ہے۔ رمضان کا
 معنی پیش ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ فرضیت روزوں کے زمانہ میں گرمی کے موسم
 میں رمضان کا مہینہ آیا تھا۔ اس واسطے اسے رمضان یعنی گرمی یا پیش والا مہینہ کہتے
 ہیں۔ رجب سے مراد عزت والا یعنی معظم مہینہ ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخری
 سردی کے موسم کے مہینے تھے۔ جہد کا معنی اسنجد ہونا یا جہم جانا ہے۔ اسی طرح شعبان
 کا معنی پراگندہ ہونا ہے۔ اس موسم میں قبائل ادھر ادھر پراگندہ ہو جاتے تھے
 ذی قعدہ، قعود یعنی بیٹھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ذوالحجہ کا یہ نام اس لیے ہے
 کہ اس مہینہ میں حج ادا کیا جاتا ہے۔ محرم سے مراد حرمت والا مہینہ ہے۔ صفر

مختلف مہینوں
 کی وجہ تسمیہ

سے مراد خالی مہینہ ہے اسی طریقہ سے ربیع بہار کو کہتے ہیں۔ ربیع الاول اور آخر اسی مناسبت سے نام ہیں۔

الغرض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ رمضان کو یہ نام پیش کی وجہ سے ملا ہے۔ جب ہر چیز گرم ہو کر پگھلنے لگتی ہے، ہمیں پگھلنے اور پچھلانے کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اسکی ایک توجہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ روزے رکھنے سے مسلمان کو جسمانی طور پر تکلیف پہنچتی ہے، جب وہ اس تکلیف کو برداشت کرتا ہے تو اس کے گناہ پگھلنے لگتے ہیں۔ گویا یہ مہینہ گناہوں کو پچھلانے والا مہینہ ہے۔

مسئلہ خلق و قرآن

ایک زمانہ میں مسئلہ خلقِ قرآن پیدا ہوا تھا۔ بعض گمراہ لوگوں نے قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے کا انکار کیا۔ اس کے بجائے قرآن کو مخلوق کہا گیا۔ اور یہ فتنہ دو تین صدیوں تک قائم رہا، البتہ اور کئی قسم کے فتنے موجود ہیں۔ اس زمانے میں اس مسئلہ کی وجہ سے اللہ والوں نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ کئی علماء اسی مسئلہ کی وجہ سے سولی پر لٹک گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے چار حکومتوں کا زمانہ اسی ابتلاء میں گزارا۔ ان پر مسلسل ظلم و ستم کے پہاڑے توڑے گئے۔ ان سے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا، فرماتے تھے۔ میرے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے تم کوئی اور چیز لے کر آئے ہو تا کہ میں اس کے مطابق بات کر دوں۔ آپ نے ہزار مصائب برداشت کیے مگر قرآن و سنت کے خلاف فتویٰ نہ دیا۔

نزل قرآن

قرآن پاک کے رمضان المبارک میں نزول کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ
سعید بن جبیرؓ اور امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو
ماہ رمضان کی ایک رات لیلة القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتارا۔
اور پھر وہاں سے پورے تیس برس ہیں محوڑا محوڑا کر کے حضور خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، نزول قرآن کی اس رات کے متعلق خود رب العزت
نے فرمایا لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ یہ تو ایک ہزار مہینوں سے

بھی زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ میسر آجائے۔ تو اس ایک رات کی عبادت، تو اسی سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں کی فضیلت کے متعلق بھی بہت سی روایات آئی ہیں۔ مثلاً طبرانی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے۔ تو رات چھ رمضان کو اور انجیل ۳۱ رمضان کو نازل ہوئی۔ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ یہ تفسیری روایات سے معلوم ہوا ہے۔ بہر حال رمضان المبارک کو قرآن پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔

تلاوت قرآن

اس ماہ مبارک کو قرآن پاک کے ساتھ بطور یادگار خصوصی لگا دیا ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ اس مہینہ میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے اگرچہ محض تلاوت منتہائے مقصود نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے نصیحت پکڑ لی جائے اس کے بتلائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ”مقصد از نزول قرآن محض تلفظ نیست“ اگرچہ اس زمانہ میں محض تلاوت بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ فرمایا جب کوئی شخص خلوص دل کے ساتھ تین حرف اللہ پڑھتا ہے۔ تو تیس نیکیوں کا مستحق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کی اس قدر برکت ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مسکوتات میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ باقی جو بھی کلام یا اوراد ہیں، انہیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صرف کلام پاک ہی ایسا کلام ہے۔ جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر حالت میں پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کے لیے صرف ایمان اور نیت صالحہ کی ضرورت ہے۔

قرآن کیا ہے ھُدًی للنَّاسِ یہ لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے

قرآن ذریعہ ہدایت ہے

یہ ایسی ہدایت ہے جو انسان کے لیے سب سے ضروری چیز ہے آپ نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا، تو سیدھا راستہ وہی ہے جو قرآن پاک دکھاتا ہے یعنی اس طرح اعتقاد رکھو، اس طرح عمل کرو اور اس طرح کے اخلاق پیدا کر دینے معاشرتی اور معاشی مسائل کو اس طرح حل کرو، قرآن پاک متن ہے حضور علیہ السلام کی حدیث اس کی شرح ہے یہ قرآن پاک کہ کھولا کہ بیان کرتی ہے امام شافعیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ صحیح احادیث کے بغیر قرآن پاک کو سمجھنا ممکن نہیں پروردگار ہی اور چمکڑا لدی محض اس لیے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی من مانی تفسیریں کر سکیں۔ اس طرح کہنا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ احادیث کے بغیر انسان قرآن کی منزل کو نہیں پاسکتا۔ لہذا جب بھی دشواری پیش آئے قرآن پاک کی طرف رجوع کرو۔ هَلْ مِنْ مَّذْكُرٍ كُنْ هُوَ اس سے نصیحت پکڑو۔ خود مفتی نہ بن بیٹھو، بلکہ فاسئلوا اهل العلم الذکر ان کنتم ولا تعلمون اگر تمہیں خود علم نہیں تو اہل علم کے پاس جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قسم اٹھا کر کہا، کہ قسم ہے اس ذات پاک کی، جس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور علیہ السلام کے بعد اپنے اس دور میں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ قرآن کریم جاننے والا ہے۔ تو میں سواری پر سوار ہو کر اس کے پاس جاؤں، خواہ مجھے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے۔ صحابہ کرامؓ نے ایک ایک حدیث کی خاطر دو دو ماہ کا سفر کیا۔ ایک ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لیے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اس مقصد سے ہٹ کر کوئی دوسرا مفاد حاصل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہاں سے کھانا تک نہیں کھایا۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔ اور حصول مقصد کے بعد فوراً واپس لوٹ گئے۔ ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے کہیں ہمارے اجر میں کمی نہ واقع ہو جائے۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے۔ خراسان سے حجاز یا حجاز سے خراسان تک ہزاروں میل کی مسافت محض کسی آیت کی تشریح معلوم کرنے کے لیے طے کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن کو مولوی محمد دین قندھاریؒ کے نام سے معنون کیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر سمجھنے کے لیے قندھار سے رانچی تک کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے مولانا کے پرچے ”الہلال“ میں بعض آیات کی تفسیر پڑھی، تو کچھ شبہ پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لیے آپ نے اتنا طویل سفر کیا۔ مولانا ان دنوں رانچی میں نظر بند تھے۔ اس شخص نے اپنا مسئلہ حل کرنے کے بعد مسجد میں نماز ادا کی اور چلتا بنا۔ مولانا نے ہر چند کوشش کی کہ اس کی کچھ خاطر مدارت کی جائے۔ اُسے واپسی کے لیے کمریہ ہی فراہم کیا جائے مگر اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا۔ مولانا اس کے تقویٰ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی تفسیر کو ان کے نام سے معنون کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے۔ جو چاہے اس سے مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

واضح اور فیصلہ کن
دلائل

فرمایا قرآن پاک سامان ہدایت ہی نہیں، بلکہ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ج اس میں ہدایت کے واضح دلائل موجود ہیں اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن بات بھی ہے۔ یہ کسی معاملہ کو ادھر ادھر نہیں چھوڑتا، بلکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔ کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے ”لِيَهْلِكَ مَن هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ“ تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ واضح بات کے بعد ہلاک ہو وَيُخَيِّطِ مَن حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ اور جو زندہ ہے۔ وہ واضح بات کے بعد زندہ رہے یعنی کسی انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنا چاہیے۔ کہ اُسے حق و باطل کی پہچان نہیں ہو سکی۔ قرآن پاک ہر چیز کی خوب خوب وضاحت کرتا ہے گویا قرآن پاک ہدایت بھی ہے اور فرقان بھی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان المبارک میں تلاوتِ ادا کی جائے جن کے دوران قرآن پاک کی تلاوت ہو۔ اور پورے رمضان میں ہر مسلمان کے کان سے کم از کم ایک دفعہ قرآن پاک گزر جائے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کا پردہ گرام ہے اُسے ہر گھر میں پڑھا جانا چاہیے۔ اس کی اشاعت اور تعلیم عام ہو، تاکہ کوئی نفس اس سے محروم نہ رہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے

لیے رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے تمہارے لیے تراویح کو سنت قرار دیا۔ اس میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہونی چاہیئے۔

روزہ لازم ہے

فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جو کوئی تم میں سے ماہ رمضان المبارک کو پائے، تو اُسے روزہ رکھنا چاہیئے۔ گویا اس آیت کے ذریعے روزہ لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس سے پہلے روزہ کے عوض میں فدیہ کی جو رعایت دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی، اب سوائے عذر شرعی ہر عاقل بالغ کے لیے روزہ ضروری ہو گیا۔ عذر شرعی میں بیمار اور مسافر آتے ہیں۔ اور شرعی سفر تین دن کی مسافت ہے جو کہ ۴۸ میل بنتا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کم از کم اس قدر سفر کرنا ہو تو روزہ قضا کر سکتا ہے۔ بعض علماء نے کم از کم مسافت ۳۶ میل بتائی ہے۔ البتہ ابو داؤد شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ مَنْ كَانَ لَهُ حَمُولَةٌ جس کے پاس سفر کے لیے سواری موجود ہو، اس کے لیے بہتر ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھے اور اگر نہیں رکھ سکے، تو بعد میں قضا بہر حال لازم ہے۔

روزے کی قضا

فرمایا وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو دو سر دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ سال بھر میں ۲۹ یا ۳۰ دن کی گنتی پوری کرنا انسان کے اندر تقویٰ اور روحانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر تقویٰ کا ڈبچہ نہیں ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی طالب علم کو سند اُسی صورت میں ملتی ہے جب وہ امتحان میں پاس ہو جاتا ہے۔ لہذا حصول تقویٰ کے لیے روزوں کی گنتی پوری کرنا لازم ہے۔ خواہ یہ رمضان کے بعد ہی کرنی پڑے۔ اہم شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے رمضان کے بعض روزے رہ جائیں اور وہ آئندہ رمضان تک ان کی قضا نہ کر سکے۔ تو پھر ہر قضا روزہ کے ساتھ اُسے دو غلہ بطور تاوان بھی ادا کرنا ہو گا۔ اہم ابو حنیفہؒ کا فرمان ہے کہ تاوان ضروری نہیں ہے۔ اُسے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ خواہ آئندہ رمضان کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ آسانی
چاہتا ہے

فرمایا يُدُّ اللّٰهُ بِكُمْ الْيُسْرَى اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ
کرتا ہے۔ وَلَا يُبْدِيْكُمْ الْعُسْرَى تمہاری دشواری منظور نہیں۔ اس
نے تمہاری آسانی کی خاطر تمہیں سہولتیں اور رخصتیں بھی دی ہیں۔ جیسا کہ حاملہ اور مرضعہ
کو سہولت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وَلِتُكَبِّرُوا الْعِدَّةَ تاکہ تم گنتی پوری
کرو۔ اور اس کے اثرات تمہارے اندر تقویٰ کی صورت میں ظاہر ہوں وَلِتُكَبِّرُوا
اللّٰهُ عَلَى مَا هَدٰكُمْ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں
ہدایت دی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے وہ تکبیریں مراد ہیں جو رمضان المبارک
کے اختتام پر نماز عید پر پڑھی جاتی ہیں۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور تاکہ تم اللہ
کا شکر یہ ادا کر سکو۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے۔ لِكُلِّ شَيْءٍ زَكَاةٌ
ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے وَزَكَاةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ اور جسم کی زکوٰۃ روزہ
رکھنے سے ادا ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی توفیق سے اس نے اس فریضہ کو پورا کیا۔ اور اس طرح تقویٰ اور روحانیت
کو اپنایا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

سَيَقُولُ

درس ہفتاد و چہارم (۷۴)

البقرة

آیت ۱۸۶

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿٣١﴾

ترجمہ : اور جب میرے بندے آپسے میرے بائے میں پوچھتے ہیں، پس میں قہر پ
ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے
پس چاہیے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں اور چاہیے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ ٹھیک
راہ پا جائیں (۱۸۶)

شاہین نذیر

آیت زیر در کس سے ماقبل اور مابعد آیات روزہ سے متعلق ہیں۔ پہلی آیت میں معذور لوگوں کو حاصل ہونے والی رعایت کا ذکر تھا۔ اور بعد والی آیت میں روزے کے احکام ہیں۔ اس درمیانی آیت میں اُس دُعا کا ذکر ہے۔ جو بندہ اپنے رب کے حضور کرتا ہے گزشتہ آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا بیان تھا۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو کس طرح پکارنا چاہیے۔ کیا وہ انسان کے قریب ہے یا بعید۔ اگر قریب ہے تو اس کے ساتھ مس گرثی سے مناجات کریں۔ اور اگر وہ دور ہے تو زور سے پکاریں۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي جب میرے بندے میرے بارے میں آپ کے سوال کریں، فَأَنِّي قَرِيبٌ تو میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ اللہ اع إِذَا دَعَانِ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو سُننا ہوں، جب وہ دُعا کرتا ہے، اور مجھے پکارتا ہے۔

مرضیان امور
قبولیت دعا

روحانیت کے لحاظ سے رمضان کا مہینہ ایسا ہی ہے۔ جیسے سال بھر کے مہینوں میں موسم بہار ہوتا ہے۔ جب ہر چیز اپنے جو بن پہ ہوتی ہے۔ اسی طرح

رمضان شریف میں دوسرے مہینوں کی نسبت نیکی کی قدر و قیمت اور وقت کمی گنا
 بڑھ جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نفل فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور
 ایک فرض ستر فرضوں کے اجر کے برابر ہوتا ہے، ترمذی شریف میں امام زہری کا
 قول ہے فرماتے ہیں تسبیحۃ فی رمضان خیر من الف تسبیحۃ فیما
 سواہ رمضان المبارک میں اخلاص کے ساتھ کی گئی ایک تسبیح غیر رمضان کی ایک
 ہزار تسبیح سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا یہ مہینہ تکمیل روحانیت کے لیے موسم بہار کا
 درجہ رکھتا ہے۔ لہذا قبولیت دعا کے لیے بھی یہ مبارک مہینہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے
 دعا کی قبولیت میں زمان اور مکان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے
 رمضان کا مہینہ الیہا مبارک مہینہ ہے۔ جس میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔
 زمان کے لحاظ سے حضور نے جوف اللیل الآخر یعنی رات کے آخری
 حصہ کا ذکر فرمایا کہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے جمعۃ المبارک کے متعلق بھی فرمایا
 کہ اس روز ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے جس میں دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ مکان
 کے لحاظ سے ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں کی گئی دعائیں لازمی قبول ہوتی ہیں
 جیسے مقامات مقدسہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، صفا و مروہ۔ بیت اللہ شریف، ملتزم
 عظیم وغیرہ۔

ایک حدیث میں یوں آتا ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ
 اس کو ناکام نہیں ٹوٹاتا۔ دعا ہمارے دین کا اہم حصہ ہے۔ عبادت کا ایک اہم اصول ہے
 الدعاء هو العبادۃ دعا عبادت ہی ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن پاک
 میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ جُلُوْکُمْ مِیْرَے سامنے
 دعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ہو کر دوزخ میں داخل ہونگے۔ مستدرک
 حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں الدعاء نور الصوۃ من سلاح المؤمن،
 نور السموات والارض، عماد الدین یعنی دعا مومن کا نور ہے۔ مومن کا
 ہتھیار ہے۔ زمین و آسمان کا نور اور دین کا ستون ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر آہستہ آواز سے کرنا چاہیئے۔ یا بلند آواز سے اس کا بیان آ
 چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں بندے سے بالکل قریب ہوں۔ ایک
 موقع پر سفر کی حالت تھی۔ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ اور بلند آواز
 سے ذکر الہی یعنی تکبیر و تہلیل میں مصروف تھے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْدِعُوا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ
 لوگو! اپنی جانوں پر نرمی اختیار کرو۔ تم جس ذات کو پکار رہے ہو، وہ بعید نہیں ہے۔
 وہ تو قریب ہے۔ لہذا بلند آواز سے چیخ و پکار نہ کرو۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا
 ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور قرآن کریم
 میں یہ بھی موجود ہے "وَمَنْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ"
 ہم تو انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ لہذا اُسے آہستگی سے پکارو
 اور اس کے سامنے آہستہ اور خاموشی سے دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
 ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اپنے رب کو عاجزی سے پوشیدہ اور
 گڑ گڑا کر پکارو۔

البتہ اونچی آواز سے دعا کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن بلند آواز اس جگہ پر ہوگی جہاں
 کسی کو تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ فقہانے کرام فرماتے ہیں کہ آواز بلند کرنے سے اگر کسی
 کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو یا تلاوت متاثر ہوتی ہو تو پھر بلند آواز سے دعا کرنا بھی
 مکروہ ہے۔ لہذا آہستہ آواز سے پکارنا ہی بہتر ہے اگرچہ با آواز بلند بھی روا ہے
 حضرت زکریا علیہ السلام کے بیان میں خود قرآن پاک کا ارشاد ہے اِذْ نَادٰی
 رَبَّهُ نِدًا خَفِيًّا جب کہ وہ چپے چپے اپنے رب کے سامنے دعا
 کر رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ خَيْرُ الذِّكْرِ مَا يَخْفٰی
 بہتر ذکر وہ ہے جو مخفی ہو دوسری جگہ فرمایا خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ
 مَا يَكْفِي بہترین ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہترین روزی وہ ہے
 جو کفایت کر جائے۔

غرضیکہ مخفی ذکر میں ایک تو دوسرے کی ایذا رسانی نہیں ہوتی اور دوسرے

ریا کاری سے بچ جاتا ہے۔ لوگ بلند آواز سے ذکر و اذکار کرتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں۔ لاوڈ سپیکر کھول کر اہل محلہ بیماروں اور دیگر عبادت گزاروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث بنتے ہیں۔ دوسروں کی عبادت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی عبادت اللہ کی بارگاہ میں باعث گناہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال ماہ رمضان سے متعلق دو آیات کے درمیان دعا کا ذکر اس لیے ہوا۔ کہ اس ماہ مبارک میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ میرے بندے جب بھی مجھے پکاریں، میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہوں اور اسے قبول کرتا ہوں مگر دو شرائط کے ساتھ۔ ایک یہ کہ دعا کرنے والا میرے حکم کو مانے اور دوسری یہ کہ وہ ایمان رکھتا ہو۔

خاندان
شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کا خاندان برصغیر پاک و ہند کا مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے علمی کارنامے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا شاہ عبدالرحیم بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ ان پانچ سو علماء کی مجلس کے رکن تھے جنہیں اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ سارے علماء بادشاہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ مگر شاہ عبدالرحیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ ان کا ضمیر تنخواہ لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب عالمگیر نے آپ کا نام اس مجلس سے خارج کر دیا۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ اس نے انہیں اس معاملے سے بچا لیا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اس کے بعد آپ نے مدرسہ قائم کرنے کے درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ آپ اہم مجدد الف ثانی کے مریدوں کے مرید تھے۔

شاہ ولی اللہ بارہوی صدیقی مجدد تھے۔ آپ نے دین اور علم کی تجدید کی آپ نے سب سے پہلے فارسی زبان میں فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے

سے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا۔ اُس وقت فارسی ہی دفتری زبان تھی۔ لہذا اس زبان میں استفادہ کا زیادہ امکان تھا۔ اُس وقت اُردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ تاہم آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدینؒ نے اُردو زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ اگرچہ آج وہ زبان پُرانی ہو چکی ہے۔ تاہم یہ لفظی ترجمہ کمال درجے کا ہے آپ نے قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اور آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے ارشادات نوٹ کر کے سورۃ بقرہ کا حصہ شائع بھی کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر عزیزی بھی اپنی نوعیت کی بہترین تفاسیر میں سے ہے یہ تفسیر شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی، آپ تو نابینا ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ خدمت آپ کے شاگردوں نے انجام دی۔ آپ تو زبانی تفسیر بیان کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن وعظ بھی کرتے تھے۔ جس میں ہزاروں لوگ شریک ہو کر فیضیاب ہوتے تھے۔ بعض اوقات غیر مسلم بھی اس پاکیزہ مجلس میں شریک ہوتے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جاتے، وعظ اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ اپنا محاورہ درست کرنے کے لیے شاعر لوگ بھی مجلس وعظ میں بیٹھ جاتے۔ اُس زمانے میں مومن خان مومن بڑا مشہور شاعر ہوا ہے۔ صحیح العقیدہ آدمی تھا۔ شاہ صاحب کی محفل میں شریک تھا، کسی نے پوچھا آپ تو وعظ وغیرہ کے شائق نہیں ہیں، آپ کیسے تشریف لائے۔ تو وہ کہنے لگا، کہ شاہ صاحب کی زبان کی شستگی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہم لوگ محاورہ میں استعمال کر کے اپنی شاعری کو چمکاتے ہیں۔

مولانا ابوالرشاد صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو کہا جا سکتا تھا۔ کہ امت نے قرآن پاک کا حق ادا کر دیا ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر پُر مغز، بامحاورہ اور حکمت آمیز تفسیر ہے۔ یہ تفسیر قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور دوسرے پارہ میں کُتِبَ عَلَیْکُمْ الصَّیَامُ تک ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب وفات پا گئے اور یہ سلسلہ یہیں رُک گیا۔ بہر حال جتنا حصہ بھی میسر ہے، حکیمانہ تفسیر کے لحاظ سے بہترین تفسیر ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے بھی قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ جسے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے مزید سلیس کیا ہے۔ مولانا شیخ الہندؒ کا ترجمہ جو میرے سامنے ہے، وہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی آسان صورت ہے۔ آپ نے ایڈورڈ روڈ دہلی کی اکبری مسجد میں بارہ سال تک اعتکاف کیا اور یہ ترجمہ لکھا۔ جو کہ بالکل با محاورہ اور سلیس ترین ہے۔ تاج پبلی اور دیگر اداروں نے اس کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی آج سے اسی برس قبل قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ آپ نے ترجمہ قرآن کو اور زیادہ آسان کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نوعیت کی یہ بھی کمال محنت کی کاوش ہے۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے حضرات نے قرآن پاک کے تراجم لکھے ہیں۔

قرب خداوندی

الغرض! شاہ رفیع الدینؒ تفسیر ربیعی میں **فَإِنِّي قَرِيبٌ** کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرب خداوندی کی کئی ایک صورتیں ہیں مثلاً خدا تعالیٰ باعتبار ذات قریب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں، جس کا قیام اور بقا خدا تعالیٰ کے وجود کے بغیر حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کی صفت قیومیت کی وجہ سے ہر چیز کو وجود حاصل ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ وجود اور ذات کے اعتبار سے قریب ہے۔

علم اور قدرت کے لحاظ سے بھی خدا تعالیٰ قریب ہے۔ کیونکہ اُس کے علم، ارادے اور تاثیر کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محبت اور حمایت کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ تجلی کے اعتبار سے بھی قریب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے، تو ادھر سے تجلی پڑتی ہے اسی طرح عبودیت کے رابطہ کے اعتبار سے بھی خداوند تعالیٰ قریب ہے انبیاء علیہ السلام کو بارگاہِ خداوندی کے ساتھ براہِ راست رابطہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ رابطہ وحی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کو انبیاء کے کرام کے بتلانے سے قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کو رابطہ بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے

یہ تو یہودی اور عیسائی سب تسلیم کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ بائبل اور قرآن دونوں کتابوں میں یہ آیات موجود ہیں۔ لہذا اگر تم آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے وسیلہ کے بغیر مانتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب چیز پر قیاس کر کے مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ تو فرمایا بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی مثال خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ اُسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نَفَخَ فِيْهِ الرُّوْحَ اس میں جان ڈالی۔ قرآن پاک میں خشک مٹی اور گارے کا ذکر بھی آتا ہے گارے میں جب خمیر پیدا ہوتا ہے تو وہ گل ستر جاتا ہے۔ یہ وہ عنصر (ELEMENT) ہے جس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ اُسے قرآن پاک میں صَلَٰوٰتٍ اور حَمَلٌ مَّسْنُوْنٍ بھی کہا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی ذکر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر اپنے دست قدرت سے اس میں روح ڈالی۔ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ پھر اُسے کہا ہو جاؤ، تو وہ کامل انسان ہو گیا۔ آدم علیہ السلام کامل انسان تھے۔ عقلمند ایسے کہ بنی سے زیادہ کوئی شخص عقلمند، ذہین اور دانا نہیں ہو سکتا۔ دارون کا نظریہ بالکل باطل ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ اولین انسان کی تخلیق بطور بندر ہوئی، پھر آہستہ آہستہ ترقی کر کے انسان بن گیا۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ حضور نے فرمایا نَبِيًّا مُّكَلِّمًا آدم علیہ السلام نبی مکلم تھے۔ نبی ہمیشہ کامل انسان ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام سر سے پہلے انسان اور نبی تھے۔ اور بالکل مکمل انسان تھے۔ سمجھانا یہ مطلوب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بغیر ماں باپ کے مٹی سے انسان کی تخلیق کر لیتا ہے۔ تو عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا فرما دینا کون سی شکل بات ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام عبد اللہ یعنی اللہ کے بندے ہیں، وہ خود اللہ نہیں ہیں۔ فرمایا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ اسحق وہ ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے

غافل ہے اور لعب میں مشغول ہے۔ اُس کی دُعا قبول نہیں کی جاتی۔ نیز یہ بھی آتا ہے کہ دُعا جب پورے یقین کے ساتھ کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائیں گے۔ حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا کَيْفَ اَدْعُوْكَ وَاَنَا اِثْمٌ۔ یعنی پروردگار! میں تجھ سے کیسے دُعا کروں۔ کیونکہ میں تو گنہگار ہوں۔ پھر عابدی سے فرمایا کَيْفَ لَا اَدْعُوْكَ وَاَنْتَ كَرِيْمٌ میں تیرے سلسلے میں کس طرح نہ دُعا کروں چالانکہ تو کریم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ حیا کرتا ہے۔ جب اس کا بندہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ کہ بندے کے ہاتھ خالی لوٹنے لہذا اس کی دُعا ضرور قبول کر لیتا ہے اور حدیث شریف میں ایسی دُعا سے پناہ مانگی گئی ہے جو قبول نہ ہو۔

دُعا کی قبولیت کا معنی بھی سمجھ لینا چاہیے۔ قبولیت دُعا صرف اسی چیز کا نام نہیں کہ النبیان جو مانگے فوراً مل جائے بلکہ کسی چیز کا حاصل ہونا تو حکمت خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور بعض اوقات انسانی ذہن یا لکل بچوں والی حرکات کہ بیٹھتا ہے وہ اللہ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق انسان کے لیے بہتر نہیں ہوتی لہذا اللہ تعالیٰ ایسی چیز اس کے مقدر میں نہیں کرتا۔ انسان سمجھتا ہے کہ اُس کی دُعا قبول نہیں ہوئی۔

حالانکہ اُس چیز کا نام ملنا ہی اُس کی خیر خواہی میں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی نا سمجھ بچہ اصرار کرے کہ آگ کا انگارہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے۔ مگر کون ٹھکنے ہوگا جو بچے کی یہ خواہش پوری کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کی دُعا قبول ضرور کرتا ہے مگر اپنی مصلحت کے مطابق۔ حضور علیہ السلام نے قبولیت دُعا کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جب دُعا مصلحت خداوندی کے مطابق ہوتی ہے، تو وہ فوراً قبول کر لی جاتی ہے۔ اور بندہ کو اسکی مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مطلوبہ شے تو بندہ کو نہیں ملتی مگر اُس دُعا کی برکت سے بندہ پر نازل ہونے

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

اِلٰ عمران ۳

درس بستم ۲

آیت ۶۱ تا ۶۳

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنْ
 الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَ
 نِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ
 نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ⑥۱
 إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ
 وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ⑥۲ فَإِنْ تَوَلَّوْا
 فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِ بِالْمُفْسِدِينَ ⑥۳

ترجمہ

ترجمہ: پس جو شخص اس بائے میں آپ سے جھگڑا کرے بعد اس کے کہ آپ
 کے پاس علم آچکا ہے۔ پس کہہ دیجئے، آؤ، بلائیں ہم اپنی اولادوں کو، تم اپنی اولادوں
 کو، ہم اپنی عورتوں کو، تم اپنی عورتوں کو۔ ہم اپنی جانوں کو، تم اپنی جانوں کو۔ پھر ہم
 التجا کریں اور گڑگڑائیں۔ پھر ہم سب اللہ کی لعنت کریں ان لوگوں پر جو جھوٹے ہیں ⑥۱
 بیشک یہی بات صحیح اور سچا بیان ہے۔ اور نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے
 اللہ کے۔ اور بیشک البتہ اللہ زبردست اور حکمت والا ہے ⑥۲ پس اگر یہ
 لوگ قبول نہ کریں، تو بیشک اللہ خوب جانتا ہے مفسدوں کو ⑥۳

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے
 اور رسول ہیں۔ وہ نہ تو خدا کے بیٹے ہیں اور نہ خود خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو
 فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات ایک واضح مثال کے
 ذریعے سمجھائی۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ناممکنات میں سے
 نہیں ہے۔ آپ کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی مثال جیسی ہے۔ جسے

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و پنج (۵۷)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۸۷

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لَبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۚ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ:۔ حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے پس اللہ نے تمہارے اوپر رجوع فرمایا ہے مہربانی کے ساتھ، اور تم کو معاف کر دیا ہے۔ پس اب مومن عورتوں سے اور تلاش کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پوہیاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگہ یا ہ دھاگے سے فجر سے۔ پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔ اور نہ مومن عورتوں سے اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے والے ہو۔ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں پس ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ متقی بن جائیں۔ ﴿۱۸۷﴾

زیادہ سمجھدار اور صاحب رائے تھا وہ کہنے لگا وَاللّٰهِ لَقَدْ عَرَفْتُمْ نَبُوَّتَهُ
خدا کی قسم تم اس شخص کی نبوت کو پہچان چکے ہو۔ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْفَصْلِ
فِیْ اَمْرِ صَاحِبِكُمْ اور تمہارے صاحب یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے
متعلق اس نے فیصلہ کن بات کی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے

اور اس کے رسول ہیں۔ وہ الہ ہرگز نہیں ہیں۔ اور میں کہتا ہوں وَاللّٰهِ مَا بَآهَلَ
قَوْمٌ نَّبِیًّا اِلَّا هَلَکُوْا خدا کی قسم جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا، وہ قوم
ہلاک ہو گئی۔ فَاِنْ اَبِیْتُمْ اِلَّا الْاِلٰهَ فَاِنَّکُمْ اِنْتُمْ اِنْتُمْ اور اگر تم اس رسول
برحق کا انکار کرتے ہو۔ اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے ہو۔ فَوَادِعُ الرَّجُلِ
تو اس شخص کے ساتھ موادعت کر لو، مصاحبت کر لو۔ اور یہاں سے واپس چلے جاؤ

چنانچہ وہ لوگ مشورہ کے لیے باہر چلے گئے۔ حضور علیہ السلام خود بھی گھر
تشریف لے گئے۔ اور پھر اس حالت میں باہر آئے کہ حضرت حسینؑ آپ کی
گود میں تھے۔ وَآخَذَ بِیَدِ الْحُسَيْنِ اور آپ نے حضرت حسنؑ کا ہاتھ پکڑا
ہوا تھا۔ حضرت فاطمہؑ آپ کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ اور حضرت علیؑ
اُن کے پیچھے تھے۔ آپ اُن سے فرماتے تھے اِذَا اَنَا دَعَوْتُ فَاَمِنُوْا
جب میں مباہلے کے لیے دُعا کروں، تو تم آمین کہنا۔ گویا آپ مباہلہ کے لیے
بالکل تیار ہو کر تشریف لے آئے۔ جب عیسائیوں نے آپ کو اس حالت میں
دیکھا تو ان کا لاٹ پادری اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا لِمَعَشَرِ النَّصَارِی
اے نصاریٰ کے گمروہ! اِلٰہِیْ لَا رَیْ وَجُوْہًا مِیْ اِیْسَہِ چہرے دیکھ رہا ہوں
لَوْ سَاکُوْا اللّٰهُ اَنْ تُیْزِلَ جَبَلًا مِنْ مَّکَانِہِ لَا ذَاکَ اگر
یہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، تو وہ ضرور ہٹا
دے گا۔ لہذا تمہاری خیریت اسی بات میں ہے فَلَا تُبَاہِلُوْا
کہ تم مباہلہ نہ کرو، ورنہ تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

چنانچہ عیسائیوں کے وفد نے مباہلے کا چیلنج قبول نہ کیا۔ اور ان بشر الطیر

مباہلہ سے
فرار

واقعہ پیش آیا تھا۔ کہ اپنی بیوی سے مباشرت کر لی اور حضور علیہ السلام کے سامنے اس غلطی کا اعتراف کیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس قسم کے واقعات پیش آنے پر اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی دے کر کہ اہل اسلام کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اب رات کے وقت اختتامِ سحر ہی تک کے لیے یہ پابندی ہٹالی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ ط حلال قرار دیا گیا ہے۔ تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ رَفَث کا معنی اُعریانی اور بے حجابی کی بات کہنا ہے۔ اور مراد عورت سے ملنا، اس سے مباشرت کہنا ہے۔

فلسفہ لباس

آگے عورتوں کو بمنزلہ لباس قرار دیکر لباس کی حکمت اور فلسفہ بھی بیان کر دیا

هٰنَ لِبَاسٌ لَّكُمْ يَهْدِيكُمْ فِي مَنَازِلِكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَذَكَّرُونَ

لِبَاسٌ لَّكُمْ يَهْدِيكُمْ فِي مَنَازِلِكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَذَكَّرُونَ

پوری ازدواجی زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ لباس انسان کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم اور لباس کے درمیان کوئی پردہ عامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ لہذا تم اپنی عورتوں سے مستفید ہو سکتے ہو۔ لباس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو زینت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سکے مقام پر لباس کی حکمت اور فلسفہ خود بیان فرمایا ہے۔ "وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا لِّيُبَيِّنَ لَكُمْ سَوَآتِكُمْ وَرِثَا" یعنی ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ستر پوشی کہتا ہے، جو فطری چیز ہے کہ اس کے بغیر انسان اور حیوان میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اور دوسرا یہ زینت کا باعث بھی ہے۔ النَّاسُ بِاللِّبَاسِ لَكُمْ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ سَوَآتِكُمْ وَرِثَا" کے ساتھ ہی چھتے ہیں، لباس کے بغیر کوئی زینت نہیں۔ چونکہ عورت مرد کے لیے زیب و زینت کی بنیاد ہے اس لیے عورت کو لباس کے ساتھ

کہ جنت صرف انہی کے لیے ہے، کوئی دوسرا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا تو پھر یہ لوگ موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے، حضور نے فرمایا۔ اگر یہ موت کی تمنا کرتے تو فوراً مر جاتے۔ اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ قرآن پاک کا دعویٰ اس قدر سچا ہے۔ کہ یہودیوں نے کبھی موت کی تمنا نہیں کی۔ نیز فرمایا کہ اگر نجران کے عیسائی مباہلہ پر آمادہ ہو جاتے، تو جب واپس لوٹتے نہ ان کا مال باقی رہتا نہ اہل۔ ہر چیز فنا ہو جاتی۔ ایک دوسری روایت میں جسے امام بیضاوی نے نقل کیا ہے۔ یہ الفاظ آتے ہیں۔ لَمْ يَخُفُوا قِرْدَةً وَخَنَازِيرَ اللَّهِ تَعَالَى اُنْ كِي تَكْلِيں سَخ كَر كے بندہ اور سور بنا دیتا۔ اللہ تعالیٰ وادی نجران پر آگ برساتا اور ساری وادی آگ سے بھڑک اٹھتی، پوری وادی میں پرندوں اور درختوں تک کوئی چیز باقی نہ رہتی بغیر مباہلہ کے لوٹ جانے سے وہ لوگ اس وبال سے بچ گئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ مباہلہ کے لیے حضور علیہ السلام اپنے اہل خانہ میں سے بیٹی فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور علیؓ کو لے کر نکلا بشیعہ حضرات اس ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے اہل بیت ہی افراد ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی اہل بیت میں شامل نہیں ہے۔ حالانکہ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں۔ مگر سب کو اس موقع پر لانا ضروری نہیں تھا۔ یہ تو دعا کا مقام تھا، آپ چند افراد کو لے کر فوراً نکل آئے۔ تاہم مذکورہ روایت میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود نہیں ہے۔

ابن عساکر بہت بڑے مؤرخ گزشتے ہیں جنہوں نے بڑی مستند تاریخ لکھی ہے۔ وہ امام جعفر صادقؑ سے اور وہ اپنے والد امام محمد باقرؑ سے روایت بیان کرتے ہیں۔ کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے تشریف لائے تو ان کے ساتھ حضرات ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی المرتضیٰؓ اور ان سب کی اولاد بھی تھی۔ یہ روایت امام جلال الدین سیوطیؒ نے درمنثور میں اسی طرح بیان کی ہے۔ اور یہی روایت تفسیر روح المعانی میں بھی موجود

منقطع ہوتی ہے۔ کیونکہ متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والی اولاد مرد کی اولاد ہی تصور نہیں ہوتی نہ اس سے نسب ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ مولود کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ لہذا یہ غلط کام ہے نہ صرف انسانی حقوق تلف ہوتے ہیں بلکہ یہ تو انسانیت کی توہین ہے لہذا نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقا ہونا چاہیے

تکمیل روزہ

فرمایا وَكُلُوا وَاشْرَبُوا رَات کو کھاؤ پیو اسکی اجازت ہے۔ اب کوئی پابندی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس معاملہ میں غلطی لگی اور انہوں نے دھاگا سے عام قسم کی ڈوری مراد لیا۔ عدی بن حاتم کا ذکر اس ضمن میں خاص طور پر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سفید و سیاہ رنگ کی دو رسیاں رکھ لیں تاکہ ان کی شناخت تک کھاپی سکیں۔ جب اس بات کا ذکر حضور علیہ السلام سے کیا، تو آپ مسکرائے۔ اور فرمایا اِذَا وَسَّادَتْكَ عَرِيضٌ تَهَارَتْكِ تَوْبَةٌ لِمَا جَوَّزْتَ اُسے کہ اس میں رات اور دن کو لپیٹ رکھا ہے۔

مفسرین کو اِس فرماتے ہیں کہ جب اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اَکَلَمَ الْفَاظَ مِنَ الْفَجْرِ اُتار کر معاملہ کو بالکل واضح کر دیا کہ دھاگے سے مراد عام ڈوری نہیں بلکہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔ جب رات کی سیاہی ختم ہو کر صبح کی سفیدی ظاہر ہو جائے، اُتوت تک تم کھا پی سکتے ہو اور اپنی بیویوں سے مباشرت بھی کر سکتے ہو۔ گویا روزے کی ابتداء صبح صادق سے ہوگی۔

ثُمَّ اَتَمَّرَ الصَّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ پھر رات تک روزے کو پورا کر یعنی طلوع فجر سے لے کر رات کی آمد تک روزہ رکھو۔ رات سے مراد مطلق غروب آفتاب ہے نہ کہ سرخس یا سفیدی کا زائل ہونا جو نہی سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی۔ روزہ افطار کر لینا چاہیے۔ مزید کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا چاہیے

اس سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ عام لوگ صوم وصال نہ کہیں یعنی متواتر کئی کئی

سوئی کی برکت

بشخص فرماتے ہیں۔ کہ مباہلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا۔ اگر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص مباہلہ کرے گا، تو اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، جو حضور علیہ السلام کے اپنے زمانے میں ہوتے، تاہم اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں، کہ جب نصاریٰ حضور علیہ السلام کے مقابلہ پر آئے تو ان کے سمجھاروں نے کہا، اے گمراہ نصاریٰ! تم خوب سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام کے متعلق بڑی واضح اور فیصلہ کن بات کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل میں آخری نبی بھیجنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ لہذا کچھ بعید نہیں کہ یہ وہی نبی ہوں جن کی بشارت ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یاد رکھو! نبی کے ساتھ مباہلہ کسی قوم کے حق میں اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ ایسی قوم کا کوئی چھوٹا بڑا عذاب الہی اسے نہ بچ سکے۔ اور پھر پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بہتری کو لوٹ جائیں۔ ہم سائے عرب سے لڑائی مول نہیں لے سکتے آخر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حسن، حسینؑ، فاطمہؑ اور علیؑ کو ساتھ لیے باہر تشریف لائے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر عیسائیوں کے لاٹ پادری نے کہا، میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دُعا پاڑوں کو بھی ان کی جگہ سے سر کا سکتی ہے۔ تم ان سے مباہلہ کر کے اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دو۔ ورنہ زمین پر ایک بھی نصرانی باقی نہیں رہیگا۔ چنانچہ خبرانیوں نے مقابلہ ترک کر دیا۔ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔

مولانا عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ قرآن پاک نے یہ نہیں بتایا کہ مباہلہ حضور علیہ السلام کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ مباہلہ کا اثر آپ کے بعد بھی وہی ہونا چاہیے جو آپ کی موجودگی میں ہونے والا تھا۔ البتہ بعض سلف اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ کی مشروعیت اب بھی باقی ہے۔

سے نہیں مل سکتے۔ اگر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانے سے بھی مادہ خارج ہو گیا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ یہاں پر مساجد کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ گھروں میں اعتکاف کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو۔ بلکہ لَا رَاعِتْكَافَ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ مسجد کے بغیر تو مرد کا اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مسجد بھی ایسی ہونی چاہیے جہاں پنجگانہ نماز باجماعت کا انتظام ہو۔ تاکہ نماز کے لیے کسی دوسری جگہ نہ جانا پڑے۔ البتہ اعتکاف کے لیے جامع مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ معتکف کو نماز جمعہ کے لیے دوسری مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں نماز جمعہ کے بعد اُسے فوراً واپس اپنی اعتکاف والی جگہ میں آ جانا چاہیے۔

عورتوں کا
اعتکاف

عورتوں کے اعتکاف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم مالک کا مسلک یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی مسجد میں اعتکاف کریں مگر اہم شافعی فرماتے ہیں۔ چونکہ عورت اور غلام پر نماز باجماعت اور جمعہ فرض نہیں ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی اعتکاف بیٹھنا چاہیں ایسا کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھنا بھی روا ہے۔ اہم ابو حنیفہ اور ان کے شاگردان اہم ابو یوسف اور اہم محمد اور اہم زفر فرماتے ہیں کہ عورت کو اپنے گھر میں ایسی جگہ اعتکاف بیٹھنا چاہیے جو اُس نے نماز کے لیے منتخب کر رکھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَا تَمْنَعُوا أُمَّةَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ کی بندہ یوں کو مسجدوں میں جانے سے مست رو کو و بِيُوتِهِمْ خَيْرٌ لَّهُمْ مِمَّا ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔ عورت کی گھر میں نماز مسجد کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتی ہے لہذا عورت کو اعتکاف بھی گھر میں ہی بیٹھنا چاہیے۔ ہاں اگر مسجد پر امن ہو اور وہاں عورتوں کے اعتکاف بیٹھنے کا معقول انتظام ہو، تو مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے حضور علیہ السلام کی ازواج مطہرات مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

یہ مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ بِهِنَّ تَامٌ کہ وہ حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوهَا پس ان کے قریب مت جاؤ، یعنی حدوں

حفاظت پر
حد شرعیہ

ہے۔ سب اُسی کے محتاج ہیں۔ آگے سورۃ مائدہ اور بعض دوسری صورتوں میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل سے موجود ہے کہ وہ خود بھی محتاج ہیں۔ فرمایا وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ بیشک خدا تعالیٰ ہی غالب اور کمال قوت رکھنے والا حکیم ہے۔ وہ اپنی حکمت سے چاہے کسی کو بغیر باب کے یا ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمائے۔ وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔

مفسدین کو
تنبیہ

فرمایا فَإِنْ تَوَلَّوْا أَكْرِهَ لَكُمْ۔ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی خدا کی وحدانیت کو تسلیم نہ کریں۔ اور اسی طرح عناد کرتے رہیں، تو آپ فرما يُحِبُّ فَتَانَ اللَّهِ عَلَيْهِمُ، بِالْمُفْسِدِينَ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اور زمین میں سب بڑا فساد شرک ہے۔ کیونکہ امن کا قیام ایمان، توحید، اطاعت اور نیکی سے ہی ممکن ہے۔ کفر، شرک اور برائیوں سے بد امنی، فساد، بد اعتقاد ہی، ذہنی لپٹی اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا خوب اچھی طرح سمجھ لو، کہ فساد ہی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ فساد کی خاطر کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والے اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور سزا دیگا۔

البقرة ۲

آیت ۱۸۸

سیقول ۲

درس مفتادوشش (۷۶)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى
الْحُكَّامِ لِيَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ۝ ۱۸۸

۱۸۸

ترجمہ: اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال اپنے درمیان باطل اور ناحق کے ساتھ اور
نہ پہنچاؤ مالوں کو حاکموں تک تاکہ تم لوگوں کے مالوں سے ایک حصہ گناہ کے
ساتھ کھاؤ۔ اور تم جانتے ہو ۝ ۱۸۸

اس سے پہلے اعتکاف کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ اعتکاف کی حالت
میں عورتوں سے مفاربت جائز نہیں۔ حدود اللہ کی حفاظت کا مسئلہ بھی بیان ہوا۔
تاکہ انسان کے اندر تقویٰ کی روح پیدا ہو جائے۔ روزہ کی مدت کا تذکرہ بھی آگیا کہ
روزہ طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک کے لیے ہے۔ رات کو کھانے
پینے اور عورتوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ الغرض اس پورے رکوع میں
روزہ ہی کا بیان ہے۔ جس میں صدقہ فطر، نزول قرآن، دعا، سحری کھانے اور
اعتکاف کے مسائل شامل ہیں۔

گزشتہ پیرتہ

اس رکوع کے بعد اگلے رکوع میں حج کا ذکر ہے۔ یَسْأَلُونَكَ عَنِ
الْأَهْلِیَّةِ سے شروع کر کے مناسک حج کی ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اس
کے بعد جہاد کا مسئلہ ہے۔ مفسرین کرام کے لیے اشکال پیدا ہوا ہے کہ درمیان
میں مال کا تذکرہ کیونکر آگیا ہے۔ جب کہ ایک طرف روزے کا بیان ہے اور
دوسری طرف جہاد کا مسئلہ ہے۔ بظاہر یہ مضامین آپس میں غیر مربوط معلوم ہوتے
ہیں۔ مگر حقیقت میں سابقہ مضمون کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

رابط آیات

حضرت مولانا شیخ المسند نے اس کی تشریح یوں بیان کی ہے کہ روزہ

عقیدہ توحید

ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے بنی (علیہ السلام) آپ فرمائیجئے اے اہل کتاب! یعنی اے تورات کے ماننے والے یہودیوں اور انجیل کے ماننے والے عیسائیوں! یہ دونوں گروہ کفر و شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے اور انہیں ایذا پہنچا کر کفر کا ارتکاب کیا جب کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دے کر شرک کو اختیار کیا۔ اُس زمانے میں اہل کتاب کے علاوہ ایران کے آتش پرست مجوسی تھے۔ اور وہ بھی مشرک۔ عرب کے لوگ جو اپنے آپ کو براہمی کہلاتے تھے، وہ بھی کفر و شرک میں غرق تھے۔ نزول قرآن کے زمانے میں کوئی اکاد کا آدمی ہی ملتِ ابراہیمی پر چلنے والا ہو گا۔ ورنہ سب کچھ سب کفر و شرک کی ظلمات میں بھٹو کر رہے تھے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرِ آخر الزمان علیہ السلام سے اہل کتاب کو کہلایا تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ اَیْکَ ایسے کلمے کی طرف آجاؤ سَوَاءٌ بَيْنِنَا وَبَيْنَکُمْ حُجْرَتَا اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یعنی مسلم ہے۔ اس بارے میں تورات، انجیل اور قرآن کی بات مساوی ہے۔ اور وہ ہے مسئلہ توحید یہ سب کا مشترکہ مسئلہ ہے یعنی اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس مسئلہ پر تورات، انجیل اور قرآن پاک متفق ہیں بلکہ مہربانی کی یہی تعلیم ہے۔ لہذا ہم سب اس پر کار بند ہو جائیں۔ قرآن پاک نے یہی مسئلہ دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا فَاَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّیْنَ پس اللہ کی عبادت کرو اپنے دین کو اسی کے لیے خاص کر کے مہربانی نے اپنی قوم سے یہی کہا لَقَوْمٍ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَیْرِہٗ اے قوم! صرف اسی ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں۔ وَلَا تَشْرَکْ بِہٖ شَیْئًا اور اس کے ساتھ ہم کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔ امام ابن کثیر لفظ شَیْئًا کی تفسیر

کی نواسی آپ کے نکاح میں تھی۔ اُس کے علاوہ سندھ کے انگریز محشر کی بیٹی مسلمان ہو کر آپ کے نکاح میں آئی اور تیس سال کی رفاقت کے بعد فوت ہوئی۔ مولانا عزیز گل ایک تاریخی انسان ہیں۔ سخاکوٹ انجینسری میں ان کی اپنی زمین ہے، وہیں آپ کی رہائش ہے۔ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ تاہم اپنے زمانے میں بڑے بہادر اور دلیر آدمی تھے۔

مولانا شیخ الہند کے ساتھیوں میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنیؒ بھی تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحبؒ بھی آپ کے ساتھ مالٹا میں قید رہے۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ انگریزوں نے ان کے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا شیخ الہند نے بڑی کوشش کی کہ حکیم کو دفن کرنے سے پہلے سنون طریقے سے غسل دیا جاسکے۔ مگر انگریزوں نے اسکی اجازت نہ دی اور کہا کہ ان کی طرف سے دیا گیا غسل کافی ہے۔ بہر حال آپ نے تیمم کر کے جنازہ پڑھا، اور ان کو دفن کیا۔

مولانا وحیدؒ

حضرت شیخ الہند انگریز کے سخت مخالف تھے۔ اگر کوئی انگریز کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا، تو فرماتے، بھئی کسی اور عالم سے پوچھ لو، شاید میں مبالغہ نہ کر جاؤں کیونکہ مجھے انگریزوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ انگریز نے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ تم کوں کی سلطنت کو انگریز نے ہی درہم بہم کیا۔ مولویوں کی قلم اور زبان سے تم کوں کی خلافت پر کفر کا فتویٰ لگوایا۔ اور انہیں بدنام کیا۔

شخصی طور پر انگریز بڑی بااخلاق قوم ہے۔ آپ ان سے تجارت کریں، کوئی اور لین دین کا معاملہ ہو، بڑے اچھے طریقے سے پیش آئیں گے، اسی لیے انگریز بڑا چال باز ہے۔ گزشتہ زمانے میں تجربہ کار لوگوں میں یہ محاورہ مستعمل تھا کہ اگر جرم ختم ہو جائے، تو دنیا سے مشینری ختم ہو جائے۔ کیونکہ جرمنی لوگ مشین ذہن کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشینری ایجاد کی ہے۔ حتیٰ کہ سلاخی مشین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ تو یہ محاورہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر دنیا سے انگریز قوم ختم ہو جائے تو چال بازی ختم

انگریز کی چال بازی

میتے ہیں۔ مسلمانوں میں اولیاء پرستی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ شہداء پرستی اور
پیر پرستی مسلمانوں میں عام پائی جاتی ہے۔ ان کی ایسی تعظیم کرتے ہیں جیسی خدا کی
کمرنی چاہیے۔ ان کی بات کو خدا اور رسول کی بات سے مقدم سمجھتے ہیں۔ ان کے
سامنے سجدے کرتے ہیں۔ اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نذر و نیاز
میتے ہیں۔

قبر پرستی کی بیماری یہود و نصاریٰ میں بھی اور اب مسلمانوں میں بھی عام
ہے۔ حکومت خود اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ چادریں چڑھائی جا رہی
ہیں۔ قبروں کی بے جا تعظیم ہو رہی ہے۔ یہ سب، شرکیہ رسوم اور اسراف ہے
بھائی! قبروں پر جاکر وہ کام کرو، جو شریعت سے ثابت ہے اور جس کا حکم دیا گیا
ہے۔ وہاں جاکر فاتحہ پڑھو، اور فوت شدگان کے لیے دعا کرو۔ جنور علیہ السلام
نے خود اپنے متعلق فرمایا اللہُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِي وَثَنًا يُعْبَدُ
اے اللہ! میری قبر کو صنم یا بت نہ بنانا کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگیں۔ اس زمانے
قبر پرستی کی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔ یہ عرس کیا ہے۔ شرک و بدعت کے
ارتکاب کا ایک طریقہ ہے۔ قبر کو بچتہ بنانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ جنور صلی اللہ علیہ
سلم نے فرمایا لَا تَجْصَّصُوا قُبُورَ يَرْحَمُ اللہُ رِجَالًا وَلَا نِسَاءً۔ اب چسپ ہو رہے ہیں۔
گنبد بنائے جاتے ہیں۔ نقش و نگار ہوتا ہے۔ اللہ کے بندو! یہ اینٹ،
مسالہ کسی غریب کو دے دو، اس کے سر چھپانے کے لیے جھونپڑی بن جائے
اور تمہیں ثواب بھی حاصل ہو۔ کسی محتاج کی دعائیں لو، قبروں پر چراغاں کرنے،
بلب لگانے اور پنکھے نصب کرنے سے کیا حاصل۔ یہ تو صریحاً قبر پرستی ہے۔
خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بہت بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ کا
لقب سلطان الہند ہے۔ تقریباً نو سو لاکھ انسانوں کو آپ کی وساطت سے ایمان
کی دولت نصیب ہوئی، اسی طرح سید خواجہ علی ہجویریؒ اپنے پیرومرشد حضرت
فتلیؒ کے حکم سے لاہور تشریف لائے اور تبلیغ کا کام کیا۔ جب آپ کو لاہور آنے

ہیں، جو ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا۔

بہر حال شیخ سعدی کی قید و بند سے واضح ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی انگریز مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں مگر وہ بام عروج پر تھے۔ فرانس اور یہ طائیہ تو اس وقت بالکل غیر مستعد تھے انہیں تو کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ پشت پر چمڑا باندھتے تھے۔ انگریز اس وقت بالکل پسماندہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کی حربے تمہی تمہی نصیب ہوئی۔ اندلس میں بھی مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ انگریز تو چودھویں صدی میں جا کر مستعد ہوئے ہیں انہوں نے سائنس میں تمہی کی اور پھر انہیں غلبہ حاصل ہوا۔

ترک سلطنت

اس زمانے میں مسلمانوں کی ترک سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا ترکوں نے چار سو سال تک عیسائی سلطنتوں کے ساتھ ٹکرائی۔ انگریز، جرمن، فرانسیسی، روسی سب اسلام کے اترلی دشمن تھے۔ ترکوں نے ہر ایک کے ساتھ خوب معرکے سر کیے بڑے بہادر لوگ تھے۔ حنفی مسلک کے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم کی طرف سے زیادہ تہ تشنہ ہی ہے۔ مگر اسلام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاہم کمال اتا ترک جس کا آج کل ٹرے منایا جا رہا ہے۔ اس نے اسلام کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس نے خلافت کو ختم کر دیا جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنا۔ مگر اس نے ترک کی کو بڑی طاقتوں سے الگ کر کے اسے سازشوں سے بچا لیا۔ اس نے عربی زبان کو ملک سے بالکل نکال باہر کیا حتیٰ کہ عربی اذان بھی بند کرادی۔ اس نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں مگر ترک کی حکومت کا زوال عربوں کی حربے سے آیا۔ یہ غدار نکلے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے آلہ کار بن گئے۔ اردن کے موجودہ فرمانروا کا دادا شریف حسین سیّد ہونے کے باوجود انگریزوں کا پھٹو تھا، اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا انگریز نے ان کو وفاداری کی بنا پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں دے دیں۔ ایک کو عراق میں جگہ دے دی۔ ایک کو اردن میں اور ایک پروردہ کو فلسطین میں بٹھا دیا پھر اس نے شاہ سعود کے ساتھ ساز باز کی۔ اس کی پوزیشن بدوؤں والی تھی، یہ مستقل مزاج

نہ علیم کل، نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ کسی کو پیر دستگیر اور غوث اعظم بھی تسلیم نہ کریں
یہ سب شرکیہ باتیں ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کے لیے لائق ہیں۔ مافوق الاسباب حاجت روائی
اور مشکل کشائی صرف خدا کی ذات ہی کر سکتی ہے۔ جگہ جگہ یا علی اور یا غوث لکھا ہوا ہے
یہ سب شرک کی نشانیاں اور غلط عقیدے کا اظہار ہے۔ پیروں کے سامنے رکوع
اور سجدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ قبضہ پر بھی سجدے ہوتے ہیں۔ یہ تو انجیل نے بھی منع
کیا ہے۔ وہاں یہ آیت موجود ہے۔ خداوند کو سجدہ کہہ اور صرف اسی کی عبادت
کہہ مگر عیسائی اس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ یا
اللہ مانتے ہیں۔ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ وہی
معاملہ کرتے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

آگے فرمایا وَلَا تَخْذَ بَعْضُنَا بَعْضًا رِبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ ہم میں
سے بعض بعض کو اللہ کے سوا رب نہ بنالیں۔ کسی کو رب بنانا بھی کفر اور شرک
میں داخل ہے۔ لَا رَبَّ سِوَاهُ خدا کے سوا کوئی رب نہیں۔ ہم بار بار پڑھتے ہیں
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ پھر یہ بھی کہتے ہیں۔ قُلْ أَعُوذُ
بِعَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ مطلب یہ کہ ربوبیت کا مالک، پرورش
کرنے والا کسی چیز کو درجہ کمال تک پہنچانے والا اور تمام اسباب مہیا کرنے والا

بزرگان دین کے کلام میں پیر دستگیر اور غوث اعظم وغیرہ الفاظ بعض مقامات پر استعمال کیے
گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس سے ہرگز وہ معانی مراد نہیں لیے جو اہل شرک مراد لیتے ہیں۔
بلکہ غوث سے مراد ایسی مقبول کار آمد مستجاب الدعوات ہستی جنہی دعاؤں اور برکات سے اللہ تعالیٰ
لوگوں کو فیض پہنچاتا ہے اور یہ لوگوں کا نفع کیونکر کرتے ہیں اور روحانی فیض پہنچاتے ہیں۔ اور لوگوں
کی طرح طرح کی مشکلات اور ضروریات کی گمراہ کشائی ان حضرات کی تعلیم و تربیت، تلقین
و تمکیم، تفسیر، دعاؤں اور توجہات وغیرہ کی وجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ ۱۲

مولانا شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ وسیع مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کے دو اسباب ہیں، قرآن سے دوری اور فرقہ بندی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلوی، اُن کے خاندان اور حضرت شیخ الہند نے قرآن پاک کی تعلیم دینے میں زندگیاں کھپا دیں۔ مولانا عبید اللہ رندھی نے حضرت لاہوری کو قرآن پاک کی تعلیم سے آراستہ کر کے فرمایا تھا، احمد علی اپنی پوری زندگی قرآن کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا، اور پھر آپ نے اس نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ ساری عمر لوگوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہے۔ چالیس برس میں آپ نے پانچ ہزار علماء کو قرآن کی تعلیم دی۔ آپ دوسری کتابیں عام طور پر نہیں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی مشکوٰۃ شریف یا حجة اللہ البالغہ کا درس دے دیتے تھے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ یہ بھی کمال مجھے کا مفصل ترجمہ ہے۔ آپ سمجھتے تھے کہ لوگ قرآن سے دور ہو گئے ہیں۔ انہیں قریب کرنے کی کوشش میں آپ نے یہ ترجمہ اور تفسیر لکھی۔

حضرت شیخ الہند فرقہ بندی کو بہت بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پارٹی بازی مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے اور اگر اسے دور نہ کیا گیا تو مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ والوں کو قریب کرنے کی کوشش بھی کی۔ آپ نے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کو قریب کیا اور پھر علی گڑھ پارٹی کو ساتھ ملایا۔ تاکہ سب مل کر مسلمان قوم کی خدمت کر سکیں اور اس سلسلہ میں متحدہ پروگرام پر عمل پیرا ہو سکیں حضرت مولانا محمد حسن کو شیخ الہند کا خطاب مولانا محمد علی جوہر نے ہی دیا تھا جسے برصغیر کے تمام لوگوں نے تسلیم کیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مولانا محمود الحسن نہایت نیک، متدین اور صالح آدمی تھے۔ خاموش رہ کر بڑے بڑے کام کرتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی جبرطوں کو انہوں نے ہی کھوکھلا کیا۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے دور دور تک جانے پہچانے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب پاشا اور الزمر شاہ بھی سمجھتے تھے کہ آپ

کی سخاوت ضرب المثل بن چکی ہے۔ امام ابن قتیبہؒ نے اپنی کتاب "الشجر والشجر" میں تذکرہ کیا ہے۔ کہ حاتم کی سخاوت کو شہرت ایسے ہی حاصل نہیں ہو گئی، اس شخص نے انیسویں مرتبہ اپنا گھربار، مال و متاع لٹا دیا تھا۔ عیسائی مذہب رکھتا تھا اور اسی پر اُسکی موت واقع ہوئی، اُس کا بیٹا عدیؒ بن حاتم بھی عیسائی تھا اور ابتداء میں اسلام کا سخت مخالف تھا۔ مگر کسی نیک آدمی کے مشورہ سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اُس کی بہن کو بھی ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ عدیؒ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اُس وقت فِ عُنْتَقَى صَلَیْبٍ مِّنْ ذَهَبٍ میری گردن میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ آنحضرت علیہ السلام نے دیکھتے ہی فرمایا اَلْقِ عَنْكَ هَذَا الْوَشْنَ اِس بُت کو اپنی گردن سے اتار پھینک۔ گویا آپ نے صلیب کو وشن کہا۔ صنم اور وشن میں فرق یہ ہے کہ جو بُت کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ صنم کہلاتا ہے۔ اور جو اُن کھڑا ہو، اُسے وشن کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے صلیب کو وشن فرمایا۔ نیز حضور علیہ السلام نے یہ بھی تلاوت فرمایا اَتَّخِذُواْ اَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ اِنَّ يَهُودِيْنَ اور عیسائیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔ حضرت عدیؒ کہتے ہیں میں نے عرض کیا حضرت! مَا كُنَّا نَعْبُدُهُمْ اِن كُنَّا لَمُتَّحِدِينَ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ رب تو جب بتاتے جب ان کی عبادت کرتے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلَيْسَ اَنَّهُمْ كَانُوا يَحْلُوْنَ لَهُمْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اہل کتاب کے مولوی اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال قرار دیتے تھے اور وہ لوگ اسے حلال ہی سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اللہ نے حلال فرمایا یہ درویش اُس چیز کو حرام قرار دے دیتے تھے، اور وہ لوگ اسے حرام ہی سمجھتے تھے۔ حضرت عدیؒ نے عرض کیا، حضور! ایا تو یہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہی تو رب بنانا ہے۔ کیونکہ حلال و حرام اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد پاک ہے۔ لَا تَحِلُّ مَالٌ إِلَّا بِطَيِّبِ نَفْسِهِ، کسی مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔ دوسرے مقام پر یہ بھی آتا ہے ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً سوائے اس کے کہ تجارت ہو کہ اس طریقے سے منافع کھانا جائز ہے۔ منافع بھی دوسرے کے لیے فائدہ ہی ہوتا ہے، اس کو جائز و شرعہ دیا گیا ہے۔ مگر ناجائز اور باطل چیز کسی وقت بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ ناجائز مال خواہ چوری کے ذریعے حاصل ہو یا خیانت یا دھوکا یا رشوت کے ذریعے یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

مولانا علیہ اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ رشوت سلطنتوں کو تباہ و برباد کرنے والی لعنت ہے۔ اس لعنت سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہو یا بد طانیہ، اور آپ کا ملک تو صفت اہل میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں کر لیا جاسکتا۔ آپ رشوت دیے بغیر ملک سے سامان نہیں چھڑا سکتے۔ اس کے بغیر ڈاک خانے والے بات نہیں سننے پولیس میں رپٹ نہیں لکھائی جاسکتی۔ محکمہ اوقاف مقدس محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اس لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ انسانیت کی دو بڑی دشمن طاقتیں رشوت اور سود ہیں، اسلام نے ان دونوں چیزوں کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

اکل حرام کی ایک اور صورت غاصبانہ قبضہ بھی ہے، جیسا کہ پبلینز پارٹی کے زمانہ میں زمین اور کارخانے چھینے گئے، پچیس سال میں واجب الادا قیمتیں لگائی گئیں اور اصل مالکوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اس سے تو بھارت والے اچھے رہے جنہوں نے چھینا بیشک مگر طریقے سے۔ یکدم کسی کی زمین یا کارخانہ چھین لینا ظالمانہ طریقہ ہے اس کا درست طریقہ یہ تھا کہ کوئی کمیشن بٹھایا جاتا جو تحقیقات کے بعد فیصلہ کرتا کہ کون سی جائیداد جائز ذرائع سے حاصل کر رہا ہے اور کون سی ناجائز ذرائع سے۔

اجرم بھی یعنی دوسرا اجر ملے گا۔ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ اور اگر تم ردگردانی کرو گے فَإِنْ
 عَلَيْكُمْ إِلَهُ الْيَرِيسِينَ تو تمام رعیت کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ کیونکہ تمہاری وجہ
 سے سب لوگ ایمان سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے بعد یہ آیت لکھی جو آج
 کے درس میں آئی ہے۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا۟ اِلٰى كَلِمَةٍ
 سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ
 شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ
 تَوَلَّوْا۟ فَقُولُو۟ا اشْهَدُو۟ا بِاَنَّا مُسْلِمُو۟نَ

حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کی سنتوں میں پہلی
 رکعت میں پہلے پائے کی یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔ قُولُوا۟ اٰمَنَّا
 بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اٰبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
 وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَاِلِسٰخٰطَ وَمَا اَوْتٰى مُوْسٰى وَعِيسٰى وَمَا
 اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نَفَرِقُ بَيْنَ
 اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُوْنَ اور دوسری رکعت میں آج کی آیت
 يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تلاوت فرماتے۔ بعض اوقات آپ پہلی رکعت میں سورۃ کافرون
 اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص بھی تلاوت فرماتے۔ یہ آیات اور سورتیں عقیدہ
 توحید اور تردید شرک پر مشتمل ہیں۔ اس لیے بڑی اہم ہیں۔ ان میں اسلام کی بنیادی باتیں
 اور اسکی دعوت ہے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۸۹

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و ہفت (۷۷)

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهِلَةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَاجَّ ۖ
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اتَّقَى ۚ وَآتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ :- لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے گھر کی یہ اوقات
ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ کہ تم گھروں میں پشت
کی طرف سے آؤ۔ لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اور گھروں
میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۸۹﴾
قبل ازیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے احکام بیان فرمائے۔
اور اس کے بعد مال کے متعلق مسائل بیان ہوئے۔ اب اس آیت میں نئے
چاند کے متعلق سوال اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔

رابط آیات

بظاہر یہ دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ چاند
کے گھٹنے بڑھنے کا رمضان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ نیا چاند نکلنے پر ہی روزہ
شرع کیا جاتا ہے۔ اور اگلا چاند نظر آنے پر ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف
میں آتا ہے۔ افْطِرُوا لِرُؤْيَايْتِهِ وَصُومُوا لِرُؤْيَايْتِهِ چاند دیکھ کر روزہ
رکھو اور دیکھ کر افطار کرو۔ اس لیے دونوں مسائل کو یکے بعد دیگرے بیان کیا
گیا ہے کہ ان دونوں میں باہمی ربط ہے۔

در اصل یہ آیت ایک سوال کا جواب ہے، جو حضور علیہ السلام کی خدمت
میں پیش کیا گیا۔ اس کمرہ ارض کے لیے روشنی کے دو ہی ذرائع ہیں یعنی سورج

شان نزول

ربط آیات

گزشتہ درس میں اہل کتاب کو اُس کلمہ توحید کی دعوت دی گئی تھی، جو تمام انبیاء علیہم السلام، تمام کتب اور تمام شرائع کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ اور ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنالیا۔ اور رب بنانے سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو مولوی اور درویش حلال قرار دے دیں اُسے حلال سمجھ لیا جائے اور جسے حرام کہیں اس کو حرام ہی سمجھ لیں۔ گزشتہ درس میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار نہیں ہے۔ جب نبی کسی چیز کو حلال یا حرام کہتا ہے۔ تو اس کو قطعی سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ نبی وہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرتا ہے۔ آج کے درس میں بھی خطاب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔ اور ان کے آپس کے اُس جھگڑے کے متعلق ہے، جو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ۔ کہ شان نزول جب بنجران کے عیسائی حضور علیہ السلام کے ساتھ بحث و مناظرہ کرنے کے لیے مدینہ آئے، تو مدینہ کے یہودی بھی جمع ہو گئے۔ عیسائیوں کا لاٹ پادری بھی دفن میں شامل تھا، ادھر یہودیوں کے علماء بھی اکٹھے ہو گئے اور یہ دونوں گمراہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے۔ مگر نصاریٰ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا دعویٰ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام عیسائیوں کے طریقے پر تھے۔ مگر دوسرا گمراہ اسے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا دونوں گمراہ اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔ یہ معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھی پیش ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر یہود و نصاریٰ دونوں گمراہوں کی تردید فرمائی۔ کہ دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام

کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپ نے نو نشانیاں بتانے کی بجائے احکام عشرہ بیان فرما دیے۔ مقصد یہ تھا کہ مسئلہ نشانیاں معلوم کر لینے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے فلاں فلاں معجزہ فلاں فلاں نشانیاں عطا کی تھیں، بلکہ تمہارا فائدہ اس بات میں ہے کہ تمہیں احکام شریعت معلوم ہو جائیں جن پر تم عمل کر سکو۔ لہذا نو نشانوں کی بجائے حضور علیہ السلام نے یہودیوں کو ان کے دس احکام بتائے۔ بعض چیزیں غامض ہوتی ہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تم وہ بات معلوم کر نیکی کو کوشش کرو جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

یہ چاند کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کے جواب میں چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان نہیں فرمائی، بلکہ اس کے فوائد بتائے۔ کہ اس عمل سے اوقات متعین ہوتے ہیں اور دینِ مہینہ و رسال کا حساب ہوتا ہے۔ سورج سے اس قسم کا حساب رکھنا ایک عام سمجھ بوجھ کے انسان سے مشکل ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے موسموں میں تغیر و تبدل آتا ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے۔ بہار اور خزاں کے موسم آتے ہیں مگر سورج کی بظاہر شکل و صورت اور حجم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسی لیے فرمایا کہ تم چاند کی کمی کی حکمت کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کا تعلق تو علمِ ریاضی سے ہے، جو اس علم کو حاصل کرے گا۔ اُسے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم ہو جائے گی کہ کس طرح سورج اور

چاند کے درمیان کرہ ارض حائل ہو کہ اس کا سبب بنتا ہے۔ تم اس کا فائدہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں لوگوں کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

ہلال پہلے دن کے چاند کو کہتے ہیں جب وہ حجم میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ عربی لغت میں ہلال سے مراد آواز بلند کرنا ہے۔ جب پہلے دن چاند نظر آتا ہے، تو لوگ اسے دیکھ کر شوق سے آواز بلند کرتے ہیں کہ وہ چاند نظر آگیا، اس لیے اسے

چاند کی مختلف صورتیں

بعد کی بات ہے۔ الغرض! عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بگڑے ہوئے
دین کا نام ہے۔

ہندوانہ
رسوم

ہمارے ملک میں بھی دین کے ساتھ کم و بیش ایسا ہی ہوا ہے۔ آج کی بیشتر
رسوم ہندوؤں سے ماخوذ ہیں۔ خصوصاً موت کی رسوم منجملہ تیسرا، ساگوں، دسواں،
چالیسواں، بڑی وغیرہ ہندوانہ رسمیں ہیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد برصغیر میں ہندو مذہب
اختیار کر لیا گیا۔ اور ان کی رسوم صدیوں تک اس ملک میں جاری رہیں۔ پھر جب
اسلام آیا تو یہی رسوم اسلام میں داخل ہو گئیں۔ شادی بیاہ کے سلسلہ میں گانا، سہرا، باجیا
وغیرہ سب ہندوؤں کی رسمیں ہیں۔ یہ چیزیں اسلام کے ساتھ عرب سے نہیں آئیں۔
بلکہ یہاں پر دین میں داخل کمر لی گئیں۔ شب معراج اور دیگر مواقع پر چراغاں کی بیماری
مجوسیوں کے راستے سے آئی کیونکہ وہ آگ کو مقدس مانتے تھے۔ ہندو بھی اپنی
دیوالی اور دسہرے کے موقع پر چراغاں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی جاری ہو گیا
الغرض! جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے غلط عقیدے اور رسوم اپنے دین
میں داخل کر کے اصل دین کو بگاڑ دیا۔ اسی طرح مسلمان بھی اس کام میں ان سے
پیچھے نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کا نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
ہزار سال بعد ہوا۔ اور انجیل کے نزول کے وقت تو دو ہزار سال سے بھی زیادہ
گزر چکا تھا۔ تو ابراہیم علیہ السلام پر ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی یہودیت یا نصرا
کیسے چپاں کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے اہل کتاب! تم
ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ وَمَا أُخْرِجَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ
إِلَّا مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے
ہزاروں سال بعد نازل ہوئیں۔ تو جو کتابیں ان کے بعد نازل ہوئیں تم ان کی نسبت
ان کتابوں کی طرف کیسے کمر لیتے ہو، عقل کی بات کرو۔ پھر تنبیہ کے طور پر فرمایا
هَآأَنْتُمْ هَآؤُمْ لَا تَعْلَمُونَ مَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ

کے لیے اوقات کا تعین ہوگا۔ اسی طرح عبادات کو لے لیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہو، تو سال کا تعین کرنا ہوگا، روزہ کے لیے چاند کے اوقات کی ضرورت پڑے گی کہ اس کی ابتداء اور انتہا چاند کے نکلنے پر ہی منحصر ہے۔ اور پھر ارکان اسلام میں سب سے چوتھا رکن ہے۔ یہ بھی مقررہ مہینہ کے مقررہ ایام میں ہی ادا کیا جاتا ہے حتیٰ کہ عورت کی عدت کے تعین کے لیے بھی چاند کا حساب ہی لینا پڑتا ہے اسی لیے فرمایا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں تمہارے لیے بہت سے فوائد ہیں۔

چاند کی تقویم

اہم رازگی کی طرح اہم ابو بکر جصاص رازگی بھی بڑے پائے کے عالم اور مفتی قرآن ہوئے ہیں۔ آپ کا زمانہ چوتھی صدی شمس ہے۔ آپ اہم ابو حنیفہ کے پیروکاروں میں سے تھے۔ انہوں نے احکام القرآن کے نام سے تفسیر لکھی ہے۔ تو یہ مولوں اہم فرماتے ہیں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ تقویم چاند کے حساب سے رکھیں اگر مسلمان اس حساب کو ترک کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ بیشک سورج کی تقویم بھی رکھیں، اس میں ممانعت نہیں ہے۔ مگر چاند کے حساب کو بھی ضرور اپنے روزمرہ کے امور میں جاری رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چاند کا حساب رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اہل لائے سے مراد مہینہ لیتے ہیں۔ اور اس آیت کا معنی یوں کرتے ہیں کہ لوگ آپ سے مہینوں کے بارے میں فریفت کرتے ہیں کہ ان کا حساب چاند سے رکھا جائے گا یا سورج سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چاند کے ذریعے حساب رکھنا مقدم، بہتر اور فطری ہے۔ چاند کے حساب سے ماہ و سال کا تعین تو ان پڑھ دیہاتی بھی کر سکتا ہے۔ جب کہ سورج کی تقویم کو یاد رکھنا مشکل کام ہے۔ سورج تو ہر روز یکساں طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ مہینہ کی ابتداء اور انتہا کا تعین ایک آدمی کے لیے مشکل ہے مگر چاند کا حساب بالکل واضح ہے۔ جس دن نیا چاند نکلے گا تو مہینہ کی ابتداء ہو جائے گی۔ لہذا چاند کی تقویم آسان ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عبادات کے معاملہ میں چاند کی جنتری کو حتم

کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ سب حنیف کی علامتیں ہیں، تو کوئی مشرک آدمی حنیف کیسے ہو سکتا ہے۔ بمشرک اور حنیف تو متضاد صفات ہیں۔

فرمایا ابراہیم علیہ السلام حنیف بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دراصل حنیف اور مسلمان ہونا ایک ہی چیز ہے۔ اسلام کا معنی اطاعت اور فرمانبرداری ہے جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اَسْلِمَ "فرمانبرداری ہو جاؤ اسلام قبول کرو۔" قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔ ہاں مولا کریم! میں نے تیری فرمانبرداری قبول کر لی۔ میرا تو مقصد حیات ہی تیری اطاعت ہے۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ یہ اپنی نسبت غلط طور پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔ وَمَا

كَانَ مِنْ الْمُشْرِكِينَ ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہیں تھے۔
 بزرگوں کی طرف خالی نسبت کی وہ مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے
 آپ کو سلفی کہلانے والے کیا واقعی اسلاف کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض عموماً
 ہے، کام اُلٹ ہیں۔ اسی طرح آج کل حنفیوں کی اکثریت امام ابو حنیفہؒ کے عقیدے
 سے بالکل مختلف عقیدہ رکھتی ہے۔ قادری اپنی نسبت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی
 طرف کرتے ہیں مگر ان کا معاملہ آپ کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے یہود و نصاریٰ
 کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ شیخ جیلانیؒ کا عقیدہ پاک تھا، ان کا
 عمل پاکیزہ تھا، اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے مگر ان کی طرف نسبت
 رکھنے والے مشرک و بدعت کے ترکیب ہو رہے ہیں۔ یہی حال نقشبندیوں اور
 چشتیوں کا ہے۔ آج کل چشتی لگانے بجانے والے کو سمجھا جاتا ہے۔ کیا خواجہ معین الدین
 اجمیریؒ کی یہی تعلیم تھی۔ خواجہ فرید الدین شکر گنجؒ کا دروازہ سال کے بعد کھولو۔ لاکھ
 دو لاکھ آدمی اس میں سے گزر گئے تو چشتی اور حنفی ہو گئے۔ العیاذ باللہ۔ یہ بزرگ
 اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے۔ یکے تو حید پرست اور متبعِ سنت
 تھے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ چشتیوں کی طرف

بزرگوں کی
 طرف نسبت

جان بھیلی پر رکھ کر نکلنا پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مال بھی خرچ کرنا ہوتا ہے
 کیونکہ اس میں یہ دونوں عمل شامل ہیں۔ وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ
 یعنی مال اور جان دونوں چیزوں کے ساتھ جہاد کرو۔

رسول باطلہ

جج کا ذکر آیا تو اس میں بعض رسومات باطلہ کا رد بھی پایا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب کسی سفر پر نکلتے، خواہ وہ حج کا سفر ہی کیوں نہ ہو۔ اور گھر میں کوئی چیز بھول جاتے تو پھر واپس آکر مکان کے دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کے پیچھے سے آتے تھے، خواہ انہیں دیوار توڑنی پڑے یا پھلانگنی پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا وَلَيْسَ الْبَيْتُ اَوْ رِيه كُوْنِي نِيكِي نِيهِي سِي هِي بَان تَا تُو الْبِيُوْت مِّنْ ظُهُوْرِهَا كِه تَمِ پِنِي گُھروں میں پشت کی طرف سے آؤ۔ بلکہ اگر واپس آنے کی ضرورت پیش آہی جائے تُو وَاتُو الْبِيُوْت مِّنْ اَبْوَابِهَا تُو دروازے کے رستے سے اندر داخل ہونا چاہیے۔ فرمایا یہ کون سی نیکی ہے کہ تم دیوار پھلانگتے پھر دو۔ وَلَكِنْ الْبَيْتُ مَبْنٰی اَلْقٰی بَلْکَہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا پِنے اندر خوف خدا پیدا کر کے اُس کے احکام کی پیروی کر دے۔ یہی اصل نیکی ہے۔ جاہلیت کی رسوم باطلہ کہ ترک کر دو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر رسومات باطلہ کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا اصول بیان فرمادیا ہے کہ اصل نیکی تو تقویٰ ہے۔ جب تقویٰ پیدا ہو جائے گا تو تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ رسومات باطلہ خود بخود ختم ہو جائیں گی شرک، بدعت اور دیگر رسوم پر عمل کرنے سے نیکی نہیں آسکتی۔ نیکی تو تقویٰ کو اختیار کرنے سے آئیگی، لہذا اس کے لیے کوشش کرو۔

عطر مستقیم

حصول نیکی کے متعلق ایک مسئلہ اصول یہ ہے کہ شریعت کے اصول پر چل کر ہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے۔ صراطِ مستقیم وہی ہے۔ جو شریعت نے قائم کیا ہے۔ اگر اس راستہ کو اختیار نہیں کر و گے تو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ کام کوئی بھی ہو، خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملات سے، اگر صراط سے ہو یا نظام حکومت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا حال دیکھو۔ اُن کے ماننے والوں نے عرس منانے پر ہی اکتفا کر لیا ہے۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں مجددیت کو ترقی دے رہے ہیں۔ یہ سب غلط نسبتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کی محض ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کچھ فائدہ نہیں دیگی۔ ان تمام بزرگوں کی طرف نسبت اُسی وقت مفید ہو سکتی ہے۔ جب اُن کا عقیدہ اور عمل بھی اپنایا جائے۔ اچکل تو محض مزار بنالینا، اس پر عمارت بنا کر قوالی کر لینا اور عرس منالینا ہی کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ عقیدے اور عمل کو کون جانچتا ہے۔ یہاں گویہ الزوالہ میں ایک پاگل یا فاجر العقل کا مزار بنا دیا گیا ہے۔ کسی نے نہیں روکا کہ کیا کر رہے ہو۔ اتنے مستدن شہر میں اُس دیوانے کی قبر پر چڑھاڑے چڑھنے لگے ہیں۔ وہ بیچارہ مجنون تھا یا مجذوب تھا، بہر حال غیر مکلف تھا۔ اُس کو خدا کا ولی بنا کر پوجا پاٹ شروع کر دی۔ کیا ایمان اور توحید اسی چیز کا نام ہے؟

حضرت ابراہیم
کے متبعین

فرمایا اور رکھو! اِنَّ اَوَّلَکَ النَّاسِ بِاِبْرٰهٖمَ لَلْذِیْنَ
اتَّبَعُوْهُ بِشَکِّ اِبْرٰهٖمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اُن کے دور میں اُن کا صحیح اتباع کیا۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت آپ کے ساتھ
درست ہے۔ اُن کے علاوہ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یہ خاتم النبیین اور آپ پر ایمان لانے والے جو درحقیقت ابراہیم علیہ السلام کے
متبع ہیں، یہ بھی اُن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی نسبت
ابراہیم علیہ السلام کی طرف کریں۔ یہود و نصاریٰ کو یہ حق قطعاً نہیں پہنچتا۔ فرمایا
وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اللہ ہی مومنوں کا کارساز ہے۔ ولی کا معنی
رفیق، سرپرست، دوست اور کارساز ہے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے پھر وہ
اُس کا کارساز بن جاتا ہے۔ پھر اُسے کسی دوسرے دروازے پر جانے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و ہشت (۷۸)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۹۰ تا ۱۹۳

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا
 إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ ۱۹۰ ۝ وَقَاتِلُوهُمْ حَيْثُ
 ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُم
 وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تَقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
 الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۚ فَإِنْ قَتَلُوكُمْ فَأَقَاتِلُوهُمْ
 كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ۱۹۱ ۝ فَإِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
 ۝ ۱۹۲ ۝ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ
 لِلَّهِ ۚ فَإِنْ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ ۱۹۳

ترجمہ :- اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور نہ زیادتی نہ
 کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۝ ۱۹۰ ۝ اور انہیں جہاں
 بھی پاؤ قتل کرو، اور اُن کو نکال دیا جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ اور فتنہ مار ڈالنے
 سے زیادہ سخت ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس اُن سے مت لڑو۔ یہاں تک کہ وہ
 خود تم سے اُس میں لڑیں۔ اور اگر وہ لڑیں تم سے پس مارو اُن کو۔ اس طرح بدلتے
 کفر کرنے والوں کا ۝ ۱۹۱ ۝ اور اگر وہ باز آجائیں۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ
 بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے ۝ ۱۹۲ ۝ اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ
 فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اطاعت اللہ ہی کے لیے ہو جاتے۔ پس اگر یہ باز آجائیں
 پس نہیں زیادتی مگر اُن لوگوں پر جو ظلم کرنے والے ہیں ۝ ۱۹۳

اسلام کے پہلے چار ارکان کا بیان سابقہ دروس میں آچکا ہے۔ اب یہاں سے
 جہاد کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ لفظ جہاد ایک عام لفظ ہے اور یہ وسیع تر معانی میں

جہاد کی قسمیں

تورات اور انجیل کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اہل کتاب نے تورات و انجیل میں تحریف
 کمرے کے اصل دین کو بگاڑ دیا۔ کفر اور شرک دونوں گمراہوں میں قدر مشترک ہے۔
 دوسری طرف مشرکین بھی اپنا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑنے کا دعویٰ
 کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر ان کے دعوے
 کی بھی تردید فرمائی ہے۔ نیز یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت
 وہ لوگ رکھتے ہیں جنہوں نے آپ کے دور میں آپ کا اتباع کیا۔ اور اس دور
 میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا۔ اور جو حقیقی معنوں میں اسلام میں داخل ہوئے۔
 اب اہل کتاب کے پیشواؤں کی گمراہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ بھٹک
 کر ایسے دور نکل گئے ہیں اور ان کے دل ضلالت میں اس قدر سخت ہو چکے ہیں
 کہ اب یہ کفر کے امام بنے ہوئے ہیں۔ یعنی جو شخص ایمان قبول کر کے صحیح
 راستے پر چلتا ہے۔ یہ لوگ اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ
 اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَذَرْتُ طَائِفَةً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
 کا ایک گمراہ وہ آرزو کرتا ہے۔ لَوْ يُضِلُّوكُمْ کہ وہ کسی نہ کسی طرح تم کو
 گمراہ کریں۔ گزشتہ چودہ سو سال کے عرصہ میں اہل کتاب یہی کچھ کرتے آئے
 ہیں۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے متنفر کر دیں۔ دوسرے مقام پر
 فرمایا کہ یہ لوگ خواہش کرتے ہیں کہ تم گمراہ ہو کر ان کے ساتھ برابر ہو جاؤ۔
 فَتَكُونُوا مِثْلَهُمْ سَوَاءٌ کے الفاظ آتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے
 ہیں کہ عیسائیوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے
 مرکزی نقطہ سے ہٹا دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی گمراہ ہو کر ان ہی کے ساتھ آلیں۔ اگرچہ
 ان کو جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ مگر مجموعی طور پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں
 ہو سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وعدہ کر رکھا ہے کہ سچا دین ہمیشہ
 قائم رہے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان قرآن پاک کی تعلیمات
 پر عمل پیرا رہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسلمان اپنے دین پر بالکل متفق

اہل کتاب
کا منصوبہ

قبول فرماتے ہیں۔ اور اس کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہ جہاد بالسیف ہے جس کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ** یعنی کبھی مومن کافر کو مار ڈالتا ہے۔ اور کبھی خود شہید ہو جاتا ہے۔

جہاد پر اعتراض

مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر بعض بے دین قسم کے لوگوں خصوصاً عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ لوگوں کو تلوار کے ذریعے مرعوب کر کے دین میں داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ تاہم اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ جہاد کا حکم فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ لازم ہو جاتا ہے جب دنیا میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے، کسی کی جان و مال محفوظ نہ رہے تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کے متمدن لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہونی چاہیے۔ تو پھر انہیں فلسفہ جہاد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اس کے بغیر ظلم و ستم کی بیخ کنی ممکن ہی نہیں۔

اقدامی اور
دفاعی جہاد

جہاد دو قسم کا ہے اقدامی یعنی جارحانہ اور دفاعی یعنی مدافعانہ مسلمان کے لیے عام حکم ہی ہے کہ وہ جنگ میں پہل نہ کرے۔ بلکہ اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع کرے۔ مگر بعض اوقات اقدامی جہاد بھی ضروری ہو جاتا ہے شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ بعض نفوس شر پسند ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ دوسروں کے مال و جان کے نقصان کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے امن کی خاطر لوگوں کے جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر بعض اوقات جہاد میں جارحانہ انداز بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس شر و فساد کا قلع قمع کیا جاسکے جس نے معاشرے کے امن و امان کو تباہ کر رکھا ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایسے شخص کی مثال خطرناک پھوٹے سے دی ہے جس طرح انسانی جسم کی حفاظت کے لیے جسم کے گلے سڑے حصے کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے یا جس طرح کسی پھوٹے کا آپریشن کر دینا مریض کی صحت کے

شامل ہو گئی ہیں۔ اس لیے آپ کو اتنا لمبا مقدمہ لکھنا پڑا۔ آپ نے پورے عالم اسلام کی سیاسی، اقتصادی، تمدنی حالت پر سیر حاصل بحث کی۔ اور تمام ممالک اسلامیہ کی مردم شماری بھی پیش کی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم گرمیانی عرصہ میں یہ بڑی اہم کتاب تصور کی جاتی تھی۔ مجموعی حالات کے لحاظ سے عالم اسلام پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہ تھی۔ آپ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یورپ کے یہودی اور عیسائیوں نے گزشتہ زمانے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کم و بیش چھوٹی بڑی چھ لاکھ کتابیں لکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں ان لوگوں نے مسلمانوں اور ان کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کس قدر طوفان اٹھایا ہو گا۔

مشرقی علوم کے ماہر انگریز اور یورپین لوگ مستشرق کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے ہمدرد بن کر اسلامی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنرل ایوب کے زمانے میں فضل الرحمن اسی قبیل سے تھا۔ وہ بھی مستشرقین کا شاگرد وہی تھا جس نے کہا تھا کہ قرآن پاک کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کچھ حصہ میں حضور علیہ السلام کے اقوال بھی ہیں۔ اس نے بظاہر خدمت اسلام کے جذبہ سے کتاب لکھی مگر اس میں اس قسم کا طوفان باندھا۔ پاکستان میں اس کے خلاف شور برپا ہوا تو فضل الرحمن کو اس کے غم سے ہٹا دیا گیا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ مسلمانوں کو دین سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ اور مستشرقین کا مشترکہ نصب العین ہے ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور قرآن پاک سے متنفر ہو جائیں۔ یہ لوگ ایسے ایسے اعتراضات اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگ شک میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کے جملہ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان اپنے سرکشی عقیدہ اور قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھیں۔ اگر مسلمان ان دو چیزوں کا دامن چھوڑ بیٹھے تو پھر گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

دیکھو مسلمانوں کے ساتھ پہلی تین جنگیں کہاں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے سینکڑوں میل دور ہے۔ جب کہ مدینہ سے قریب، پھر دوسری جنگ احد کے میدان میں ہوئی، وہ بالکل ہی مدینہ کے مضافات کا واقعہ ہے۔ کفار نے اتنی دور سے مدینہ پر چڑھائی کی۔ اور تیسری بڑی لڑائی جنگ خندق ہے۔ اس میں بھی کفار تین سو میل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے مگر اہل اسلام نے مدینہ کے اندر رہ کر اپنا دفاع کیا۔ لہذا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا قطعاً ناروا ہے۔ کہ ان کا دین تلوار کے ذریعے پھیلا۔

زیادتی کی
ممانعت

فرمایا جو تم سے لڑتے ہیں تمہیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا مَنكُمُ الزَّيَادَتِي نہ کرو۔ زیادتی نہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو کوئی تم سے لڑائی نہیں کرتا، تم اُس سے مت لڑو اور بے گناہوں کو قتل نہ کرو۔ مقصد یہ کہ تم سے تو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں نوجوان آتے ہیں۔ تم ان کو مارو مگر ان کے بچوں، ان کے بوڑھوں اور ان کی عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ایک جنگ کے دوران حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت مری پڑی ہے۔ آپ بہت ناراض ہوئے اور نَهَى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا کہ یہ زیادتی ہے۔ اسی طرح کوئی بہت بوڑھا ہے، معذور ہے، ہتھیار بھی نہیں اٹھا سکتا، یا اصحاب الصوامع میں سے ہے۔ کہ کٹیا میں بیٹھا رہتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے شخص پر ہتھیار اٹھانا تعدی کی بات ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

خلفائے راشدین نے بھی اپنے اپنے عہد میں حکم دیا اُغْزُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، مگر کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا، کسی عورت کو تکلیف نہ پہنچانا اور جو لوگ دنیا سے الگ تھلک کر جائے کٹیا میں جا کر رہیں ہو گئے ہیں ان کو بھی قتل نہ کرنا جو کوئی تمہارے مقابلے پر لڑنے کے لیے آتا ہے اس سے لڑائی کرو، اور اس کو قتل کرو، بے گناہ پر زیادتی مت کرو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک وصیت فرمائی تھی کہ کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، سوائے

کا علاج قرآن و سنت پر استقامت میں ہے۔ مگر اس دور میں دنیا بھر کے مسلمان
یہودیت اور نصرا نیت کا شکار ہیں۔

مشرقی
اداروں
کا جال

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عیسائیوں کے مشنری ادارے بھی مسلمانوں کو ان
کے دین سے گمراہ کرنے کا "فریضہ" ادا کر رہے ہیں۔ گرجے، سکول، ہسپتال سب
گمراہی کے اڈے ہیں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو انجیل کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ جب
مریض تندرست ہو کر باہر نکلتا ہے۔ تو اُدھا عیسائی ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی حال مشنری
سکولوں کا ہے۔ جہاں بائبل کی تعلیم لازمی ہے۔ ان مشنری اداروں کو چلانے والے
امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور جرمنی کے عیسائی ہیں۔ انہوں نے مشرقی ممالک پر یلغار کی
ہوتی ہے تاکہ مسلمان اپنے اسلام سے بیگانہ ہو کر ان کے مشن کو اپنالیں۔ آج کی
دنیا میں عالمی خبریں تمام کی تمام یہود و نصاریٰ کے توسط سے آتی ہیں اور وہ انہیں
اپنی مرضی کے مطابق توڑ موڑ کر اخبارات میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے
خلافت یہود و نصاریٰ کو تقویت حاصل ہو۔ پوری دنیا میں کوئی مسلمان خبر ایجنسی
نہیں جو ان تک صحیح خبریں پہنچائے۔ لوگ غلط ملط خبریں پڑھ کر یقین کر لیتے ہیں
حالانکہ ان میں بیشتر من گھڑت ہوتی ہیں، ان کا مقصد محض یہ ہے کہ تمہیں اپنے
اصل نظریات سے متنفر کر کے باطل نظریات کی طرف راغب کریں تاکہ قرآن
کے ساتھ تمہارا تعلق منقطع کر دیں۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے مرکزی عقیدہ اور قرآن پر قائم رہیں
گے تو وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ نہیں گمراہ کر سکیں گے مگر اپنی ہی
جانوں کو۔ ان کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا وبال انہیں بچ پڑے گا بشرطیکہ مسلمان اپنے
صحیح عقیدہ پر قائم رہیں۔ آگے قیامت کا محاسبہ آئیو والا ہے۔ ان کو معلوم ہو
جائے گا کہ گمراہی پھیلانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وَمَا يَشْعُرُونَ وہ اس
وقت نہیں سمجھتے۔

تکفیر آیات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ

میں رکاوٹ بن جائیں تو یہ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ البتہ ایک اصول یاد رکھو
 وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْہیں مسجد الحرام کے پاس قتل کرو
 یہ حرم پاک کے تقدس کا تقاضا ہے۔ حَتّٰی يُقْتَلُوْكُمْ فِیْہِؕ یہاں تک کہ
 وہ خود تم سے مسجد حرام میں جنگ کریں۔ فَاِنْ قُتِلُوْكُمْ اَکْمِرْہِمْ سَے لڑائی کریں۔
 فَاَقْتُلُوْهُمْ تو تم بھی اُن سے جہاد کرو۔ مقصد یہ کہ مسجد حرام کی حرمت و عظمت
 کا تقاضا ہے کہ تمھاری طرف سے پھل نہ ہو۔ اور اگر وہ باز نہ آئیں، تو پھر تمہیں
 بھی دفاع کی اجازت ہے۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے اس خطے کو محترم بنایا
 ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے درخت کاٹنا بھی جائز نہیں، خود رو گھاس نہیں کاٹی جاسکتی
 کسی جانور کو ایذا نہیں پہنچائی جاسکتی۔ شکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ شکار کو چھوڑنا بھی جائز نہیں۔
 یہاں پر لڑائی تو بالکل ہی حرام ہے۔ یہاں تک کہ کوئی دوسرا تم پر حملہ آور ہو۔ حضور علیہ السلام
 نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن اللہ تعالیٰ نے دن کے کچھ حصہ کے لیے میرے واسطے
 حرم میں لڑائی کو حلال قرار دیا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ مشرک آمادہ جنگ ہوں
 اس کے بعد قیامت تک کے لیے اس خطہ پاک پر لڑائی کو حرام کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ
 کا واضح ارشاد ہے مَنْ دَخَلَہُ كَانَ اٰمِنًا یعنی جو کوئی حرم میں داخل ہو گیا
 اسے امن مل گیا۔

الغرض فرمایا کہ مسجد حرام کے پاس اگر مشرک لڑائی کی ابتدائی کریں تو تمہیں بھی
 جواب دینے کی اجازت ہے۔ تم بھی انہیں قتل کرو۔ کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِّلْکٰفِرِیْنَ
 کُفٰرًا کَا یٰہِیْ بَدَلًا ہُنَّ۔ فَاِنْ اَنْتُمْ سَوَآءٌ اور اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں اور صلح کر
 لیں۔ تو لڑائی کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہ ایمان قبول کر لیں تو معاملہ
 بالکل ہی صاف ہو گیا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا
 مہربان ہے۔ اُن کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اب آگے جہاد کی حکمت بھی بیان فرمادی۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی

تھے۔ اُن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، مگر تم جان بوجھ کر گمراہی میں پڑے ہوئے
 ہو تمہارا کوئی علاج ممکن نہیں، جب یہ لوگ مکے میں آتے تو مشرکین ان سے
 دریافت کرتے کہ ہمارا مذہب اچھا ہے یا مسلمانوں کا تو کہتے تمہارا دین صحیح ہے
 اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں
 کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ یہ اہل کتاب ہیں۔ انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں
 مگر اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے
 ہیں۔ اس وقت ساری دنیا میں یہود و نصاریٰ کی سازش پھیلی ہوئی ہے۔ مگر
 بہت تھوڑے مسلمان اس سازش کو پہچانتے ہیں۔ اور اپنے دین پر قائم ہیں۔
 ورنہ اکثریت ان کے جال میں پھنس چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ترقی یافتہ لوگ ہیں
 جو کچھ کہتے ہیں، درست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق و باطل کی پہچان کی توفیق
 عطا فرمائے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و نہ (۷۹)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ فَمَنْ
 اَعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا عَتَدَا
 عَلَيْكُمْ صَ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۴﴾
 وَانْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
 وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾

مع

ترجمہ: حرمت کا مہینہ حرمت کے مہینے کے مقابل ہے۔ اور تمام حرمتوں کا بدلہ ہے۔

پس جس شخص نے تم پر زیادتی کی، تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی کہ اُس نے زیادتی
 کی ہے تم پر اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں
 کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور احسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

گذشتہ پیوتر

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تھا، اور اس کی
 وجہ بھی بیان فرمائی کہ مشرکین کے برپا کردہ فتنہ و فساد کو فرو کرنے اور ظلم و زیادتی
 کو ختم کرنے کے لیے جہاد ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ
 عام طور پر جہاد اپنے دفاع کے لیے کیا جاتے، البتہ اگر انبیاء کے ظلم و ستم کی بنا پر
 مخلوق خدا کی جان و مال اور عزت و ناموس خطرے میں ہو تو جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے
 حرمت والے چار مہینوں کا ذکر بھی اجمالاً آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض و

سما کے وقت سے ہی بارہ مہینوں کی تقویم مقرر کر رکھی ہے۔ جس میں سے چار
 مہینے حرمت والے ہیں۔ مگر اب یہی میں یہ امر مسلم ہے کہ ان چار مہینوں میں مشرک
 بھی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عام راہزن بھی کسی کا مال نہیں لوٹتے تھے اور تجارتی

کے بارے میں خصال کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کا مصداق مدینہ کے ارد گرد
 بسنے والے یہودی خاص طور پر ہیں۔ اب تک اہل کتاب کی دینی خیانت کا تذکرہ
 ہو رہا ہے۔ آج کا درس بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ تاہم آئندہ آنے والے درس
 سے اہل کتاب کی دنیوی خیانت کا بیان ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دینی طور
 پر بھی خائن ہیں اور دنیوی طور پر بھی ایسے ہی ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں یہ
 بیان ہوا تھا کہ اہل کتاب کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو
 ان کے دین سے پھیر دیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہر حیلہ اختیار کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں
 آج کے درس میں ان کی ایک تدبیر کا تذکرہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں سے کچھ
 لوگ صبح کے وقت ایمان لے آئیں۔ اور شام کو انکار کر دیں۔ تاکہ اس طریقہ سے
 ان لوگوں کو دین سے بدظن کر سکیں جو پہلے ہی ایمان لائے تھے۔

سورۃ بقرہ میں تحویل قبلہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب وہ آیات نازل ہوئیں
 ”قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ“ اور مسلمانوں نے اپنا قبلہ
 بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو مقرر کر لیا تو مدینہ کے یہودی بہت
 سیخ پا ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہ کسی طرح اسلام کے بڑھتے ہوئے
 سیلاب کے سامنے بند باندھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ تدبیر
 بنائی کہ ان میں سے کچھ لوگ دن کے پہلے حصے میں اور پھرے دل سے اسلام
 قبول کر لیں اور آخری حصے میں اسلام سے باہر آجائیں۔ اس طرح کھمزور ایمان یا
 ناواقف لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کہ اگر اسلام سچا مذہب ہوتا تو یہ
 پڑھے لکھے یہودی اسے قبول کر کے منحرف کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح
 اسلام میں نئے آنے والے رک جائیں گے۔ اور جو ایمان لائے تھے، ان کے
 ایمان متزلزل ہو جائیں گے۔

یہودی اسی تدبیر کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے
 وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ

درگزر سے کام لیا گیا۔ اب اگر ایسا کہیں تو تمہیں لڑائی کی اجازت ہے۔ اُن سے پورا پورا مقابلہ کیا جائے اور انہیں ترک کی بات کی جواب دیا جائے گا۔ اس سال پھر ذی قعدہ کا حرمت والا مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اب انہوں نے اس مہینہ کا احترام نہ کیا اور آمادہ جنگ ہوئے، تو تم پر بھی ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

فرمایا الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے مقابل ہے۔ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ اور تمام ادب والی چیزوں کا بدلہ ہے۔ حرمت والی چیزوں میں بیت اللہ شریف، مسجد الحرام تمام مساجد اور حرم کا پورا خطہ شامل ہے۔ لہذا ان تمام چیزوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ان میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان تو بہر حال ان کا احترام کرتے ہیں۔ البتہ اگر مشرکین ان کے ادب کو ملحوظ نہ رکھیں اور لڑائی پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ ان کا بدلہ چکائیں۔ مطلب یہ کہ فَحِينَ اعْتَدَى عَلَيْنَا جو کوئی تم پر زیادتی کرے، فَأَعْتَدُوا عَلَيْنَا بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْنَا تو تم بھی اُس پر اُسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اُس نے تم پر کی ہے۔ یہی قانون اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اگر اُن کی تعدی کے عوض میں مخاف کر دو، تو تمہیں بڑا اجر ملیگا۔ اور اگر بدلہ لینا ہے۔ تو پھر انہیں اُسی قدر ایذا پہنچاؤ، جس قدر انہوں نے تمہیں پہنچائی ہے۔ اُن سے زیادتی نہ کرو۔

وَاقْضُوا لِلَّهِ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی

خوف خدا

نہ ہوتے پائے اور اگر تم خوف خدا کو دل میں جگہ دو گے تو پھر تمہیں خوشخبری ہو کہ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اُس کی رضا اور خوشنودی بھی ایسے ہی لوگوں کے حق میں ہوتی ہے، نہ کہ کافروں اور ظالموں کے ساتھ۔ بہر حال مسلمانوں کو حکم دیا کہ لڑائی میں تم ابتداء نہ کرو اور حرمت والے مہینوں کا پورا پورا احترام کرو۔ البتہ اگر مشرکین اس بات کی پروا نہیں کرتے تو پھر تمہیں بھی اپنا دفاع کرنا ہی اجازت ہے۔ مگر وہ بھی اس حد تک جس حد تک

عارضی طور پر دین کے اوّل حصہ میں بظاہر ایمان بھی لے آؤ، تو تصدیق صرف اُسی چیز کی کرنا جو تمہارے دین میں شامل ہے۔ کسی دوسری بات کی تصدیق نہ کرنا۔ کیونکہ سچا دین صرف تمہارا ہی ہے۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں اُن کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا اَوْ نَصْرٰی یعنی جنت کا داخلہ صرف یہودیوں اور نصرائیوں کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم قل ان الہدٰی ہٰدٰی اللہ ان سے کہ دیں، ہدایت تو وہی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ کسی پارٹی کا باطل یہ پختہ ہونا حق کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہدایت یافتہ وہ ہے جو ہدایت من جانب اللہ پر عمل کرتا ہے۔ یہودیت اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ یہ اصل دین کی مسخ شدہ صورت ہے اور اس میں کفر اور شرک کی آئینہ نش ہے۔ اگرچہ صحیح ہدایت کی تلاش ہے، تو وہ ہدایت ایسی ہے۔ جو اللہ کے نبیوں پر نازل ہوئی۔ اور جس کی آخری کڑی قرآن پاک ہے اَنْ یَّکُوْنُوْا اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِیْتُمْ یہ کہ کسی دوسرے کو بھی ایسی ہی چیز دی گئی ہے جو تم کو دی گئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے اس حصے کا تعلق گذشتہ حصہ وَلَا تُوْهِنُوْا اِلَّا لِمَنْ شِیعَ دِیْنُکُمْ کے ساتھ ہے۔ یعنی یہودی اپنے ہی دینی بھائی ہندوؤں کو کہہ رہے ہیں۔ کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو بھی ویسی ہی فضیلت، برتری یا کتاب دے دی جائے جیسی تم کو دی گئی ہے تمہارا دین ہی برتر اور افضل ہے۔ لہذا اسی پر قائم رہنا۔ اور اختیار کی عدم تصدیق کی دوسری حکمت یہ ہے۔ کہ اَوْ یُحٰکِمُکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ یا وہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ کہ اگر تم نے اہل ایمان کی تصدیق کر دی تو پھر بحث مباحثہ میں تم پر غالب

تھے۔ پھر جب دجال کا زمانہ قریب آئے گا تو اس علاقہ پر علیائیوں کا قبضہ ہو جائے گا اس کے بعد پھر مسلمان غالب آجائیں گے۔

الغرض اس جہاد کی کمان مشہور سپہ سالار خالد بن ولید کے بھائی عبدالرحمن بن ولید کو رہے تھے۔ میدان جنگ کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ سامنے دشمن تھا۔ اور مسلمانوں کے پیچھے دیوار تھی، گویا مسلمان گھسے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان جذبہ جہاد میں کفار کی صفوں میں گھس گیا، بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہ یوں کی لڑائی میں حضرت زبیرؓ لاکھ سو لاکھ کفار کی صفوں پر تنہا حملہ آور ہوئے تھے۔ اسی طرح یہ گھوڑ سوار صحابی دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور پھر اُدھر سے حملہ آور ہو کر واپس آئے۔ اس موقع پر ایک شخص نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَقْرَبُوا يَدَيْكُمْ إِلَى الثَّهْلُكَةِ یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو تنہا اتنے بڑے لشکر میں گھس جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضرت ابوالدب النصار می ڈال ہاں موجود تھے، کہنے لگے بھئی اس کا یہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ آیت تو ہمارے یعنی النصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی اگر تم نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ تو من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہم نے مہاجرین کی میربانی کی، پھر اسلام کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، پھر جب دین کو کافی حد تک غلبہ حاصل ہو گیا۔ تو ہم انصار نے خیال کیا کہ ہم مالی لحاظ بہت پیچھے رہ گئے ہیں لہذا اب ہمیں اپنے کاروبار اور زمینوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بات سمجھا دی۔ کہ کاروبار میں مصروف ہو کر جہاد اور الفاق فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر بیٹھنا۔ اگر ایسا کیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے، ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ لہذا جہاد کے لیے ہر آن اور ہر لمحہ کمر بستہ رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کی صفوں میں گھس جانا

بنا دیا جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ہم نے تم کو عادل اور افضل امت بنایا۔ نیز یہ بھی فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ تم سب امتوں سے بہترین امت ہو۔ گویا آخری امت کو اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ اہم پر برتری عطا کر دی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے میری امت کا فیصلہ ہوگا اور جنت میں بھی سب سے پہلے یہ آخری امت ہی جائے گی۔ لہذا اہل کتاب کی دائمی برتری کا دعویٰ باطل ہے۔

فرمایا قُلْ إِنْ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہ دیں کہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ یُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وہ جس کو چاہتا ہے، فضل عطا کر دیتا ہے۔ جب تک بنی اسرائیل اس کے احکام پر عمل پیرا ہے، اللہ نے ان کو فضیلت عطا کی۔ پھر جب ان کی صلاحیت ختم ہوگئی، تو اللہ نے فضیلت والی نعمت بھی ان سے واپس لے لی۔ اور دوسری امت کو دے دی۔ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر امت کی صلاحیت کو جانتا ہے اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا اشارہ تھا کہ میری امت کے عروج کا زمانہ نصف دین سے کم کا نہیں ہوگا۔ اور نصف دین پانچ سو سال کا ہوتا ہے۔ پانچ تقریباً چھ سو سال تک دنیا میں مسلمانوں کو مکمل عروج حاصل رہا۔ پھر حوجوں حوں ان کی صلاحیت ختم ہوتی گئی، اقتدار بھی ان سے چھینا گیا۔ اب گذشتہ آٹھ سو سال سے پستی میں جا رہے ہیں۔ اور دوسری اقوام مادی لحاظ سے ترقی پر ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ جب تک صلاحیت موجود رہی برتری حاصل رہی، جب صلاحیت ختم ہوگئی، تو فضیلت بھی چھن گئی۔

فرمایا فضیلت کا مالک وہ ہے يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِا مَنْ يَشَاءُ وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ اپنے اپنے وقت

تمام فضائل
کا مالک
اللہ ہے

اہم محمدؐ نے سیر کبیر اور سیر صغیر دو مشہور کتابیں لکھی ہیں ان میں سیر کبیر اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب نہیں۔ اس میں احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آثار صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں مسائل صلح و جنگ کو حل کیا گیا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا کہ اگر کفار کی کثیر تعداد سامنے موجود ہو، تو اس کے ساتھ ایک تنہا مسلمان کو جنگ کرنا کس حد تک درست ہے۔ جب کہ اس کی جان تلف ہو جانے کا غالب گمان ہو۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کھسنے سے دشمن کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جس کا بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو فائدہ ہو، تو اس قسم کی قربانی پیش کرنا روا ہے۔ اور اگر ایسا کرنے سے نہ کفار کو نقصان پہنچ سکتا ہو، اور نہ ہی اسلام کو فائدہ ہو، تو پھر محض جان کا ضیاع ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

یہاں پر مطلق حکم ہے۔ **وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اللہ کا راستہ کون سا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مختلف مدت بیان کی گئی ہیں۔ **مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ** میں بھی یہی بات ہے خرچ کریں مگر کہاں۔ تو اس کی تشریح پہلے آچکی ہے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرو، پھر حج و عمرہ کا خرچہ ہے۔ غریبار و مساکین پر خرچ کرو۔ اس کے بعد دفاع ہے اور اسی میں جہاد فی سبیل اللہ بھی آتا ہے۔ اور پھر اللہ کے راستے کی آگے کسی شاخیں ہیں۔ جیسے دین کی تعلیم کا شعبہ ہے تصنیف و تالیف کی مدد ہے، مجاہدین کی اعانت ہے۔ ان سب امور پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، محض زکوٰۃ ادا کر دینے سے سائے مالی حقوق ادا نہیں ہو جاتے بلکہ **إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ** حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق باقی ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کے بعد صدقہ فطر واجب ہے۔ قربانی بھی واجب ہے۔ اسی طرح اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخراجات سنت اور مستحب ہیں۔

الفاق فی
سبیل اللہ

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْإِعْمَارِ ۲

درس بست و پنج ۲۵

آیت ۵، آیت ۶

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ
يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ
لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّينَ سَبِيلٌ
وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾
بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٦﴾

ترجمہ: اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ایک خزانہ
امانت رکھیں۔ تو وہ اس کو تمہاری طرف لوٹا دے گا۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں
کہ اگر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں، تو اُسے آپ کی طرف واپس
نہیں کرے گا، جب تک کہ آپ اُس پر قائم نہ رہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں
کہ ہمارے اوپر اُمّی لوگوں کے حق میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور یہ لوگ اللہ پر جھوٹ
کہتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں ﴿۵﴾ کیوں نہیں۔ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے گا
اور ڈرتا ہے گا۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ڈرنے والے اور تقویٰ
اختیار کرنے والوں کو ﴿۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی دینی خیانت کا
ذکر فرمایا تھا کہ اہل اسلام کو گمراہ کرنے کے لیے کیسی کیسی تدبیریں اختیار کرتے
ہیں۔ اس کے علاوہ بلیس کا ذکر تھا کہ یہ لوگ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر
دیتے ہیں اور حق کو چھپا دیتے ہیں۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب باطل

زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وظیفہ محض علم دین کی تحصیل کے لیے دیا گیا تھا اور وہ لوگ نواب کی کسی پالیسی کے پابند نہیں تھے۔ جیسا کہ آجکل بیوروکریسی کا شیوہ ہے کہ کسی کو چند ٹکے دیکر اس کا دین ایمان تک خرید لیا۔ ایسا نہیں تھا۔

آج مسلمان تبلیغ دین کے لیے کتنی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ عیسائیت کا راستہ بند کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اربوں روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ کہیں سکول کے نام پر، کہیں کسی ہسپتال کی اسٹریس اور کہیں کسی اور رفاہی ادارہ کی صورت میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر سچے دین کا داعی مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ خدا کا فرمان ہے خرچ کر دو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر ہم پر کوئی اثر نہیں۔ ایسی صورت حال میں دشمن غلبہ حاصل نہیں کرے گا، تو اور کیا ہو گا۔

احسان کرو

فرمایا، وَاحْ سِنُوْا یعنی مستحقین کے ساتھ احسان کرو۔ قرابت داروں غریبوں مسکینوں، بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اللہ کے راستے میں خرچ کر کے احسان جیسے اہم اصول پر عمل کرو۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے والوں، کفر و شرک اور بدعات کے مرتکبین کو کبھی پسند نہیں فرماتا۔

کے پاس ۲ اسواونس چاندی امانت رکھی۔ ایک
 اونس چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ جب اس شخص نے اپنی امانت طلب
 کی تو عبداللہؑ نے کوئی پس و پیش نہ کی اور امانت اس کے حوالے کر دی۔ ایک
 دوسرا یہودی عالم فنیخاص بن عازور تھا، اس کا حال یہ تھا کہ قریش خاندان کا کوئی مسافر
 مدینہ آیا۔ تو فنیخاص کو شکل و صورت سے بڑا بزرگ شخص خیال کر کے ایک دینار
 اس کے پاس امانت رکھ دیا۔ مگر جب اپنی امانت واپس لینا چاہی تو فنیخاص نے
 انکار کر دیا۔ کہ میں نے تمہاری کوئی امانت نہیں رکھی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پاس ہی
 اس کا شاگرد تھا۔ اس نے کہا، کہ حضرت اس شخص کی امانت آپ کے پاس موجود ہے
 اُسے واپس کر دیں۔ کہنے لگا، ٹھیک ہے میں نے ایک دینار اس سے لیا تھا۔
 مگر یہ اُمّی (ان پڑھ) لوگ ہیں، ان کا مال ہضم کر جانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ ہمارے
 لیے جائز ہے۔ کیونکہ ہم اللہ کے محبوب ہیں نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبُّهُ
 یہ لوگ ہمارے مرید ہیں۔ ان کا مال ہمارے لیے حلال ہے۔ آخر ہم نے علم حاصل کیا
 ہے۔ اس کے لیے محنت کی ہے، خرچ کیا ہے، وہ ان سے پورا نہیں کریں گے،
 تو اور کس سے کریں گے۔ جب وہ مسافر مالوس ہو گیا۔ تو ایک دوسرا یہودی نے
 اُسے یہ ترکیب بتائی۔ کہ تم امانت دار سے یوں کہو کہ میں نے تمہیں نیک آدمی سمجھ کر تمہارے
 پاس امانت رکھی تھی۔ اگر میری امانت واپس نہ کی تو میں مدینے میں یہ اعلان کروں
 گا کہ فلاں شخص میری امانت کھا گیا ہے اور تم بدنام ہو جاؤ گے، چنانچہ اس بدنامی سے
 ڈرتے ہوئے فنیخاص نے وہ ایک دینار واپس کر دیا۔ غرضیکہ ان واقعات کے
 پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اہل کتاب میں سے بعض ایسے
 ہیں کہ ڈھیروں مال امانت کے طور پر ان کے پاس رکھو، تو وہ عنذ الطلب لوٹا
 دیتے ہیں۔ اور اس میں ذرہ بھر خیانت نہیں کرتے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ایک
 دینار امانت رکھ کر کہہ جاتے ہیں۔

اُس زمانے میں دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن چار شے ہوتا تھا۔ اور دینار محمد

خاص طور پر حج کے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہذا قمری مہینے کی تقویم ضروری ہے۔ حج اور اس کے ساتھ جہاد کا بیان بھی آگیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کی غرض و غایت بھی آگئی ہے کہ اس سے مقصود فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہے۔ جہاد ہی کے ضمن میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اس کے بغیر جہاد کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور اگر جہاد کا جذبہ ختم ہو جائے گا تو دشمن غالب آجائے گا۔ حرمت والے مہینوں کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ کون کون سے مہینے ہیں۔ اور پھر ان میں قتال کے کیا احکام ہیں۔ مسلمانوں کو ان مہینوں کا پورا پورا احترام کرنے کا حکم دیا گیا، تاہم اگر کفار لڑائی سے باز نہ آئیں، تو پھر مسلمانوں کو بھی اس کا جواب دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

حج اور عمرہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس سفر کے دوران اگر احصار پیدا ہو جائے یعنی رکاوٹ کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص حج و عمرہ کی تکمیل نہ کر سکے، تو اُسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ مسائل بیان ہوئے ہیں حج اور عمرہ کے ارکان ملتے جلتے ہیں، تاہم ان کی ادائیگی کے اوقات مختلف ہیں۔ عمرہ کو حج اصغر بھی کہتے ہیں اور یہ سال بھر کے تمام ایام میں سوا ایام حج کے ادا کیا جاسکتا ہے۔ حج مخصوص ایام یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تا تیرھویں تاریخ کو ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان ایام کے علاوہ کسی اور تاریخ پر حج ادا نہیں ہو سکتا۔ حج عمر بھر میں صاحب استطاعت کے لیے ایک دفعہ فرض ہے، البتہ عمرہ سنت ہے ہاں اگر ایک دفعہ اس کی نیت کر لے تو پھر واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے، تو پھر لازماً اس کو پورا کرنا پڑے گا۔ اگر سفر کے دوران کوئی رکاوٹ پڑ جائے اور انسان عمرہ مکمل نہ کر سکے۔ تو اُسے بہر حال قضا کرنا ہوگا اب اُس کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ خود حضور علیہ السلام کا عمل موجود ہے۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ۶۷ھ میں عمرہ کا سفر اختیار کیا مگر مدینہ کے مقام پر کفار نے روک دیا اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس جانا پڑا۔

کوئی حق نہیں دیا۔ اللہ جل جلالہ نے جاہلیت کی تمام باتیں (رسومات) میرے پاؤں کے نیچے روند دی ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ إِلَّا الْأَمَانَةَ سوائے امانت کے کیونکہ اِنَّهَا ثَوْدَةُ الْحَبْرِ وَالْفَجْرِ امانت خواہ نیک آدمی کی ہو یا بُرے شخص کی، اسکا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس میں دوستی اور دشمنی کو کوئی دخل نہیں۔ کوئی شخص کسی مذہب کے تعلق رکھتا ہو، جاہل ہو یا عالم، امانت بہر حال واجب الادا ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی، چوری، خیانت وغیرہ کا مال قطعاً حرام ہے ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے کسی کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لیے جائز ہے۔ وگرنہ امانت کی ادائیگی ہر ایک کے لیے لازم ہے۔

تقسیم ہند کے موقع پر لوگوں نے ایک دوسرے کا مال کھلے عام کھایا خوب لوٹ مار کی۔ یہ قطعاً حرام ہے۔ اس کا حساب قیامت کو دینا پڑے گا۔ ہندو تو ویسے ہی کافر ہے۔ اگر کسی مسلمان نے ہندو کا مال کھایا ہے۔ تو وہ بھی معاف نہیں ہوگا۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ ہم جہاد کے لیے جاتے ہیں۔ ذمیوں کے علاقے سے گزرتے ہوئے کوئی بھیڑ بکری یا مرغی وغیرہ مل جائے تو ہم کھا لیتے ہیں۔ آخر ہم غازی ہیں ذمیوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ حضرت ابن عباسؓ ناراض ہوئے اور فرمایا یہ تو وہی بات ہے جو یہودیوں نے کی تھی۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّانِ سَبِيلٌ یعنی امیوں کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں۔ فرمایا جب ذمی لوگ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتے ہیں تو پھر ان کے مال و جان کی حفاظت ہم پر لازم آتی ہے۔ ان کے مال کو اٹکی رضا مندی کے بغیر کھانا حرام ہے۔

فرمایا بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر آپ اس کے پاس کثیر مال بطور امانت رکھیں، تو وہ لوٹا دے گا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار بھی امانت رکھیں، تو وہ واپس نہیں کرے گا۔ ہاں امانت کی واپسی کی ایک صورت ہے إِلَّا هَادُمَتَ عَلَيْهِ قَائِمًا کہ تو اس کے سر پر سوار ہے۔ یعنی وقتاً فوقتاً مطالبہ کرتا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ نے اسی سے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ قرض خواہ اپنے قرض کا پیچھا کر سکتا ہے۔

امانت کی واپسی
بہم اصرار

یہی کچھ ہوتا ہے حاجی کو ہاروں اور اب خاص طور پر کہ نہی نوٹوں کے ہاروں سے لاوا جاتا ہے۔ اور اگر ہار پہنانے والا کوئی نہیں پہنچا تو اپنے پاس سے ہار نکال کر گلے میں ڈال لیا جاتا ہے کہ حاجی کی پہچان ہو۔ یہ سب فخریہ چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے رضا خالص اللہ کی نہیں رہتی بلکہ اس فعل میں دوسرے لوگوں کی رضا کو بھی شامل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور یہی چیز لفظ اللہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔

فرمایا حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کے لیے پورا کر دینا اِحْصَان ہے پھر اگر تم روک دیے گئے۔ یعنی تم نے احرام باندھ کر حج یا عمرہ کا سفر شروع کر دیا ہے اور راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو اسے احصار کہتے ہیں۔ احصار کی تعریف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم شافعیؒ کے نزدیک شرعی احصار صرف ایسی صورت میں شمار ہوتا ہے۔ جب حج و عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے۔ اس کی مثال ۱۔ میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کا واقعہ ہے۔ جب ان کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا اور آپ بغیر عمرہ کیے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے۔ ۲۔ اہم ابو حنیفہؒ کے مسئلہ کے مطابق دشمن کی رکاوٹ کے علاوہ بیماری یا حادثہ بھی احصار کا سبب بن سکتا ہے۔ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے جس کی وجہ سے عازم حج سفر نہیں کر سکتا یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہے، سخت زخمی ہو گیا ہے، ٹانگ زخمی ہو گئی ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ کسی درخت نے راستہ روک رکھا ہے۔ سیلاب آ گیا ہے یا کسی اور وجہ سے راستہ رُک گیا ہے۔ یہ بھی شرعی احصار کی تعریف میں آئے گا۔

احصار کے مسائل

اس قسم کی صورت حال کے متعلق ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

جو میسر ہو قربانی کر دو۔ احرام باندھ کر حج و عمرہ سے محروم ہونے کی صورت میں قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ ایک بکری یا گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، قربانی کر دے اور احرام کھول دے۔ یہ قربانی کس مقام پر کھرے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ اہم شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر کوئی رُک جائے، وہیں قربانی کر کے احرام

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاِعْمَرَانِ ۳

درس سبست و شش ۲۶

آیت ۷ تا ۸

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
 قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
 اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ
 وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا
 يَلُوفُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ
 الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا
 هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی سی قیمت خریدتے
 ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اللہ ان سے کلام نہیں کرے
 گا۔ اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ اور نہ ان کو پاک کرے گا۔
 اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۷﴾ اور بیشک ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ
 ایسا ہے۔ جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ، تاکہ تم اسے کتاب سے
 گمان کرو۔ حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب
 سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور یہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں ﴿۸﴾

اس سے پیشتر اہل کتاب کی دینی اور مالی خیانت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آج کی
 آیات بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اور ان میں اہل کتاب کی تیسری بڑی خیانت کا ذکر ہے۔ تیسری خیانت
 یہ لوگ ان پیش گوئیوں کو چھپا لیتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتب میں قرآن کریم اور
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازل فرمائی تھیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

نہیں کاٹ سکتا۔ بیوی کے پاس نہیں جاسکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر مجبور کسی پابندی کو توڑنا پڑے۔ تو پھر اس کے عوض میں فدیہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں پر اسی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو ففدیۃ

مِّنْ صَّيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ اَوْ لُصُكٍ پس فدیہ ہے روزے سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ یعنی عذر کے ساتھ احرام کی پابندی توڑنے کی صورت میں ان تین چیزوں میں سے کوئی ایک ادا کر دینی ہوگی۔ تین روزے رکھنے یا صدقہ میں تین صاع گندم ادا کرے یا کم از کم ایک بھیترا یا بجری ذبح کرے۔ صدقہ کی صورت میں چھ مساکین کو نصف صاع گندم فی کس ادا کرنا ہوگا۔

حضرت کعب بن عجرؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ ہانڈی پکانے کے لیے آگ جلا رہی تھی اور آپ کے سر سے جو میں نیچے گر رہی تھیں جنہور علیہ السلام کا گزیر ہوا تو فرمایا تمہارے سر کے جانور تمہیں بہت ستاتے ہیں؟ عرض کیا حضور! واقعی بہت ستاتے ہیں۔ مگر میں نے احرام باندھا ہوا ہے، کیا کر سکتا ہوں حکم ہوا اگر سر منڈوانا ہے۔ تو ایک بھیترا یا بجری کا دم دیدے یا چھ مساکین کو صدقہ دے یا تین دن کے روزے رکھ لے، اس جنابت کی تلافی ہو جائے گی۔

حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، قرآن اور تمتع۔ افراد حج یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کمر کے احرام کھول دے۔ اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ دوسری صورت قرآن ہے کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اُسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تاریخ کو احرام کھول دے۔ جنہور نبی کریم علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کیا تھا کیونکہ احادیث میں واضح طور پر آتا ہے کہ آپ یتیمہ میں کہتے تھے لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ

حج کی اقسام

وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔ آپ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔ "إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ" حضرت اشعث بن قیسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔

ارشاد ربانی ہے "إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا جُلُودًا لِّسَاءٍ لِّمَن يَشَاءُ" اور قسم کے بدلے دنیا کا حقیر مال خریدتے ہیں اُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ اُن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں۔ دنیا کا مال جس قدر بھی زیادہ ہو۔ آخرت کے مقابلے میں بالکل حقیر ہے۔ مَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ یہ دنیا کی زندگی تو تھوڑا سا بہتے کا سامان ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ آپ کہ دیں دنیا کا سارا مال و اسباب آخرت کے مقابلے میں بالکل قلیل ہے۔ لہذا دنیا کے حقیر مال کو ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے والوں کو آخرت میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وَلَا يَكْلَمُهُمُ اللَّهُ اور اللہ ان سے شفقت و مہربانی کے ساتھ کلام نہیں کرے گا۔ غصے اور باز پرس کی صورت میں تو ضرور کلام کرے گا۔ مگر لطف و کرم کے ساتھ گفتگو نہیں فرمائے گا۔ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اور نہ نگاہ شفقت سے ایسے لوگوں کی طرف دیکھے گا۔ وَلَا يُزَكِّيهِمْ اور اُن کو پاک بھی نہیں کرے گا۔ یہ ہمیشہ نجاستوں میں لت پت رہیں گے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور وہ عذاب الیم کا شکار ہوں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے عہد لیا تھا کہ ہر نبی برحق کی حمایت کرتا اس پر ایمان لانا اور اس طرح خدا تعالیٰ کے عہد کی پابندی کرنا۔ مگر ان لوگوں نے عہد کو توڑ دیا۔ انبیاء کی تکذیب کی اور اللہ کے احکام کو چھپایا۔ کلام الہی میں تحریف کی۔ جھوٹی قسم کھا کر دنیا کا مال حاصل کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد کی پابندی کی سخت تاکید کی تھی، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُورًا۔ اللہ کے عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ

اہل کتاب
کی بدعہدی

سکتا ہے۔ البتہ ایسی قربانی کو حدود حرم کے اندر ذبح کرنا ضروری ہے۔
 بعض صورتیں ایسی بھی پیش آسکتی ہیں کہ انسان قربانی کرنے کی پوزیشن
 میں نہ ہو۔ ایسے ہی حالات کے متعلق فرمایا فَصَنْ لِّمَنْ يَجِبُ جو کوئی قربانی نہ
 پائے فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ تو وہ ایام حج میں تین روزے
 رکھے وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتَ اور سات اس وقت جب تم واپس
 لوٹ جاؤ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ یہ پورے دس ہو گئے۔ یعنی جو شخص حج قرآن
 یا حج تمتع ادا کرے اور قربانی کرنے کے لیے اس کے پاس مال نہ ہو یا جانور نہ مل
 سکے، تو اس قربانی کا نعم البدل دس روزے ہیں۔ تین روزے تو واضح ہیں کہ ایام حج
 میں رکھے جائیں گے یعنی ذی الحج کی سات، آٹھ اور نو کو رکھے جائیں۔ کیونکہ دس تاریخ
 کو روزہ رکھنا منع ہے۔ البتہ سات روزوں کے متعلق اختلاف ہے، امام شافعی
 فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حاجی کا اپنے وطن پہنچنا ہے۔ اور یہ روزے
 اُسے اپنے گھر آکر رکھنا چاہئیں۔ مگر امام صاحب فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے
 سے مراد حج سے واپسی ہے۔ جب ایام حج ختم ہو جائیں تو یہ سات روزے
 اگر قیام ہو تو حرم میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یا راستے میں یا گھر واپس آکر ہر طرح درست
 ہے۔ دس روزے پورے کرنے سے قربانی کی تلافی ہو جائے گی۔ اور حاجی
 کا قرآن یا تمتع درست ہو جائے گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایام حج میں تین روزے
 لازمی ہیں۔ اگر یہ چھوٹ گئے تو پھر باقی سات رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے
 بہر حال دم دنیا پڑے گا۔

تمتع کی شرط

فرمایا حج تمتع اور قربانی کے مسائل کے متعلق شرط یہ ہے ذَلِكَ لِمَنْ
لَمْ يَكُنْ أَهْلًا حَاضِرًا المسجد الحرام ط کہ تمتع کرنے والے کا گھر بار
 مسجد حرام کے پاس نہ ہو۔ یعنی حج تمتع اس شخص کے لیے روا ہے جو حدود
 حرم کا رہنے والا نہ ہو بلکہ آفاقی ہو۔ حدود حرم کے رہنے والے اور محلی تو جب
 چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ حدود حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں اور مکہ مکرمہ آکر

صحیح احادیث میں آتا ہے۔ کہ تین قسم کے آدمی اس زمرہ میں آتے ہیں اَلْمُسْبِلُ وہ شخص جو اپنے پاجامے یا تہبند۔ پتلون کو ٹخنوں سے نیچے ٹکاتا ہے۔ مردوں کے لیے مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ عورتیں مستثنیٰ ہیں۔

دوسرا شخص وَالْمَنْفِقُ سلحتہ جو جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچتا ہے۔ گاہک کو جھوٹا یقین دلاتا ہے۔ اور تیسرا شخص الْمَنَّانُ ہے۔ جو کسی پر احسان کر کے جلاتا ہے اس کا نہ صرف احسان ضائع ہوا۔ بلکہ وہ بھی بنو منکر وہ میں شامل ہو گیا۔ ایک حدیث میں عنون بنی کریم کا ارشاد ہے تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بغض رکھتا ہے پہلا شخص

اَلتَّاجِرُ الْخَلَّافُ یعنی قسمیں

کھانے والا تاجر ہے۔ وَالْفَقِيرُ الْمُحْتَالَ دوسرا شخص وہ ہے جو محتاج ہو کر غرور کرے۔ وَالْبَخِيلُ الْمَنَّانُ اور تیسرا شخص احسان جتانے والا بخل ہے ان تینوں اقسام کے آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔

پھر فرمایا تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پہلا محبوب لوگ شخص وہ ہے جو دشمن کے مقابلے میں جہاد کرتا ہے۔ پھر یا تو فتح تک پہنچتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے۔ فرمایا دوسرا محبوب آدمی وہ ہے۔ جو کسی قافلے میں شامل ہو کر سفر پر جاتا ہے۔ پڑاؤ کے مقام پر قافلے والے سو جاتے ہیں اور وہ خدا کے حضور کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے اللہ کے سامنے اپنی مناجات پیش کرتا ہے۔ پھر جب نماز فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔ تو اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ فرمایا تیسرا محبوب خدا وہ شخص ہے۔ جو پڑوسی کی تکالیف پر صبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسے موت آجائے یا وہاں سے علیحدگی اختیار کرے۔ ان اقسام کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔

آیت زیر درس میں یہودیوں کا ذکر اُس گروہ میں کیا گیا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔ وہ بغوض لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا اور جھوٹی قسمیں کھائیں

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہشاد ویک (۸۱)

آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۖ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ ۖ وَتَزُودُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ ۝ (۱۹۷) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ ۚ

وَقَفَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ترجمہ: حج کے چند مہینے ہیں، جو معلوم ہیں۔ پس جس شخص نے حج کو لازم کر لیا ان مہینوں میں، پس عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا جائز نہیں ہے اور نہ گناہ کی بات اور نہ حج میں جھگڑا کرنا۔ اور جو کچھ کرو تم نیکی سے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور توشہ بناؤ۔ بیشک بہتر توشہ تقویٰ ہے۔ اور مجھ سے ڈرو، اے عقل مند (۱۹۷) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

رابط آیات

اس سے پہلے جہاد اور حج کا مشترکہ حکم بیان ہوا پھر احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے یعنی بیماری لاحق ہو جائے یا دشمن کی وجہ سے راستہ غیر محفوظ ہو جائے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ اس کے بعد تمتع اور قرآن کا بیان آیا کہ جسے حج اور عمرہ نصیب ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسے شخص کو دم یعنی قربانی دینا ہوگی۔ اگر قربانی کی استطاعت نہیں ہے۔ تو دس روزے رکھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ان آیات میں بھی حج کے مختلف احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرکین کی اس تحریف کا رد ہے جو انہوں نے حج سے متعلق زمانہ جاہلیت

انجیل میں موجود لفظ فار قیسط کی جگہ مددگار یا شفیع لکھ دیا۔ اور دس ہزار کی بجائے
 لاکھوں لکھ دیا۔ اور اس طرح لفظی تحریف کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے
 کہ اُس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔ آگے فرمایا مَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ
 یہ اس لیے فرمایا کہ ان بد بختوں نے تورات میں بھی رد و بدل کیا، تورات میں بھی
 موجود ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔ مگر ان لوگوں نے آگے
 لکھ دیا فاستراح (پھر اس نے آرام کیا) اللہ نے فرمایا یہ تو کفر کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ
 تھک گیا تھا، جو آرام کی ضرورت پڑی۔ اللہ کے ساتھ ایسی بات منسوب کرنا صریح
 کفر ہے۔ مگر ان لوگوں نے محض ساتویں دن کی چھٹی ثابت کرنے کے لیے یہ
 لفظ بڑھا دیا۔ یہ بھی تحریف لفظی کی ایک مثال ہے۔ انہوں نے نہ صرف الفاظ کو
 تبدیل کیا، بلکہ معنوی طور پر بھی مطلب کچھ کا کچھ کر دیا۔

مسلمانوں میں سے اہل بدعت بھی اس بیماری کا شکار ہیں۔ یہ قرآن پاک کے
 الفاظ تو تبدیل نہیں کر سکے مگر مطلب سارا الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ جس آیت
 سے چاہتے ہیں، اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ دیکھیے میلاد کا موسم
 آتا ہے۔ پہاڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ پوچھو بھائی یہ پہاڑیاں کیسی ہیں، کہتے ہیں قرآن میں
 صفا و مروه پہاڑیوں کا ذکر آیا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ
 کہ یہ پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس قسم کی باتیں قرآن پاک میں صریح تحریف
 ہے۔ قطعاً ناجائز اور گمراہی کا باعث ہے۔

بہت سے واعظین اور خود ساختہ مفسرین بھی اسی ڈگمگہ پر چل رہے ہیں۔
 ایک صاحب نے بسم اللہ کی تفسیر لکھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسم اللہ سے مراد
 حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ حالانکہ اسم اللہ سے اللہ کا نام مراد
 ہے۔ اور اللہ کا نام لیکن ہی شروع کرنا چاہیے۔ مگر انہوں نے اس کا معنی تبدیل
 کر دیا۔ خود پر و فیسر ہیں، معلم ہیں، مگر تفسیر یہ کی ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی تو یہی کہا۔ کہ میرا
 نام سورۃ فتح میں محمد رکھا گیا ہے اور رسول اللہ بھی لکھا ہے (العیاذ باللہ) یعنی لفظ

بطور دم قربان کرنا ہوگی۔ اسی طرح احرام کی حالت میں کوئی مرد سلا ہوا کپڑا حتیٰ کہ موزہ تک نہیں پہن سکتا۔ خوشبو نہیں لگا سکتا۔ سر اور منہ کو ڈھانپ نہیں سکتا۔ عورتیں سِلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں مگر خوشبو نہیں لگا سکتیں۔ سر کو ڈھانپ لیں گی مگر چہرہ کھلا رہیگا۔ اسپر کپڑا نہیں آنا چاہیے۔ اگر کوئی عورت پردہ کرنا چاہے تو چہرہ پر کوئی لکڑی وغیرہ رکھ کر اوپر نقاب ڈال سکتی ہے۔ جس سے کپڑا چہرے کو نہ لگے۔ احرام کی حالت میں شکار کرنا بھی منع ہے اس کے متعلق واضح حکم ہے۔ "حُرِّمَ عَلَيْكَ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُ حُرْمًا" جب تک تم احرام میں ہو، خشکی کا شکار نہیں کر سکتے بلکہ کسی جانور کو ذبح بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کر گئے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ لہذا اس کو کوئی دوسرا شخص بھی نہیں کھا سکتا گویا یہ سب چیزیں احرام کی حالت میں ممنوع ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی اپنے اوپر حج کو لازم رکھے، تو فَلَا رَفَثَ حج میں رفث نہیں ہے۔ لفظ رفث عام ہے۔ اس کا اطلاق معمولی بے پردگی سے لے کر مباشرت تک ہوتا ہے۔ عورت کے ساتھ بوس و کنار شہوانی باتیں اور مباشرت سب رفث میں آجاتا ہے غیر عورت کے ساتھ تو یہ چیزیں ہر وقت حرام ہیں۔ مگر احرام کی حالت میں یہ افعال اپنی بیوی کے ساتھ بھی جائز نہیں ہوتے۔

بے حجابی

وَلَا فُسُوقَ احرام کی حالت میں فسق بھی جائز نہیں۔ اس سے مراد اطاعت سے باہر نکل جانا یا نافرمانی ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں عام حالت میں بھی منع ہیں مگر جب کوئی حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لیتا ہے۔ تو ان کی ممانعت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حرم کے اندر کوئی گناہ کرنا عام جگہ کی نسبت زیادہ جرم ہے۔ یا جس طرح حرمت کے مہینوں میں کسی گناہ کا ارتکاب دیگر مہینوں کی نسبت زیادہ باعث وبال ہے۔ الغرض احرام کی حالت میں نافرمانی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ فسق کا لفظ نفاق اور اعتقاد پر بھی بولا جاتا ہے۔ عمل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کافروں، منافقوں اور عام گناہگار مومنوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا

نافرمانی

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

اِلِ عِمْرَانَ ۳

درس بابت و ہفت ۲

آیت ۷۹ تا ۸۰

مَا كَانَ لِبَشِيٍّ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّيْنَ بِمَا
كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ
بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

۷۹/۸۰

ترجمہ: کسی انسان کے لیے یہ بات (مناسب) نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے۔ پھر وہ شخص لوگوں سے کہے کہ ہو جاؤ تم میرے بندے اللہ کے سوا۔ لیکن وہ یوں کہے گا کہ ہو جاؤ رب مائے۔ اس وجہ سے کہ تم کتاب سیکھاتے ہو، اور اس وجہ سے تم اس کو پڑھتے ہو ﴿۷۹﴾ اور وہ تم کو اس بات کا حکم نہیں دیگا، کہ تم اللہ کے فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تم کو کفر کا حکم دیگا، بعد اس کے کہ تم فرمانبردار ہو چکے ہو ﴿۸۰﴾

اہل کتاب کی مختلف خیانتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ دینی، دنیوی اور مالی ربطیات لحاظ سے خائن تھے۔ جھوٹ بولتے تھے۔ اللہ کی کتاب کے احکام کو تبدیل کرتے اور حق کو چھپاتے تھے۔ الفاظ و معانی میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے، خود مسائل گھڑ کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ یہ کتاب کا حصہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صریح جھوٹ بولتے آخری

حالت تھی حضور علیہ السلام نے دیکھا تو فرمایا کہ اس احرام والے آدمی کا حال دیکھو کہ اس حال میں بھی نہ کمر کو مار رہا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑا، مار کٹائی گالی گلوچ کا تو امکان تک نہیں ہونا چاہیے۔ لَا رِفْتَ لَا فِسْوَۃَ اَوْ رَاجِحَالَ کا یہی معنی ہے۔ حضور علیہ التیمۃ والسلام کا فرمان ہے۔ مَنْ حَجَّ حَجَّ شَخْصٍ نَعَىٰ حَجَّ کَیَا فَلَمْ یَرْفَتْ وَلَمْ یَفْسُقْ اور اس نے دوران حج نہ بے حجابی کی بات کی اور نہ نافرمانی کی، تو اسکی حالت ایسی ہے رَجَعَ کَیَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ گویا آج ہی ماں نے اُسے جنا ہے۔ جس طرح نوزائیدہ بچہ گناہ سے بالکل پاک ہوتا ہے اسی طرح ان بُدی باتوں سے بچنے والا حاجی گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی حج کو حج مبرور کہا جاتا ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے حج مبرور کی دعا کی اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا وَ ذَنْبًا مَّحْفُوْرًا اے اللہ میرے حج کو حج مبرور بنا دے اور میری غلطیوں کو معاف فرما دے ایسا حج نصیب فرما جس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہو اور نہ ساتھیوں سے کوئی جھگڑا واقع ہو۔

شیخ سعدیؒ نے اپنی کتاب گلستان میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حاجیوں کا قافلہ جا رہا تھا۔ اور اس میں شامل لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ہم فلاں جگہ خوب لڑے۔ گویا انہوں نے دادر فسق دیا تو کسی شریف آدمی نے کہا "ازمن بگو حاجی مردم گندارا" حاجی تو نیستی شتر است، یعنی میری طرف سے آدمیوں کو کاٹنے والے حاجی سے کہ دیں کہ تو تو حاجی نہیں ہو سکتا، البتہ تیرا دنٹ حاجی ہو سکتا ہے جس پر تو سوار ہے۔ تیرے اندر حاجیوں والی کوئی خصلت نہیں کیونکہ تو نے فسق و جدال کا ارتکاب کیا ہے! اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ حج کے دوران بے پردگی گناہ اور جھگڑا قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں حج میں نقص نہ واقع ہو جائے۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمُہُ اللّٰہُ اور تم جو بھی نیکی کا کام کرو گے اللہ تعالیٰ اُسے جانتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ حج کے

نہیں ہونا۔ حالانکہ حدیث شریف میں صریح الفاظ آئے ہیں۔ کسی نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کے متعلق سوال کیا۔ تو انہوں نے کہا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ بَشَرًا مِّثْلَ بَشَرِ النَّاسِ یعنی حضور علیہ السلام انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ پوچھنے والے نے دریافت کیا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام کی گھڑیوں زندگی کیسی ہے۔ آپ کا اخلاق کیسا ہے۔ آپ گھڑیوں کیا کیا کام کرتے ہیں تو جواب یہی تھا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان ہیں۔ جو کام عام آدمی گھڑیوں کرتے ہیں، وہ کام اللہ کا نبی بھی کرتا ہے۔ حدیث شریف میں بَشَرًا مِثْلَ بَشَرِ النَّاسِ کا لفظ آتا ہے۔ نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللَّهِ نہیں آتا۔ یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے۔ انہوں نے بھی مسیح علیہ السلام کو خدا کا جزو بنا دیا۔ اور آج کے مسلمان بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ الغرض! حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، آنحضرت علیہ السلام گھڑیوں بکری کا دودھ دودھ لیتے، اپنے کپڑے صاف کر لیتے۔ جوتے کاٹنا لگا لگاتے، گویا اپنا کام اپنے دست مبارک سے انجام دے لیتے تھے۔

بخاری، مسلم، ترمذی اور دیگر کتب احادیث میں یہ حدیث موجود ہے۔ کہ کچھ لوگ آپ کی خدمت میں ایک مقدمہ لائے تاکہ آپ اس کا فیصلہ فرمائیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ! میں ایک انسان ہوں اور انسان عالم الغیب نہیں ہوتا۔ میں ظاہر میں تمہارا معاملہ سنوں گا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ ہو سکتا ہے ایک فریق اپنا مقدمہ پیش کرنے میں بڑا چرب زبان ہو اور دوسرا فریق اتنا فصیح نہ ہو۔ فرمایا فَلَعَلَّكُمْ بَعْضُكُمْ لَمِنَ مُّجْتَبٰیہِ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کی دلیل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ یاد رکھو! جو شخص کسی چیز کا مستحق نہیں ہے۔ وہ اس چیز کو مست لے۔ کیونکہ اُس کے حق میں وہ دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہو گا۔ فرمایا میں انسان ہوں۔ باطنی حالات تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے۔ مالک الملک کی جانب سے علم دیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ فرمایا تمام انبیاء علیہم السلام انسان ہیں اور انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اسی لیے فرمایا وَتَذَوُّوا زَادِ رَہ لے لیا کرو۔ تو شہ بنا کر حج کا سفر اختیار کرو
 آدمی کو چاہیے کہ وہ برائی اور سوال سے بچے۔ تو شہ بنانا اور اس کے لیے جائز ذرائع
 اختیار کرنا بالکل درست ہے۔ اسباب کو ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ ان ذرائع
 اور اسباب پر بھروسہ رکھنا تو کل کے خلاف ہے۔ بھروسہ صرف اللہ کی ذات
 پر ہونا چاہیے۔ وہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے۔ بیماری کی صورت
 میں علاج کرنا درست ہے۔ مگر ڈاکٹر پر بھروسہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ شفا تو من جانب
 اللہ ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو دوائی میں تاثیر پیدا کر دے گا اور مریض صحت یاب
 ہو جائے گا، ورنہ لاکھ دوائیں استعمال کرے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ چاہے تو پانی
 میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا کر دے، اور اگر وہ نہ چاہے تو پوری ہنر کا پانی پی کر
 بھی استقامت کے مریض کی پیاس نہ بجھے۔ یہ اُس کے قبضہ قدرت میں ہے
 معلوم ہوا کہ اسباب پر کنٹرول ذاتِ خداوندی کا ہے مگر اسباب کو ترک کرنا
 روا نہیں ہے۔ لہذا حج کا ارادہ کیا ہے۔ تو سواری کا انتظام کرو، سامان ساتھ لو
 اخراجات کے لیے روپیہ پیسہ لے لو اور پھر توکل بہ خدا روانہ ہو جاؤ۔ بغیر زادِ راہ
 سفر پر نکلنا تو ویسے ہی عزت نفس اور شرافت کے خلاف ہے۔ اس میں قباحتیں
 پیدا ہوتی ہیں انسان دوسروں پر بوجھ بنتا ہے جو کہ بالکل جائز نہیں۔ لہذا فرمایا کہ
 زَادِ رَہ لے لیا کرو۔

گداگری حرام ہے

جو شخص خالی ہاتھ سفر پر روانہ ہوگا، ظاہر ہے کہ اُسے ضروریات زندگی کے لیے
 ہاتھ پھیلا نا پڑے گا۔ حالانکہ گداگری اسلام میں حرام ہے اس میں شک نہیں کہ آج آدمی
 دنیا کے مسلمان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا ہے ہیں۔ مگر یہ گداگری بہر حال حرام ہے
 شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ چوری، ڈاکہ وغیرہ کی طرح گداگری بھی ایک مضرت پیشہ ہے
 اور حرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کسی آدمی کو سوال کرنا روا نہیں،
 سوائے خاص پریشانی کی حالت میں۔ آپ نے چند آدمیوں کو کچھ وقت کے لیے سوال
 کرنے کی اجازت دی مگر اُس وقت تک جب تک اُن کی حالت درست ہو

نبی کا فہم، عقل اور ذکاوت تمام انسانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ نبی عقل انہیں ہوتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ ذکی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں کمال درجے کی صلاحیت و ولایت کرتا ہے۔ آگے فرمایا وَالْمُتَّبِعُونَ یعنی ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم کے علاوہ نبوت بھی عطا فرمائے۔ اس کی یہ شان نہیں ہے ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ کہ وہ لوگوں سے کہے كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ، اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نبوت اور رسالت عطا فرمائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانے کی بجائے اپنی بندگی کی طرف دعوت دے۔ یا کسی دوسرے انسان یا کسی بھی مخلوق کی عبادت کی تلقین کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا اگر ایسی بات ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نعوذ باللہ، اللہ کا انتخاب ہی درست نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پر جہالت لازم آئے گی (نعوذ باللہ) کہ اُس نے ایسے شخص کو نبی بنایا جو اس نبوت کا اہل نہیں تھا۔ نبی کا منصب تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کار بند ہو اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دے۔ دنیا کے معاملات میں بھی جب کسی شخص کو وزارت یا گورنری کے عہدہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ تو اس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق کام کرے گا۔ اگر کوئی شخص خلافت کرے تو اُسے ایک منظر کے لیے کسی اعلیٰ عہدے پر برداشت نہیں کیا جاتا۔ اللہ کا نبی تو اللہ کا کامل وفادار ہوتا ہے۔ دنیا میں منشا ئے ایزدی کی تکمیل اُس کا فرض ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے علاوہ اپنی یا کسی دوسری مخلوق کی عبادت کی دعوت کیسے دے سکتا ہے۔

انبیاء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اُن میں موجود بشریت کے تمام نقصان بہترین طور پر سنور جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی تربیت ہی ایسی کرتا ہے۔ جس سے اُن کے تمام قویٰ درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ اُن سے ایسی بات کا سرزد ہونا جو منشا ئے الہی کے خلاف ہو، ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا، ہم نے تم پر احسان کیا۔ تمہاری پرورش ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی

ہونی چاہیئے۔ وہاں جا کر ضروریات کی اشیاء خرید لے تو منع نہیں۔ اور اگر نیت
 ہی خرید و فروخت کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگ جانتے ہی سامان خریدنے
 کے لیے ہیں۔ بعض سیر و تفریح کی غرض سے جاتے ہیں بعض لوگوں سے سنا
 کہ بھائی اس سال لندن جانا ہے۔ یا اس سال حجاز کی سیر کرنی ہے۔ یہ باطل نظریات
 ہیں۔ جب نیت ہی سامان خریدنے کی ہے، تو پھر سونا بھی خریدیں گے اور کسٹم سے
 بچنے کے لیے طرح طرح کے چیلے بہانے بھی بنائیں گے اور اس طرح گناہ پر گناہ
 کے مرتکب ہوں گے۔ اگر حج کرنا ہے۔ تو نیت خالص حج کی ہونی چاہیئے
 اس کے باوجود اگر ضرورت کی چیزیں خرید لی ہیں تو کوئی ممانعت نہیں۔
 اس ضمن میں قرآن پاک نے دو اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ ایک اصطلاح
 ”رضوان“ ہے۔ جس سے مراد امور آخرت کی طلب ہے۔ اور دوسری اصطلاح
 ”فضل“ ہے جس سے مقصود رزق حلال ہے۔ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں۔

ہوں گے وہ خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔

فرمایا اللہ کا بنی تو کہے گا، اللہ والے ہو جاؤ، رب والے ہو جاؤ وَمَا كُنْتُمْ
تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ اس وجہ سے کہ تم کتاب سکھلاتے ہو۔ اور کتاب سکھلانے والے
کی لازماً اصلاح ہونی چاہیے۔ اس میں خالص توحید اور جذبہ عبادت ہونا چاہیے۔
بلکہ اُسے دوسروں کی اصلاح بھی کرنی چاہیے۔ وَمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ
اور اس وجہ سے کہ تم خدا کی کتاب پڑھتے ہو۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ تم اللہ والے
بن جاؤ۔

عبدیت
کی غلط
نسبت

کل ذکر کیا تھا کہ کتاب اللہ میں لفظی یا معنوی تحریف کرنا اہل کتاب کا کام تھا
مگر اس زمانے میں یہ کام خود مسلمان بھی انجام دے رہے ہیں۔ بلکہ یہ تو ان سے بھی
بدتر کام کر رہے ہیں۔ کلام اللہ کے ایسے غلط معانی و مطالب بیان کرتے ہیں جو نہ
اللہ کی مراد ہے اور نہ رسول اللہ کی تشریح ہے۔ نہ خلفائے راشدین نے ایسے معنی
کیے اور نہ ائمہ دین نے یہ مطلب سمجھا مگر آج کا پیر ویز اور مرزا قادیانی عجیب و غریب
تاویلات کرتے ہیں۔ اب دیکھئے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اس
آیت قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ سے کیا مطلب نکالا
ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں آپ اپنی طرف سے کہہ دیں
اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ گویا حضور علیہ السلام اپنی امت
کو میرے بندو کہہ مخاطب کر رہے ہیں (نعوذ باللہ) اسی سے مولوی احمد رضا خاں
یہ نکالتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کہہ کے نام رکھنا جائز ہے۔
جیسے عبد الرسول، عبد المصطفیٰ، عبد البنی وغیرہ، حالانکہ یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ آیت کا
مطلب یہ ہے کہ اے نبی! آپ اللہ کی طرف سے کہہ دیں یعنی اللہ تعالیٰ یوں فرماتا
ہے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت
سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرما دیگا، اس کی مثال سورۃ مریم میں موجود
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حضرت مریمؑ کی طرف یہ آیت دے کر بھیجا۔

ارشاد گرامی ہے الْحَجُّ عَرَفَةَ حج دراصل نام ہی وقوف عرفہ کا ہے۔ لہذا جو شخص
 نودی الحج کو بعد از زوال سے لے کر دس تاریخ کی صبح صادق طلوع ہونے تک ایک
 لمحہ کے لیے بھی میدان عرفات پہنچ گیا اُس نے حج کو پایا۔ اور جو شخص ان اوقات
 میں وہاں نہیں پہنچ سکا۔ وہ حج سے محروم رہا۔ اُسے اگلے سال قضاء مانا ہوگا۔ کیونکہ
 وقوف عرفہ کا کوئی بدل نہیں۔ حج کے دیگر ارکان مثلاً طواف، قربانی، رمی جمرات
 وغیرہ میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے اور کوئی جھوٹ بھی سکتا ہے۔ پھر اسکی تلافی دم، صدقہ
 یا روزے کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ مگر وقوف عرفہ ایک ایسا اہم رکن ہے جس کی
 کوئی تلافی نہیں۔ میدان عرفات مکہ مکرمہ سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ میدان
 تین اطراف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جبل رحمت نامی پہاڑ ہے
 جس کے دامن میں حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر وقوف فرمایا تھا۔ تاہم آپ
 نے واضح فرمادیا کہ وَقَفْتُ هَهُنَا وَكُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ یعنی میں نے یہاں
 قیام کیا ہے۔ مگر سارا عرفات موقف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ ملے وقوف کر سکتا ہے
 سوائے بطن عرنہ کے جو مسجد نمروہ کی پھلی طرف ہے، وہاں وقوف جائز نہیں۔ چنانچہ
 آجکل پورا میدان عرفات حاجیوں سے بھر جاتا ہے۔ وقوف عرفہ حضرت ابراہیم علیہ
 السلام کے زمانہ سے حج کا رکن چلا آرہا ہے۔ اسی طرح واپسی پر مزدلفہ کا وقوف اور
 پھر منیٰ میں ٹھہرنا سب حج کے لوازمات ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔
 قِصْوًا عَلَى مَشَاعِرِكُمْ اپنے مشاعر پر ٹھہرو۔ اور پھر بتائے گئے طریقے کے مطابق
 اللہ کا ذکر کرو فَإِنَّكُمْ أَرْتُمْ مِنْ أَرْتُمْ ابْنِكُمْ ابراہیم کیونکہ یہ تمہارے
 باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت میں سے ایک ورثہ ہے۔

وقوف عرفات کے لیے آدمی کا احرام میں ہونا لازمی ہے۔ اگر بغیر احرام کے
 وقوف کیا ہے۔ تو وہ وقوف نہیں ہوگا اور حج باطل ہو جائے گا۔ احرام کی تعریف
 میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اُسے رکن کہتے ہیں اور بعض شرط کہتے ہیں۔
 بہر حال جس طرح حضور نماز کے لیے شرط ہے۔ اور اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

متعارف ہے۔ کسی کو سجدہ کیا جائے، اندر نیاز پیش کی جائے، حاضر و ناظر سمجھا جائے
 علیم کل سمجھا جائے، ما فوق الاسباب، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، یہی شرک
 ہے۔ اس قسم کا جو بھی عقیدہ اللہ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا جائے گا شرک ہوگا،
فرمایا پیغمبر کبھی یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں یا انبیاء کو رب بناؤ۔ اَیَا مَرْکُمُ
بِالْکُفْرِ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے؟ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُسْلِمُونَ باوجود اس کے کہ تم فرمانبرداری اختیار کر چکے ہو۔ اللہ کی وحدانیت
 کو اپنا چکے ہو۔ جب تم اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آچکے ہو تو پھر وہ تمہیں
 ایسا حکم کیسے دیگا۔ جس سے تم پھر کفر و شرک کی تاریکیوں میں غرق ہو جاؤ ایسا نہیں ہو
 سکتا۔ اللہ کے نبی سے یہ توقع ہر گز نہیں ہو سکتی۔

اہل کتاب نے نبی علیہ السلام سے کہا تھا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ
 آپ کی عبادت کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ قانون بتلادیا
 کہ اللہ کا نبی نہ اپنی عبدیت کی طرف دعوت دیتا ہے اور نہ کسی غیر اللہ کی۔
 مسیح علیہ السلام نے بھی ربوبیت کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتے ہوئے
فرمایا تھَا اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ تمہارا اور تمہارا سب کا رب

اللہ ہے۔ میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوتا تم بھی اُسی کی عبادت کرو اللہ کا ہر نبی
 یہی دعوت دے گا کہ اللہ مالے بن جاؤ۔ رب مالے بن جاؤ۔ اس کے سوا کسی
 انسان کی پوجا نہ کرو۔

لیے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو عرفہ کہا جاتا ہے۔

میدان عرفات ایک سنان میدان ہے۔ جو سارا سال غیر آباد رہتا ہے۔ تاہم ذی الحج کی نوں تاریخ کو سائے سال کی کسرتکل جاتی ہے۔ جب پورا میدان حاجوں سے بھر جاتا ہے۔ ہر طرف مخلوق خدا نظر آتی ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کافران ہے کہ شیطان جس قدر عرفہ کے دین ذلیل ہوتا ہے۔ اور کسی دین نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باران رحمت کو اتمتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے

یوم عرفہ کی بعض خصوصیات ہیں۔ کہ ذی الحج کی نوں تاریخ ہو اور انسان احرام کی حالت میں ہو۔ امام حج کے پیچھے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ظہر کے وقت میں ادا کی جاتی ہیں نزال کے فوراً بعد امام حج کا خطبہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اذان ہوتی ہے۔ پھر اقامت ہوتی ہے۔ اور ظہر کے دو فرض ادا کئے جاتے ہیں۔ پھر اقامت ہوتی ہے اور عصر کی نماز دو رکعت ادا کی جاتی ہے۔ دونوں نمازوں کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ نیز دو دو فرض الف کے علاوہ سنن نوافل وغیرہ بھی ادا نہیں کیے جاتے اس کے بعد جبل رحمت کے قریب وقوف ہوتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی وقت ہوتا ہے غروب آفتاب تک انسان کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں۔ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے ہیں۔ رد و کما اللہ مالک الملک سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ یہ وقوف عرفات ہے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد یہاں سے نکل جانے کا حکم ہے۔ مغرب سے پہلے میدان سے نکل جانا درست نہیں

مشرکین مکہ کی بعض خرابیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سورج ابھی کھڑا ہوتا تھا اور وہ عرفات سے نکل جاتے تھے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میدان عرفات یا مزدلفہ کے راستہ میں نماز مغرب ادا کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ خواہ رات کا آخری حصہ ہی کیوں نہ ہو۔

الغرض! میدان عرفات سے حاجیوں کی واپسی بعد غروب شمس مزدلفہ

کہ ہم لوگ آپ کی پرستش شروع کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اہمیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو نبوت سے سرفراز فرمائے، اس کی یہ شان نہیں ہے۔ کہ وہ اللہ کی بجائے لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے یہ اہل بات ہے کہ نبی ہمیشہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے۔ کہ اللہ والے ہو جاؤ۔ وہ ملائکہ یا انبیاء کی عبادت کا حکم نہیں دیتا۔ اس معاملہ میں انبیاء کی برکت واضح کمرہ نے کے بعد آمدہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے میثاق النبیین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یعنی اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی جماعت سے لیا تھا۔ کہ جب تمہارے پاس اللہ کا رسول آجائے۔ جو تمہارے پاس موجود چیز کی تصدیق کرے، تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

میثاق الست

قرآن پاک میں مختلف میثاقوں کا ذکر ہے۔ منجملہ ان کے میثاق الست ہے یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ قَدْ اخَذَ رَبُّكَ مِنْ ابْنِ آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ ۗ الشَّهَادَةُ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو عالم ارواح میں متمثل فرما کر ان سے سوال کیا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں گویا یہ عہد اللہ نے اپنی الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کے لیے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا۔ پھر جوں جوں بنی آدم کو پیدا فرمایا اس عہد کی یاد دہانی کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اور کتابیں نازل فرمائیں۔

تمام انبیاء سے میثاق

دوسرا عہد میثاق انبیاء ہے جس کا ذکر آیت زیرہ درس میں آیا ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے لیا۔ اس میثاق کی تشریح میں دو قول ہیں۔ پہلا قول حضرت علیؑ کا ہے جسے امام ابن جریر نے اپنی تفسیر طبری میں اور سیّد محمد الوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے۔ دوسرا قول امام طائوسؒ کا ہے۔ آپ تابعین میں سے ہیں اور مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ بلند پایہ فقیہ اور محدث تھے۔ امام صاحب کا یہ قول مصنف عبدالمزاق میں درج ہے۔ جو کہ علم حدیث کی معتبر کتاب

ہے۔ کہ رات مزدلفہ میں قیام کریں۔ فجر کی نماز وہیں ادا کریں۔ اور پھر ذکر الہی میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بعد طلوع آفتاب سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جائیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مطابق جو شخص مزدلفہ میں وقوف نہیں کرے گا اسے دم دینا ہوگا۔ کیونکہ یہ واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ بیمار اور ضعیف حاجیوں کو اجازت ہے۔ کہ وہ مزدلفہ میں تھوڑی دیر قیام کے بعد رات کو ہی منیٰ کو چلے جائیں۔ اور صبح کی نماز منیٰ میں جا کر ادا کر لیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت سودہؓ جو بیمار تھیں ان کو اور بعض دوسرے ضعیف اہل خاندان اور بچوں کو اجازت دیدی تھی۔ کہ وہ مزدلفہ میں راست کے وقت تھوڑی دیر وقوف کریں دعائیں کریں اور پھر منیٰ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ تاکہ وہ عام لوگوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے آسانی کے ساتھ رمی کر لیں کیونکہ رمی کرنا بھی بہت کھٹن کام ہے آپ نے ضعیف اور بیماروں کو اوّل وقت میں رمی کی اجازت مرحمت فرمادی۔

بہر حال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مزدلفہ کے گُھٹا موقوف یعنی سارا مزدلفہ موقف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ میسر آئے بٹھ جائے البتہ وادی محسر جو منیٰ کی طرف ہے۔ وہاں نہیں بٹھنا چاہیے۔ باقی ہر جگہ قیام کر سکتا ہے۔

فرمایا شِعْرُ اکرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کَمَا هَدَاكُمْ جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی۔ لفظ کما مشبہ بھی بن سکتا ہے اور تعلیلیہ بھی۔ اور زائد بھی بن سکتا ہے۔ جیسے یاد کرو واللہ کہ لَانَّہُ هَدَاكُمْ اس لیے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ یہ کما تعلیلیہ ہے۔ اللہ نے تمہیں ایمان کی دولت بخشی ہے اس لیے اُس کو یاد کرو۔ اسی قسم کا کاف تعلیلیہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے ضمن میں پہلے گزر چکا ہے۔ نیا کپڑا پہننے کی دعا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی سکھائی ہے اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ کَمَا كَسَوْتَنِي اے اللہ میں تیری حمد بیان کرتا ہوں اس لیے کہ تو نے مجھے کپڑا پہنایا ہے۔ تیری عطا کردہ اس نعمت پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی کاف علت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اس لیے کہ اُس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔

ذکر الہی

مگر حضور علیہ السلام کے متعلق اس سے عہد لیا لائن بُعِثَ وَهُوَ حَيٌّ كَيْتُومِنَ بِهِ وَلَيَنْصُرُنَّ لَكَ کہ اگھر ہماری زندگی میں نبی آخر الزمان آجائیں تو ان پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کر دے گے۔ لہذا یہ عہد خاص طور پر حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تھا۔ یہ قول بھی صحیح ہے۔

حضور علیہ السلام کے متعلق اس خاص عہد سے آپ کی ختم نبوت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کسی نبی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہیں پایا، جو اس میثاق کی رو سے آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی مدد کرتے۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب قرب قیامت میں نازل ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پائیں گے۔ اُس وقت وہ حضور علیہ السلام کے نائب کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوں گے اور آپ کی شریعت کے مطابق دنیا میں قرآن و سنت کا نظام جاری کریں گے۔ اس عہد سے حضور علیہ السلام کی خاص فضیلت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شب معراج میں اللہ نے تمام انبیاء کو بیت المقدس میں جمع کیا۔ فَأَمَّتْهُمْ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کھدایا اور آپ نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔

سید الموسیٰ بغدادی جنہوں نے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے، بلند پایہ مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ آپ تیرھویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں ۱۲۷۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی جتنی مسک رکھتے تھے۔ آپ نے تین سول جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ ہر پائے کی الگ جلد ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ یہ تفسیر آپ نے آغانہ جوانی میں لکھی۔ اس تفسیر میں تمام علوم منجملہ صرف، سخن، علم عقائد اور قرأت وغیرہ موجود ہیں۔

دیگر مفسرین کی طرح آپ نے بھی اپنے زمانے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن پاک کی عظیم تفسیر کی ہے۔

میثاق انبیاء کا تذکرہ کر کے امتیوں کو بات سمجھائی جا رہی ہے کہ جس چیز پر نبیوں کی خلاف ورزی

بنایا ہوا تھا۔ اللہ کے گھر کو بھی مبنع توحید کی بجائے بت خانہ میں بدل دیا گیا تھا۔ رسومات باطلہ کی بھرمار تھی۔ ننانویں فیصد لوگ ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت سے نوازا۔ لہذا اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کا ذکر کرو۔

قریش مکہ
کا تشخص

حج کے متعلق قریش مکہ اور ان کے رشتہ داروں بنو خزیمہ اور بنو کنانہ نے اپنا علیحدہ تشخص قائم کر رکھا تھا۔ یہ لوگ نودی الحج کو مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے حالانکہ عرفات کی حاضری تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے رائج تھی۔ مگر یہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے ہم احسن ہیں۔ دوسروں سے بلند تر ہیں اس لیے ہم عرفات میں نہیں جائیں گے شیطان چم نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈال دیا تھا کہ میدان عرفات حدود حرم سے باہر ہے اور ہم خانہ کعبہ کے مجاور ہونے کے سبب حرم سے باہر کیوں جائیں۔ قریش کے اس باطل نظریے کو توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ پھر تم بھی وہیں سے پیو جہاں سے دوسرے لوگ پلٹ کر آتے ہیں یعنی عرفات سے۔ مزدلفہ سے واپس آ جانے کا تمہارا نظریہ غلط ہے۔ تم ٹسے نیچی سمجھ رہے ہو، حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ناس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور آپ کے لیے جمع کا صیغہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو پوری امت قرار دیا ہے۔ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا آپ مجموعہ امت کے قائم مقام ہیں۔ تمام امت کے خواص آپ میں پائے جاتے تھے۔

اس حکم کے ذریعے قریش کے تفاخر کی نفی کی گئی ہے اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے افضل اور بہتر سمجھنا درست نہیں ہے۔ خاص طور پر عبادتِ ریاست کے معاملہ میں تو اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور ہی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو تمام لوگ برابر ہیں۔ اُس کے ہاں اگر کوئی بہتری ہے تو محض تقویٰ کی

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ چونکہ ایک سنی دوسرے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے انبیاء کے متبعین کا فرض ہے کہ اپنے نبی کے اتباع میں وہ بھی دوسرے راہبیار کی تصدیق کریں۔ اس سے شاہ صاحب یہ بھی اخذ کرتے ہیں۔ کہ مشائخ کو مشائخ سے ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ کوئی شیخ وقت، نیک بندہ یا درویش اپنے برابر والے شیخ یا اپنے سے اونچے درجے والے کی تصدیق کرے۔ اس سے دعا کرنے اور اس کی حمایت کرنے سے گمراہ نہ کرے۔ شاہ رفیع الدینؒ تو یوں فرماتے ہیں۔ کہ اللہ کے نیک بندے اور اولیاء ایک دوسرے کی کبھی مخالفت نہیں کرتے۔ اَلْفُتْرَاءُ كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ تمام فقرار کی مثال ایک جسد واحد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بزرگ نے دوسرے کی تکذیب نہیں کی کہ فلاں غلط ہے یا جھوٹا ہے۔ بلکہ اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ انبیاء کی تعلیم کا نتیجہ ہے جس طرح ایک سنی دوسرے سنی کی تنقیص نہیں کرتا اسی طرح ایک اللہ والا دوسرے ولی اللہ کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اس وقت جو ایک دوسرے کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ یہ نہ تو درویشی اور نہ فقرار کا سلسلہ ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔ بزرگی محض قبریں بنالینے، ان پر گنبد کھڑے کر لینے اور بدعات، جاری کرنے کا نام نہیں ہے۔ اصل بزرگوں کا ہرگز یہ مشن نہیں ہو سکتا۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ہمیشہ نیکی کا حکم کرتے ہیں۔

حضرت بیچی امیریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید اور بڑے بزرگ مرد تھے۔ مشرقی ہندوستان میں قیام تھا۔ لوگوں نے ان کے لیے خانقاہ تیار کی اور لاکھ روپے بٹھا دیا۔ فرمانے لگے دوستو! بڑا افسوس ہے، تم نے میرے لیے ایک مہندر سا بنا دیا۔ ہمارے ساتھ تو اس کا تعلق ہی قائم نہیں ہوتا۔ خواجہ فرید الدینؒ کو بادشاہ وقت فیروز تغلق نے جاگیر کی پیشکش کی۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اور میرے بزرگوں کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس جاگیر کو مستحقین میں تقسیم کر دو۔ یہی بات حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صدر ہند راجندر پرشاد کو کہی تھی۔ حکومت نے

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہشادوسم (۸۳)

آیت ۲۰۰ تا ۲۰۳

فَإِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۖ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ (۲۰۰) وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ (۲۰۱) أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۚ (۲۰۲) وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۚ (۲۰۳)

ترجمہ :- جب تم ارکان حج کو پورا کر چکو، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ تم یاد کرتے ہو اپنے باپ دادا کو۔ بلکہ اس سے زیادہ یاد کرنا چاہیئے۔ پس لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! دے دے ہم کو اس دنیا کی زندگی میں۔ اور ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ (۲۰۰) اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے دے اور آخرت میں بھلائی دے دے۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ (۲۰۱) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے اُس سے جو انہوں نے کمائی کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۰۲) اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں۔ پس جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جس نے آخر کی

تھا۔ اس نے تورات میں سے کچھ اچھی اچھی باتیں لکھ کر آپ کو دیں حضرت عمرؓ وہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور عرض کیا کہ میرے ایک یہودی دوست نے تورات کی بعض اچھی چیزیں لکھ کر دی ہیں۔ کیا میں ان کو پڑھ لیا کروں۔ یہ سن کر ناراضگی کی وجہ سے حضور علیہ السلام کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ فرمایا اَتَهْوِكْتُمْ كَمَا تَهْوِكُ الْيَهُودُ وَالتَّصَالِي كَمَا تَمْ بِي اِسِي طَرَحَ سِرْمَهُ دَانَ هَوْنًا يَهْتَنُ هُوَ حَسْبَ طَرَحِ يَهُودٍ وَنَصَارَى هُوَ نَسَبُ هِيَ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ تو تم تحریر شدہ تورات کا ورق لائے ہو اگر موسیٰ علیہ السلام بنفس نفیس آجاتے اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کا اتباع کرتے تو تم گمراہ ہو جاتے اَنَا آخِرُ النَّبِيِّينَ فِي آخِرِي بَنِي هَوْنٍ حَتَّى تَهْتَكُوا حَصِيَّيَ آيَا هَوْنٍ۔ لہذا تم پر میری ہی اطاعت لازم ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَرَسُولًا میں راضی ہو گیا اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے پر۔ اس پر حضور علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

الغرض! جب تمام انبیاء نے اپنے عہد کا اقرار کر لیا۔ قَالَ تَوَالَّفَ تَعَالَى نے فرمایا فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ گواہ بن جاؤ۔ کہ تم نے یہ اقرار کر لیا ہے۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ کہ جب بنی آخر الزمان علیہ السلام آئے گا تو اُس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی تائید کرو گے۔ اور دیکھو! میں بھی تمہارے ساتھ اس بات پر گواہ ہوں۔

فرمایا کہ پختہ عہد کرنے کے بعد فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ جَسَدٌ اعْرَاضَ کیا اس کے بعد یعنی عہد کی پابندی نہ کی۔ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ تَوَلَّى ایسے لوگ فاسق اور نافرمان ہوں گے۔ فاسق نافرمان، منافق اور کافر کو بھی کہا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکاری ہے تو یہ بنیادی فسق ہے۔ اِنَّا نَاكَرُ

تمام حاجی وہیں پر قربانی کرتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی تھی۔ آج کل وہاں پر ہر قسم کے قربانی کے جانور بل جلتے ہیں۔ لوگ وہیں سے جانور خریدتے ہیں اور وہیں ذبح کرتے ہیں۔ تو انا آدمی قربان گاہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور ضعیف حاجی اور عورتیں اس کام کے لیے دوسروں کو مامور کر دیتے ہیں۔

قربانی کے بعد اگلا کام حجامت ہونا ہے۔ ریش کی وجہ سے یہ کام بھی بڑی مشکل سے انجام پاتا ہے۔ بال منڈائے یا کترائے جاتے ہیں۔ اور پھر احرام کھول دیا جاتا ہے (لیکن عورت کے پاس جانا منع ہوتا ہے طواف تک)

طواف زیارت

حج کا اگلا رکن بیت اللہ شریف کا طواف ہے۔ اسے طواف زیارت کہا جاتا ہے اور یہ فرض ہے۔ اسی طواف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّہٗ لَیَقْضُوْا تَفَتُّہُمْ وَلَیُؤَفُّوْا نَدْوٰہُمْ وَلَیَطُوْفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ پھر چاہیے کہ اپنا میل کچل صاف کریں، اپنی تدریں پوری کریں اور تدریم گھر (بیت اللہ شریف) کا طواف کریں۔ یہ طواف بھی دس تاریخ کو ہی کیا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے کوئی شخص آج کے دن طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ نہ جاسکے تو گیارہ تاریخ کو کرے۔ اسے بارہ تاریخ تک بھی بوجہ مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ اگر بارہ تاریخ کے بعد طواف کرے گا تو اسے ساتھ دم دینا پڑے گا۔ اور یہ فرض ادا ہو جائے گا یہ طواف

چونکہ عازمین حج نے مقرر اوقات میں لازمی کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر بھی بڑا سخت ہجوم ہوتا ہے۔ طواف کے بعد صفا و سروہ کی سعی بھی ہے۔ اس کے بعد مکہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں بلکہ واپس منیٰ آنا ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ اور تیرہ ذی الحجہ ایام منیٰ کہلاتے ہیں۔ ان ایام میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ البتہ معذور لوگوں کو استثناء حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ تمام مناسک حج جو مختلف مقامات پر پورے کرنے ہوتے ہیں

خاندانی تفاخر

زمانہ جاہلیت میں ایام منیٰ کے دوران بہت بڑی منڈھی یا میلہ لگتا تھا جس میں خرید و فروخت کے علاوہ مختلف قبیلے اپنے اپنے خاندان کی مدح سرائی کرتے اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے، بڑوں کے کارنامے دہراتے اور اس طرح اپنے

اَفَیْرِ دِیْنَ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗ اَسْکَمَ مَنْ
 فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْہًا وَّالِیْہِ یُرْجَعُوْنَ ۝۸۳
 قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی
 اِبْرٰہِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ
 وَالْاِسْبٰطِ وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ
 مِنْ رَّبِّہُمْ لَا نَفَرِقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْہُمْ
 وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۸۴ وَمَنْ یَّبْتَغِ
 غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہٗ وَہُوَ
 فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۸۵

ترجمہ: یہ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرتے ہیں، حالانکہ اسی اللہ
 کے لیے فرمانبرداری کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں۔ اور جو زمین میں ہیں خوشی اور ناخوشی
 سے۔ اور اسی کی طرف سب لوٹانے جائیں گے ۝۸۳ اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ
 کہ دیجئے، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے۔ ہمارے اوپر اور
 اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے، حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام
 اور ان کی اولاد پر اور جو چیز دی گئی ہے۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور جو چیز دی گئی
 ہے سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم تفریق نہیں کرتے کسی ایک
 کے درمیان۔ اور ہم اسی اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں ۝۸۴ اور جو شخص
 اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا۔ پس اُس سے ہرگز نہ قبول کیا جائیگا
 اور وہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ ۝۸۵

بِسْمِ اللّٰهِ لِيَكُ تَذَكُّرٌ لِّلّٰهِ كَا بَهِتْ بِذٰلِكَ عَمِلُوْا

دنیا کی
خواہش

آگے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کی خواہش رکھتے ہیں فَمِنْ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں جو کچھ دنیا ہے دنیا میں ہی عطا کر دے۔ ایسے لوگ آخرت کے طلبگار نہیں ہوتے۔ دوسرے مقام پر اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ وہ کہتے ہیں عَجِّلْ لَنَا قِطْعًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ یعنی جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ ہمیں یوم حساب سے پہلے ہی مل جائے۔ ہمیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں دنیا کا مال و دولت جاہ و مرتبہ، آرام و آسائش، صحت اور تندرستی حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ جو حج پر جا کر بھی دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ بیماری سے نجات، قحط سالی سے پناہ، اولاد اور کاروبار ہی چاہتے ہیں۔ اور آخرت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

فرمایا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ دنیا کے طالبوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے آخرت کی خواہش ہی نہیں کی۔

دنیا اور آخرت

فرمایا وَمِنْهُمْ اُنْهٰی میں سے بعض ایسے بھی ہیں مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً اور ہمیں آخرت میں بھی بھلائی نصیب فرما۔ اور پھر دوزخ سے پناہ بھی مانگتے ہیں۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ دوزخ سے بچنے کا مطلب یہ ہے۔ دنیا میں گناہ اور برائی سے بچ جائے۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو آخرت میں دوزخ سے بھی بچ جائے گا۔ غرضیکہ جو نیک لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔

کھڑو شرک والے ادیان کو تسلیم کریں۔ اللہ کے علاوہ کوئی ذات ہے۔ جس کی طاعت تمام مخلوق پر لازم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو خود فرمایا وَلَکُمْ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سَمٰوٰتِ وَزَمِیْنِ کی ہر مخلوق اُسی خدا نے وحدہ لا شریک کی فرمانبرداری کرتی ہے۔ ہاں! طَوْعًا وَکَرْهًا کچھ لوگ اس کی اطاعت خوشی سے کرتے ہیں اور بعض دوسرے مجبوری اور لاچارگی کی بنا پر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں۔ تکوینی احکام وہ احکام ہیں جو انسان کو اپنی خواہش اور اختیار کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے زندگی، موت، بیماری، حادثات، بارش، خشک سالی، سیلاب، زلزلہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جو انسان پر بغیر خواہش اور بغیر اختیار کے وارد ہوتی ہیں۔ انسان کو ان احکام پر مجبوراً عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ یہ تکوینی احکام ہیں۔ دوسری قسم کے احکام شرعی احکام کہلاتے ہیں۔ یہ احکام اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ ان پر عمل انسان اپنی خواہش اور اختیار سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتنی مخلوق ہے۔ جو ان احکام کو احکام الہی سمجھ کر خوشی سے تسلیم کرتی ہے۔ اور بعض بد بخت ایسے بھی ہیں، جو انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تو فرمایا کہ ایسی ہستی جس کے تمام تکوینی اور شرعی احکام ماننے جائیں وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اور ماننے والے آسمان میں بھی ہیں۔ اور زمین میں بھی ہیں۔ آسمانی مخلوق میں فرشتے ہیں۔ یہ اللہ کی مطیع اور فرمانبردار مخلوق ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ آسمان میں چار بالشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اپنے مالک کی عبادت میں مصروف نہ ہو۔ زمینی مخلوق میں انسانوں کے علاوہ شجر، حجر، چرند، پرند، نباتات، جمادات سب اللہ کے تکوینی احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ انسان تو ان میں بہت سے ایسے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے شرعی احکام قبول کرتے ہیں۔ اللہ کی طاعت اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں وَکَثِیْرٌ اٰمَنَ عَلَیْهِ الْعَذَابُ اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی سزا ثابت ہو چکی ہے۔ تکوینی احکام تو وہ بھی مجبوراً مانتے ہیں مگر شرعی

سے سعادت مندی ہے۔ منہ احمد کی روایت میں ہے کہ اچھی بیوی، اچھی سواری، اچھا مکان دنیا کے اعتبار سے انسان کی نیک نیتی ہے۔ انسان کے لیے صحت بھی ضروری ہے۔ کہ عبادت اور دیگر امور کا مدار اسی پر ہے۔ یہ سب چیزیں حسنہ ہیں۔ مگر بالیقین مقصود بالذات ایمان باللہ، خدا کی عبادت اور اعمال صالحہ ہیں۔ جو چیز ان کے تابع ہو کر آئیگی وہ حسنہ ہی کہلائے گی۔

ذخیرہ آخرت

فرمایا اُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا اِنْ لَوْ كُنْ لَیْسَ اس چیز میں سے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا۔ دنیا کی کھائی کے متعلق تو دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِنْ كَانُوا عَرَفُوْهُ" تو دنیا میں ہی ختم ہو گیا، آگے اُن کے لیے کچھ نہیں۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اُن کے اعمال آخرت کا ذخیرہ بنتے ہیں فرمایا اُن کے لیے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا، وَاللّٰهُ سَوِّیْعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے جب قیامت برپا ہوگی۔ حساب کی منزل شروع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو طے کر دیں گے۔

ایام تشریق

سنی کے احکام کے ساتھ فرمایا تھا فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اپنے آبا و اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اور غرور و تکبر کو چھوڑ دو۔ اب آگے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ چند گنتی کے دنوں میں۔ ان چند ایام سے مراد ایام تشریق ہیں اور یہ چار دن ہوتے ہیں یعنی ذی الحجہ کی دسویں تا تیرہویں تاریخ۔ تشریق کا لفظی معنی گوشت کو خشک کرنا ہے۔ ان ایام میں قربانی کا گوشت وافر مقدار میں میسر آتا ہے۔ اور لوگ آئندہ استعمال کے لیے خشک کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ان دنوں کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ سورۃ حج میں فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ آیا ہے۔ اور اس سے مراد قربانی کے تین دن یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں تاریخ ہیں۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم سے منقول ہے کہ یہ دن یَوْمُ النَّحْرِ و

نازل کی گئی ہے۔ لوگوں کے سامنے اس کی تشریح بیان کرے۔ تاہم یہ تشریح بھی منجانب اللہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک وحی جلی ہے اور جو تشریح پیغمبر کی زبان سے ہوتی ہے۔ وہ وحی خفی ہے مسلم شریف کی روایت میں ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ایمان وہ چیز ہے مَاجُتُ بِلہ جو کچھ میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی جو بھی چیز اللہ کی طرف سے بنی لایا ہے، اس پر ہم ایمان لائے ہیں۔

فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَیْ اِبْرٰہِیْمَ اِہْم اُس چیز پر بھی ایمان لائے ابراہیم علیہ السلام پر اتاری گئی ہے۔ قرآن میں موجود ہے کہ اللہ جل جلالہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے نازل فرمائے۔ جیسا کہ سورۃ اعلیٰ میں آتا ہے صُحُفٍ اِبْرٰہِیْمَ وَمُوسٰی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین دیا، شریعت دی، احکام دیے اور تمام مخلوق کا امام بنایا۔ فرمایا وَاِسْمٰعِیْلَ وَاسْحٰقَ وَیَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطَ ہم اُس چیز پر بھی ایمان لائے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ پہلے حضرت حاجرہؑ کے بطن سے اور دوسرے حضرت سارہؑ سے۔ دونوں اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ اللہ نے اُن کو مستقل شریعت دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم کے پوتے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی اللہ کے صاحب شریعت نبی ہیں۔ اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسباط یعنی اولاد ہے۔ اُس میں سے اللہ نے جس کو نبوت دی، ان پر وحی نازل فرمائی اور ان کو شریعت بھی دی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے اللہ نے چار ہزار نبی اور رسول مبعوث فرمائے۔ یہ اتنا عظیم خاندان ہے۔ اسباط سے ہی انبیاء اور رسل مراد ہیں جن میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر مبعوث ہوئے۔ حضرت الیاس علیہ السلام بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں تاہم بعض انبیاء کا ذکر قرآن میں موجود ہے، اکثر کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ ان تمام

قانون خداوندی کی کس حد تک پابندی کرتا ہے۔ قانون شکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسی لیے فرمایا کہ جس عازم حج میں تقویٰ یعنی قانون کی پابندی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ دو دن ٹھہر کر بھی چلا جائے۔ لہٰذا اسکا حج صحیح ہے۔ اس میں کوئی عرج نہیں۔

تقویٰ کیا ہے

فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو بھی خاطر میں لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ امتحان میں خیل ہو جاوے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے جو کفر، شرک اور معصیت سے بچ جائے، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرے۔ اللہ والے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی فکر کرتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَٰهٌ تَحْشَرُونَ یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے۔ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے اکٹھے جاؤ گے بخاری شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دن انسان کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔ اُس وقت حالت یہ ہوگی کہ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَوْبَانِ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا۔ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ مِّنْجَادِلٍ ہر شخص کو اپنی طرف سے اللہ کے سامنے براہ راست جواب دینا پڑے گا۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے حج کے احکام بیان فرمادیئے ہیں اس کے بعد منافعتین کا تذکرہ اور بعض دوسری باتیں آئیں گی۔ حج کے تمام ضروری اجزاء اسی رکوع میں مکمل طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔

کی گئی ہے۔ وہاں پر عَلَيْنَا کی جگہ اَلَيْسَا اور وَالنَّبِيُّونَ سے پہلے وَمَا
اَوْفَتْ کے الفاظ زیادہ ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ جو کچھ اللہ نے نبیوں پر نازل
کیا ہے وہ حق ہے اور ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ گویا۔ اس اصل ہدایت
پر ہمارا مکمل ایمان ہے اگرچہ بعد میں آنے والوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا
تاہم اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں اور اللہ کے ہاں جواب دہ ہیں۔

ایمان
باللہ

اور آخر میں تمام انبیاء پر ایمان لانے کی وضاحت، اس طرح فرمائی
لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ہم انبیاء اور رسل میں کسی کے
درمیان تفریق نہیں کرتے، تفریق کرنے کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح
بعض انبیاء پر ایمان لائے اور بعض پر نہ لائے۔ اس قسم کی تفریق صریح کفر ہے
کیونکہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے
کر حضور خاتم النبیین علیہ السلام تک جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں۔ وہ سب
اللہ کے کامل بندے اور بہ حق نبی ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دور میں مخلوق خدا
کو حق کا پیغام پہنچایا۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو کتابیں اور شرائع عطا فرمائیں۔ ان سب
پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر یہود و نصاریٰ اللہ کے تمام انبیاء پر ایمان نہیں رکھتے۔
مثال کے طور پر دونوں گمراہ حضور خاتم المرسلین علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔
لہذا یہ تفریق بین الرسل کے مرتکب ہو کر کافر بھڑے۔ اسی طرح یہودی مسیح علیہ السلام
کو نہیں مانتے۔ بلکہ انہیں دجال کہتے ہیں اور ان کی تذلیل و تحقیر کرتے ہیں۔ مگر ہم
بحیثیت مسلمان کسی نبی کے درمیان تفریق نہیں کرتے وَنَحْنُ لَكُمْ مُسْلِمُونَ
ہم اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہی اسلام ہے۔ یہی حیثیت ہے اور
یہی ملتِ ابراہیمی ہے جسکی تعلیم سائے نبی نیتے آئے ہیں۔

غیر اقوام کی
سازشیں

ارشاد ہوتا ہے۔ يَادْرِكْهُوَ! وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا
جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تلاش کرے گا۔ اور یہ سمجھے گا۔ کہ ایسا
کفر کے وہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے فَ لَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ اس سے

جو کچھ دینا ہے، اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ کیونکہ آخرت پر یہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ دوسرے گمراہ وہ ان لوگوں کا ہے جو دنیا اور آخرت ہر دو کے طالب ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی دنیوی زندگی بھی خوشحالی میں بسر ہو، اور آخرت میں بھی نجات حاصل ہو جائے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ سے یوں سوال کرتے ہیں۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یہ ایماندار لوگ ہیں۔ گزشتہ آیات میں ان دو قسم کے لوگوں کا بیان آیا۔

مخلص اور منافق

اب ان آیات میں بھی دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں پر مومن اور کافر کا تقابل نہیں، بلکہ مخلص اور منافق کا حال ہے۔ بظاہر یہ دونوں گمراہ ایماندار ہیں۔ مگر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مخلص وہ لوگ ہیں جو انتہائی درجے کے پکے سچے اور مخلص ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ظاہر میں تو ایمان والے ہیں مگر ان کے باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنَ الْمُنَافِقِينَ مَنْ يَعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا يَعْنِي بَعْضُ لَوْكٍ اَيْسے ہیں جن کی بات دنیوی زندگی میں آپ کو پسند آتی ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو بڑے پتے کی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے نچے درجے کے لوگ ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ ان کی چرب زبانی اور مکاری ہوتی ہے۔ محض زبان سے آپ کے روبرو میٹھی میٹھی اور آپ کے لیے خوش کن باتیں کرتے ہیں۔ اور آپ کو وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قُلُوبِهِمْ اور جو کچھ اُس کے دل میں ہے، اُس پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ اور قسمیں کھا کر کہتا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِي الْخَصَّاهُ کہ وہ سخت جھگڑا کرنے والا ہے ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ اَلْغَضُّ الرَّجَالِ اِلَى اللّٰهِ اَلَّذِي الْخَصَّهٖ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی کے نزدیک بغض ترین وہ لوگ ہیں جو سخت جھگڑا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت اغنس بن شریق کے متعلق نازل

پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لہذا اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو تلاش نہ کرو۔
جو ایسا کرے گا، اُس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ
الْخَسِرِينَ ایسا شخص آخرت میں نقصان میں پڑے گا۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین
 بھی کامیابی کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ اُس کے متبعین سراسر خسارے کا
 سودا کریں گے۔

مسلمانوں کی
 بدقسمتی

یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی تو قابلِ فہم ہے، وہ تو دوسرے دین ہی تلاش
 کریں گے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ آج کا مسلمان بھی اپنے دین پر اعتماد نہیں کرتا۔
 آج کے مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جب تک غیر اقوام کی شاگردی اختیار نہیں کریں
 گے، ترقی نصیب نہیں ہوگی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب مسلمان اپنے دین
 پر یقین کرتے تھے، عروج کی بلندیوں پر تھے۔ کوئی قوم ان کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ مگر
 اب خود مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہیں۔ ان کی تہذیب اختیار کر رہے ہیں۔
 انہی کے لہو و لعب میں مشغول ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت
 یہ ہے کہ پیر و انِ اسلام کے سوا کسی کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ آخرت میں تو سخت
 نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے

اسلامی
 قوانین

تہذیب و تمدن کے علاوہ آج کا مسلمان اسلامی قوانین سے بھی مطمئن نظر نہیں
 آتا۔ اسی لیے وہ غیر اسلامی قوانین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام ایک
 فرسودہ دین بن چکا ہے۔ لہذا وہ اقتصادی نظام کے لیے روس، جرمنی، امریکہ اور
 فرانس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس تعزیرات کا کوئی قانون موجود نہیں
 ان کے تمام قوانین بناوٹی ہیں۔ برخلاف اس کے کہ اسلام کے پاس اپنے قوانین
 موجود ہیں۔ صحابہ کرام کا دستور العمل مشعلِ راہ ہے۔ مگر اب قوانین اُس مجلس
 شورٰی سے بنائے جاتے ہیں جس میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔ کیا اسلام کا
 قانون یہ لوگ بنائیں گے؟ ممبرانِ شورٰی کے لیے تو خصوصی اہلیت مقرر ہونی چاہیے
 تھی۔ جس سے پتہ چلتا کہ واقعی یہ لوگ اسلامی قانون سازی کے قابل ہیں۔ حضرت عمرؓ

اور فساد سے مراد مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اور انہیں مالی و جانی نقصان پہنچانا ہے
 مزید برآں یہ شخص وَیْهْلُکَ الْحَرْثُ کھیتی کو ہلاک کرتا ہے۔ اور وَالنَّسْلُ اور نسل کو
 ضائع کرتا ہے۔ کھیتی کو ہلاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تیار فصل کو نقصان
 پہنچایا جائے۔ پکی ہوئی کھیتی کو آگ لگا دی جائے۔ درختوں کا پھل ضائع کر دیا جائے۔
 یا سرے سے درخت ہی کاٹ دیے جائیں۔ اور نسل کشی سے مراد مطلق نسل کشی بھی ہے
 جیسا کہ منافقین کا طریقہ ہے۔ اور اس سے مراد موتی بھی ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہلاک کر دیا
 جائے یا انہیں معذور بنا دیا جائے۔

فساد اصلاح کے مقابلے میں آتا ہے۔ اصلاح کا معنی درستگی اور فساد سے مراد
 بگاڑ ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی آچکا ہے۔ "وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا
 فِي الْأَرْضِ" جب منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے
 ہیں "إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ" ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہم کافروں سے محض اس
 لیے ملتے ہیں تاکہ صلح صفائی کا پہلو نکل سکے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ
 مجھے فساد بالکل پسند نہیں۔ یہ منافق تو ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کر کے آپس
 میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد تو لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔

فساد کی ایک اور صورت لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بدظن کرنا ہے۔ اور سب
 سے بڑا فساد شرک اور کفر ہے۔ جو ان کے دلوں میں موجود ہے کفر اور شرک سے بگاڑ
 پیدا ہوتا ہے جب کہ ایمان اور نیکی سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ شرک و بدعات
 اور منکرات کے ذریعے ضمیر کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ شرائع الہیہ کو توڑنا فساد
 ہے۔ لوگوں کو غلط باتوں کی تلقین کرنا فساد ہے۔ اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ سب
 چیزیں فساد ہی کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین
 کلام فرماتے ہیں کہ تولی کا ایک معنی پشت پھیرنا ہے۔ اور دوسرا معنی والی یعنی حاکم
 بن جانا بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے۔ تو مطلب ہوگا کہ جب منافق آدمی حاکم بن

تولی بمعنی حاکم

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاَعْمُرَانِ ۳

درس سی ۳۰

آیت ۸۶ تا ۹۱

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ
وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾ أُولَٰئِكَ
جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا
مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا

كُفْرًا لَّنْ تَقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَاقْبَلَ
مِنْ أَحَدِهِمْ مِلُّ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوْ افْتَازَ
بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ
مِنْ نَّاصِرِينَ ﴿٩١﴾

ترجمہ :- اللہ کس طرح راہ بتلانے کا اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا ایمان کے پیچھے ۔

اور انہوں نے گواہی دی کہ بیشک رسول برحق ہے ۔ اور اُن کے پاس کھلی نشانیاں

آئیں اور اللہ نہیں دیکھاتا اس قوم کو جو ظلم کرنے والی ہو ﴿۸۶﴾ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ

یہ ہے کہ بیشک اُن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ﴿۸۷﴾

منکوحہ عورت کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ **فَسَاءَ مَا كُمُ حَرِّتُمْ لَكُمْ تَمَارِی**
 عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ انہیں سے فصل یعنی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور جب زنا کیا
 جاتا ہے۔ تو کھیتی کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی
 شخص کو اپنی منکوحہ بیوی یا لونڈی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے تمتع کی اجازت
 نہیں دی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق فرمایا **اُولَٰئِكَ هُمُ
 الْعَادُوْنَ** یہ لوگ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہذا اُسے ہر لحاظ سے ناپسندیدہ
 فعل قرار دیا گیا ہے۔ باقی رہا **يَهْلِكُ النَّسْلُ** تو اس سے مراد لواطت (SODOMY)
 بھی ہو سکتی ہے۔ جس سے نسل ضائع ہوتی ہے۔ ایسا فعل جانوروں سے بھی حرام ہے
 حتیٰ کہ جلق (MASTURBATION) کو بھی ملعون فعل قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو
 دین اخلاق اور ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں زنا کی وہ صورت حرام ہے۔ جو باجبر (RAPE) کیا گیا ہو۔ اور
 اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تو قانون کی
 نظر میں کوئی جرم نہیں۔ ایسے امور میں پولیس کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔
 اسی طرح امریکہ میں برہنہ رقص بھی جائز ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب منافق برہنہ رقص
 آئیں گے۔ تو یہی کچھ ہوگا۔ اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ
 کو ہرگز پسند نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا **وَإِذْ أَوْفَيْتُ لَهُمْ أَوْفَی اللّٰہِ** اور جب ایسے منافق کو کما جائے
 کہ اللہ سے ڈر جاؤ، ایسی باتیں نہ کرو، کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ گندے قانون جاری
 نہ کرو۔ جس سے لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہوں تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں۔
أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ تو اسی گناہ پر تکبر کرتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ کہتے
 ہیں۔ ہمارا تو قانون ہی یہ ہے۔ اور فخر یہ انداز میں کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اس قانون کی
 خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری اسمبلی کا ہماری اکثریت کا بنایا ہوا قانون ہے
 فرمایا **يَسْئَلُ لَكُمْ فِيهِ لَبَّاسٌ كَثِيرٌ** کہ ان کے لیے جہنم کافی

تکبر کا گناہ

بدلہ ملے گا۔ اس کے بعد روزہ آئے گا۔ اور عرض کرے گا۔ اَنَا الصَّوْمُ اِلَی اللّٰہِ
 میں روزہ ہوں۔ اللہ فرمائے گا۔ تم بھی بہتری پہ ہو۔ پھر اسلام آئے گا اور عرض کرے گا۔
 اے پروردگار! اَنْتَ السَّلَامُ وَاَنَا الْاِسْلَامُ تو سلام یعنی سلامتی والا یا سلامتی مینے
 والا ہے (یہ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک ہے) اور میں اسلام ہوں یعنی مجھ پر فرمانبرداری ہوں
 میں اطاعت ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہاں ٹھیک ہے۔ بِكَ اَعْطِیْ وَبِكَ اُخْذُ
 آج میں تیری وجہ سے ہی دوں گا اور تیری وجہ سے مؤاخذہ کر دوں گا۔ آج سارا
 دار و مدار اس بات پر ہے کہ جس نے اسلام قبول کیا ہے، اس کو اچھا بدلہ ملیگا۔ اور
 جس نے اسلام سے روگردانی کی، اُس کا مؤاخذہ ہوگا۔ کہ تم نے اسلام کو کیوں نہ قبول کیا
 ان آیات کی شانِ نزول میں مختلف روایات آتی ہیں حضرت عبداللہ بن
 عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انصارِ مدینہ میں سے کوئی شخص اسلام قبول کرنے
 کے بعد پھر گیا۔ مگر بعد میں اس پر نادم ہوا تاہم بعض شخص ایسے بھی تھے جو اسلام کو
 ترک کرنے کے بعد کفر پر اڑے رہے، منجملہ اُن کے بُشَیْبُ منافق کا ذکر آتا ہے
 جو مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملا۔ یہ شخص اسلام اور اہل اسلام کی سخت مخالفت کرتا رہا
 اسی طرح ابنِ خطل کے متعلق آتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کو حضور علیہ السلام
 نے صدقات کی وصولی کے لیے کسی جگہ بھیجا۔ راستے میں خدمت کے لیے ایک
 خادم بھی ہمراہ بھیجا۔ دورانِ سفر اس خادم نے کھانا تیار کرنے میں دیر کر دی تو اس
 ظالم نے اُس کو قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ قتل ناحق کے جرم میں اُس کے خلاف مقدمہ
 قائم ہوتا، پھر یا تو وہ قصاص میں قتل کیا جاتا یا دیت پر فیصلہ ہو جاتا اور آخرت کی
 سزا سے بچ جاتا۔ مگر اُس نے دنیا کی سزا قبول کرنے کی بجائے اسلام کو ترک کر دیا اور
 مرتد ہو کر کفار مکہ سے جا ملا۔ وہاں پر اُس نے عیش و عشرت کی زندگی گزارنا شروع کر
 دی۔ اُس کے پاس لونڈیاں تھیں۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں جن میں اسلام
 کی توہین اور اللہ کے رسول کی شان میں گستاخی کی جاتی۔ حضور علیہ السلام نے ابنِ خطل
 سمیت چار آدمیوں کے متعلق حکم دے رکھا تھا کہ یہ جہاں بھی ملیں قتل کر دیے جائیں۔

شانِ نزول

اللہ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے۔ جو رضائے الہی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتا ہے
 شرار کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں طرح آتا ہے۔ مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اس آیت کرمہ
 میں حضرت صہیب رومیؓ کی طرف اشارہ ہے آپ جب ہجرت پر روانہ ہونے لگے
 تو مشرکین نے راستہ روک لیا۔ آپ نے کمان کو درست کیا۔ ترکش سے تیر نکالے اور
 فرماتے لگے۔ اے قریش! تم مجھ سے واقف ہو کہ میں تیر انداز ہوں۔ جب تک میرے
 پاس ایک بھی تیر ہے۔ تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔ اور تلوار بھی میرے پاس موجود
 ہے۔ میں تمہارا ڈٹ کہ مقابلہ کروں گا۔ بہتر ہے کہ تم میرا راستہ نہ روکو۔ میرا اتنا مال فلاں
 جگہ موجود ہے۔ جاؤ وہ لے لو، تمہارے لیے مباح کرتا ہوں۔ چنانچہ مشرکین نے
 اس پر اکتفا کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جب مدینہ پہنچے تو حضور علیہ السلام نے
 فرمایا اے ابو بکر! تیری تجارت نفع مند ہے۔ وہ لوگ نہ مال کی پروا کرتے تھے۔
 نہ جان کی۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی۔ کہ کسی طرح ایمان بچ جائے۔ یہی وہ
 لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ضغائنے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔
 عمارؓ کی والدہ سمیہؓ نے ایک عورت ذات ہوتے ہوئے اتنی بڑی قربانی دی۔ عمارؓ
 کا باپ یاسرؓ بھی شہید ہوا۔ اور ماں بھی شہید ہوئی۔ ظالم ابو جہل نے حضرت سمیہؓ کی دونوں
 ٹانگیں مختلف اونٹوں سے باندھ کر مخالف سمتوں میں چلا دیا اور اس طرح انہیں بے رحمی
 سے شہید کیا۔ حضرت خباب بن ارتؓ، حضرت بلالؓ اور اس قسم کے کتنے ضغائنے تھے
 جنہوں نے بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ جان اور مال قربان کر دیے۔ مگر ایمان کو
 بچا گئے تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

فرمایا واللہ رَعُوفٌ بِالْعِبَادِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت
 کرنے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اور جان اللہ کی رضا کی تلاش میں صرف کر دیتے ہیں
 تو اللہ بھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ تو بڑا ہی مہربان ہے۔ یہ بھی اُس
 کی خاص مہربانی ہے کہ اُن کے دلوں کو نیکی کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ ہر قربانی

کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان کے حق میں نتیجہ بھی خوب ہی نکلے گا۔ وہ لوگ
یقیناً مرتب عالیہ پر فائز ہونگے۔ اللہ تعالیٰ خاص مہربانی کرنے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا
 خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿٢٠٨﴾ فَإِنْ
 زَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ
 اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ
 اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالسَّالِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
 وَلِلَّهِ تَرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾

۲۰۸

ترجمہ :- اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی
 نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پس اگر تم پھسل گئے بعد اس کے
 کہ تمہارے پاس واضح باتیں آگئی ہیں۔ پس جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست
 اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ یہ لوگ نہیں انتظار کر رہے مگر اس بات کا کہ آئے اللہ
 تعالیٰ ان کے پاس آئے بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے بھی۔ اور فیصلہ

کر دیا جائے معاملے کا۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے جائیں گے سب کام ﴿۲۱۰﴾

گزشتہ آیات میں منافقین کی مذمت اور مخلص ایمان والوں کی تعریف بیان کی گئی تھی
 کہ وہ اپنی جان اور مال ہر چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوتے
 ہیں۔ اب ان مخلص مومنین سے خطاب ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا

مکمل اسلام

فِي السِّلْمِ كَآفَّةً اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔
 کافہ کا معنی 'جميعاً' ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے جسم کے لحاظ سے اور
 ادھر احکام شریعت کے لحاظ سے پورے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں۔
 وفاداری صرف اور صرف اسلام سے ہو، باقی تمام ادیان، بدعات، رسومات باطلہ

وغیرہ سے مکمل طور پر علیحدگی ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں اسلام کے منافی ہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ ساتھ ایسی قبیح چیزوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ کافہ کا دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن اور عقیدے اور عمل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ جو کچھ دل کے اندر ہے زبان پر بھی وہی آنا چاہیے۔ اور جو عقیدہ ہے عمل بھی اس کے مطابق ہو۔ زبانی دعویٰ کچھ ہو۔ اور عملی طور پر اُسکی تردید ہوتی ہو۔ تو یہ اسلام میں مکمل طور پر داخلہ نہیں ہوگا۔ اگر عقیدہ توحید کا ہو اور عمل میں شرک پایا جائے۔ زبان پر اتباع سنت کا دعویٰ ہو مگر رواج بدعت کو دیا جا رہا ہے۔ تو یہ چیز کافہ کے منافی ہوگی۔

شیخ النذار
ترجمہ قرآن

حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ برصغیر کے بلند پایہ مفسر قرآن ہوئے ہیں انہوں نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ قرآن پاک کو آسان بنایا۔ ان کے زمانے میں جو الفاظ متروک زبان ہو چکے تھے انہیں آسان اور عام فہم الفاظ کے ساتھ بدل دیا۔ یہ بامعاورہ ترجمہ آپنے اسیری کے دوران مالٹا جیل میں مکمل کیا۔ اور ساتھ دو ہورتوں کا حاشیہ بھی لکھا مگر زندگی نے وفانہ کی۔ چنانچہ بقیہ قرآن پاک کا حاشیہ آپکے شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیا۔ اس وقت برصغیر میں اردو زبان کا سب سے بہتر حاشیہ یہی ہے۔ جو مختصر اور صحیح ہے۔ تفسیریں اور حاشیے تو اور بھی بہت سے ہیں۔ کوئی لمبا کوئی مختصر۔ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بے شمار حواشی موجود ہیں۔ مگر یہ ترجمہ اور حاشیہ سب سے بہتر ہے۔ جو تمام عالمانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں بدعات کا خاص طور پر رد کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شیخ الہندؒ مالٹا سے بذریعہ بحری جہاز واپس آ رہے تھے۔ تو سمندر میں طوفان آگیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جہاز کے بیچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تو آپنے ایک شاگرد کو جو ہمراہ تھا فرمایا کہ اس ترجمہ کو اپنے سینہ سے باندھ لو۔ اگر جہاز کی تباہی کی صورت میں تیرنا بھی پڑے تو اس ترجمہ کو ساتھ لیجانا۔ یہ مولانا عزیز گل سخا کوڑٹ پشاور کے رہنے والے تھے۔ اور تیرنا جانتے تھے۔ حضرت

شیخ الہندؒ کے ہمراہی پانچ شاگردوں میں سے مولانا عزیز گل ماشاء اللہ آج بھی بقیہ حیات
ہیں۔ سمندری طوفان کے دوران اگر آپ کو کسی چیز کی فکر لاحق ہوئی تو وہ ترجمہ قرآن
پاک تھا۔ جو اپنے نہایت عرق ریزہ می سے لکھا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور
جہاز صحیح سلامت طوفان سے بچ نکلا۔ الغرض حضرت شیخ الہندؒ کو اس ترجمہ قرآن پاک
کی اتنی فکر تھی کہ اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ آپ کو صرف اسی گوہر نایاب کی فکر لاحق ہوئی۔
شیخ الہندؒ بڑے خدا پرست انسان تھے۔ محدث اور فقیہ تھے۔ انگریزوں کے
سخت دشمن تھے۔ انہیں ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہ فرماتے آپ سمجھتے تھے کہ
مسلمانوں کے دین، مذہب، اور قوم کو خراب کرنے والے انگریز ہی ہیں۔ مسئلہ کشمیر،
فلسطین، قبرص، شام اور لبنان سب انگریز کے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ یہ امریکہ تو کل
کی پیداوار ہے۔ اصل فتنہ پرداز انگلینڈ والے ہیں۔ جو یہاں سے بھاگ کر امریکہ چلے
گئے اور وہاں حکومت قائم کر لی۔ عیسائی خواہ امریکی ہوں یا برطانوی یا روسی انہوں نے
ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں
کے ساتھ سازشیں کیں۔ ان کو ذلیل و خوار کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سب
پیروں اور مولویوں نے ترکی کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ یہ صرف حضرت مولانا
شیخ الہندؒ تھے جنہوں نے انگریز کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ
کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔

بدعت کی تردید

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافہ کا معنی یہی لکھا ہے کہ
اسلام میں اس طرح داخل ہو جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل احکام اسلام کے خلاف نہ ہو۔
اپنی عقل یا دوسرے کے کہنے سے دین میں کوئی چیز داخل نہ کرو کہ یہ بدعت ہے۔
مگر لوگ اسے اسلام کے نام کا رٹوا ب سمجھ کر کرتے ہیں۔ کیونکہ بدعت نام ہی اُس عمل
کا ہے۔ جسے اچھا سمجھ کر دین میں اپنی طرف سے شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ دین
کا اُس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہوتے ہیں جیسے نماز اور
روزہ افضل ترین عبادات میں سے ہیں۔ لیکن جب کوئی شریعت کی مقررہ نماز کے علاوہ

اب دفات پانچے ہیں۔ قیاض

اپنی طرف سے کوئی نماز ایجا دکریگا تو وہ بدعت ہوگی مثلاً عید کے روز عید گاہ میں نوافل ادا کرنا اگرچہ نماز ہے مگر اسے بدعت کہیں گے۔ کیونکہ دین میں اسکی اصل نہیں ہے۔ اسی طرح ہزار روزہ رکھنا بھی بدعت میں شمار ہوگا۔ کیونکہ اپنی طرف سے دین میں شامل کیا گیا ہے۔

ایصال ثواب کی تمام رسوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔ قیسرا، دسواں چلم وغیرہ کا ثواب اور مزدے کے لیے باعثِ اجر سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی مدح سرائی کے لیے نعت خوانی اور محافل میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ اور مختلف مقامات پر مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ شریعت کی منشا اور اس کے حکم کے بغیر ہوتا ہے۔ ملا علی قاریؒ اور دیگر فہمائے کرام لکھتے ہیں۔ کہ نماز جنازہ کی سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں کہنی چاہیے۔ کیونکہ یہ جنازہ میں اپنی طرف سے اضافہ تصور ہوگا۔ یہ چیز شارع علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح جب اقامتِ صلوٰۃ کے آخری کلمات لا الہ الا اللہ کہے جاتے ہیں۔ تو دوسرے لوگ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی بہت بڑی نیکی اور ثواب کی خاطر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام سے قطعاً ثابت نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے مسلمان کو حضور علیہ السلام کے طریقے پر یقین نہیں آیا۔ لہذا اس میں اضافہ کر لیا ہے۔ اذان سے پہلے درود شریف بہت بڑی سعادت سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ اس قسم کی بدعات کا ارتکاب محض اپنی عقل کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔

نوافل کی ادائیگی بلاشبہ خیر کثیر ہے۔ مگر اسکی جماعت ثابت نہیں۔ فقہائے کرام نے اسے بھی بدعت سے تعبیر کیا ہے۔ ہاں جن نمازوں کی جماعت حضور علیہ السلام سے ثابت ہے، وہ درست ہے۔ ان میں نماز تراویح، صلوٰۃ کوف اور نماز استسجار وغیرہ ہیں مگر صلوٰۃ التیسیح کی جماعت کہاں سے آگئی۔ علمائے احناف اسے بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں درست نہیں ہے۔

حالانکہ یہ نماز سہے اور اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔

الغرض ! خلاصہ ان آیات کا یہ ہے۔ کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ، اور بدعات سے بچتے رہو اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی بعض لوگ مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں اہل کتاب کی مثال موجود ہے۔ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلام کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور وہ اسلام لائے۔ بعض دوسرے یہودی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ تورات کے احکام کی بھی رعایت ہونی چاہیے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کی تردید فرمادی کہ اسلام کے ساتھ کسی اور شریعت یا دین کی رعایت اسلام میں مکمل داخلے کی نفی ہوگی۔ لہذا باقی تمام شرائع اور ادیان کو چھوڑ کر اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

تورات میں حکم موجود ہے کہ ہفتہ کے روز سوائے عبادت الہی کے اور کوئی کام نہ کرو۔ گویا اس دن دنیوی کاروبار مکمل طور پر بند کرنے کا حکم تھا۔ حتیٰ کہ چولہا بھی گرم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ زراعت، نہ دکانداری اور نہ کوئی اور کام کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے دین میں اونٹ کا گوشت کھانا اور دودھ پینا ممنوع تھا۔ تو نو مسلم یہودیوں نے خیال کیا کہ اسلام میں جمعہ کو افضل دن قرار دیا گیا ہے۔ ہم سکو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پُرانے طریقے پر اگر ہفتہ کی تعظیم بھی رواد رکھی جائے۔ اور ممنوعات کی پابندی کی جائے تو کیا حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اب اسلامی احکام کے ساتھ دوسری شریعت کی پابندی روا نہیں ہے اگر اب بھی ایسا کیا جائے تو یہ فعل بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ شریعت محمدی نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

أَدْخُلُوا فِي السِّلَاحِ أَفَّةً اٰیة جامع آیت ہے۔ اسلام میں مکمل داخلہ صرف ظاہری اعمال تک ہی موقوف نہیں۔ بلکہ باطنی طور پر بھی اسلام کے احکام

ظاہر و باطن
میں یکسانگی

پہلو پر یقین ہونا چاہیے۔ ظاہر تمام اعضا مثلاً ہاتھ پاؤں، کان اور آنکھ احکام اسلام پر کاربند ہوں جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ روزہ صرف جھوک اور پیاس پر شہادت کرنے کا نام نہیں بلکہ آنکھ، کان، زبان اور دیگر تمام اعضا و جوارح کا روزہ ہونا چاہیے اسی طرح باطن و دل میں بھی پورا ایمان و یقین ہو کہ ان احکام کو پورے خلوص نیت کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اگر ایسی کیفیت پیدا ہو جائے، تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے کافۃً کا مفہوم پالیا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ حصہ اسلام کا لے لیا۔ اور کچھ بدعات کو بھی اپنا لیا۔ یا کوئی عبادت اسلام سے لے لی اور کچھ چیزیں کسی اور شریعت یا مقامی رسم و رواج سے حاصل کر لیں تو اسلام میں مکمل داخلہ تصور نہیں ہوگا۔ آپ کو یاد ہے سابقہ حکومت نے نعرہ لگایا تھا کہ دین تو ہمارا اسلام ہے مگر معیشت ہماری سوشلزم اور سیاست ہماری جمہوریت ہوگی۔ تو بتائیے یہ اسلام کی مکمل اتباع کیونکر ہوگی۔ یہ تو تثلیث بنا کر رکھ دی۔ یقیناً یہ اس آیت کریمہ کی نفی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حکم دیتا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک تہائی اسلام کالیں گے اور باقی دو تہائی کے لیے دوسروں کے دروازے پر جانیں گے، ہم نے اسی وقت کہ دیا تھا۔ کہ یہ نعرہ اسلام کے سراسر منافی ہے۔ اگر دین اسلام ہے تو پھر معیشت اور سیاست بھی اسلام ہی سے کرنا ہوگی۔ ورنہ یہ قول و فعل میں تضاد اور ظاہر و باطن میں عدم یکسانیت ہوگی۔

محضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد عالیہ کتب احادیث بخاری و مسلم وغیرہ میں مرتب شکل میں دستیاب ہیں ان میں نظام حکومت کا مکمل خاکہ موجود ہے خلفاء راشدین کے نظام حکومت کی تفصیلات موجود ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء اور دیگر کتب میں دستور مملکت موجود ہے۔ مگر آپ اس کو چھوڑ کر غیروں کے نظام تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کے نام پر قائم ہونے والے پاکستان میں ابھی تک نیکو کا قانون

نافذ ہے۔ قوانین دیوانی و فوجداری، تجارت و معیشت وغیرہ سب انگریزی قانون ہیں انگریز کے زمانہ میں ان قوانین کو قبول کرنا تو ہماری مجبوری تھی، اب کیا تکلیف ہے ہم اسلامی نظام کیوں نافذ نہیں کر سکتے۔ کیا کارپوریشن حکومت کو اسلام کے قوانین و نظریات پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد ہوتا تو انگریزی قوانین پہلے دن سے تبدیل کر دیے جاتے۔

اسلام انقلابی
مذہب ہے

اصل بات یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو انقلابی مذہب ہم خود اور ہمارے حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اسلام کا نفاذ بتدریج چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح پہلے حکمران نفاذ اسلام کے بغیر چلے گئے۔ اسی طرح موجودہ حکومت بھی رخصت ہو جائیگی مگر اسلام نافذ نہیں ہو گا۔ اور اس کے بعد تیسرا آجائے گا وہ اپنا طور طریقہ اپنائے گا۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت مگر لوگ اسلام کی برکات سے محروم ہی رہیں گے۔ جب تک اسلام کو انقلابی اقدام کے طور پر نافذ نہیں کیا جائے گا، کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ دیکھئے۔ فتح مکہ کے روز حضور نے انقلابی اعلان فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ہر رسم آج میرے پاؤں کے نیچے روند دی گئی ہے آج کے بعد کسی مشرک کو بدہنہ حالت میں طواف کعبہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی غیر مسلم کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آج کے بعد تمام سودی کاروبار بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب انقلابی مذہب کے انقلابی پروگرام تھے جو غلط پروگرام کی جگہ فی الفور نافذ کر دیے گئے۔ مقصد یہ کہ اگر عقیدہ اسلام کا ہے۔ تو پھر قوانین بھی اسلامی نافذ ہونے چاہئیں۔ جو ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہوں۔ ملکی مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی، عبادات ہوں یا رسم و رواج ہر معاملہ میں اسلام سے رہنمائی حاصل کرنا ہو گا۔ ادھاتیہ اور ادھابٹیر سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس ہر ہر شعبہ کے لیے قوانین موجود ہیں، ضرورت صرف عمل کی ہے۔ اسلام کی عملداری میں انگریز کی جمہوریت چلے گی، نہ سوشلزم کی اقتصادیات ہوں گی اور نہ کارل مارکس کی اشتراکیت کا کوئی حصہ ہو گا۔ بلکہ پورے کا پورا نظام اسلامی ہو گا۔ حتیٰ کہ دیوانی اور فوجداری قوانین

بھی وہی نافذ ہوں گے جو اسلام نے عطا کیے ہیں۔ حق دار کی حق رسی اسنی قوانین کے ذریعے ممکن ہے۔ اور ظالم کو ظلم کا بدلہ ہی قوانین دلا سکتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے دنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا یہی مطلب ہے۔

شیطان کے
نقش قدم

یہودیوں میں بھی یہی خصلت پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی اپنی کتاب پر بحال ایمان نہیں رکھتے تھے۔ کسی حکم کو مانتے تھے اور کسی کا انکار کر دیتے تھے۔ جبھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتلایا اَفْتَوْهُمُنَّوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم کتاب کے کسی حصے کے ساتھ ایمان لاتے ہو اور کسی حصے کو نہیں مانتے۔ یہ تمہارا ایمان کیسا ہے۔ یہ تو سرسراہٹ ہے۔ اس روش کو چھوڑ کر پورے کے پورے ایمان میں داخل ہو جاؤ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ گویا بدعات پر چلنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے بہرے میں نہ آجانا۔ مطلب یہ کہ جو کوئی دین اسلام کا راستہ چھوڑ کر ہندو اور رستم و رواج کو اپنائے گا۔ انگلیزوں اور اشتراکیوں کا قانون اختیار کرے گا۔ وہ شیطان کے نقش قدم پر چلے گا۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن ہمیشہ دشمنی کرتا ہے۔ وہ کبھی خیر خواہی کی بات نہیں کرتا۔ وہ تمہیں ہستی کی طرف لے جائے گا۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے۔ يَذْعُوْا حِزْبًا لِّیْكُمْ ذُوْا اَمْنٍ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ وہ تو اپنا بڑے سے بڑا گروہ لے کر جہنم کی طرف رواں ہے۔ اور اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کو اسکی طرف دعوت دے رہا ہے۔

وعید کو دینی

اللہ تعالیٰ نے اسلام کے مکمل نفاذ کی ترغیب دینے کے بعد اس سے روگردانی کرنے والوں کو وعید بھی سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنٰتُ۔ اور اگر تم بھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس نشانیاں آگئیں۔ فَاَعْلَمُوْا تَرٰی اَنْ لِّلّٰهِ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ

بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے۔ اور حکمت والا ہے وہ کمال قدرت کا مالک ہے اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ اسکی حکمت کے مطابق دیکھ سکتی ہے مگر گرفت سے بچاؤ ممکن نہیں۔ وہ تمہارے کئے کا ضرور بدلہ لے گا۔ دوکے مقام پر فرمایا قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ نِجْی اور بدی کی واضح نشان دہی ہو چکی۔ اب تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان واضح ہدایات کے بعد نیکی یا بدی کا اختیار کرنا تمہارے بس میں ہے۔ اور اس پر جزا یا سزا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والوں کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ انہیں کس چیز کا انتظار ہے۔ جسے دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ يَهْدِيهِمْ لَوْ كُنُوا يُدْرِكُونَ الْإِنشَاءَ يَوْمَ يُنْفَخُ الْكَوْكَبُ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ يَهْدِيهِمْ لَوْ كُنُوا يُدْرِكُونَ الْإِنشَاءَ

ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان کے پاس بادلوں کے سائے میں آئیں مطلب یہ کہ منکرین کی خواہش یہ ہے کہ جو چیز قیامت کو ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ آج ہی ہو جائے۔ بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت کے روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ خود نزول اجلال فرمائیں گے اور سائبان جو ہوں گے، وہ نار، نور اور پانی کے ہوں گے۔ ستر ہزار حجاب میں اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا۔ ارد گرد فرشتے تسبیح پڑھ رہے ہوں گے۔ اس وقت عدالت قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ بھلا قبل از وقت یہ کیسے ممکن ہے۔ دوسری جگہ فرمایا قَدْ يَتَذَكَّرُ الْعَبْدُ يَوْمَئِذٍ أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْعَبْدُ يَوْمَئِذٍ أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ

اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے آجانے کے بعد یہ اور کس کتاب کے منتظر ہیں۔ جس پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر خاتم النبیین تشریف لے چکے۔ اب ان کی راہنمائی کے لیے اور کون سا نبی آئے گا۔ جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں اب کوئی شریعت، کوئی پروگرام نہیں جو باقی ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جائے۔

الغرض فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت

اللہ تعالیٰ
کافیصلہ

کے روز ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی ستر ہزار پڑوں کے اندر ظاہر ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز درہم
 بہرہم ہو جائے گی۔ اور سخت ناراضگی کا ظہور ہو گا۔ چنانچہ اس وقت وقُضِيَ الْأَمْرُ
 فِیْ صُلْحٍ مِّمَّا بَیْنَ یَدَیْہِمْ وَکَلِی اللّٰہِ تَرْجِعُ الْأُمُورَ تَمَامَ کَامِ اللّٰہِ ہِیَ کِی طَرَف
 لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔ اس کا مقرر کردہ ہر کام وقت پر
 ہو گا۔ اُسی کے قانون کے مطابق انسانوں کو اس دنیا پر مہلت دی جاتی ہے۔ مگر
 آخری فیصلہ اور نزول اجلال قیامت کے روز ہی ہوں گے۔ یہ چیزیں قبل از وقت
 وقوع پذیر نہیں ہوں گی۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۱۱ تا ۲۱۲

سَيَقُولُ ۲

درس ہشادوش (۸۶)

سَلْ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ط
وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۲۱۱) زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ

يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۲۱۲)

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں۔ اور جو
کوئی اللہ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ اس کے بعد کہ وہ نعمت اُس کے پاس پہنچ
چکی۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ۝ (۲۱۱) مزین کی گئی ہے۔ دنیا کی
زندگی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا۔ اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ
جو ایمان لائے۔ اور وہ لوگ جو ڈرتے رہے۔ وہ ان کے اوپر (بلند) ہوں گے قیامت

کے دن۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے ۝ (۲۱۲)

واضح نشانیاں
گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا تھا کہ اُس کے واضح احکامات آجانبہ
کے بعد ان کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ احکام الہی کی تعمیل ہونی چاہیے
واضح نشانات کے بعد بھی اگر کوئی شخص پھسل جائے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں
آسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔ سَلْ بَنِي
إِسْرَءِيلَ، آپ ذرا بنی اسرائیل سے دریافت تو کریں كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ
آيَةٍ بَيِّنَةٍ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں عطا کیں۔ واضح یا کھلی نشانیوں میں تعلیم
بھی آتی ہے۔ اور معجزات بھی آتے ہیں مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام
کے توسط سے تمہیں کس قدر واضح معجزات عطا کیے۔ ان کی تفصیل پہلے آچکی ہے

منجملہ اُن کے ابرہہ کا سایہ کرنا، پتھروں سے بارہ چشمے جاری کر کے بنی اسرائیل کو سیراب کرنا، اُن کے لیے من و سلویٰ کی خوراک مہیا کرنا، دشمن کو آنکھوں کے سامنے ہلاک کرنا، بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستے بنا دینا وغیرہ ایسے واضح نشان اور معجزات ہیں جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کا انکار کیا۔ اور پے درپے غلطیاں اور کوتاہیاں کیں جن کا ذکر اس سورۃ مبارکہ میں آچکا ہے۔ اور جن کی تعداد کم و بیش چالیس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر بار معاف فرمایا۔ بنی اسرائیل بہت بڑی قوم تھی۔ دنیا میں جاہ و وقار کی مالک تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے علم و حکمت اور بادشاہی عطا کی۔ تمام دنیوی نعمتوں سے مالا مال کیا مگر اس کے باوجود جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ذلیل و خوار کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ اللَّهُ تَعَالَىٰ كِىَ نِعْمَتِ كَيْفَ يَنْجُو مِمَّا بَدَّلَ اللَّهُ وَاسْمُ اللَّهِ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۖ

وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے اس کی نعمت کے لیے بھیجی تھی، اسے بدل دیا، تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔

انبیاء و
الہی ہیں

انبیاء علیہم السلام کا وجود بھی خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کے لیے معیار اور نمونہ ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ اپنے ظاہر و باطن کو درست کر سکتے ہیں۔ انبیاء کا وجود انسانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اسی نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ کُفْرًا کُیِّمًا نَّهَضُوْا غُلُوْدًا یَّحْمِلُوْنَ اَوْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہَا فَاِذَا کَانَ مِنْہَا رِجْلٌ مِّنْہَا سَوَّوْا لَهَا سَوًّیًا ۚ فَاُولٰٓئِکَ لَیْسَ لَہُمْ اِلٰہٌ سِوَ اللّٰهِ ۚ فَاُولٰٓئِکَ یُعَذِّبُ اللّٰہُ ۚ

جنہوں نے اللہ کی نعمت کے ساتھ کفر کیا۔ اس نعمت سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے سے اعراض کیا۔ لہذا خود بھی جہنم میں گئے اور قوم کو بھی جہنم رسید کیا۔

علم اور عمل انسان کے لیے لازمی چیزیں ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ اور عمل انبیاء سے ملتا

ہے۔ انبیاء معیار ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اعمال درست کیے جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اللہ کے رسول تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس اسوہ کی ضرورت ہے۔ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا، صلح کی حالت ہو یا جنگ کی، نبی کی ذات ہر حالت میں نمونہ ہوتی ہے۔ اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ایسے شخص کو اپنا انجام دیکھ لینا چاہیے۔

انعامات کی
ناقدری

جس طرح پیغمبر علیہ السلام کی ذات بابرکات انعام خداوندی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہیں کی۔ آپ ہر خطبہ میں سنتے ہیں خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللَّهِ تمام کلاموں سے بہتر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہ علیہ وسلم اور بہترین طریقہ حضور علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ مگر آج کون ہے جو ان دونوں انعامات سے استفادہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے راہ ہدایت ہیں۔ مگر جب کسی خوشی غمی، قومی وطنی، سیاسی و معاشرتی معاملات میں راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے رسم و رواج کا سہارا لیتے ہیں۔ یاد دوسرے غیر اسلام ازموں کی طرف دیکھتے ہیں۔ کیا یہ انعامات کی ناقدری نہیں۔

گزشتہ چوبیس سال میں ہمارے پاس صرف ایک آدمی آیا ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں صحیح راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہنے لگا کہ ہمارے بچے اور بیوی میں تنازعہ ہے۔ دو سال سے مصاحبت کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ نو بہت طلاق تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا آپ ہمیں طلاق کا شرعی طریقہ بتائیں تاکہ ہم عند اللہ ماخوذ نہ ہوں۔ اس ایک کیس کے علاوہ ہمیشہ یوں ہوا ہے۔ کہ از خود تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد جب ہدایت

ہوئی تو ہمارے پاس آگئے کہ جلد ہی میں طلاق دیدی ہے۔ اب کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے مطلقہ دوبارہ حلال ہو جائے۔ اللہ کے بندو! بغیر سوچے سمجھے، بغیر مسئلہ دریافت کیے ایسا کام کیوں کرتے ہو، جس سے خود تمہیں تکلیف ہو، اور جو تمہارے والدین اور پورے خاندان کے لیے باعثِ اذیت ہو چاروں مذاہب میں تیسری طلاق کے بعد بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اگر زبردستی حلال کرنے کی کوشش کرو گے، تو حلال نہیں ہوگی۔ اولاد بھی مشکوک اور حرام ہوگی۔ پھر جا کر شیعوں اور اہل حدیثوں سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں کہ کسی طرح حلیت کا فتویٰ مل جائے۔ یہ سب انعاماتِ خداوندی کی ناقدری ہے۔ اس نعمت کو بد وقت استعمال کرنا چاہیے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔ جس قوم کے پاس قرآن و حدیث جیسی نعمت موجود ہو، اُسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کبھی اسریحہ کی طرف دوڑتے ہیں کبھی برطانیہ اور فرانس کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہ ہمیں سکیم دو۔ کوئی ایڈوائز دے۔ جو ہماری رہنمائی کریں یہ کس قدر کفرانِ نعمت کی بات ہے فکر اور عقیدہ فاسد ہے۔ جس کی وجہ سے راہِ راست میسر نہیں آ رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ خود سخت سزا دینے والا ہے۔ اس کی نعمتوں سے روگردانی کر کے، قرآن و سنت کا دامن چھوڑ کر عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تو عذاب و سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اپنے ارگرد نظر مار کر دیکھ لیں، کوئی قوم تسلط کے چھن جانے کے عذاب میں مبتلا ہے کہیں بدعات اور رسوم باطلہ کا دور دورہ ہے۔ محتاجی ہے۔ دین مجبوس ہو گیا ہے۔ نیکی سے محرومی ہے۔ بدی کا چرچا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، جس بادیر میں جس کنویں پر تین آدمی موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں۔ اس بخود علیہم الشیطان اُن پر شیطان قابو پالیتا ہے۔ مقصد یہ کہ جب بھی کوئی قوم اسلام کے خلاف چلے گی، اُس پر شیطان قابو پائے گا۔ اور یہی عذاب ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرنا چاہیے۔ بنی اسرائیل نے ان

نعمتوں کی قدر نہ کی، معجزات کو ٹھکرایا، نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے اپنی سازشی، تخریبی اور گندی ذہنیت کی بناء پر بدترین قوم بن کر رہ گئے۔ اسی طرح جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری کرے گی ذلیل و خوار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے ساتھ ایک معیاری جماعت کو پیدا کیا، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ تھے۔ ان کی پیروی کرنے والے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوئے۔ دنیا میں عروج حاصل ہوا فتوحات نصیب ہوئیں اور آخرت میں بھی بہترین اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔

حُبِّ دُنْیَا

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو واضح فرمایا کہ کفار کے نزدیک دنیا کی کیا حیثیت ہے۔ اور اہل ایمان کی حالت دنیا میں کیا ہے۔ اور آخرت میں ان کے لیے کون سے

انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ فرمایا زینِ کفر والْحَيٰوةُ الدُّنْیَا جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان کے لیے دنیا کی زندگی مزرین کی گئی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سارے شر و فساد کی جڑ ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہو جائے کہ صرف اسی کو اپنا مقصد حیات بنائے تو پھر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دوسروں کی حق تلفی، قتل و غارت، عیش و عشرت یہ سب دنیا سے غیر معمولی محبت کا ثمرہ ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ دُنْیَا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ محبت سے مراد ایسی محبت ہے جس سے آخرت بھی فراموش ہو جائے۔ دین ختم ہو جائے عبادت رہ جائے خدا پرستی کے طور طریقے ناپید ہو جائیں۔ اور حالت یہ ہو جائے کہ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْیَا وہ دنیا کی تمام ظاہری چیزوں کو جانتے ہیں وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ غٰفِلُونَ مگر آخرت کے بارے میں بالکل غافل ہیں، کچھ نہیں جانتے بظاہر بڑے عقل و دانش کے مالک ہیں۔ مگر معاد کے متعلق ذرہ بھر بصیرت نہیں رکھتے۔ اسی کا نام گمراہی ہے انسان جس قدر دنیوی محبت میں گرفتار ہو گا نیکی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ کافروں کے لیے دنیا کی زندگی کو مزرین

کیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کی ایک قبیح حرکت یہ ہے۔ کہ
 اہل ایمان سے ٹھٹھا
 وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهِيَ اہل ایمان کو تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایمان
 والوں کی ظاہری کمزوری، اُن کا فقر و فاقہ دنیا داروں کے لیے ٹھٹھا بن جاتا ہے اُن
 پر آوازے کستے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَإِذَا هُمْ يَتَغَامَسُونَ
 کافر لوگ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر اشائے کرتے ہیں کہ دیکھو یہ جنت کے وارث جا
 رہے ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑے انہ زمین نہ باغات انہ سہنے کو مکان، مگر دعویٰ جنت
 کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کے دل میں محض دنیا کی محبت گھر کر چکی ہے۔ اُن کے
 لیے دنیا کے لوازمات اور آسائش ہی معیار ہے۔ اُن کے نزدیک ایسا شخص حقیر
 ہے جس کے پاس دنیا کا مال و دولت نہیں ہے اور اس ساری خرابی کی بنیادی
 وجہ یہی ہے۔

فرمایا اہل دنیا کے برخلاف وَالَّذِينَ اتَّقَوْا جو لوگ اہل تقویٰ ہیں جو دنیا
 سے بے رغبت اور آخرت پر نظر رکھتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
 وہ قیامت کے دن اہل دنیا سے بلند تر درجات پر فائز ہوں گے۔ تقویٰ۔ کفر
 شرک اور معصیت پر ہیز گاری کا نام ہے یعنی اتَّقُوا عَنِ الشُّرْكِ وَالْكَفْرِ
 وَالنِّصَاقِ وَالْعِصْيَانِ غرضیکہ عقائد و اعمال کی ہر بُرائی سے بچ جانا ہی تقویٰ ہے
 شیخ عبد القادر جیلانیؒ آیت پاک "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ"
 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہیں۔ اور جو لوگ
 ظالم ہیں، عدل و انصاف سے عاری ہیں۔ وہ متقی نہیں ہو سکتے۔

الغرض! فرمایا کہ دنیا میں تو یہ لوگ اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں مگر قیامت
 کے دن اہل ایمان ان سے بالا ہوں گے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ
 جو شخص کسی مومن سے اُس کی ناداری کی بنا پر ٹھٹھا کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت
 کے دن ایسے شخص کو تمام اولین اور آخرین کے سامنے ذلیل و رسوا کرے گا جو کوئی

شخص کسی مومن پر ایسا عیب لگاتا ہے۔ جو اس میں نہیں پایا جاتا، تو قیامت کے روز عیب لگانے والے کو آگ کے ٹیلے پر کھڑا کیا جائیگا اور کہا جائے گا کہ سب سے خود اپنی تکذیب کرو۔ میں نے اس پر جھوٹ کہا تھا۔ درحقیقت اس مرد مومن میں یہ عیب نہیں پایا جاتا تھا۔ آج تو یہ لوگ طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں اور بہتان لگاتے ہیں۔ مگر انہیں قیامت کے دن پتہ چلے گا۔ جب دنیوی زندگی میں کمزور ناتواں مومن ان پر حاوی ہوں گے اور بلند مراتب پر فائز ہوں گے۔ یہ مقام انہیں تقویٰ کی وجہ سے حاصل ہوگا۔

قرآن پاک میں متقین کا ذکر بار بار ہے۔ جیسے ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ سورة بقرہ کی ابتداء میں ہے۔ کہ یہ قرآن پاک، یہ ہدایت متقیوں کے لیے ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوا وَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ یعنی جن لوگوں کا ایمان اعمال، اور اخلاق اچھا ہے۔ جن میں تہذیب نفس پایا جاتا ہے، وہی لوگ سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں اگر ظاہری اسباب کے لحاظ سے کوئی شخص نادار اور کمزور ہے تو اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مگر کار دولت مندی اور ناداری نہیں، بلکہ ایمان، تقویٰ اور نیکی ہے۔ کیونکہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰی اللّٰهِ کے نزدیک قدر و منزلت کا معیار تقویٰ ہے۔ ایک مزدور بڑی محنت و مشقت سے اپنی روزی کھاتا ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ فرائض کو ادا کرتا ہے، تو ایک بڑے سے بڑا دولت مند اس کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ایک مالدار ایک مزدور کو حقیر سمجھے۔ یہ تو باعث لعنت ہے ایسا شخص عذاب کا مستحق ہے۔

فرمایا واللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ اللّٰهُ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ رزق کی فراوانی اللّٰهُ تعالیٰ کے مقرب ہونے کی دلیل نہیں۔ اور نہ ہی یہ اللّٰہ کی رضا کا معیار ہے۔ رزق کا بہت و کثاد مالک الملک کی مصلحت پر موقوف ہے۔ اللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ

رزق کی فراوانی

لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۖ اللَّهُ تَعَالَىٰ جِسْمِ كَافٍ رِزْقُ فَرَاخٍ كَرِيمٍ ۚ
 تنگ کر دیتا ہے۔ اس کی مصلحت کو انسان نہیں جان سکتا۔ یہ اُس کا اپنا پروگرام ہے۔
 چاہے تو کافر دنیا میں زندہ رہے پھر اس اور مومن کمزور محض ہو کر رہ جائے۔ مگر یہ ضروری
 نہیں ہے کہ ہر نافرمان دنیا میں خوشحال ہو اور ہر مومن تنگ دست ہو۔ بلکہ ”كُلًّا
 نَحْدُ“ ۱۔ ”ہو گا“ وہ سب کو دیتا ہے۔ مومن کو بھی، کافر کو بھی مگر حقیقی کمال یہ
 ہے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام اور سلف صالحین کو بلند می کیسے نصیب ہوئی
 ہے۔ یہ چیز صرف اور صرف تقویٰ کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

مال کے
 تین مصروف

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اے ابن آدم تیری زبان میرا
 مال میرا مال کہتے نہیں تھکتی۔ تو ہمیشہ مکالی مکالی کہتا رہتا ہے۔ کبھی میری دکان
 کبھی میری زمین، میرا کاروبار، میرا باغ تیرے وردِ زبان رہتا ہے۔ حالانکہ ”هَلْ
 مَالُكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ تِیرا مال وہ ہے جو تو نے کھایا۔ اَوْ لَبَسْتَ یا تو نے پہن
 لیا اور لبس کیا۔ اَوْ قَدَّمْتَ یا آگے بھیج دیا۔ اس کے علاوہ تیرا اور کوئی
 مال نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔ ”الدُّنْيَا دَارٌ ۚ مَنْ
 لَا دَارَ لَهُ ۚ یعنی دنیا تو اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ اُس کا مال ہے،
 جس کا مال نہ ہو، اور صرف دنیا کی خاطر وہی انسان جمع کرتا ہے۔ جس کی عقل نہ ہو۔
 کیونکہ صاحب عقل آخرت کی بھی فکر کرے گا۔ ایمان دار کو یہ فکر دامن گیر ہوگی۔ کہ
 آخرت کا سامان ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر کہیں خالی ہاتھ نہ رہ جائیں۔ کیونکہ بعد میں
 وہاں کون سے کہ آئیگا۔ لہذا آخرت کے لیے توشہ پہلے ہی بھیج دے۔

کس نیار دتہ پس تو پیش فرست

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ جسے چاہتا ہے۔ بغیر حساب کے روزی
 عطا کر دیتا ہے۔ اور کمالِ مدارِ ایمان اور تقویٰ ہے۔ سلف صالحین کو اسی چیز سے
 عروج حاصل ہوا۔ کافر لوگ حُبِ دنیا کی وجہ سے اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں
 حالانکہ یہی چیز خرابی کی اصل جڑ ہے۔ دنیا کو استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہے

مگر اس کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دینا۔ اور اس کی وجہ سے فرائض اور
 امور آخرت سے غافل ہو جانا یا عیش و بال ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و ہفت (۸۷)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۱۳

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنْذِرِينَ ۖ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ
بَيْنَ النَّاسِ فِيهَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ
إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنَّا بَعْدَ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا
أَبَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ
مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ ۚ (۲۱۳)

ترجمہ: سب لوگ ایک ہی امت (دین ملت) پر تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے۔
خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان نبیوں کے ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ
وہ لوگوں کے درمیان اُس بات میں فیصلہ کریں، جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور
نہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی بعد اس کے کہ ان کے
پاس واضح باتیں آچکی تھیں (یہ اختلاف کیا انہوں نے) آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔
پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت دی اپنے حکم سے جو ایمان لائے اُس بات میں
جس میں وہ اختلاف کرتے تھے حق سے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستے

کی ہدایت دیتا ہے (۲۱۳)

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی، کہ جو شخص نعمت الہی کے حصول کے
بعد اسکی تکذیب کرتا ہے، وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ جل جلالہ نے بنی اسرائیل
کا بطور مثال ذکر فرمایا، کہ ہم نے انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر اس قوم نے

ناشکر گزاری کی اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنی۔ گذشتہ درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ فتنہ و فساد کی اصل جڑ حب دنیا ہے۔ دنیا کی محبت میں گرفتار کفار اہل ایمان سے ٹٹا کر رہتے ہیں اور ان کو حقیر جانتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی کا اصل دار و مدار مال و دولت پر نہیں بلکہ تقویٰ و پیمیزگاری پر ہے۔ اہل تقویٰ قیامت کے دن اہل دنیا پر برتری حاصل کر لیں گے۔

امت واحدہ

آیت زبیر درس میں اللہ تعالیٰ نے دین و ملت کی وحدت کا تذکرہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً سب لوگ ایک ہی ملت پر تھے۔ ملت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد کے افکار و خیالات ایک جیسے ہوں۔ ملت حق بھی ہوتی ہے اور ملت باطل بھی۔ مگر اس آیت میں جس ملت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد ملت حق ہے۔

تمام لوگ ایک ہی ملت پر کب تھے۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو حاضر کر کے ان سے سوال کیا تھا۔ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ قَالُوا بَلَىٰ اے مولا کریم! کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے۔ اس وقت تمام لوگ امت واحدہ تھے یعنی ایک ہی ملت پر قائم تھے۔ اس قسم کے اشارات سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں بھی ملتے ہیں مقصد یہ کہ اس وقت تمام روحوں نے ملت واحدہ پہ ہونے کا اقرار کیا تھا تو اس دنیا میں اس سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ یہ تو بڑی نا انصافی کی بات ہے۔

اس ضمن میں مشہور تہ تشریح جو اکثر مفسرین کرام نے بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملت واحدہ کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت اوریس علیہ السلام تک کا ہے اس عرصہ میں تمام لوگ ایک ہی امت تھے اور وہ ملت واحدہ پر قائم تھے۔ ان کا دین بعینہ وہی تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہونے لگے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک ان کا دائرہ

بہت وسیع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے زمانے میں لوگوں کی وسیع پیمانے پر تطہیر ہوئی ان کی اکثریت ہلاک ہوئی اور صرف گنتی کے وہ افراد بچ گئے جو دین حق پر قائم تھے۔ کہ کشتی میں سوار ہو کہ نہ بچ جانے والوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا تک شامل نہیں تھے، کیونکہ وہ دین حق سے روگردانی کر چکے تھے۔ کشتی کے ذریعے ہلاکت سے محفوظ رہنے والے لوگ کافی عرصہ تک دین توحید اور ایمان خالص پر کاربند رہے۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آیا، جب اختلاف نے پھر زور پکڑ لیا اور امت میں غلط مطلقہ عقیدے پیدا ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امت واحدہ کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کا زمانہ ہے۔ آپ کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سچے دین پر قائم رہے۔ تا آنکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے عمر دین لکھی جسے عمر ابن قیمہ بھی کہتے ہیں۔ اُس نے عربوں میں بت پرستی کو رواج دیا۔ اس کے بعد چند صدیوں میں بت پرستی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ اللہ کا پاک گھر بیت اللہ شریف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب نبی کریم نے مکہ کو فتح کیا۔ تو اس پاک گھر کو بتوں سے پاک کیا۔ اور پھر حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں عرب کا ہر حصہ کفر و شرک کی نجاست سے پاک ہو گیا۔ یہ سب تفسیریں ملتی ہیں۔ مگر زیادہ مشہور تفسیر وہ ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔

بعثتِ انبیاء

امت واحدہ کے تذکرے کے بعد فرمایا فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ۔ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اب آیت کے ان دونوں حصوں کا ترجمہ یوں ہو گا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ملت کا دین حق پر کاربند ہونا بعثت کی علت نہیں بنتا۔ اس سلسلہ میں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے ان دو جملوں کے درمیان لفظُ فَاخْتَلَفُوا "مخدوف ہے اس لفظ کو درمیان میں لانے سے اشکال دور ہو جائے گا کیونکہ اب پورا جملہ اس طرح ہو گا کہ سب لوگ ایک ہی دین حق پر تھے۔ پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ

نے انبیاء کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا۔ جب لوگ اختلاف کی بنا پر دین سے ہٹ جاتے تھے تو اصل دین کی نشاندہی کے لیے انبیاء کو بھیجا گیا۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ تم اصل دین سے ہٹ چکے ہو، صحیح راستہ یہ ہے، اس کی طرف آؤ۔ اس بات کی مزید وضاحت سورۃ انبیاء میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے فرمایا اِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ شب معراج میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء سے دریافت فرمایا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے۔ تو سب نے یہی جواب دیا۔ بُعِثْنَا بِالسَّوْحِیْدِ مَعِیْہِمْ تَوْحِیْدٌ اِلٰہِیٌّ اَللّٰہُ اَحَدٌ۔ تاکہ لوگوں کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کر سکیں۔

فرمایا ان تمام انبیاء کی ایک صفت یہ ہے مَبَشِّرِیْنَ کہ یہ مبشرین ہیں۔ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تم اعلیٰ مقام پر فائز کیے جاؤ گے۔ خدا تعالیٰ تم پر راضی ہو گا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام و سکون حاصل ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے جو لوگ کفر شرک اور محصیت کا راستہ پکڑیں گے۔ ان کے لیے یہی پیغمبر مُذَرِّیْنَ ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں سورۃ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم حضور خاتم النبیین کو دیا قُمْ فَانْذَرْ، آپ کھڑے ہو جائیں اور ان کفار و مشرکین کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں۔ ان کو اچھی طرح خبردار کر دیں تاکہ کل کو یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس کوئی بشر یا نذیر نہیں آیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر یہ حجت پوری کر دی ہے۔ لَئِنْ یَکُوْنُ لِلنَّاسِ عَلٰی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ اَنْبِیَآءُ کَآءُنْہِمْ اَفٰیؕ بعد یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دیتے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ نبی کافر جن منصبی ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام امت تک پہنچا دے۔ علم عہدہ والوں نے نبی کی تعریف یوں کی ہے۔

ہو انسان بعثہ اللہ لتبلیغ ما اوحی اللہ الیہ۔ یعنی نبی ایک انسان

ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ تبلیغ انسانوں کو کرنا مقصود ہوتی ہے۔ لہذا نبی بھی انسانوں میں سے بھیجا جاتا ہے کوئی فرشتہ یا کسی دوسری نوع سے نہیں ہوتا۔ تاہم نبی کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول وحی کے لیے اُسے منتخب فرماتا ہے۔ نبی معصوم عن الخطا یعنی خطاؤں سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔

فرمایا انبیاء کی بعثت کے علاوہ وَأَنْزَلَ مَعَهُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ اُنْكَ سَاحِدٌ کتب سماویہ سچی کتاب بھی نازل فرمائی۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور پیغمبر بھیجے اور ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ ان میں چار بڑی کتابیں ہیں۔ زبور، تورات، انجیل، اور قرآن پاک اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں جو مختلف انبیاء پر نازل ہوئے۔ تاہم تمام کتب سماویہ کا موضوع ایک ہی تھا یعنی سچے دین کی تبلیغ اور لوگوں کو ان کی غلطیوں پر آگاہ کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری اور پھر آپ کے پیچھے آنے والے کئی ہزار پیغمبر اس کی تبلیغ و تبلیغ کرتے رہے۔ انبیاء کے ساتھ کتابوں کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ نبی تو انسان ہوتا ہے، جسے دوام حاصل نہیں۔ لہذا جب نبی اپنا کام ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی لائی ہوئی کتاب آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ نبی کا لایا ہوا علم اور اس کی شریعت کتاب کی صورت میں موجود رہتا ہے۔

فرمایا انبیاء کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ دیگر کتب سماویہ کی طرح قرآن پاک کے نزول کا مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ بوجہِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھائی ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ گویا نبی کتاب کے ذریعے اللہ کی وحی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

آگے اس امر کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اہل کتاب میں اختلاف کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ احکام الہی سے بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ اور اس میں صرف انہی لوگوں نے اختلاف کیا جنہیں کتاب دی گئی اور ان کے پاس واضح نشانات آچکے تھے اور پھر وہ آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔

آئندہ یہ اختلاف ہوئے اور اس کی وجہ ان کی خود غرضی، ضد اور حسد تھا۔ جیسا کہ یہود کے متعلق پہلے بھی آچکا ہے۔ يَعْرِفُونَ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ۔ یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے۔ مگر آپ سے اختلاف کی وجہ حسد اور من عند انفسہم محض حسد تھا کہ نبوت بنو اسماعیل میں کیوں منتقل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اپنی بدتمیزی کو قائم و دائم دیکھنا چاہتے تھے اور کسی صورت اقتدار کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے مگر یہ تو مشیتِ الہی تھی کہ ختم نبوت کا تاج حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا۔

حدیث شریف میں موجود ہے کہ قیصر روم نے زبان سے اقرار کیا تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں جن کا ذکر سابقہ کتابوں میں موجود ہے مگر وہ ایمان کی دولت سے محض اس لیے محروم رہا کہ اسکی زدا اس کے جاہ و مال اور حکومت و اقتدار پر پڑتی تھی۔ ایمان لا کر وہ اپنی بادشاہت اور مطلق العنانی کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہذا وہ کفر پر اڑا رہا۔ مقصد یہ کہ حق سے اختلاف کی وجہ اکثر و بیشتر حسد، بغض، عناد، خود غرضی وغیرہ ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات غلط فہمی کی بنا پر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اصل وجہ اختلاف وہی ہے جس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہود و نصاریٰ کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

کفر و شرک، بغض و حسد، اور حب مال و جاہ کے اندھیروں میں کہیں کہیں شمعِ ہدایت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ مالک الملک کا خاص کرم ہوتا ہے فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ط پس اللہ تعالیٰ نے

حق و باطل
میں تمیز

اہل ایمان کو اپنے حکم سے حق سے مختلف فیہ امور میں ہدایت بخشی۔ اختلافی معاملات میں ہدایت کی تلاش حضور نبی کریم ﷺ رُوف الرَّحِيم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نوافل کے دوران سجدے کی حالت میں دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ قَادِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فَيَسْمَاكَ اَلَوْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صَوَابٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اے خالق ارض و سما، اے عالم ظاہر و باطن! تو ہی مختلف فیہ امور میں اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ حق سے اختلافی معاملات میں اپنے حکم سے میری راہنمائی فرما۔ تو جسے چاہتا ہے، راہِ راست کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ ایک دعا میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا ۝ اے اللہ! ہمیں حق بات سچ کر کے دکھا اور اس کا اتباع بھی نصیب فرما۔ وَالْبَاطِلَ لَبَاطِلٌ ۝ اور باطل کو باطل کی صورت میں ہی دکھا۔ وَاِنْ زُقْتِ اِجْتَنَابُهُ اور ہمیں اس سے اجتناب کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا اور اُسے خلط ملط نہ بنا کہ کہیں ہمارے لیے حق و باطل کی تمیز ہی نہ اٹھ جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے یہاں پر بڑا عمدہ نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک ایک ہی سچا دین یعنی دینِ توحید قائم رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، جو اہل ایمان کو اطاعت اور ثواب کی بشارت دیتے تھے۔ اور اہل کفر و باطل کو عذاب سے ڈراتے تھے۔ اُن انبیاء کے ساتھ سچی کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والا نزاع دور ہو سکے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ محض ضد اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔ حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل حق کی راہنمائی فرمائی اور انہیں گمراہی اور اختلاف سے بچالیا جیسا کہ آپ کی امت کو عقیقہ و عمل میں امر حق کی تعلیم فرمائی اور اہل کتاب جیسی لواط و

تقریظ سے محفوظ رکھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی بات یہ ہے۔
کہ اللہ تعالیٰ نے جو متعدد دینی اور کتابیں بھیجیں تو ان کا مقصد لوگوں کو ہر نبی کے علیحدہ علیحدہ
فرقہ میں تبدیل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی راستہ کی طرف راہنمائی کرنا مقصود رہا ہے جب
لوگ اصل دین کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف راغب ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک اور نبی اور
کتاب بھیج کر اصل راستہ کی پہچان کر دیتا تاکہ لوگ اسی صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ
آئیں۔ اس کی مثال آپ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے لیے صحت فقط
ایک چیز ہے مگر بیماریاں لاتعداد ہیں۔ جب کسی انسان کے جسم میں کوئی ایک بیماری
پیدا ہوتی ہے۔ تو معالج اُس بیماری کے مطابق دوائی اور یہ ہمیز تجویز کرتا ہے۔ پھر دوسرا
مرض پیدا ہوتا ہے تو اس کے مطابق دوسرا علاج اور یہ ہمیز تجویز کیا جاتا ہے۔ یہی حال
امتوں کا ہے۔ جب کسی قوم میں کوئی روحانی بیماری پیدا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور
کتاب بھیج کر اس بیماری کا علاج کیا۔ پھر دوسری بیماری پیدا ہوتی تو اس کے حسبِ حال
نبی اور کتاب آئی۔ اور پھر آخر میں نبی آخر الزماں اور آخری کتاب قرآن پاک بھیج کر تمام
روحانی بیماریوں کا شافی علاج کر دیا۔ تاکہ لوگ قیامت تک پیدا ہونے والی بیماریوں
سے محفوظ رہ سکیں۔

صبرِ استقامت

حضرت مولانا شیخ الحداد فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دوسری بات یہ معلوم
ہوتی۔ کہ اہل حق کو صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ سنت اللہ۔ ابتداء سے جاری
ہے۔ کہ ہر نبی اور ہر کتاب آسمانی کی مخالفت بڑے لوگ کرتے ہیں۔ کیونکہ حق کو تسلیم
کر لینے کی زد ان ہی کے اقتدار پر پڑتی ہے نبی اور کتاب اللہ کی مخالفت ہمیشہ
انہی لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ لہذا اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ ان لوگوں کے ٹھٹھا
کرنے، بدسلوکی اور ایذا رسانی سے گھبرائیں نہیں۔ بلکہ صبر و استقامت سے ہر تکلیف
کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

ہدایتِ بانی

فرمایا انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کو بھیجنے کے باوجود ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ

میں ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وہ جسے چاہتا ہے
 راہِ راست کی طرف راہنمائی فرما دیتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت اُسی کو نصیب کرتا
 ہے جس کے اندر حصول ہدایت کی طلب اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اور جو کوئی ظلم و جفا
 پر اڑا رہتا ہے اسی کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ
 ایسے لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہیں ہوتی۔ بہر حال لِمَنْ يَّشَاءُ سے واضح ہے
 کہ ہدایت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اہل حق کو ہی حاصل
 ہوتی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہشاد و ہشت (۸۸)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۱۴ تا ۲۱۵

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ
 الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمْ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَآءُ
 وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى
 نَصُرُ اللَّهُ ۖ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا
 يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ
 وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ وَمَا تَفْعَلُوا
 مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

ترجمہ: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے پاس
 پہلے لوگوں کے سے حالات نہیں آئے۔ اُن کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ مٹر لندل
 کیے گئے، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ
 کی مدد کب آئے گی۔ فرمایا اگاہ ہو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾ آپ سے
 لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم جو کچھ بھی مال سے خرچ کرو۔ پس
 والدین کے لیے، قرابت داروں کے لیے، یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں
 کے لیے۔ اور تم جو کچھ بھی بھلائی کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے

والا ہے۔ ﴿۲۱۵﴾

گزشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ابتداء میں سب لوگ ایک
 ہی مذہب و ملت پر تھے۔ پھر جب انہوں نے دین حق سے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ
 نے سچا دین واضح کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ اختلاف

گذشتہ سورت

کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ واضح دلائل آنے کے بعد محض حسد، خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہ حق کی طرف راہنمائی فرمادی اور ان پر حق واضح کر دیا۔ کیونکہ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے جسے چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ کافر لوگ دنیا کی محبت اور غرور کی وجہ سے کمزور و ناتواں مسلمانوں کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ ان دونوں آیات کا آیت زیر درس کے ساتھ ربط ہے۔ ان کو ذہن میں رکھنے سے اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اہل ایمان کو پیش آنے والی مشکلات کی طرف اشارہ کر کے ارشاد ہو رہا ہے
 اَوْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ كَمَا تَمْلِكُ اَنْ تَكْفُرَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ
 اٹھائے اور بغیر کسی تکلیف کے تم جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ مسلمانوں کو یاد ہونا چاہیے
 کہ ان کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے واسطہ ہے منافقین ہر حالت میں ان کے نقصان
 کے درپے ہیں۔ ان پر آوازے کسے جاتے ہیں، جسمانی تکلیف دی جاتی ہیں میکان
 فقر و افلاس کے شکار ہیں۔ امراض اور دیگر پریشانیوں میں مبتلا ہیں فرمایا جو کوئی ان تمام
 مشکلات کو عبور کر کے اپنے ایمان کو سلامت لے نکلے میں کامیاب ہوگا۔ وہی
 جنت میں داخلے کا حق دار ہوگا۔ محض کلمہ پڑھ لینے سے کوئی جنت میں داخل نہیں
 ہوگا، بلکہ اس پر طرح طرح کی آزمائشیں آئیں گی، جن پر اسے پورا اتمہ نا ہوگا۔ کیونکہ اللہ
 تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ "تَبْلُوهُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" ہم خیر اور شر کے
 ذریعے تمہیں آزمائیں گے ایک اور مقام پر فرمایا "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
 وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ" ہم تمہیں ہر طرح سے آزمائیں
 گے یعنی خوف، بھوک، جان و مال اور بچلوں میں کمی کر کے آزمائش کریں گے۔ کہ ہمارا بندہ
 کس حد تک مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے حُفَّتِ الْجَنَّةُ

بِالْمَكَارِهِ یعنی جنت کی باڑ مشکلات ہیں۔ ان کو عبور کر کے ہی کوئی شخص جنت میں پہنچ سکتا ہے خُفَّتِ النَّارُ بِالسَّهْوَاتِ جہنم کی باڑ خواہشات ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے لوگ دوڑ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔ اور انہیں عبور کر کے جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ بغیر کسی مشقت کے آسانی کے ساتھ جنت میں مقام حاصل کر لو گے۔ ایسا نہیں ہے۔

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

سابقہ کی
مثالیں

وَلَمَّا يَأْتِكُم مِّثْلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ کیا تم تک پہلے لوگوں کے حالات نہیں پہنچے۔ اگر نہیں پہنچے تو ذرا ان کے حالات معلوم کر لو۔ تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ مَسْتَهْمُ الْبِاسَاءِ وَالضَّيَاءِ وَزَلْزَلُوا ان پر کیسی کیسی سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا دیے گئے۔ ان کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ تم گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام تر دشواریوں کو برداشت کرنے کے بعد وہ جنت کے حقدار ہوئے مثلاً حضرت جناب بن اریثؓ کی تکالیف کو دیکھو۔ بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے۔ کہ حضرت جنابؓ نے ان مشکلات کو کس طرح برداشت کیا۔ اور پھر کفار مکہ کی ان سزاؤں سے تنگ آکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! اَلَا تَدْعُو لَنَا کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مصائب سے نجات دلائے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا افسوس کا مقام ہے۔ کہ تم بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم سے پہلے اہل ایمان بھی گزرے ہیں جن کے سروں پر آدھ رکھ کر چیر دیا گیا۔ مگر وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ پھر ایسے لوگ بھی تھے جنہیں لوہے کے کنکھوں سے نوچ دیا گیا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ میں تم کو بتلا دینا چاہتا ہوں۔ وَاللّٰہِ لِيُتِمَّنَّ هَذَا الْأَمْرَ اللہ کی قسم یہ معاملہ پورا ہو کر رہے گا۔ تب اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور پھر امن و امان کا وہ دور دورہ ہوگا۔ کہ ایک عورت صغیرہؓ سہنا حضرت عیسیٰؑ کی بچی۔ مگر اُسے سوائے خدا تعالیٰ کے کسی چیز کا خوف نہیں ہوگا۔ انسان تو گنا

کسی بھیٹے کو بھی یہ جرأت نہ ہو گی کہ کسی بھیڑ کو کھا جائے۔

بأساً آؤ سے مراد سختی ہے۔ اور یہ اندرونی اور بیرونی ہر دو طریقے سے ہو سکتی ہے۔ جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا۔ فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اس کی تفصیل آگے آئیگی اور ضحاک و جہانی تکلیف کو کہتے ہیں جیسے بیماری آگئی۔ کوئی حادثہ پیش آگیا نہ لڑنا کا معنی ہلا دیے گئے ہے۔ یعنی پریشانی کے عالم میں اُن پر لڑہ طاری ہو گیا۔ گھبراہٹ پیدا ہو گئی یا اُن کی عزت نفس کو متزلزل کر دیا گیا، یہ سب آزمائش کی مختلف قسمیں ہیں۔ جن سے پہلے لوگوں کو گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اہل ایمان بکاہ اٹھے۔ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔

نصر الہی مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ بشریت کے تقاضے اللہ کے کامل بندوں پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اُن پر بھی دشواریاں آتی ہیں، اُن پر بھی اضطراری حالت آتی ہے۔ مگر یہ چیز اُن کے مرتبہ کمال کے منافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انبیاء بھی پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کب آئیگی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ اے میرے بند و فکر نہ کرو، اللہ کی مدد بالکل قریب ہے اور وہ پہنچنے ہی والی ہے۔ تاہم اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ صف میں اہل ایمان کو خطاب فرمایا کہ اللہ کے عذاب سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہو تو تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ و تُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین نعمتوں والی جنت میں داخل کر دے گا۔ وَأُخْرٰی تُحِبُّوْنَہَا اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ایک اور نعمت عطا کر دے گا، وہ کیا؟ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وہ اللہ کی مدد اور قریبی فتح ہو گی، جس سے تم نوازے جاؤ گے۔ غرضیکہ اللہ کی یہی وہ مدد ہے جس کے لیے اللہ کے رسول بھی ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اللہ کا ارشاد ہوتا

کہ اس کی مدد قریب ہے۔

اشاعتِ دین

جہاد کی مختلف اقسام میں سے معروف قسم جہاد باللسان یعنی تلواریں و تیر کے ساتھ جہاد ہے۔ آج کے زمانہ میں ترقی یافتہ آلاتِ حرب، ہندوق، پستول، بم، میزائل، ٹینک توپ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ جن کے ذریعے دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ تاہم جہاد کی ایک نہایت اعلیٰ قسم اشاعتِ دین ہے۔ جسے ”جَاهِدْهُمْ بِالْجِهَادِ كَبِيرٍ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ بڑا جہاد و کمرہ یں۔ اور وہ جہاد نیکی کو پھیلانا اور بُرائی کو روکنا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اشاعتِ دین جیسے اہم فریضہ جہاد پر مامور کیا ہے۔ جس کے لیے میں شب و روز مصروف کار ہوں۔

اشاعتِ علمِ دین کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ ان میں ایک معروف صورت تالیف و تصنیف ہے۔ ائمہ دین نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش اور محنت کی ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح کی تدوین پر سولہ سال صرف کر کے جہاد فی اشاعتِ علم کا حق ادا کر دیا۔ امام مسلمؒ نے پندرہ سال کے عرصہ میں ذخیرہ حدیث میں سے صحیح مسلم کو جمع کیا۔ مفسرینِ کرام نے قرآنِ پاک کی تفاسیر لکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ نے اپنے اپنے شعبہ میں دین کی خدمت انجام دی۔ الغرض تبلیغِ دین کے کسی بھی شعبہ کو حقیر نہیں جانا چاہیے۔ اشاعتِ دین کے ہر کارکن کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اہل ایمان کے لیے تبلیغِ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو تبلیغِ دین کا کام کرے، لوگوں کو نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے روکے خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے: ”بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ حکم آپ آگے پہنچا دیں۔ ”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ“ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو سمجھا جائے گا

کہ آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔

ساتویں صدی ہجری تک کا زمانہ مسلمانوں کا سنہری زمانہ شمار ہوتا ہے۔ تبلیغ دین، فتوحات، سیاسیات، معاشیات سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ علمی کام جس قدر انجام پایا ہے۔ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے محدثین، مفسرین، حفاظ اور فقہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اشاعت دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بعد مسلمانوں پر انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں خال خال ہی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے کما حقہ اشاعت دین کا کام کیا۔ لہذا اس زمانے میں اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

جانی اور
مالی جہاد

جہاد میں مال اور جان دونوں چیزیں لگانا پڑتی ہیں۔ پہلے ذکر آچکا ہے۔ کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو "يَا مَوَالِدُكُمْ وَأَنْفُسُكُمْ" تاہم نیت اصلاح کی ہونی چاہیے۔ آگے اصلاح کے دو پہلو ہیں یعنی اصلاح نفس اور اصلاح عالم۔ اپنے نفس کی اصلاح اس لیے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر انسان خطیۃ القدس کا ممبر بن کر علیین میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصلاح عالم بدیں وجہ لازم ہے۔ کہ اس کے بغیر فتنہ و فساد کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

مال کا ایک بہترین مصرف اشاعت اسلام ہے۔ انحطاط کے اس زمانہ میں اہل ثروت اس میں کتنا خرچ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی دولت آج عیش پرستی پر خرچ ہو رہی ہے۔ حضور علیہ السلام نے ممانعت فرمائی ہے۔ فرمایا "فَإِنْ عِبَادَ اللَّهِ لِيَسْأُوا بِالْمُتَنَعِّمِينَ" یعنی اللہ کے بندے عیش پسند نہیں ہو سکتے۔ عیش پرستی تو کفار کا شیوہ ہے۔ مسلمان کی دولت تو امور خیر پر خرچ ہونی چاہیے۔ مگر افسوس کا مقام ہے۔ آج مسلمان عمارت اور ان کی تزئین پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا ہے۔ کھیل تماشے اور لہو و لعب کو اولیت دی جا رہی ہے۔ مگر جہاد کی مدت سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ اشاعت دین کا بھڑا بہت کام جو

ہو رہا ہے۔ وہ بزرگانِ دین کے خلوص کا نتیجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ ورنہ موجودہ زمانے میں کتنے لوگ ہیں جو اس طرف توجہ دے رہے ہیں اَللّٰہُ مَا شَاءَ اللّٰہُ۔

مجاہد ضروری

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے، جنہیں بغیر حساب کتاب کے بخش دیا جائے گا۔ تو یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آزمائشوں میں پورا اُتدنا کس حد تک ضروری رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ مجاہدہ کے بغیر بخشش نہیں ہے۔ البتہ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے تو مجاہدہ اور بھی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے قریب تمام لوگوں کو امتحانات سے گزرنا پڑا، تب ان کو بلند مرتبہ حاصل ہوئے۔ مگر کوئی عام مسلمان بھی مجاہدہ سے خالی نہیں ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی جب ایمان لاتا ہے، تو اُسے کم از کم اپنے نفس اور شیطان کے خلاف تو مجاہدہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے کہ نیکی کی طرف راغب ہو اور بُرائی سے اجتناب کرے۔ اور یہی چیز شیطان پر شائق گزرتی ہے۔ جب شیطان اُس مومن کی نیکی میں آڑے آتا ہے۔ تو اُس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے "وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا" ہر شخص کے لیے اُس کے عمل کے مطابق درجات ہیں۔ مگر مجاہدہ سے مبرا کوئی بھی نہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وضو کرتے اور نماز ادا کرتے کے لیے بھی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، یہی مجاہدہ ہے۔ پھر جتنا بڑا مجاہدہ کوئی کرے گا، اتنا بڑا اعزاز پائے گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن یہ نہ سمجھیں کہ بغیر آزمائش کے جنت میں چلے جائیں گے حالانکہ پہلے لوگوں کو بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں تب جا کر وہ جنت کے حقدار ہوئے۔

خرچ کی مدت
(۱) والدین

یہاں پر دوسرا مسئلہ خرچ کی مختلف مدت کے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔ یہاں پر بھی سوال عام نوعیت کا ہے

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اس بات کا جواب دیتے ہیں قُلْ اَبْنَاهُ يُسَبِّحُ، مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ تَمَّ جَوْ كُفَّهِ بَیْ اُنْهَ مَالٍ سَ خَرَجَ كَرُو۔ فَلِلْوَالِدَيْنِ یہ تمہارے والدین کے لیے ہے۔ خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اس سے مراد مال ہے۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا اِنَّ ذَ لِحَبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ النّٰن مَالِ كِی مَحَبَّتِ مِیْنِ بَہْتِ سَخْتِ ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ کسی پوچھنے والے نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَبَتْ مِیْنِ كَسْ كِی سَا تَہْ نِیْ كِی رُو۔ رَحْمَتِ الْعَالَمِیْنِ نَیْ فَرَمَا اُھَا كِی عِنِّیْ اِیْنِیْ مَالِ كِی سَا تَہْ بَہْتِ سَلُوْ كِی رُو۔ سَوَالِ كِی نَیْ مَالِ Kِی تِیْنِ دَفْعَہٗ دَرِیَا فِتْ كِیَا اور آپ نے ہر بار یہی جواب دیا چوتھی دفعہ پوچھنے پر فرمایا اَبَا Kِی عِنِّیْ اِیْنِیْ بَا P كِی سَا تَہْ حَسَنِ سَلُوْ Kِی رُو۔ بِمَقْصَدِیْہِ كِی مَالِ خَرِیْجِ كِی نَیْ كِی مَعَالِمِیْنِ وَالِدِیْنِ كِی اَوَّلِیَّتِ رُو۔ اِن كِی خَدْمَتِ كِی رُو۔ وَہ سَبْ كِی زِیَادَہٗ مَسْتَحَقِّ ہِیْنِ۔ ہَاں یَہْ بَا T ذَمِّہْنِ مِیْنِ ہِے۔ كِی زَكَاوٰةٗ كَا مَالِ نَہْ اَوَّلَادِ وَالِدِیْنِ پَہْ خَرِیْجِ كِی سَكْتِ ہِے۔ اور نہ والدین اولاد کو دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ جو مال ہے۔ اس کے سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں۔ البتہ یہ استحقاق مشروط ہے۔ اگر والدین محتاج ہیں۔ تو پھر اُن پر خرچ کہنا فرض ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خود صاحب مال ہیں۔ تو پھر مالی خدمت فرض نہیں رہتی۔ البتہ اُن کی جانی خدمت کرے۔ مسمیٰ چا پی کے ذریعے اُن کو راحت پہنچائے یا اچھی بات کہے کہ اُن کا دل بہلائے۔ تمام سابقہ شرائع اور خود ہماری شریعت مطہرہ کا قانون ہی ہے۔ کہ بِاَلْوَالِدِیْنِ اِحْسَانًا وَالِدِیْنِ كِی سَا تَہْ اِحْسَانِ كِی رُو

(۴۱)
اقربا

خرچ کی دوسری مد فرمایا وَالْاَقْرَبِیْنِ قَرَابَتِ دَارُوں پَہْ خَرِیْجِ كِی رُو۔ اگر کسی صاحب ثروت آدمی کے قریبی عزیز رشتہ دار امداد کے مستحق ہیں، تو ان کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَالْاَقْرَبِیْنِ حَقُّہٗ اِیْنِیْ قَرَابَتِ دَارُوں

کو اُن کا حق ادا کرو۔ اس کا فلسفہ یہ بیان فرمایا اَتَوْهُم مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اٰتٰکُمْ جو مال تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے۔ اُس میں سے دو۔ اور یہ اسی طرح مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا رہتا ہے، جیسے کسی کو وراثت میں حصہ مل گیا، کسی کو تجارت میں نفع حاصل ہوا، کسی کا ذریعہ ملازمت بن گیا، کسی کو کھیتی باڑی، کسی کو محنت مزدوری کے ذریعے مال حاصل ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مختلف ذرائع سے جو مال تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے اپنے قرابت داروں پر خرچ کرو۔ اتفاق مال کی یہ بھی ایک مد ہے۔

(۳)
یتیم و مسکین

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ اور یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو۔ اس مادی جہاں میں یتیم وہ ہے جس کے سر پر اس کا سرپرست نہ ہو۔ والد فوت ہو جائے ذرائع آمدن نہ ہوں انسان بے سہارا ہو جائے ایسے فرد کی دشگیری ضروری ہے اور مسکین وہ ہے جو محنت اور کوشش کے باوجود اپنے ضروری اخراجات پورے کرنے کے قابل نہ ہو۔ ایسے شخص زکوٰۃ کے حقدار بھی ہیں۔ اِنَّمَّا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰکِیْنِ۔ لہذا صدقات و خیرات کا حقدار وہ شخص ہے، جو محنت مزدوری کرنے کے باوجود اپنے بچوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔ وہ بیچارے مناسب لباس اور معقول خوراک سے محروم ہیں۔ اُن کی صحت اور تعلیم کی ضروریات ہیں۔ سر چھپانے کے لیے انہیں بھی مکان درکار ہے۔ مگر اُن کا سرپرست یہ ضروریات کا حق پوری نہیں کرتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ یہی وہ بنیادی ضروریات ہیں۔ جن کو پیش کرتے ہیں یورپ و امریکہ والے فخر کرتے ہیں۔ اور ان کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ دراصل یہ چارہ ٹہ تو قرآن و سنت کا مقررہ کردہ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم تو یہاں سے ملتی ہے۔ یہ منشور ہمیں بتاتا ہے کہ ہر انسان کو کم از کم اتنی تعلیم تو حاصل ہونی چاہیے جس کے ذریعے وہ اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہو سکے اور پھر ان کی ادائیگی کے لیے کوشش کرے

وَابْنِ السَّبِیْلِ اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے مسافروں کی خدمت کا بھی حکم دیا، مسافروں پر خرچ کرنا بھی تمہارے مال کے مصارف ہیں ایک یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اس معاملہ میں کسی پارٹی یا گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ کہ یہ ہماری پارٹی کا ہے۔

(۴)
مسافر

اور وہ تمہارے گروہ کا ہے بلکہ ہمارا تو شمار یہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَلْيُكْرِمْ
صَیْفَتُهُ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت
کرے۔ اور مسافر مہمان ہوتا ہے۔ اور مہمان کے متعلق حکم ہے کہ ایک دن تک
اسکی خوب خاطر تواضع کرو اور تین دن تک ضیافت۔ اگر تین دن کے بعد بھی اسکی
خدمت کرو گے تو وہ صدقہ میں شمار ہوگا۔

اسلامی معاشرہ

الغرض! اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کمزوروں اور محتاجوں
کی اعانت کی جائے تاکہ وہ سوسائٹی میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے
ان مدت پر مال صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ بہ خلاف اس کے غیر ضروری اور ناجائز
کاموں پر خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اسے اسراف سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے دیواروں پر پڑے لٹکانے اور تصاویر اورینٹل کرنے کا حکم تو نہیں دیا۔ باجے گاہنے
اور عیاشی و فحاشی سے منع فرمایا ہے۔ بلکہ محتاج و ناقواں کی دست گیری کا حکم دیا ہے۔
صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے دور کا مطالعہ کریں کہ وہ غریب طبقوں کی کس طرح
مدد کرتے تھے۔ ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے احساس تک کو مجروح
ہونے سے بچاتے تھے۔ ان کی ضرورت خفیہ طریقے سے ان کے گھروں پر پہنچا
دیتے تھے۔ اسلامی سوسائٹی کا معیار تو یہ ہے۔ انسانیت کا مقام تو اس طرح بلند ہوتا
مگر آج ہمارا شیوہ یہ ہے کہ گھر سے پڑے کو اٹھانے کی بجائے اُسے بالکل ختم کرنے
کے لیے ہیں۔ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی سوسائٹی
کے اصولوں سے لاعلمی ہے۔ کفر و شرک اور بدعات پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہاسل
رسومات پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر دوسروں کا خون
چوسا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے مستحقین کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے
والدین کو گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ قرابت داروں سے عناد ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے
تو کوئی پروا نہیں انٹرکانٹیننٹل میں داد عیش دے رہے ہیں۔ غریب کے پاس دوائی لانے
کے لیے پیسے نہیں مگر امیر بلا ضرورت اپنے نفس پر خرچ کر رہا ہے۔

فرمایا وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ تم نیکی کا جو کام بھی
 کرو، اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔ وہ تمہاری نیت تک کو جانتا ہے۔
 لہذا وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا پورا پورا اجر عطا کرتا ہے۔ لہذا لازم ہے
 کہ اسی کے عطا کردہ مال کو اس کی رضا کی خاطر خرچ کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر لو۔
 اس سے بہتر سودا کیا ہو سکتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ
 تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ
 تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
 لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ
 قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَمَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ
 بِالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ
 وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى
 يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ
 مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ
 حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ
 هَاجَرُوا وَجْهَهُدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ
 رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

ترجمہ: تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے۔ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ اور شاید کہ
 تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو،
 اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۶﴾
 آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے
 حرمت کے مہینے میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے
 روکنا اور اُس کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا۔ اور اُس کے اہل کو

دہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ یہ کافر لوگ ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کو طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر مر جائے گا، اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والا ہے۔ پس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۱۷) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جہنوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۱۸)

گزشتہ سے
پیوستہ

گزشتہ دروس میں مال کے مصارف کا بیان تھا۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا کہ لوگ اپنا مال کن امور پر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھیجا کہ مال خرچ کرتے وقت سب سے پہلے والدین، پھر قرابت داروں پھر یتیموں اور مسکینوں اور اس کے بعد مسافروں کو پیش نظر رکھیں۔ تاہم کلیہ کے طور پر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ نیکی کا جو بھی کام انجام دیا جائے، اللہ تعالیٰ اسکو جانتا ہے اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب ہے تو اسے سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ پھر صدقات واجبہ کا حکم آتا ہے۔ اس کے بعد نفعی صدقات پر خرچ کرے جسکے لیے صاحبِ نصاب ہونا ضروری نہیں۔ البتہ اجر و ثواب کی خاطر اچھی سے اچھی چیز خرچ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز راہِ خدا میں صرف نہ کرو نیکی کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ الفاق فی سبیل اللہ سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا نفس بخل جیسی رذیل خصلت سے پاک ہوتا ہے۔ اور یہ شخص بارگاہِ رب العزت میں پیش ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس

سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتا ہے۔ غرابو
مساکین کی اعانت بحیثیت مجموعی انسانیت کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔
لہذا کسی مستحق کی مالی مدد سے بنی نوع انسان کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔

جہاد اور قتال
میں مشرق

دین کی خاطر بعض اوقات مال سے بڑھ کر جان کی بازی بھی لگانی پڑتی
ہے۔ اس کو قتال کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاد عام لفظ ہے۔ اور اس سے
مراد اقامت دین کے لیے ہر قسم کی جدوجہد ہے۔ جس میں قتال بھی شامل
ہے۔ مگر قتال سے مراد راہ خدا میں لڑائی کے ذریعے جان پیش کرنا ہے
جب کوئی شخص دشمن کے مقابلہ میں آتا ہے۔ تو پھر اس بات کی پروا
نہیں کرتا کہ اس کی جان سلامت رہتی ہے یا نہیں۔ یہ قتال ہے۔ اسی لیے
فرمایا جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
مال بھی صرف کرو اور بنفس نفیس خود بھی میدان جنگ میں کود پڑو۔ ابو داؤد و ترمذی
کی روایت میں تین چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ جَاهِدُوا وَالْكَفَّارَ بِأَمْوَالِكُمْ
وَأَنْفُسِكُمْ وَالسِّنَّاءَ لَعْنَةُ اللَّهِ لِمَنْ جَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
کے دین کو زبانی طور پر لوگوں تک پہنچانا، ان کے شکوک و شبہات کو زبان
کے ذریعے دُور کرنا دین کی خوبیوں کو زبان کے ساتھ اجاگر کرنا، یہ بھی جہاد میں
شامل ہے۔ چنانچہ یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ دُشْمَنُكُمْ
ساتھ لڑائی تم پر فرض کی گئی ہے۔ قتال کی فرضیت بعض دوسرے مقامات پر بھی
بیان ہوئی ہے۔ سورۃ حج میں فرمایا اِذْ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَالِمُونَ
مظلوم مسلمان جن کے ساتھ کفار لڑائی کرتے ہیں۔ اب انہیں بھی اجازت ہے
کہ وہ کفار کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔

فرض عین اور
فرض کفایہ

یہاں پر لفظ کُتِبَ سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال ہر شخص پر لازم ہے
جیسے رمضان المبارک کے متعلق آیا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ فَمَنْ
فرض کیے گئے ہیں ظاہر ہے کہ روزوں کی فرضیت ہر مرد و زن کے لیے

ہے اسی طرح یہاں پر ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تَمَّ بِقِتَالِ فِرْعَوْنَ كَمَا
 گیا ہے۔ مگر قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات سے اور خود حضور علیہ السلام
 کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ جہاد اور قتال کے فرض ہونے کی دو صورتیں
 ہیں یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔ فرض عین، فرض کی وہ صورت ہوتی ہے۔ جس سے
 کوئی مسلمان مرد و زن مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے اگر دشمن کا اس
 قدر غلبہ ہو کہ ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی خدمات کی ضرورت
 ہے۔ تو پھر ہر ایک پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ سب کو شامل ہونا ہو گا۔ اگر کوئی
 اعراض کرے گا، تو گنہگار ہو گا۔ ایسی حالت میں اولاد کے لیے والدین کی اجازت
 کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر فرد بلا چون و چرا جنگ میں کود پڑے گا۔ البتہ عام
 حالات میں قتال کا فریضہ فرض کفایہ کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ جب جنگ
 کے لیے فوجی جوان کافی ہوں۔ اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں اور بوقت ضرورت
 دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے ہوں۔ تو ایسی صورت میں صرف ان خاص مجاہدین
 کا شریک جنگ ہونا ہی تمام مسلمانوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اور یہ فرض
 کفایہ ہو گا۔ ہر ایک کا قتال میں شامل ہونا ضروری نہیں ہو گا۔ بالکل اسی طرح جس
 طرح میت کا جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ جب بعض لوگ جنازے میں شامل
 ہو جائیں۔ تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی بھی شریک نہ
 ہو کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔

عام حالات میں اگر جہاد کے لیے جانا ہو، تو والدین کی اجازت ضروری
 ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہوتا ہے۔ جبکہ
 جہاد میں شمولیت فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک
 شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور! میں جہاد میں شریک ہوتا
 چاہتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کیا تیرے ماں باپ موجود ہیں۔ عرض کی ہاں
 فرمایا پھر والدین کی خدمت کر۔ تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ یاد ہے کہ

والدین کی خدمت اُس وقت فرض عین ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا اُن کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو۔

خیر و شر اللہ کے علم میں ہے

یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے وَهُوَ كَرِهٌ لَّكُمْ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ یہاں پر ناگوار گزرنے یا برداشت کرنے سے مراد طبعاً بُرا لگنا ہے۔ کیونکہ عقلاً تو کسی بھی حکم الہی کو کوئی مومن بُرا نہیں کہہ سکتا۔ البتہ طبیعت کے لحاظ سے ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کو کوئی چیز اچھی محسوس نہ ہو کیونکہ خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا انسان پیدا ہی کمزور کیا گیا ہے۔ اور یہ بعض بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل کے لحاظ سے ہر مسلمان ہر حکم الہی پر اہمیت و صدقنا ہی کہے گا۔ چاہے اُس کا فائدہ ہو یا نقصان۔ کدو؟ مشقت والی چیز کو کہتے ہیں جو شاق گزے۔ دوسرے مقام پر عورت کے حمل کے متعلق آتا ہے۔ حَمَاتِهِنَّ أُمَّهِنَّ كَرِهًا و وَضَعَتْهُ كَرِهًا ماں بچے کو پیٹ میں بڑی شقت سے اٹھاتی ہے۔ اور پھر اُسے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ جنم دیتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے ماں کا بڑا حق رکھا ہے۔

فرمایا بعض چیزوں کا ناگوار گزرنا انسان کی ظاہرِ طبیعت پر منحصر ہے۔ مَكْرَ حَقِيقَتِ اللَّهِ ہی کے علم میں ہے۔ کیونکہ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار جانو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو وَعَسَى أَنْ تَحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔

غالب اور مغلوب

جان کی بازی لگا کر دشمن کے ساتھ جنگ لڑنا کوئی معمولی بات نہیں اور اس کا طبیعت پر ناگوار گزرنا بھی طبعی ہے۔ مگر اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا جو قومیں اتنی آرام طلب ہو جائیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں، وہ جلد یا بدیر مغلوب ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ دشمن غالب آئیگا اور پھر جان مال، عزت و آبرو ہر چیز چھین جائے گی۔ حتیٰ کہ نرن و فرزند کی

بیخسرتی تک ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہوگا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض کر کے مسلمان کو مشقت میں نہیں ڈالا۔ بلکہ اسے بدترین نتائج سے بچا کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی قوم غالب آتی ہے۔ تو مغلوب قوم کو کس طرح پامال کرتی ہے۔ جب تاتاری غالب آئے تو انہوں نے ایک کروڑ مسلمانوں کو تیغ کر دیا۔ تمام کتب خانے جلا دیے، عورتوں اور بچوں تک کو معاف نہیں کیا۔ اسی طرح جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو کون سا ظلم ہے جو یہاں کے باشندوں پر نہیں کیا۔ جی ٹی روڈ پر ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔ ان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب عیسائیوں نے اندلس (سپین) پر حملہ کیا تو وہاں دو کروڑ کی تعداد میں مسلمان تھے۔ مگر جب وہ غالب آئے تو مسلمانوں کی تعداد صرف گیارہ ہزار رہ گئی تھی۔ باقیوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا۔ یا مرتد کر لیا گیا۔ یہ بلخ اور بخارا کا زمانہ تو قریب کا زمانہ ہے۔ صرف بخارا شہر میں چار سو مسجدیں تھیں۔ بے شمار دینی مدارس تھے۔ مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ فرمایا جنگ کے حکم کو خوش دلی سے قبول کرو۔ تمہاری نظر صرف ظاہر پر ہے۔ مگر درحقیقت وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر کام کے نتیجے سے وہی واقف ہے تم اس کی اصلیت کو نہیں جانتے

حرمت والے
مہینے

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لڑائی فرض کی ہے۔ مگر اگلی آیت میں حرمت والے مہینوں کے دوران جنگ کے جواز یا عدم جواز کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ یعنی اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ إِنَّ مَهِينُوا فِيهِ جُنُودًا ان مہینوں میں جنگ کرنا کیسا ہے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ فَقِتَالٍ فِيهِ کہیں یعنی ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا سخت گناہ ہے۔ اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرمت والے مہینے کون سے ہیں جن کے دوران لڑائی ممنوع ہے۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد

فرمایا ہے۔ "إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" یعنی اللہ کے
 ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے "مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ" ان میں چار مہینے حرمت
 لئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں، رجب، ذی قعد، ذی الحج اور محرم۔ ملت ابراہیمی میں یہ
 بات مسلم تھی کہ ان چار مہینوں میں لڑائی قطعاً جائز نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین
 بھی اس کی پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ان مہینوں میں ہتھیار ڈال دیتے تھے
 کوئی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ کسی قافلے کو نہیں لٹتے تھے۔ بعض کہتے ہیں
 کہ حضور علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور بعض اصحاب
 کہتے ہیں کہ یہ حکم مطلقاً منسوخ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی تاکید میں بھی ہو گئی ہے۔
 اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان مہینوں میں مسلمان خود لڑائی کی ابتداء نہ کریں
 اور اگر دشمن جنگ شروع کرے، تو پھر اس کا جواب دیا جائے۔

شان نزول

دوسرا سوال شان نزول کا ہے کہ یہ آیت کس موقع پر نازل ہوئی۔ اور لوگوں
 نے یہ سوال کیوں اٹھایا۔ محمد بن اسحاق کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام
 نے غزوہ بدر سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں کفار کے ایک
 تجارتی قافلے کو پکڑنے کے لیے ایک جماعت کو بھیجا۔ آپ نے امیر جماعت
 کو ایک خط لکھ دیا۔ اور ساتھ حکم دیا کہ مسلسل دو دن سفر کرنے کے بعد اس
 خط کو کھول کر پڑھنا اور پھر اس میں مندرج ہدایات کے مطابق عمل کرنا۔ اس حکم
 کی تعمیل میں دو دن بعد جب خط کھول کر پڑھا گیا۔ تو اس میں لکھا تھا کہ قلال
 قافلہ کو گرفتار کر لو۔ اس کو کسی صورت میں جلے نہیں دینا۔ یہ دن جمادی الاخری
 کے آخری دن تھا۔ امیر لشکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ رجب حرمت والا مہینہ
 شروع ہونے والا ہے لہذا اس سے پہلے پہلے قافلے کو پکڑ لینا چاہیے۔
 چنانچہ اپنے حباب سے انہوں نے جمادی الاخری کی تیس تاریخ کو کفار کے
 قافلے پر حملہ کر دیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ باقی قید ہوئے۔ سامان بھی ہاتھ آگیا۔
 لہذا لشکر واپس آگیا۔

درحقیقت حملہ کرنے کی تاریخ جہادی الاخری کی تیس تاریخ نہیں تھی۔ بلکہ حبیب کی پہلی تھی، جو کہ حرمت والا مہینہ ہے۔ لہذا مشرکوں کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر اپنے آپ کو ملت ابداہیم کے متبع کہتے ہیں۔ مگر حرمت والے مہینہ کا بھی خیال نہیں کیا۔ قافلے پر حملہ کیا ہے۔ آدمی مارا گیا ہے اور قافلے کو جمع سامان گرفتار کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا کیسا ہے۔

حرام فعل اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو آپ فرمائیے کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے۔ تاہم جس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا گیا تھا۔ وہ تو غلطی سے ہوا تھا۔ مسلمان سمجھے کہ ابھی رجب کا مہینہ شروع نہیں ہوا۔ لہذا حملہ آور ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مزید جواب یہ دیا۔ کہ مسلمانوں سے تو یہ خلاف ورزی خطا ہوئی۔ مگر کفار و مشرکین اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ خود کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فرمایا بے شک حرمت والے مہینوں میں لڑائی حرام ہے مگر وَصَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكَفَرًا بِهِ اللہ کے رستے سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا بھی تو سخت گناہ ہے وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور مسجد حرام سے روکنا بھی بڑا گناہ ہے۔ وَإِخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ اور وہاں کے رہنے والوں کو مسجد حرام سے نکالنا بھی اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے فرمایا اے کفار و مشرکین تم یہ لوگ مسلمانوں سے کہتے ہو کیا یہ کوئی کم گناہ ہے جو تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تم جس مسجد سے مسلمانوں کو نکال رہے ہو تم خود اس کے اہل نہیں ہو۔ إِنْ أُولَئِكَ إِلَّا الْمُتَفَقِّحُونَ اس کے اہل تو صرف متفق ہیں اور وہ مسلمان ہیں فرمایا یاد رکھو، وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ یہ فتنہ بڑا کفر و قتل سے بھی بڑا گناہ ہے مسلمانوں سے تو بھول کر ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے مگر تم انہیں بیت اللہ شریف سے روک کر اور انہیں ہجرت پر مجبور کر کے فتنہ پیدا کر رہے ہو، تمہارا کفر اور شرک پر اڑے رہنا بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی غلطی معمولی چیز ہے

مرتہ اور اس
کی سزا

اس کے بعد فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ واقعہ تو کفار کو بہانہ کے طور پر مل گیا بحقیقت
یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے
حتیٰ یُذَوِّكُمْ عَنْ دِينِكُمْ اِنْ اَسْتَطَاعُوا اِیْہَاں تک کہ اگر استطاعت رکھیں
تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ اُن کا مقصد تمہیں اپنے سابقہ دین پر واپس لانا
ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق بھی دو کمرے مقام پر فرمایا کہ اُن کا بھی یہی مقصد ہے
”وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَہُودُ وَلَا النَّصَارٰی“ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں
ہوں گے حتیٰ تَبِيعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ کا دین اختیار نہ کر لیں (معاذ اللہ)
گویا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھو۔
وَمَنْ تَبِعَ دِیْنًا عَنْ دِیْنِہِ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر
جائے گا۔ فِیْمَتْ وَہُوَ کَافِرٌ اور کفر کی حالت میں مرجائے گا فَاُولٰٓئِکَ
حَبِطَتْ اَعْمَالُہُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ سو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و
آخرت دونوں جگہ پر ضائع ہو جائیں گے جو کوئی سچے دین اسلام کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی
ہو گیا۔ کافر یا مرتد ہو گیا۔ اس کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو گئیں۔
دنیا میں اعمال ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مرتد
شخص کی سابقہ نمازیں، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ سب ضائع ہو گئے۔ اسے
اِنْ نِیکِیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا سب ضائع ہو گئیں۔ جب تک کہ وہ دوبارہ ایمان
نہ لے آئے۔ علاوہ ازیں مرتد آدمی قوم و ملت کا غدار ہے۔ اور غدار کی سزا قتل ہے
حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ کَبَلَ دِیْنًا فَاَقْتُلُوْہُ جو دین تبدیل
کرے تا ہے۔ وہ واجب القتل ہے۔ البتہ اس کا طریق کار یہ ہے۔ کہ تین دن
تک اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اس سے توبہ
کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر یہ کوشش باہر آور نہ ہو سکے۔ اور مرتد
دوبارہ مسلمان ہونے پر آمادہ نہ ہو۔ تو اسے سزائے موت دے دی جائے یہ شخص
دین کی توہین کا مرتکب ہوا ہے۔ اور معافی کا حقدار نہیں۔

اشتراکی ممالک میں ان کے آئین کی توہین کرنے والا شخص موت کی سزا پاتا ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق جیسا ایمری کے بیٹے نے جنگ کے دوران غداری کی تو اسے سولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کسی نے آواز نہیں اٹھائی کہ ان کے وزیر کے بیٹے کو سزائے موت کیوں دی گئی۔

موت کے بعد مرتد کی سزا یہ ہے۔ کہ نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ مرتد اپنے مسلمان مورث کی وراثت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو دنیا میں اس کے اعمال کا ضیاع ہے۔ اور آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ابدی جہنمی ہے۔ اسے کبھی دوزخ سے رہائی نہیں ہوگی مرتد اصل کافر سے بھی بڑا مجرم ہے۔ کافر سے تو جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے مگر مرتد سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا۔ امام اعظمؒ کے فتویٰ کے مطابق اگر عورت مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تاسرگ قید میں ڈال دیا جائے گا۔ اگر توبہ کر لے تو آزاد ہو جائے گی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ۔ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ اور هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

کفار و مشرکین اور مرتدین کی مذمت کے بعد اہل ایمان کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَجَوَّجُوا بِآيَاتِ اللَّهِ اور جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کی۔ نہ صرف وطن کو چھوڑا بلکہ مَنْ هَاجَرَ مانتھی اللہ عنہ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چیزوں سے منہ موڑ لیا کہ یہ ہجرت بہت بڑا عمل ہے۔ إِنَّ شَانَ الْهَاجِرَةِ لَعَظِيمٌ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے دین کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جس نے ایسا کر لیا وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ واللہ عفویم رحیم اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے وہ نیچے کاروں کو پورا پورا اجر دے گا۔

اہل ایمان کے
لیے خوشخبری

سَيَقُولُ ۲

درس نور (۹۰)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْ
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ط وَيَسْأَلُونَكَ
مَاذَا يَنْفِقُونَ ه قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ
الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط

ترجمہ: لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ کہ دیجئے
ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ
ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔
آپ کہ دیجئے، جو زائد ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات بیان کرتا ہے۔ تاکہ
تم فکر کرو ﴿۲۱۹﴾ دنیا اور آخرت کے بارے میں

گزشتہ درس میں جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت بیان کی گئی تھی رحمت
دارے مبینوں میں لڑائی سے منع کیا گیا تھا۔ کفار کی خصلت بیان ہوئی۔ کہ وہ مسلمانوں کو
برہکا کر دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے رہیں گے نیز فرمایا کہ جو شخص مرتد
ہو گیا، اس کی دنیا اور آخرت ہر دو برباد ہو گئیں۔ اس کے بعد ایمان، ہجرت اور
جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی گئی کہ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔
اور ان کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

اس سے پہلے درس میں مال خرچ کرنے کا قانون بیان ہوا تھا۔ اور الفاظ
کی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ اس کا بیان آگے بھی آئے گا۔ گویا یہ حصول مال کے
ذرائع اور خرچ کی مدت کا مفصل تذکرہ ہے۔

اس آیت میں شراب اور جوئے کے فوائد و نقصانات اور ان کی حرمت کا
موضوع آیات

بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمَسِ اے نبی
 علیہ السلام! آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ ان کی
 کیا حیثیت ہے۔ جائزہ ہیں یا ناجائز، حرام ہیں یا مباح، ان میں فائدہ ہے یا
 نقصان۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قُلْ آبُ كَمَا دِيحِي فِيهِمَا
اِثْمُ كِبِيرٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے
 تاہم لوگوں کے لیے بعض فوائد بھی ہیں۔ مگر ایک بات ہے۔ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ
مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا گناہ، ان کے فوائد سے بہت بڑا ہے۔ مقصد یہ کہ ان برہمی
 چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

شراب نوشی

خمر نشہ آور چیز کہتے ہیں۔ مَا خَاصَّ الْعَقْلَ جو کہ عقل کو ڈھانپ لے
 انسان کو بے عقل بنا دے۔ عام طور پر یہ لفظ شراب پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ نشہ آور
 اشیا میں شراب سرفہرست ہے۔ اس قبیلہ چیز کے متعلق دو حکم وارد ہوتے
 ہیں، ایک اس کے استعمال پر پابندی اور دوسرے اس کے ذریعے حصولِ زہر
 یعنی تجارت کی ممانعت۔ اس کے نقصانات تو واضح ہیں۔ کہ انسان کو بے خود
 بنا دیتی ہے۔ جس میں انسان گالی گلوچ بکھتا ہے۔ فَرَأَى سے محروم
 رہ جاتا ہے۔ ذہن ماؤف ہوتا ہے۔ اور پھر مال کا ضیاع بھی ہے۔ نشہ کی لت
 میں انسان قتل و زنا جیسے کبیرہ گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے۔

شراب کے فوائد کے ضمن میں عربوں میں مشہور تھا کہ یہ انسانی ذہن کو جلا
 بخشتی ہے، دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان میں قیاضی کی صفت پیدا
 ہوتی ہے۔ عرب لوگ شراب کو کرم کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے حضور نے
 ایسے نام سے منع فرمایا۔ اور ارشاد کیا۔ کہ مومن کا دل تو کرم ہو سکتا ہے۔ شراب
 نہیں ہو سکتی۔ فرمایا، اس ام النجاست کو عنیب یا جلمہ کہو، جن چیزوں سے یہ کشیدہ
 کی جاتی ہے۔ عرب شراب نوشی کو شرفیاء فعل قرار دیتے تھے۔ کہ اس کی وجہ سے
 قیاضی پیدا ہوتی ہے۔ اور جو شخص شراب کی محفل میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اُسے

کم تر خیال کرتے تھے۔ غرضیکہ شراب اور جوا عام تھے۔ کوئی خال خال ہی ان سے بچتا تھا۔ وگرنہ جس طرح اونٹ، گھوڑا، تلوار، لڑائی عربوں کی گھٹی میں پڑے تھے اسی طرح شراب اور جوا بھی ان کا عام مشغلہ تھا۔

قمار بازی

میسسی، جوا یا قمار بازی کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ یسر ہے اور یسر آسانی کو کہتے ہیں۔ قمار بازی کے ذریعے کوئی شخص بغیر محنت و مشقت، صنعت و تجارت یا مزدوری و ملازمت دوسرے کے مال پر قبضہ کر لیتا۔ اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں جوئے کی یہی خباثت ہے۔ کہ اس میں ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جس شخص کا داؤ چل گیا۔ اُسے بغیر کچھ کیے کرائے مال حاصل ہو گیا۔ اور دوسرا شخص بیٹھ بٹھائے بلا وجہ محروم ہو گیا پھر جس شخص کو مال مل جاتا ہے۔ وہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور اُسے عیش و عشرت اور برائی کے کاموں میں صرف کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے معصیت کا شکار ہوتا ہے۔ دولت بھی ضائع کرتا ہے۔ اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ عربوں میں باقی خباثت کی طرح جوئے کی وبا بھی عام تھی۔ وہ قمار بازی کو اچھا فعل سمجھتے تھے۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں جوئے میں شدت پید ہو جاتی تھی۔ اور قمار بازی سے حاصل کردہ مال غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

نزول قرآن کے زمانہ میں قمار بازی اس قدر عروج پر تھی۔ کہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مجسموں کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر پکڑائے ہوئے تھے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہ جلیل القدر پیغمبر بھی جوا کھیلا کرتے تھے (العیاذ باللہ) بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام ان مجسموں کے قریب سے گزے تو فرمایا، ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو، اللہ کے پاک بندوں کی نسبت کیسی ناپاک چیزوں کی طرف کرتے ہیں۔ حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ایسے شنیع کام سے کیا سروکار۔

جوئے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ قحط کے زمانے میں عموماً یہ طریقہ

اختیار کرتے تھے۔ کہ دس آدمی مل کر مساوی حصہ سے ایک اونٹ خرید لیتے تھے اُن کے پاس دس تیر ہوتے تھے۔ جن پہ ایک سے لے کر سات تک نمبر لکھے ہوتے تھے۔ اور باقی تین تیر خالی ہوتے تھے۔ اب اُن دس تیروں میں سے کسی ایک حصہ دار کے نام سے تیر نکالتے تھے۔ اور پھر جس نمبر والا تیر اُس نام پر نکلتا تھا۔ اونٹ کے گوشت کے اتنے ہی حصے وہ اکیلا لے جاتا تھا۔ اُس کے بعد حسب ضرورت دوسرا اور تیسرا تیر نکالا جاتا، حتیٰ کہ اونٹ کا سارا گوشت ختم ہو جاتا۔ اور جو حصے دار باقی بچ جاتے وہ اپنے حصے سے محروم رہ جاتے۔ اسی طرح اگر ابتداء میں کسی کے نام خالی تیر نکل آتا، تو وہ بھی اپنے حصے سے محروم رہ جاتا اور اگلے نمبر والا اپنا حصہ وصول کرنا اعلیٰ ہذا القیاس۔ جب ایک اونٹ کا گوشت تقسیم ہو جاتا تو محروم ہونے والے دعوت دیتے کہ ایک اور اونٹ خریداجائے اور اس کے پھر اسی طرح حصے بکھرے کر لیے جاتے۔ یہ گوشت چونکہ غربائیں تقسیم کیا جاتا تھا اس لیے اس قمار بازی کو بھی وہ لوگ باعث فضیلت سمجھتے۔ موجودہ زمانے میں گھڑوٹ لاٹری، انعامی یکمیں وغیرہ سب جوئے کی مختلف اقسام ہیں۔ جو مختلف ناموں سے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہر قسم کی قمار بازی حرام ہے۔

حرمت شراب
کے مراحل

شراب بیک حکم حرام نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی حرمت آہستہ آہستہ بتدریج ہوئی ہے۔ اس کے احکام مختلف مواقع پر نازل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ چوتھے مرحلہ پر اس کو قطعی حرام قرار دے دیا گیا ابتداء اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں اشارتاً پھلوں کا ذکر کیا اور فرمایا تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَوًا وَرِزْقًا حَسَنًا تم ان سے نشہ آور اشیا مثلاً شراب وغیرہ بناتے ہو اور اچھا رزق یعنی چٹنی، لپار، مربے وغیرہ بھی بنا لیتے ہو۔ یہاں پر علت و حرمت کا ذکر تو نہیں ہے۔ مگر نشہ آور اشیا کو رِزْقًا حَسَنًا (اچھی روزی) سے علیحدہ کر کے اُسے حکم نہ قرار دیا۔

دوسرے نمبر پر اس درس والی آیت نازل ہوئی۔ کہ آپ سے شراب اور

جوتے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدہ بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے فوائد سے بڑا ہے۔ یہاں پر حرمت شراب کا قطعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ فوائد کی نسبت اس کا نقصان بہت بڑا ہے۔ ابو علی ابن سینا کے قول کے مطابق شراب میں نقصان اس کے فائدے سے ڈبل ہے۔ یعنی اس کے ذریعے فائدہ تو ایک حصہ ہوتا ہے۔ مگر نقصان دوحصے کے برابر ہے۔

حرمت شراب سے متعلق تیسرے حکم کے پس منظر میں ایک واقعہ پیش آیا ایک انصاری کے ہاں بعض صحابہ کرامؓ کی دعوت تھی۔ ان میں حضرت سعدؓ بھی تھے۔ جو عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ صحابہؓ نے کھانا کھایا۔ چونکہ اُس وقت تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی، لہذا اس کا دور بھی چلا۔ آپس میں کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ انصار زیادہ اچھے ہیں۔ دوسرا گروہ مہاجرین کے حق میں تھا۔ آپس میں دوست اور رشتہ تھے، محض ایک دوسرے کی بدترہی کا ذکر ہو رہا تھا اتنے میں ایک نوجوان کو غصہ آیا، اُس نے طیش میں آکر ایک جبرٹا حضرت سعدؓ کے سر پر دے مارا، جس سے وہ زخمی ہو گئے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ کہ ایک دعوت میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ بھی شامل تھے۔ چونکہ ابھی تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اکثر لوگ پیتے تھے، مگر بعض نہیں بھی پیتے تھے۔ جیسے حضور علیہ السلام نے کبھی شراب نہیں پی۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور عثمانؓ بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے، ایسے اصحاب اسے وفار کے منافی سمجھتے تھے۔ اسے استعمال کرنے والوں میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ وغیرہم تھے۔ کہ ایک چیز مباح ہے لہذا استعمال کرنے میں کوئی عرج نہیں۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے شراب پی رکھی تھی۔ ایک صحابی کو امامت کے لیے آگے کر دیا گیا۔ نشے کی حالت میں

قرآن پاک غلط پڑھا۔ اسی طرح مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت ولیدؓ امامت کرا رہے تھے۔ نشے کا زور تھا دو رکعت پڑھا کر کہنے لگے اور پڑھا دوں۔ ایسے ہی واقعات کے پیش نظر سورۃ نازلہ کی آیت نازل ہوئی۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ" یعنی اے اہل ایمان نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تمہارے ہوش و حواس بحال ہو جائیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ گویا تیسرے نمبر پر نشے کی حالت میں نماز سے روک دیا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس معاملے میں اکثر تشویش رہتی تھی۔ اور وہ دعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ بَيْنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيْنًا شَافِيًا یعنی اے مولا کریم! ایشائے کناہ سے تو شراب کی قباحت محسوس ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے لیے کوئی واضح حکم نازل فرما، چنانچہ اب چوتھے مرحلے میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی، جس میں شراب اور بعض دیگر اشیاء کو قطعی حرام قرار دیا گیا۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ۔ اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا، تھان اور پانے شیطان کے ناپاک کام ہیں۔ ان سے بچ جاؤ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد شراب قطعی حرام ہو گئی تو یہ چار مراحل تھے جن کے ذریعے شراب کو بتدریج حرام قرار دیا گیا۔

بعض نئی روشنی کے لوگ شراب کی حرمت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض دوسری حرام چیزوں کی طرح اس پر حرمت کا واضح حکم نہیں لگایا گیا۔ جیسے مردار، خون وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكَ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ" مگر اس آیت میں لفظ "فَاجْتَنِبُوهُ" آیا ہے۔ یعنی اس سے اجتناب کرو، بچ جاؤ حالانکہ اگلی ہی آیت میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی

حرمت شراب
پر تاویلیں

اور بغض ڈالنا چاہتا ہے۔ فَانْتَهُوا اِیْسَ اِنْ چیزوں سے باز آ جاؤ۔ لہذا یہ بھی قطعی حرمت کا حکم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور خمر دو مختلف چیزیں ہیں۔ شراب ہر پینے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ سورۃ دھر میں موجود ہے "وَسَقُھُوْا رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا" جنتیوں کو ان کا رب پاک شراب پلائے گا۔ مگر وہ نشہ سے خالی ہوگی اور خمر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ اور وہ حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کُلُّ مُسْکِرٍ خَمْرٌ ہر نشہ آور چیز شراب کے زمرے میں آتی ہے۔ وَکُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اس لحاظ سے بھنگ، چرس، گانجا اور شراب کی تمام اقسام حرام ہیں۔ خواہ وہ معمولی درجہ کی ہوں یا اعلیٰ درجہ کی۔ انگور سے کشید کردہ ہوں یا کھجور سے۔ شہد سے بنی ہوں یا گندم یا جو سے وہ بہر حال حرام ہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی علامہ سید محمود آلوسی بغدادی شاہ عبدالعزیزؒ کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے تیس جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کا جال لکھتے ہیں کہ لوگوں نے عجیب روش اختیار کر لی۔ شراب کو مختلف ناموں سے پکار کر استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں۔ کسی نے عرق اکیر نام رکھ لیا ہے۔ اور کوئی اسے آب جو کہتا ہے۔ مگر نام بدلنے سے ایک حرام چیز حلال نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ حرمت شراب کے متعلق اگر کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ تو وہ صرف مذہب اسلام ہے۔ سر ولیم میور ہندوستان میں صوبجات متحدہ کا گورنر رہا ہے۔ بڑا متعصب عیسائی پادری تھا اس نے دو جلدوں میں حضور علیہ السلام کی سوانح حیات لکھی ہے۔ جس کا نام ہے لائف آف محمد (LIFE OF MUHAMMAD) مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ دو چیزیں انسانیت کی دشمن ہیں۔ ایک محمدؐ کی تلوار

اور دوسرے محمد کا قرآن۔ مگر اس کو تسلیم کرنا پڑا کہ شراب کی حرمت کے متعلق اسلام کے سوا کوئی مذہب کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعثِ فخر ہے کہ انہوں نے شراب جیسی قبیح چیز کو واضح طور پر حرام قرار دیا اور بڑی حد تک اس سے محفوظ ہے۔

حرام چیز کی
تجارت بھی
حرام ہے

بہر حال سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت نازل ہونے پر شراب حرام ہو گئی۔ اور صحابہ کرامؓ نے کلی طور پر اس کو ترک کر دیا۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَأَمْسَهَا ۖ يَعْنِي شَرِبَ پینے والا، پلانے والا، سچوڑنے والا، بنانے والا، اٹھا کر لے جانے والا، اس کو بیچنے والا اور اس کی کھائی کھانے والا سب لعنتی ہیں۔ پھر آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان کیا کہ جس خداوند تعالیٰ نے شراب پینے سے منع فرمایا ہے۔ اُسی خدا نے اس کی تجارت سے بھی منع کر دی ہے گویا ہر حرام شے کی تجارت بھی حرام ہے یہود حرام ہے، اس کی لین دین بھی حرام ہے۔ اسی طرح بتوں کی تجارت حرام ہے مردار کی چربی کا بھی یہی حکم ہے۔ مگر اس زمانے میں سوائے سعودی عرب کے تمام اسلامی ممالک میں شراب استعمال ہوتی ہے۔ اس کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس جاری ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں پابندی کا نام سنتے ہیں۔ وہ بھی زبانی حکم تک ہے عملی طور پر مختلف حیلوں بہانوں سے اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

خرچ کی
مقدار

آگے خرچ کے متعلق سوال اور اس کا جواب ہے وَ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں۔ یہ سوال گزشتہ سے پیوستہ درس میں بھی آچکا ہے۔ وہاں پہ اس کا جواب دیا گیا تھا۔ کہ فلاں فلاں مد پر خرچ کریں۔ مگر اس آیت کے جواب میں ہے۔ قُلِ الْعَفْوَ ۚ آپ کہ دیجئے جو اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ خرچ کر دیں۔ گویا اس سوال کا متعلق خرچ کی مقدار سے ہے۔ یہاں یہ ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاجت سے زائد سب کچھ خرچ کر دینا فرض، واجب وغیرہ کی کس مد میں آئے گا۔ تو

اس کا جواب یہ ہے کہ خرچ جس مذکے لیے کیا جائے گا، اس کا شمار اسی میں ہوگا مثلاً اگر زکوٰۃ ادا کی گئی ہے تو اس مذکے خرچ فرض ہوگا۔ اگر صدقہ فطر ادا کیا ہے یا کسی اور واجب پر خرچ کیا ہوگا۔ تو واجب شمار ہوگا۔ اسی طرح نقلی امور کا خرچ نقل شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام میں خرچ کیا گیا ہے تو ایسا خرچ بھی مباح ہوگا، اگر محض ثواب کی نیت ہے، تو خرچ کنندہ کو ثواب حاصل ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر کسی معصیت والے کام پر خرچ کر دیا ہے، تو ایسا خرچ حرام شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام پر خرچ کیا ہے مگر ثواب کی نیت نہیں کی۔ تو ایسا خرچ جائز تصور ہوگا۔

چونکہ اس آیت میں ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض واجب کے متعلق نہیں کیونکہ زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار تو مقرر ہے۔ مگر یہاں ہر زائد چیز کے خرچ کرنے کا حکم ہے تو اس سے مراد صدقہ خیرات اور دیگر نقلی اخراجات ہیں۔ بہر حال اس آیت سے ایک بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اپنی ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے زائد مال کو خرچ کر دے۔ اگر خود اپنے لیے، اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات موجود ہیں۔ اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا، تو مت خرچ کر دے۔ پہلے اپنی ضروریات پوری کر دے، اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر حق تلفی نہ کر دے۔ ہاں بعض خاص شخصیات ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ جن میں صبر کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے تو ایسے شخص اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ مگر جو شخص صبر کے اس مرتبہ پر نہ ہو، اسے اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر خرچ کرنا ہوگا۔

ذخیرہ اندوزی
کی ممانعت

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ ذخیرہ اندوزی درست نہیں ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ یا بَنِ آدَمَ اِنْ تَمَسَّكَ شَيْئًا مِّنْ اَمْرِكَ بِيَمِيْنِكَ، اگر چیز کو روک رکھو گے تو یہ تمہارے لیے شر ہوگا۔ اور اگر زائد حصہ کو خرچ کر دو گے، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ وَلَا تُلَاحِظْ عَلَى كِفَافٍ اور اگر آمد و خرچ برابر ہیں۔ تو پھر زائد نہ

خرچ کرنے پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص فرض ادا نہیں کرتا تو وہ عند اللہ
ماخوذ ہوگا، اور اگر فرض کی ادائیگی کے بعد روک رکھا ہے۔ تو ثواب سے محروم ہو
گیا۔ اگر ضرورت سے زائد موجود ہے مگر خرچ نہیں کرتا، تو بخل کا مادہ پیدا ہوگا،
ثواب سے محروم ہوگا۔ اور شر بہر حال ہوگا۔

غور و فکر
کی دعوت

فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْآٰيٰتِ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے
لیے احکام بیان کرتا ہے۔ یہاں پر آیات سے مراد احکام ہیں لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کرو، فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ دنیا اور آخرت
کے بارے میں۔ دنیا محل حوائج ہے۔ یہاں پر رہ کر انسان ضرورتوں اور حاجتوں پر
درماندہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی لحاظ رکھو۔ اور آخرت تو ثواب دائمی کا محل ہے
اس کا بھی خیال رکھو۔ مقصد یہ ہے کہ دنیوی اور آخری دونوں ضروریات کو
ذہن میں رکھو۔ نہ یہاں محروم رہو اور نہ وہاں، بلکہ ہر دو مقامات کے لیے لوازمات
مہیا کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ نہ ہاتھ کو زیادہ کھلا رکھو کہ خود محتاج ہو
جاؤ اور نہ اتنا سیکڑ کر رکھو کہ بخیل شمار ہو۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی جائز ضروریات
پوری کرو اور اس کے بعد مال کو روک کر نہ رکھو۔ بلکہ غریبوں اور محتاجوں کو بھی انکا حق ادا کر دو۔
جائز ضروریات میں انسان کے بنیادی اخراجات ہیں، جیسے کھانا، پینا، لباس
صحت، تعلیم، رہائش وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں پر خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اگر
ریڈیو، ٹیلیوژن، کھیل تماشہ کو بھی بنیادی ضروریات میں شمار کر لیا جائے، تو پھر انسان
کے پاس کبھی کچھ نہیں بچے گا۔ یہ سامان تعیش ہے اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اس زمانہ
میں مکانوں کی بلا ضرورت زیبائش، ان میں قیمتی سے قیمتی فرینچر، پڑے، قالین، فرج
وغیرہ سب بلا ضرورت ہیں۔ اور ان اشیاء پر خرچ کرنا بلا جواز اور محتاجوں کی حق تلفی
کے مترادف ہے۔ اور اگر اس دنیا میں سب کچھ اپنی ذات پر ہی خرچ کر جاؤ، تو پھر آخرت
میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات کا خیال رکھو
یہاں پر بھی جائز ضروریات سے محروم نہ رہو، اور آخرت کے لیے بھی توشہ تیار کر دو۔

سَيَقُولُ ۲

درس نود و یک (۹۱)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۰ بقیہ

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ طَوَّانٌ
تَخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَا غَنَتُكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ②۲۰

ترجمہ :- اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے، انکی اصلاح کہہ فی ان کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے خرابی پیدا کرنے والے کو سنوارنے والے سے۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بیشک اللہ کمال قوت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ ②۲۰

گزشتہ
پوسٹ

اس سے پہلی آیات میں شراب اور جوئے نیز خرچ کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات تھے۔ پورے قرآن پاک میں کل بارہ یا تیرہ مقامات ایسے ہیں۔ جن میں اس قسم کے سوالات کا ذکر ہے۔ یعنی لوگ آپ سے فلاں سوال کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بالعموم اہل ایمان ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے۔ بکثرت سوال کرنے کی بجائے اصحاب رسول آپ کی بات کو نہایت غور سے سنتے تھے اور پھر اس پر عمل شروع کر دیتے تھے۔ حضور علیہ السلام دین کی ضروری باتیں خود بخود بیان فرما دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس قسم کے سوالات کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔

گزشتہ درس میں شراب کی حرمت کے مختلف مراحل کا تذکرہ ہو چکا ہے

کہ یہ غنیت چیز کس طرح بتدریج حرام قرار دی گئی۔ اُس آیت میں تو شراب کے فوائد و نقصانات کا ذکر تھا۔ اس کی قطعی حرمت سورۃ مادہ والی آیت کے ذریعہ ہوئی۔ اسی طرح جوئے کو بھی اسی آیت نے حرام قرار دیا۔ سابقہ آیت میں دوسرے سوال اخراجات کے متعلق تھا کہ لوگ آپسے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اس کا جواب یہ تھا۔۔۔۔۔ کہ چونکہ دنیا دار الحوائج ہے اس لیے اپنی جائز ضروریات

کو پیش نظر رکھ کر جو باقی بچ جائے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اگر زائد مال کو روک رکھو گے تو شرک کا باعث ہوگا۔ ایک شخص کو کہیں سے سونے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ میں اسے صدقہ کرنا ہوں آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور سونے کو پھینک دیا۔ آپ نے تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ کوئی شخص ایسی حرکت نہ کرے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے۔ صدقہ کر دیتا ہے۔ اور پھر محتاج ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ صبر بھی نہیں کر سکتا مقصد یہ کہ اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر زائد مال خرچ کر دو گویا دنیا و آخرت ہر دو مقامات کو پیش نظر رکھ کر خرچ کر دو تاکہ تمہیں اس دنیا میں بھی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور آخرت کے لیے بھی سامان کر سکو۔ عاصم ابن ابی النخوع کی روایت میں آتا ہے کہ مومن آدمی کو دونوں باتوں کی فکر ہوتی ہے۔ هم المعاد وهم المعاش اس کو آخرت کی بھی فکر ہوتی ہے اور دنیا میں رزق حلال کی جستجو بھی۔

شان نزول آیت زیر درس میں یہ تیسرا سوال یتیموں کے متعلق اٹھایا گیا ہے وَكَيْسُلُونَكَ
عَنِ الْيَتَامَىٰ اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں دراصل یتیموں کے مال کی حفاظت کے متعلق قرآن پاک میں بہت سی آیات نازل ہوئیں۔ عرب کے لوگ عام طور پر یتیموں کا مال غصب کر جاتے تھے۔ اُن کے متولی بن کر اُن کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے اور پھر جیلے بہانے سے اُن کا مال ناجائز طور پر ہضم کر جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ایک احکام نازل فرمائے مَثَلًا وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ یعنی سوائے احسن طریقہ کے یتیم کے مال

کے قریب نہ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْْوَالَ الْیَتٰمٰی
ظُلْمًا اِنَّہُمْ یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہُمْ نَارًا یعنی جو لوگ ظلم کے ذریعے
یتیموں کا مال کھاتے ہیں، دراصل وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

ان آیات کے نزول پر صحابہ کرام یتیموں کے مال کے متعلق بڑے محتاط
ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اُن کی آمدنی اور خرچ اپنے سے بالکل علیحدہ کر دیا۔
مقصود یہ تھا کہ ملا کر کھانے پینے سے کہیں یتیم کے مال کا کوئی لقمہ سوا بھی
ہمارے پیٹ میں نہ چلا جائے۔ جس کی وجہ سے قابل مواخذہ ٹھہریں۔ ایسا کرنے
سے وقت پیش آئی کہ بعض اوقات یتیم کا مال ضائع ہو جاتا تھا۔ مثلاً یتیم کے لیے
علیحدہ سالن روٹی وغیرہ پکائی گئی ہے۔

اُس نے پورا کھانا

نہیں کھایا اور وہ بچ گیا ہے۔ تو یتیم کا بچا ہوا کھانا وعید خداوندی کے پیش نظر خود
نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے وہ خراب ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں
میں صحابہ کرام یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے جو اس درس میں بیان ہوا ہے۔

یتیم کی سرپرستی

یَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال
کرتے ہیں کہ ان کا مال آپس میں ملا کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یا وہ بالکل الگ
تھلک بنے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا قُلْ اٰپ
دِیَجَبْرِ اَصْلَاحٌ لِّہُمْ خَیْرٌ اُن کے متعلق اصلاح کا کام ہی بہر حال بہتر ہے
یعنی یتیموں کی بھلائی ہر حالت میں مقصود ہونی چاہیے۔ اگر اُن کا آمد و خرچ بالکل علیحدہ
رکھنا اُن کے لیے بہتر ہے۔ تو ایسا کر لو۔ اور اگر اپنے ساتھ ملا لینا اُن کے حق میں
جاتا ہے۔ تو انہیں ساتھ ملانے کی بھی اجازت ہے۔ اس میں سہولت یہ ہوگی کہ
اگر کسی یتیم نے کسی ایک وقت میں مشترکہ کھانے میں سے کھانا استعمال نہیں
کیا۔ تو وہ اس کے سرپرست استعمال کر لیں گے۔ اور اگلے دن یتیم اپنے سرپرست
کا کھانا کھائے گا۔ اور اس طرح یتیم کا مال ضائع نہیں ہوگا۔

ایک امریکی مصنف رابرٹس نے اپنی کتاب "سوشل لاز آف دی قرآن"

SOCTAL LAWS OF THE QURAN میں لکھا ہے کہ دیکھو حضرت محمد صلی

اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یتیموں کی پرورش، اُن کی نگرانی اور رعایت، کارکن قدر خیال رکھا گیا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات

کی برتری کا ثبوت ہے۔ کمزوروں کی دلداری کی تاکید جس قدر اسلام نے کی ہے کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے یتیم، مسکین، مسافر، یتیم، یتیم، یتیم کے ساتھ حسن سلوک اور اُن کی خدمت کا زبردست حکم دیا ہے بلکہ اُس سوسائٹی کو ملعون قرار دیا ہے جس سوسائٹی میں کمزور طبقوں پر ظلم و زیادتی کی جاتی ہو۔ جو لوگ بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے والے ہوتے ہیں فرمایا یتیموں کی ہر حالت میں خیر خواہی چاہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے

مفسدہ اور
مصلح

لیے انہیں الگ رکھو یا ساتھ ملاؤ، یہ تم پر منحصر ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھو کہ تم جو بھی فیصلہ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری یتیموں کو جانتا ہے۔ کہ تم نے یہ فیصلہ نیک نیتی سے کیا ہے۔ یا بد نیتی سے۔ اس فیصلہ سے فساد مراد ہے یا اصلاح کا پتہ۔ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اللہ تعالیٰ فساد لیوں اور اصلاح کنندگان سب کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ تم جو بھی یتیموں کے متعلق فیصلہ کرتے ہو۔ وہ کس نیت کے ساتھ کرتے ہو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ اے مولا کریم إِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِبَةً الْأَعْيُنُ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ تو آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔ جو کوئی یتیموں کے متعلق بُری نیت سے معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے ایسا شخص اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم تمہاری آسانی کے لیے دیا ہے۔ کہ چاہو تو الگ رکھو یا چاہو تو ساتھ ملاؤ۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَا عُنْتُكُمْ وَكَرِهَ اللّٰهُ جَاهِلًا تَوْتَمِيں مشقت میں ڈال دیتا۔ اور حکم دیتا کہ یتیموں کا خرچ لازماً علیحدہ رکھو، پھر تمہارے

لیے معیار یہ پورا اثر نامشکل ہو جاتا اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسانی پیدا فرما
 دی ہے۔ کہ وہ کام کرو جس میں یتیموں کی بھلائی مقصود ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ
 بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور کمال قوت کا مالک ہے۔ وہ حکم ہے۔ وہ
 انسانوں کی مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے۔ جو
 انسانوں کی مصلحت کے خلاف ہو۔ لہذا اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے یتیموں
 کے ساتھ بہتر سلوک روارکھو۔

سَيَقُولُ ۲

درس نور و دور (۹۲)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۱

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ تُؤْمِنَ وَلَا مِمَّنْ مُؤْمِنَةٌ
 خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ
 حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ
 أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
 بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۚ

ترجمہ: اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں
 البتہ ایک ایماندار لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو کتنی اچھی معلوم
 ہو۔ اور نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا مشرکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ وہ ایمان لے
 آئیں۔ البتہ ایک ایماندار غلام مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھا معلوم ہو
 یہ لوگ (مشرک) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے، جنت
 اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بیان کرتا ہے اپنے احکام لوگوں کے

لیے، تاکہ وہ نصیحت قبول کر لیں (۲۲۱)

ربط آیات

گزشتہ آیت میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان تھا۔ کہ ان کے
 ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیئے، جو ان کے حق میں بہتر ہو۔ اور ان کی اصلاح مقصود
 ہو، ان کو کھانے میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے یتیمہ کے طور
 پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یتیموں
 کے متعلق تمہارا فیصلہ اصلاح پر مبنی ہے یا فساد پر۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یتیموں
 کو اپنے ساتھ ملانے کی اجازت دے کر تم پر مہربانی فرمائی ہے ورنہ تم مشقت
 میں پڑ جاتے۔

مشرکین سے
نکاح کی ممانعت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح جیسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور حکم دیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ يُوْمِنَ مَشْرُک عورتوں سے نکاح نہ کر دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ نکاح محبت اور رافت کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں اور بیوی کے درمیان شفقت و محبت کو پیدا فرمایا ہے اگرچہ نفسانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں مگر اصل جو ہر الفت و محبت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ”وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً“ ہم نے ان کے درمیان رافت و رحمت کے جذبے کو پیدا کیا۔ لہذا اس پاکیزہ رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ میاں بیوی ہم عقیدہ و ہم خیال ہوں ورنہ اس رشتہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کر دو۔ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور پھر دلیل کے طور پر فرمایا وَلَا مَآئِمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ایک مومنہ لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اَکْمَرِچہ مشرکہ عورت تمہیں کتنی اچھی لگے۔ معاشرے میں لونڈی کی حیثیت آزاد عورت کی نسبت کم تر ہے۔ مشرکہ اگرچہ آزاد ہو، مالدار ہو، حسن و جمال میں بھی خوب ہو، اس کے باوجود ایک مومنہ لونڈی اللہ کے ہاں بہتر ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت اور حسن بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب مشرکہ کا دین الگ ہوگا، عقیدہ غلط ہوگا، تو میاں بیوی کی راہیں جدا جدا ہوں گی اور ان میں رافت و محبت کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ جو نکاح کی غرض و غایت ہے۔ لہذا مومنوں کو منع فرما دیا کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

آگے مومنہ عورتوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوا ان کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کر دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ جس طرح مومن مردوں سے مشرکہ عورتوں کا نکاح جائز نہیں، اسی طرح مومن عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح درست نہیں۔ آگے دلیل کے طور پر فرمایا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ایک مومن غلام مشرک

آزاد مرد سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعَجَبَكُمْ اَگرچہ تمہیں مشرک بھلا معلوم ہو۔ یعنی مالدار ہو، صحت مند ہو، اور شکل و صورت میں بھی پسندیدہ ہو، مگر مشرک ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیونکہ عقیدے کی خرابی کی وجہ سے میاں بیوی کا نباہ ممکن نہیں نیز قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا اِنَّ الْمَشْرِكِيْنَ يَحْسَبُوْنَ كَيْدًا عَظِيْمًا مشرکین ناپاک ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ غلط ہے شرک کی غلاطی اس کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، جو کہ میاں بیوی کے مقدس رشتہ کے منافی ہے۔ لہذا نکاح کے لیے ایمان دار مرد کو تلاش کر دو، جس کا عقیدہ درست ہو، اگرچہ وہ کم تر حیثیت کا مالک ہو۔

مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی امتوں میں مومن مرد اور مشرک عورت یا مومنہ عورت اور مشرک مرد کا نکاح جائز تھا۔ نکاح کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں مشرک اور کافرہ تھیں۔ خود قرآن پاک نے گواہی دی ہے "كَانَتْ اَنْتَ اَخْتٌ عِبْدٍ ذِيْ ذُرِّيَةٍ دُوْنِكَ بَنُوْنَ" کے نکاح میں تھیں، مگر ان کا عقیدہ فاسد تھا۔ اب شریعت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا کہ نہ مومن مرد مشرک عورت سے نکاح کرے اور نہ مومنہ عورت مشرک مرد کے عقد میں جائے یہاں تک کہ مشرکین ایمان لے آئیں۔ ایسی صورت میں نکاح جائز ہو گا۔

ارتداد ناقض
نکاح ہے

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد اگر کوئی مرد یا عورت مشرک ہو جائے یا مرتد ہو جائے۔ تو اس نکاح کی کیا حیثیت ہوگی جو بحیثیت مومن مرد اور مومنہ عورت ہوا تھا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اگر مرد مشرک ہو گیا ہے یا دہریہ ہو گیا ہے۔ تو عورت اس کے مرتد ہونے کے وقت سے آزاد ہو جائیگی۔ البتہ نکاح ثانی کے لیے اُسے عدت گزارنا ہوگی۔ اگر عورت کو حیض آتے ہیں تو اسکی عدت تین حیض ہیں۔ اگر حیض نہیں آتے تو تین ماہ عدت گزارے گی اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ عدت پوری کرنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

شرک کیا ہے

شرک کی تعریف میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرماتے

ہیں شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت یا اسکی کسی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے مَوْکَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مَّحِيطًا یعنی اس کا علم ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ہستی کا علم بھی ہر شے پر محیط ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم ہونا اللہ کی صفت مختصہ ہے۔ اور اس میں غیر اللہ کی شرکت شرک ہے۔ اس زمانہ میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر یا فلاں بزرگ یا پیغمبر علیہ السلام کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ یہی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت خاصہ قادر مطلق ہونا ہے۔ "وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" گویا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہذا وہ جو چاہے کر سکتا ہے اب اگر یہی صفت کسی غیر اللہ میں ثابت کی جائے کہ فلاں بھی جو چاہے کر سکتا ہے تو ایسا اعتقاد رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی خاص صفت اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اسی طرح "وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" ہے۔ ہر چیز اللہ کی نگہبانی میں ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر یہی صفت کسی دوسرے میں مانی جائے تو شرک کا ارتکاب ہو گیا۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت میں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی حلال و حرام کرنے کی مجاز ہے۔ تو ایسا شخص بھی خدا تعالیٰ کی صفت مختصہ میں شرک کا مرتکب ہوا۔ اس کی مثال اہل کتاب کی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ اہل کتاب کے علماء جس چیز کو حلال قرار دیں وہ اُن کے نزدیک حلال ہے۔ اور جس کو حرام کہ دیں، اس کو حرام مان لیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ اسی طرح جو تعظیم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا سجدہ کرنا، اگر ایسی ہی تعظیم یا سجدہ کسی غیر اللہ کے لیے کیا جائے، تو شرک میں داخل ہو گا۔ مولانا شیخ الحداد فرماتے ہیں کہ علم یا قدرت یا کسی دیگر صفت خداوندی میں

کسی غیر کو خدا کا مماثل سمجھنا، خدا کے مثل کسی کی تعظیم کہنا، یا کسی کو مختار سمجھ کر اس سے حاجت طلب کرنا، ان تمام صورتوں میں ایسا عقیدہ رکھنے والا یا ایسا عمل کرنے والا مشرک تصور ہو گا۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین ایسا ہی کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے شرک کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ جب تک مشرک سچے دل سے توبہ نہ کرے، یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اسی لیے میاں یا بیوی میں کوئی ایک بھی شرک کا مرتکب ہو گا تو ان کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اہل کتاب عورتوں
سے نکاح جائز ہے

البتہ ایک اور مسئلہ یہاں پر قابل بیان ہے بعض دوسری آیات سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ ”وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْيَهُودِ اَوْ ثَوَّالِكِتٰبٍ مِنْ قَبْلِكَ“ اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتا ہے۔ جب کہ زوجین اپنے اپنے دین پر قائم رہیں۔ اگرچہ یہ پسندیدہ کام نہیں ہے۔ تاہم اس کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے عیسائی عورت نائلہؓ سے نکاح کیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُسے توفیق بخشی اور وہ اسلام لے آئی۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو علم ہوا، تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت حذیفہؓ نے پوچھا، کیا یہ نکاح ناجائز ہے۔ فرمایا، ناجائز تو نہیں مگر خطرناک ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے نکاح میں بدکار عورتیں آجائیں اور تمہارا اخلاق بگڑ جائے۔ اور یہ بھی خطر ہے کہ وہ تم پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ تمہارے دین میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ نکاح میں پیار و محبت کو بڑا دخل ہے، اور محبت میں اگر کم انسان بہت کچھ کر بیٹھتا ہے۔ لہذا حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس بی بی کو جد کر دو یہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ بہر حال یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم رہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہوں اگرچہ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔ مگر ملحد اور دہریہ نہ ہوں، جیسا کہ آجکل اکثر نصاریٰ ہیں۔ عام طور پر تمام انگریزوں کو عیسائی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے

دہریہ ہوتے ہیں، جو نہ کسی کتاب کو مانتے ہیں۔ اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کا ایمان ہے۔ ایسی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

نکاح کی طرح اہل کتاب کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر ذبح کریں گے۔ تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا شیخ الہند صاحب مالٹا میں نظر بند دایرہ تھے تو وہ عیسائیوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں زندہ جانور مہیا کیا جائے، تبھی وہ خود ذبح کریں گے آپ فرماتے تھے کہ اُن کی پچی ہوئی روٹی تو کھالیں گے مگر ان کا ذبیحہ نہیں کھائیں گے، کیونکہ ہماری تحقیق کے مطابق یہ لوگ عیسائی نہیں، بلکہ دہریہ ہیں۔ بہر حال کافی تک و دو کے بعد انگریزوں نے حضرت شیخ الہند کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

الغرض اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے درست نہیں تا وقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اور اس آزاد مشرک سے ایک لونڈی بہتر ہے گویا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، اعلیٰ سے اعلیٰ مشرک سے بہتر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ الْمُؤْمِنُ الْفَوِيُّ خَيْرٌ طاقور مسلمان بہتر ہے وَفِي كُلِّ خَيْرٍ اور پھر ہر ایک میں بہتری ہے جو کافر اور مشرک میں نہیں، یعنی کمزور مسلمان طاقور مشرک سے بہتر ہے۔ مشرکین سے جس قدر محبت کی جائیگی، اسی قدر کفر و شرک سے نفرت میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ چیز اصل دین کو ضائع کرنے کا سبب بن سکتی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ اُولَٰئِكَ يَدْعُونَ رَاٰی السَّارِ كُفَّارٍ وَشُرَكِيْنَ دُوْرَخِ كِي طَرَفِ دَعْوَتِ يَتِيْتِي هِي۔ یعنی ایسے کام کرتے ہیں۔ جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی تحریف، باطل رسومات، شرک وغیرہ ایسے افعال ہیں جن کی وجہ دوزخ لازم ہو جاتا ہے۔ اَلْبَسْتَهُ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا رَاٰی الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰی اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ نیکی اور توحید کی طرف بلاتے

دوزخ اور
جنت کی طرف
دعوت

ہیں۔ اور اس طرف آجاؤ اور شکر یہ افعال سے بچ جاؤ۔ فرمایا وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
اللّٰهُ تَعَالٰی اپنے احکام لوگوں کے پاس کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ
 تاکہ وہ نصیحت پکڑ لیں، راہِ راست پہ آجائیں اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس نود و سہ (۹۳)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۲ تا ۲۲۳

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى لَا فَاعْتِزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۚ (۲۲۲) نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَاتُوا حَرْثَكُمْ أَلَى شِعْمَتِكُمْ وَقَدْ مَوْلَا أَنْفُسَكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوُهُ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ (۲۲۳)

ترجمہ :- اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ کہ دیجئے وہ گندگی ہے۔ پس الگ رہو عورتوں سے حیض کے دوران۔ اور ان کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔ جب وہ خوب اچھی طرح پاک ہو جائیں۔ پس جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے تو بہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے طہارت حاصل کرنے والوں کو ۚ (۲۲۲) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تو جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح تم چاہتے ہو۔ اور آگے بھیجو اپنے نفسوں کے لیے اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ بیشک تم اس سے ملنے والے ہو۔ اور خوشخبری سنائے ایمان والوں کو ۚ (۲۲۳)

ربط آیات

پچھلے رکوع میں مختلف مسائل کا ذکر تھا۔ اور سوالات کے جوابات تھے۔ خصوصاً

شراب اور جوئے سے متعلق سوال کا جواب تھا۔ پھر شراب اور جوئے کی قباحت

کا ذکر ہوا۔ پھر مال میں سے خرچ کرنے کے متعلق سوال آیا۔ اس کے جواب میں

بنیادی قانون سمجھایا گیا۔ کہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد خرچ کرنا چاہیے۔ پھر

یہیتموں کی اصلاح اور ان کے خرچ کو اپنے ساتھ ملانے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے لکھ دیا ہے۔ فرمایا حج کے ضیاع کا فکھ نہ کرو۔ تم احرام باندھ لو، حج کے تمام ارکان ادا کرو، اسول نے اس کے کہ طواف کو مؤخر کر دو، کیونکہ اس کے لیے مسجد الحرام میں جانا ضروری ہے۔ اور وہاں ایسی حالت میں نہیں جاسکتیں۔

عورت کے خون مختص کی دوسری قسم نفاس ہے یہ نہ چچی کے دوران آتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد کم و بیش چالیس روز تک رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے نفاس نہیں شمار کیا جاتا۔ عموماً یہ خون دس بیس دن یا مہینہ تک ختم ہو جاتا ہے۔ حیض اور نفاس کے خون کے احکام مشترک ہیں۔ البتہ دوسری قسم کا خون استحاضہ کہلاتا ہے۔ یہ بیماری کی وجہ سے آتا ہے۔ عورت کے رحم میں کوئی باریک سی رگ پھٹنے سے خون رستا رہتا ہے۔ اس کا حکم الگ ہے۔

حیض کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم البوصیفہ ام سفیان ثوری، اہم محمد، اور اہم ابو یوسف کہتے ہیں کہ حیض کی مدت کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے کم خون آکر ختم ہو گیا۔ تو وہ حیض شمار نہیں ہوگا، بلکہ کسی بیماری وغیرہ کا اثر ہوگا۔ اسی طرح اگر دس دن سے زیادہ عرصہ تک خون آتا رہا، تو وہ بھی حیض کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔ بلکہ استحاضہ ہوگا، بخلاف اس کے اہم شافعی فرماتے ہیں کہ حیض کی مدت ایک دن سے لے کر پندرہ دن تک ہے۔ اور ان ایام میں حیض ہی کے احکام لاگو ہوں گے۔ عورت نماز نہیں پڑھ سکے گی۔ اہم ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق تین دن سے دس دن تک کی مدت کے علاوہ بھی اگر خون آتا ہے۔ تو عورت کو غسل کر کے نماز پڑھنا ہوگی۔ ہندو مذہب میں بھی حیض کی مدت پندرہ دن تک ہے۔ البیرونی نے کتاب الهند میں لکھا ہے۔ کہ ہندو لوگ بھی پندرہ دن تک حیض شمار کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں دیگر مذاہب میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مثلاً عیسائی حیض کی حالت میں عورت سے جماع کر لیتے تھے۔ بخلاف اس کے یہودی، مجوس

بہ حیض

افراط و تفریط

اور ہندو مت والے عائضہ سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اُسے گھر سے نکال دیتے نہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگا سکتی اور نہ کھانا پکا سکتی۔ بلکہ یہودیوں کی خود ساختہ تورات میں موجود ہے کہ اگر عائضہ عورت کسی شخص کے کپڑے کو ہاتھ لگا دے۔ تو وہ شخص چوبیس گھنٹے کے لیے ناپاک ہو جائے گا۔ جو کوئی ایسے کپڑے کو دھوئے گا وہ بھی پورے دن کے لیے پید ہو جائے گا۔

سوال جواب

افراط و تفریط کے اس دور میں صحابہ کرامؓ کو حیض کے متعلق احکام الہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اسی سوال کے متعلق فرمایا وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ اے پیغمبر علیہ السلام یہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ آیا ان ایام میں عورت کے قریب جانا چاہیے یا نہیں۔ یا اس سے تعلق بالکل ہی قطع کر لینا چاہیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ یعنی اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہہ دیں، هُوَ أَذًى یہ گندگی ہے۔ أَذًى اس گندگی کو کہتے ہیں۔ جو تکلیف دہ ہو یعنی یہ سخت ناپاکی کی حالت ہے فَاعْلَنُوا لِلنِّسَاءِ فِي الْمَحِيضِ لہذا حیض کی حالت میں عورت کے قریب نہ جاؤ۔ مطلب یہ کہ ان ایام میں مباشرت کرنا حرام ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرتا ہے اور اسے حلال بھی جانتا ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قطعی حکم کو توڑ دیا ہے۔ اور اگر نفسانی اور شیطانی غلبہ سے یہ کام کیا ہے۔ تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسی غلطی کرنے والے کو توبہ کرنی چاہیے۔ استغفار کرے اور ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔

طبی لحاظ سے بھی حیض کے دوران جماع کرنا میاں بیوی کے لیے مضر صحت ہے۔ یہ خون بعض اوقات بدبودار بھی ہوتا ہے۔ اس کی رنگت بھی لبا اوقات سیاہی مائل یا سٹیلی ہوتی ہے۔ لہذا اس حالت میں عورت سے پرہیز

کرنا چاہیئے۔ البتہ یہودیوں کی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ عورت کو بالکل ہی گھر سے الگ کر دیا جائے کہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس آیت میں عورتوں سے الگ رہنے کا مطلب یہ ہے اُن سے مباشرت نہ کر دو۔ اس کے علاوہ عورتیں کھانا پکاسکتی ہیں۔ تم اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہو۔ ایک چارپائی پر لیٹ سکتے ہو، ان سے دیگر خدمات لے سکتے ہو۔ تاہم ناف سے لیکر گھٹنے تک کے حصہ کو نہ ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حیض کی حالت میں ام المؤمنین حضور علیہ السلام کا سر مبارک دھو ڈالتی تھیں۔ الغرض! اسلام نے اس معاملہ میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے بہتر اور درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔

حائضہ کے
احکام

حیض والی عورت کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اس حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، اُس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح روزہ بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے نماز کی قضا بھی نہیں ہے۔ البتہ روزے کی قضا لازم ہے۔ حائضہ عورت کا مسجد میں داخلہ منع ہے اسی لیے طواف بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی کیونکہ ناپاک ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حیض و نفاس والی عورت یا جنابت والی عورت یا مرد قرآن پاک نہ چھو سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاوت کر سکتے ہیں۔ البتہ درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ دیگر وظائف استغفار بسم اللہ وغیرہ کا ورد کر سکتے ہیں۔
فرمایا وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں فَإِذَا تَطَهَّرْنَ اور جب وہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر لیں۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب طہارت حاصل کر لیں۔ غسل جنابت کے سلسلہ میں بھی یہی صیغہ استعمال ہوا ہے فَاطْهَرُوا یعنی خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ حتیٰ کہ بال برابرہ جگہ بھی خشک نہ ہے۔ حیض و نفاس سے طہارت کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ کیونکہ حضور نے فرمایا کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ لہذا خوب مل مل کر بڑے اہتمام سے غسل کرنا چاہیئے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جائے۔

فَاتَوَهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَ اللَّهُ بِسِجْنِ جَاوَانِ كَيْسَ جَاهِلٍ سِجْنِ اللَّهِ
 تمہیں حکم دیا ہے۔ یعنی جب عورتیں پاک صاف ہو جائیں تو پھر تم مباشرت کر سکتے ہو
 اس ضمن میں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کل مدت حیض یعنی دس دن گزرنے کے بعد
 اگر کوئی شخص عورت کے غسل کیے بغیر بھی مباشرت کرے تو کوئی حرج نہیں۔ اور اگر
 ان دس ایام کے اندر خون بند ہو گیا ہے۔ تو پھر جب تک عورت غسل نہ کر لے یا ایک
 نماز کا وقت نہ گزر جائے مباشرت جائز نہیں ہوگی۔

فرمایا انَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند
 کرتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے معافی مانگتا ہے
 اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کُلُّكُمْ مُخْطِئٌ وَ
 تَمَّ سَبْ كَسِي نَكْسِي لِحَاظِ سَخَا كَارِ هُوَ۔ چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں وَ خَيْرُ الْخَطَايَا
 التَّوْبَةُ اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ عاجزی کرنے
 والوں، استغفار کرنے والوں اور معافی مانگنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ فرمایا وَ يُحِبُّ
 الْمُتَطَهِّرِينَ اور اللہ تعالیٰ پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے
 یہاں پاکیزگی سے مراد ہر قسم کی پاکیزگی ہے۔ جس میں جسم، لباس، خوراک، مکان حتیٰ کہ
 عقیدہ و نظریات کی پاکیزگی بھی مقصود ہے۔ طہارت کا اصول

اتنا اہم اصول ہے کہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ چار چیزیں تمام ادیان میں اٹل
 رہی ہیں اور ہمارے دین میں بھی ہیں۔ نمبر ایک طہارت جس کا بیان آچکا ہے دوسرے
 نمبر پر اجبات ہے جس کا مطلب خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے۔ نماز،
 روزہ، حج، اور ذکر و اذکار سب اجبات کا حصہ ہیں۔ تیسری چیز سماحت ہے
 یعنی خمیس اور حقیر چیزوں سے بچ جانا، منجملہ ان کے ہر قسم کا گناہ، اللہ تعالیٰ کی حرام
 کردہ اشیاء، کفر و شرک، حد، بغض، لالچ وغیرہ ان چیزوں سے اعراض
 کرنا سماحت کہلاتا ہے۔ اور آخری چیز ہے عدالت۔ پوری زندگی کے ہر مرحلہ
 پر عدل و انصاف کا دامن تھامے رہنا اور کسی سے ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ یہ تمام

امتوں کے مشترکہ اصول ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پاکیزگی کے اصول میں عقیدہ کی پاکیزگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سورۃ مدثر میں آتا ہے "وَالرَّحْبَزَ فَإِنَّهُ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ" سے کفر و شرک اور بدعت کی گندگی کو نکال باہر کر دو۔ جب تک عقیدہ پاک نہیں ہو گا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ کام نہ آئے گا۔ لہذا اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے ایک اور اہم طہارت مال کی طہارت ہے جس مال سے انسان خوراک کھاتا ہے لباس پہنتا ہے، مکان بناتا ہے۔ وہ مال بھی پاک ہونا چاہیے۔ چوری، خیانت رشوت، اور بلیک کمال اللہ تعالیٰ کو ہرگز نہ پسند نہیں۔ اسی طرح جس مال سے زکوٰۃ نہیں نکالی گئی وہ مال بھی پاک نہیں ہے۔ ایسے مال سے اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں کرتا ایسے شخص کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ ایسا شخص مر گیا تو اپنے پیچھے جہنم کے راستہ کا نقشہ چھوڑ گیا۔

عورت بمنزلہ
کھیتی

آگے ایک اور مسئلہ بیان فرمایا۔ عورت کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد ہوا۔ رَبَّنَا ذُرْئُنَا لِلْإِسْلَامِ صِدْقًا تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں فَاتَّوَحَّشْتُكُمْ أَنْ يَشْكُرُوا پس جاؤ اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو۔ اس مقام پر عورت کو کھیتی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھا دی کہ مرد کا نطفہ بمنزلہ تخم کے ہے اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے اور اس سے فصل پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کا یہ قطرہ آب عورت کے رحم میں جا کر بچے کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اولاد جیسی ہوگی جب نطفہ اصل مقام میں جائے گا۔ لہذا دوسرے مقام میں مباشرت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ فَرَمَا مِنْ آتِي امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا نَزَّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی جس شخص نے عورت کے ساتھ پیچھے کے راستے مباشرت کی، اس نے محمدؐ کی شریعت کا انکار کر دیا۔ وہ باغی اور مجرم ٹھہرا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ آتِي شَتْرًا

سے جماع کی کیفیت مراد ہے۔ یعنی تم جس طرح بھی پسند کرو مثلاً لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے
کے بل یا پیچھے سے ہو کر۔ مگر شرط یہ ہے کہ فی مقام واحد مقام ایک ہی ہو
دوسرے مقام کے استعمال کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر کھیتی کا لفظ لا
کہ ان سب باتوں کی وضاحت فرمادی

نیک اولاد
صدقہ جاریہ

فرمایا وَقَدْ مَوْلَا نَفْسَكُمْ اپنے نفسوں کے لیے کچھ آگے بھی بھجو۔ یعنی
اگلے جہاں کے لیے بھی نیکی کا کچھ فکر کرو۔ نیت، صحیح ہونی چاہیے۔ مباشرت سے
مقصود محض شہوت رانی ہی نہ ہو، اگرچہ یہ بھی روا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اولاد کی
پیدائش ہونا چاہیے۔ اگر صالح اولاد ہوگی۔ تو وہ تمہارے پیچھے صدقہ جاریہ ہوگی۔ حضور
علیہ السلام نے فرمایا اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْكَ نِيكَ اَوْلَادٌ ہوگی تو تمہارے لیے
دعا کرے گی، جو تمہارے لیے ذخیرہ آخرت ہوگا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرو۔
کہیں اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کہہ بیٹھنا۔ اس نے طہارت اور مباشرت
نیک کے قانون واضح کر دیے ہیں اب اُن سے روگردانی نہ کرنا۔ ایام حیض میں مباشرت
سے نہ صرف اخلاق بگڑ جائے گا۔ بلکہ طرح طرح کی بیماریاں بھی لاحق ہو سکتی ہیں وَاعْلَمُوْا
اَنَّكُمْ مَّمْلُوْهُ اور یاد رکھو، ایک نہ ایک دن تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات
کرنی ہے۔ اس کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا یَوْمَ تَأْتِي كُلُّ
نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا جب ہر شخص خود اپنے نفس سے سوال و جواب
کرے گا۔ درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ نہ کوئی وکیل ہوگا۔ اور نہ کوئی ساتھی۔ اپنی جوابدہی
آپ ہی کرنا پڑے گی۔ اور آخری جملہ فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ جو اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ
کی وحدانیت، اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ پیغمبر پر ان کا ایمان ہے۔
احکام الہی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ انہیں خوشخبری سنا
دیں کہ اللہ کے نزدیک ان کے لیے فلاح و کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا
وَتُصَدِّقُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُوَخِّدُكُمْ
اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَخِّدُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ
قُلُوبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ
نِسَاءِهِمْ تَرِبٌ مِنْ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ کہ تم سچی نہیں کرو گے۔ پہنیز گارہی اختیار نہیں کرو گے اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری بیہودہ قسموں میں نہیں پکڑتا۔ لیکن ان قسموں پر پکڑتا ہے۔ جن پر تمہارے دل قصد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بدبار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کے لیے جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ اس دوران میں کوٹ آئیں، تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۲۲۶﴾ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

رابطہ آیات

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ حیض کی وضاحت فرمائی کہ ایسی حالت میں عورت سے مباشرت حرام ہے۔ تاہم طہارت حاصل کر لینے کے بعد عورتوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ اس سے گذشتہ آیت میں مشترک

مرد اور مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت فرمائی تھی۔ اُس سے پہلے یتیموں کے مال سے متعلق مسائل تھے۔ اور انہیں ساتھ ملائے کی اجازت دی تاہم فرمایا کہ ہر حال میں یتیموں کی اصلاح پیش نظر ہونی چاہیئے۔ محتاجوں کی اعانت کے متعلق بھی حکم آچکا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زائد مال مستحقین پر خرچ کر دو۔ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا شرک کا باعث ہے۔ اس سے پہلے شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ سب ناپاک چیزیں ہیں۔ اور ہر بات کی جڑ ہیں۔

گزشتہ دروس کی آیات میں متذکرہ قبیح چیزوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیات میں لوگوں میں پائی جانے والی ایک اور بُری بات کا ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے کسی کا کام نہ کرنے پر اللہ کی قسم اٹھانا۔ قسم کے متعلق احکام مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ مجملہ ان کے یہ آیات اور سورۃ مادہ کی آیات ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا ہو اور قسم اٹھائے بغیر چارہ بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں قسم اٹھانے کی اجازت ہے۔ اور اس میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے کسی نام یا اس کی صفت کے ساتھ اٹھائی جائے، کسی انسان، جن، نبی یا کسی اور چیز کی قسم نہیں اٹھانی چاہیئے۔ کیونکہ مَنْ أَقْسَمَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ حَسْبُكَ غَيْرُ اللَّهِ کی قسم اٹھانی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اور اگر ایسی قسم اٹھانے والا شخص اُس غیر اللہ کی ایسی ہی تعظیم کرتا ہے جیسی اللہ کی کرنی چاہیئے یا اس کی صفت کو ویسی ہی جانتا ہے۔ جیسی اللہ کی صفت، تو پھر ایسے شخص نے حقیقتاً شرک کیا۔ اور مشرک یا کافر ہو گیا۔ اور اگر حقیقی تعظیم غیر اللہ مراد نہ ہو پھر بھی غیر اللہ کی تعظیم میں شبہ ہو گا، اس کے مناسب نہیں کہ کسی حال میں بھی غیر اللہ کی قسم اٹھائی جائے اور مطلقاً بھی قسم اچھی نہیں لہذا بہتر یہی ہے کہ حتی الامکان قسم اٹھانے سے گریز کیا جائے۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے پوری زندگی میں کبھی قسم نہیں اٹھائی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جائز امور میں تو قسم اٹھانے کی اجازت ہے مگر بُری باتوں میں قسم مت اٹھاؤ۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ

نابجائز قسم کی ممانعت

اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ ان امور میں اَنْ تَسْبُرُوا وَ اَوْ تَنْقُورُوا وَ تَصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ کہ تم نیکی نہیں کرو گے، پیر ہیز گاری اختیار نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرو گے۔ فرمایا یہ تو بہت بُری حرکت ہے کہ ایک اچھائی کے کام میں اللہ کی قسم کھاتے ہو کہ ہم یہ نیکی کا کام نہیں کریں گے۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہے، مثلاً کوئی اس بات کی قسم اٹھائے کہ میں والدین سے کلام نہیں کروں گا۔ یا کسی محتاج کی اعانت نہیں کروں گا یا کوئی فرض ادا نہیں کروں گا تو فرمایا ایسا نہ کرو۔ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ اللہ تعالیٰ سُننے والا ہے۔ لہذا کوئی ایسی بات زبان پر نہ لاؤ جو قابلِ مواخذہ ہو۔ اور وہ عَلِيمٌ بھی ہے۔ جو دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے کہ کوئی کام تم اچھی نیت سے کر رہے ہو یا بُری نیت سے۔ لہذا اپنا دل قابو میں رکھو۔ اور اس میں کوئی بُرا خیال نہ آنے دو۔ زبان پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ زبان سے کوئی بُری بات نہ نکلے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

قسم کی تین قسمیں

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یَمِینُ لغو ہے۔ جو بغیر ارادے کے زبان سے نکل جائے۔ ایسی قسم پر کوئی مواخذہ نہیں اور نہ ہی کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر آخرت میں بھی کوئی گرفت نہیں۔ ہاں اگر دل کے ارادے سے قسم اٹھائی جائے بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ایسی قسم پر یقیناً مواخذہ ہو گا۔

دوسری قسم یَمِینُ غموس ہے۔ غموس کا معنی کسی گناہ میں غوطہ مارنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق دیدہ واندہ غلط قسم اٹھاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص میرے پاس آیا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ نہیں آیا تھا تو ایسی قسم غموس کہلاتی ہے۔ اس میں اگرچہ کفارہ نہیں ہے۔ مگر قسم اٹھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ اور آخرت میں قابلِ مواخذہ ہے۔

قسم کی تیسری قسم یَمِینُ منعقدہ ہے یعنی کوئی شخص آنے والے زمانہ کے لیے

قسم اٹھائے کہ میں فلاں کام کر دوں گا یا فلاں کام نہیں کر دوں۔ اگر ایسی قسم جائزہ کام سے متعلق ہے اور اس نے قسم کو پورا بھی کر دیا، تو وہ بُری ہو گیا۔ اگر اس نے قسم کو توڑ دیا ہے۔ تو کفارہ دینا پڑے گا۔ اور قسم کسی ناجائزہ کام سے متعلق اٹھائی ہے تو قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

قسم کا کفارہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جب میں کسی بات پر قسم کھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات زیادہ بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔ ایک موقع پر مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا، حضور! ہم جہاد پر جانا چاہتے ہیں، ہمارے لیے سواری کا انتظام فرمادیں۔ آپ نے فرمایا وَاللّٰهِ لَا اَحْمَدُكَ عَالَمٌ اللّٰہ کی قسم میں تم کو کسی سواری پر سوار نہیں کراؤں گا۔ صحابی خاموش ہو کر چلے گئے۔ پھر واپسی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بلا کر اونٹ ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے عرض کیا حضور آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں سوار نہیں کریں گے۔ اور میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دیا کہ آپ نے یہ قسم اٹھالی ہے۔ حضور! اگر اب میں اونٹ لے گیا تو اپنے ساتھیوں میں جھوٹا ثابت ہوں گا۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ جب میں کسی معاملے میں قسم اٹھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایک بات پر اصرار نہ کرے جب کہ دوسری بات بہتر ہو۔ اس کو چاہیے کہ ایسی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔

قسم کا کفارہ سورۃ مائدہ میں مذکور ہے قسم توڑنے والا ایک غلام آزاد کرے۔ غلامی کا رواج اب ختم ہو چکا ہے۔ لہذا یہ کفارہ تو اب ادا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ کہ دس مسکینوں کو اتنا کھیر اپنا دیا جائے جہیں وہ نماز ادا کر سکیں۔ یا دس مساکین کو دو وقت اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے۔ نہ زیادہ اچھا ہو اور نہ بُرا ہو۔ سادہ گوشت روٹی کھلا دینا کافی ہو گا۔ اگر اتنی استطاعت بھی نہ ہو، تو پھر تین دن

کے مسلسل روزے رکھے۔ ان چاروں صورتوں سے قسم کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔

الغرض! فرمایا لَا يُؤْخَذُ كُفْرُ اللَّهِ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ اللَّهُ تَعَالٰی تمہاری

لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا وَلَكِنْ يُؤْخَذُ كُفْرُ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ بلکہ ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو۔ لہذا اکثر

سے قسمیں نہیں اٹھانا چاہئیں جو کوئی ایسا کرے گا، اُسے ان احکام کی پابندی کرنا ہوگی۔

ہاں! اگر کوئی شخص ایسی کوتاہی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے

اور مذکورہ احکام کے تحت کفارہ ادا کر دے تو وَاللَّهُ عَفْوٌ رَّحِيمٌ اللہ تعالیٰ

بخشنے والا اور بردبار ہے مگر ایک بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور

اس کی بردباری سے انسان کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ

سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ کہ کہیں اس کی گرفت میں نہ آجائے۔

اس سے پیشتر حیض کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ حیض کے دوران عورت کے

قریب جانا حرام ہے۔ اب اسی نوعیت کا ایک اور مسئلہ بیان ہو رہا ہے جسے ایلاہ

کہتے ہیں۔ ایلاہ کا لغوی معنی قسم اٹھانا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ کوئی شخص

اس امر کی قسم اٹھالے کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہیں جائیگا۔ اس کی چار صورتیں

ہو سکتی ہیں۔

مسئلہ ایلاہ

(۱) مطلقاً قسم اٹھانا کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۲) چار ماہ کی مدت مقرر کرے کہ اتنا عرصہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۳) چار ماہ سے زیادہ مثلاً پانچ، چھ، آٹھ ماہ کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے

قریب نہیں جاؤں گا۔

(۴) چار ماہ سے کم مدت ایک، دو، تین ماہ تک کے لیے قسم کھائے کہ عورت

کے قریب نہیں جاؤں گا۔

چوتھی صورت یعنی چار ماہ سے کم مدت کے ایلاہ کو شرعی ایلاہ نہیں کہا جاتا

اگر مقررہ مدت تک ایسا شخص عورت کے قریب نہیں گیا تو قسم سے بری ہو جائیگا۔

اور اگر اس دوران عورت سے مقاربہ نہ کر لی۔ تو قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ باقی تین صورتوں میں حکم یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کو قسم توڑ دینی چاہیے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر چار ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور قسم کھانے والا شخص عورت کے پاس نہیں گیا، تو پھر ایلاہ مؤثر ہو گیا۔ البتہ اس کے حکم میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے۔ کہ ایسی صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اب اگر مرد دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اُسے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ اگر رجوع کا کوئی ارادہ نہیں تو عورت آزاد ہے، عدت گزرنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، بلکہ حاکم وقت اُس شخص کو عدالت میں طلب کر کے اُسے مجبور کرے گا۔ کہ یا تو وہ رجوع کر لے یا طلاق لے لے دوںوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا۔ اُس کے مطابق عمل ہوگا۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ شرعی ایلاہ اُس صورت میں قائم ہوگا جب عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی گئی ہو۔ اگر قسم نہیں کھائی ویسے ہی کہ دیا کہ بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ تو یہ ایلاہ شمار نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین (جیسا صاحب تفسیر القرآن کو مغالطہ ہوا ہے اور اس نے غلط مسئلہ لکھا ہے) کو مغالطہ ہوا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ بغیر قسم کے بھی ایلاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ کہ ایلاہ کے لیے قسم اٹھانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص لیے ہی ایک دو سال کے لیے علیحدہ رہے تو ایلاہ قائم نہیں ہوگا۔ لغوی اعتبار سے بھی قسم ضروری ہے کیونکہ ایلاہ کا معنی ہی قسم ہے۔ البتہ قسم کے بغیر ایسی بات کرنے سے انسان گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے اس سے عورت کو تنگ کرنا مقصود ہے جو کہ ناروا ہے۔ جس طرح میاں بیوی کے دیگر حقوق ہیں۔ اسی طرح نفسانی خواہش کی تکمیل بھی دونوں کا حق ہے۔ اور کسی

فریق کو اس کے حق سے محروم کرنا مستحسن نہیں ہے۔ بلکہ بُرہی بات ہے۔

فَرَّيَا لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَاءِهِمْ تَرْتِجُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ

اُن لوگوں کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ فَإِنْ فَاءُوا أَيْسَ اِکْرَاهٍ اِسْ دَوْرَانِ لَوْ طِ اِیْنِ۔ فَإِنَّ اللّٰهَ عَفُوٌّ

رَحِيْمٌ تَوَاللّٰہِ تَعَالٰی نَسَخْتَنِ وَالَا اور مہربان ہے غلطی کو تا ہی معاف ہو جائے گی

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اِذَا اِکْرَاهِنَّ طَلَّاقٌ اِذَا تَفَرَّقَ کَا بَحْتِ اِکْرَاهٍ کَرِیْبَا ہے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ تَوَاللّٰہِ تَعَالٰی سُنَّیْنِ وَالَا اور جاننے والا ہے۔ وہ

انکی ہر ہر ظاہر بات کو سنتا ہے۔ نیز اُن کی نیت اور ارادے تک کو جانتا ہے۔

وَالْمُطَلَّاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَنَّ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا
إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ (۲۲۸)

۲۲۸

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ اور ان کے لیے
حلال نہیں ہے کہ وہ اُس چیز کو چھپائیں، جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ اگر
وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں۔ انہیں
اس مدت میں لوٹانے کا۔ اگر وہ اصطلاح کا ارادہ کریں۔ اور ان عورتوں کے لیے بھی
اُسی طرح حق ہے جس طرح عورتوں پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق۔ اور
مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے اور حکمت والا (۲۲۸)
گزشتہ درس میں قسم کے متعلق بیان تھا۔ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایلاہ کا مکمل بیان فرمایا
سے مراد عورت سے عدم مقاربت کی قسم کھانا ہے۔ اور اس کی مدت زیادہ سے زیادہ
چار ماہ رکھی گئی ہے۔ اگر خاوند اس دوران رجوع کر لے تو قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ اور
اگر چار ماہ کی مدت پوری ہو گئی۔ تو عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائیگی۔ تاہم بعض فقہائے
کرام فرماتے ہیں کہ طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی بلکہ ایلاہ کرنے والے کو عدالت میں
طلب کر کے رجوع یا طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

نکاح اور طلاق

نکاح اور طلاق کے مسائل اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان
فرمائے ہیں، خصوصاً سورۃ احزاب، طلاق اور اس سورۃ بقرۃ میں یہ مسائل آئے ہیں

نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی اور اجتماعی معاہدہ ہے۔ جسے مرتے دم تک نبھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جب تک نکاح کا معاہدہ طے نہیں پاتا، اس معاہدہ کے فریقین یعنی مرد اور عورت کے اخلاق کی چھان بین کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک قابل قبول ہیں پھر جب نکاح طے پا جاتا ہے۔ تو زوجین پر معاہدہ نکاح کی قانونی پابندی عاید ہو جاتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق دیے ہیں اور کچھ فرائض سونپے ہیں۔ اگر فریقین ان کی پابندی کرتے ہیں تو ان کی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون گزرتی ہے۔ تاہم بعض اوقات اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں اس معاہدہ کا منسک فریقین کا نباہ ممکن نہیں رہتا، تو ایسی صورت میں شریعت نے ان میں تفریق کا قانون بھی نافذ کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ساری عمر کھٹن زندگی گزارنے کی بجائے اپنے لیے کوئی دوسرا بہتر ذریعہ تلاش کر سکیں۔

دوسرے مذاہب سے تقابل

اس مسئلہ میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاشروں میں طرح طرح کی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بائبل کے باب استئنا میں موجود ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی پر کسی وجہ سے ناراض ہو جائے تو فوراً طلاق نامہ عورت کے ہاتھ میں دے کر گھر سے نکال دے، اس سلسلہ میں صفائی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اُدھر مطلقہ کو حق حاصل ہے کہ طلاق کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ تو یہودی مذہب ہے اب عیسائیوں کو لیجئے۔ ان میں طلاق کا تصور ہی نہیں ہے۔ جب ایک دفعہ نکاح ہو گیا۔ تو ساری عمر کے لیے میاں بیوی ایک دوسرے کے پابند ہو گئے۔ اب ان کو موت ہی علیحدہ کر سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کسی جوڑے کا میلان طبع ایک سانہ ہوا اور ان میں ناچاقی پیدا ہوئی تو ساری عمر عذاب میں بسر کرنا پڑی۔ البتہ عیسائیوں کا دوسرا فرقہ جو صدیوں کی پیدوار ہے اُس نے عدالت کے ذریعے طلاق کو قانونی شکل دے دی ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ عدالت مجاز فریقین کو طلب کرے گی۔ اور اس بات کی تحقیق کرے گی، کہ

فریقین میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے۔ یا کسی ایک نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اگر کوئی ایسا جرم ثابت ہو جائے۔ تو عدالت اُن کے درمیان تفریق ڈال دے گی۔ اور اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ہندو مت میں بھی طلاق کا کوئی تصور نہیں مرتے دم تک میاں بیوی میں علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ رومیوں اور یونانیوں میں بھی طلاق نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان مذاہب میں معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

اسلام میں
نظرۂ طلاق

اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ زوجین میں تفریق ڈال دی جائے۔ اس معاہدہ (AGREEMENT) کو نبہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود اگر میاں بیوی کے لیے اکٹھے زندگی گزارنا ممکن نہ ہو، تو پھر اسلام نے طلاق کے ذریعے ان کی علیحدگی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اگرچہ طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ یعنی مباح اشیا میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت اس کی اجازت ہے۔ طلاق کی صورت میں اسلام نے ایک اور ضروری قانون عدت کا دیا ہے۔ جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت ایک خاص مدت تک دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کا مقصد تحفظِ نسب ہے تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کا نسب شکوک نہ ہو جائے۔ طلاق کے بعد اگر عورت فوراً دوسرا نکاح کر لے۔ تو بچے کے نسب پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے خاوند کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے اسلام نے عورت کے دونکاحوں کے درمیان مختلف صورتوں میں مختلف مدتیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ آئندہ پیدا ہونے والا بچہ کس باپ کا ہے۔ نیز پہلے نکاح کے احترام کا تقاضا بھی ہے۔ کہ دوسرے نکاح سے پہلے کچھ وقفہ ہونا چاہیے۔

عدت اُس کم از کم مدت کا نام ہے جو طلاق کی تاریخ یا شوہر کی فوتیگی کی تاریخ سے لیکر نکاح ثانی تک کے لیے مقرر ہے۔ اس عرصہ میں عورت دوسرا نکاح نہیں

کر سکتی۔ عدت مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً فوتیدگی کی صورت میں عدت تاریخ وفات سے چار ماہ دس دن ہے۔ اتنے عرصہ میں پتہ چل جاتا ہے۔ کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ اگر حاملہ نہیں ہے۔ تو چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر عورت نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ جس دن بچہ جنے گی اس کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔ بیوگی سے لے کر وضع حمل تک کی مدت کا کوئی تعین نہیں ہے۔ یہ عرصہ خواہ ایک دن کا ہو یا پورے نو ماہ کا۔ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ لہذا بچہ جب بھی پیدا ہو، عورت نکاح کر سکتی ہے۔ حجۃ الوداع کے سفر میں ایک صحابی اونٹنی سے گر کر فوت ہو گئے۔ ان کی بیوی حاملہ تھی۔ ٹھیک بائیس دن بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ یہ جب چاہے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

اگر عورت عاقل، بالغ اور آزاد ہے، اور اسے حیض آتے ہیں۔ کسی وجہ سے طلاق ہو گئی ہے۔ تو اس کی عدت تین حیض ہوگی۔ یہ تین حیض خواہ دو ماہ میں آجائیں یا ۱۹ ماہ میں، اُسے بہر حال تین حیض تک انتظار کرنا ہوگا۔ عام طور پر حیض ماہ ب ماہ آتے ہیں۔ اس لیے ایسی عورت کے حیض کم و بیش تین ماہ میں پورے ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد اسے نکاح کی اجازت ہوتی ہے۔

پاکستان میں نافذ عائلی قوانین میں ایسی عورت کی عدت نوے دن مقرر کی گئی ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ حیض والی عورت کو تین حیض کی عدت پوری کرنا ہوگی۔ خواہ اس میں کتنا عرصہ لگے۔ البتہ ایسی عورت جو ابھی بالغ نہیں ہوئی یا جو کبیرنی میں پہنچ چکی ہے اور اس کے حیض بند ہو چکے ہیں۔ ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ یا ۹۰ دن درست ہے۔ اس کی تفصیلات سورۃ احزاب میں موجود ہیں۔ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ نکاح ہو گیا۔ مگر میاں بیوی کی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی انہیں مباشرت کا موقع نہیں ملا۔ ایسی صورت میں اگر طلاق واقع ہو جائے، تو فرمایا

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَقْتَدُونََهَا اِیْسٰی عورتوں کے لیے کوئی عدت

نہیں۔ وہ جب چاہیں دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھی عائلی قوانین درست نہیں
 کیونکہ وہاں سب کے لیے نوے دن کی عدت مقرر ہے حالانکہ یہاں کوئی عدت نہیں ہے
 ایسا ہی عدت کا ایک مسئلہ ہمارے نوٹس میں آیا تھا۔ کہوٹہ کے رہنے والے ایک
 شخص نے بتایا کہ کسی عورت کو طلاق ہو گئی۔ اُس کو حیض دیر سے آتا ہے۔ اور
 نوے دن میں اس کے تین حیض مکمل نہیں ہوئے۔ مگر یونین کونسل والوں نے نوے
 دن کے بعد اس کا نکاح کر دیا۔ حالانکہ یہ نکاح ہوا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ عدت کے
 دوران نکاح ہو نہیں سکتا۔ تو اس قسم کی خرابیاں ہیں۔ جو عائلی قوانین میں خامی کی وجہ سے
 پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کے نکاح قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار
 وہ لوگ ہیں جو ایسا حکم دیتے ہیں۔

الغرض فرمایا وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ط حیض یا طہر
 مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ قُرُوءِ قُرُوءِ کی جمع ہے
 اور اس لفظ کے معانی میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل لغت بھی
 اس کے مختلف معانی بتاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ دو معانی میں مشترک ہے یعنی اس کا
 معنی حیض بھی آتا ہے اور طہر بھی۔ طہر اُس وقفہ یا مدت کو کہتے ہیں۔ جو دو حیضوں کے
 درمیان ہوتا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ قرر کا معنی حیض بتاتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے نزدیک
 بالغ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔ وہ ابو داؤد و تشریف کی حدیث سے استدلال
 کرتے ہیں۔ کہ ایک عورت نے حضور علیہ السلام سے استحاضہ کے متعلق مسئلہ پوچھا، تو
 آپ نے فرمایا تَدْعُ الصَّلَاةَ اَيَّامُ اقْرَابِہَا یعنی حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھے
 البتہ جب حیض کے عام ایام گزر جائیں تو پھر غسل کر کے نماز ادا کرے کیونکہ اب یہ
 حیض نہیں رہا، بلکہ استحاضہ کا خون شمار ہوگا۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے قرر کا
 معنی حیض نکلتا ہے۔ البتہ اہم شافعی قرر سے مراد طہر لیتے ہیں۔ ان کا مسلک
 یہ ہے۔ کہ طلاق کے بعد عورت تین طہر گزرنے تک دوسرا نکاح نہ کرے۔
 اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں عورتوں کو متنبہ فرمایا ہے وَلَا يَحِلُّ لَهَا

اور اگر تینوں طلاقیں دے دی ہیں تو پھر کسی صورت رجوع نہیں ہو سکتا۔ عورت
عدت پوری کرنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی، تو فرمایا کہ رجعی طلاق میں غامذوں
کا زیادہ حق ہے۔ کہ وہ رجوع کر لیں بشرطیکہ اُن کا ارادہ اصلاح کا ہو، محض تنگ کرنا
مقصود نہ ہو۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ عورت کو تنگ کر نیکی غرض سے
کبھی طلاق دے دی کبھی رجوع کر لیا۔ تاکہ وہ دوسری جگہ بھی نہ جاسکے یہ بات جائز نہیں ہے
آگے اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ

حقوقِ زوجین

الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَالدِّينِ کے مطابق عورتوں کا مردوں پر اُسی طرح حق
ہے جس طرح مردوں کا عورتوں پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ دین کے اپنے اپنے دائرہ
میں کچھ حقوق ہیں۔ لہذا اُن کی پاسداری ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مرد تو اپنے
حقوق نہ بدوستی عورت سے وصول کرے۔ مگر عورت کو اُس کا حق نہ دے۔ مثلاً
اللہ تعالیٰ نے عورت کا وراثت میں حق رکھا ہے۔ لہذا مرد پر لازم ہے کہ اُسے
یہ حق ادا کیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔
یہ بیماری عام معاشرتی حقوق سے بھی محروم تھی۔ جو کہ سرسری زیادتی ہے۔ رومی اور یونانی بھی
عورت کو ذلیل سمجھتے تھے اور اس کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عیسائی بھی اسی قسم کے
تاثر کا شکار ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مردو! جس طرح تمہارے
کچھ حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ انہیں ان سے محروم نہ کرو یہ تو
اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ اُس نے کس فرد کو کس مقام پر رکھا ہے۔ خَلَقَ
مِنْهُمْ سَاوِجْهًا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً یعنی اللہ تعالیٰ
نے ایک فرد سے سب کو پیدا کیا۔ پھر اُسی میں سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر بشمار
مرد و زن بکھیر دیے۔ یہ اُس کی حکمت ہے کہ کسی کو مرد بنا دیا اور کسی کو عورت بنا دیا۔
اب تمہارا فرض یہ ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھو۔ دوسرے کو حقیر نہ
سمجھو۔ اور دستور کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ
کا ارشاد یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حقوق و فرائض کو بجالاؤ اور کسی دوسرے

کا حق غصب نہ کرو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم پر یہ حق ہے۔ کہ بیوی کے لیے بھی ویسی ہی خوراک کا بندوبست کرو۔ جیسا کہ اپنے لیے کرتے ہو۔ جس معیار کا لباس پسند کرتے ہو، عورت کو بھی مہیا کرو۔ اُس کو بھی معقول ٹھکانہ بنا کر دو۔ اس کا حق مہر ادا کرو اور اُسے آزادی دو کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اس رقم کو خرچ کر سکے۔ یہ اُس کے حقوق ہیں۔ اُسے بلا وجہ مار تاپینا بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کسی جائز ضرورت کی بنا پر تنبیہ مقصود ہو۔ تو اتنی خفیف ضربات لگاؤ کہ ہڈی پسلی نہ ٹوٹے۔ اس کی اجازت ہے **فَاضْرِبُوْهُنَّ**۔ ناجائز مار پیٹ درست نہیں۔ اُس سے قطع تعلقی بھی نہیں کرنی چاہیے عورت پر بھی حق ہے۔ کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے۔ سینما وغیرہ کے لیے جانا تو ویسے ہی حرام ہے۔ جائز امور کے لیے بھی اجازت یعنی چاہیے۔ اس کی تفصیلات آگے سورۃ نسا میں آئیں گی۔

مرد کی فضیلت

فرمایا **اِنَّ حَقَّوْنَ كَے باوجود وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھُمْ دَرَجَةٌ** مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اسی موضوع کو سورۃ نسا میں یوں بیان کیا ہے **الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ** مرد عورتوں پر نگران ہیں یا ان کے محافظ ہیں ان سے برتر ہیں اور یہ ایک فطرتی امر ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اور پھر مردوں کی برتری کی دلیل بھی بیان فرمائی۔ **وَبِمَا آَنَفَقُوا مِنْ اَمْوَالِھِمْ** کہ مرد اپنی کائی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ ان کے کفیل ہیں۔ اللہ نے انہیں برتری دی ہے۔ اور مشقت کے کام مرد کے سپرد کیے ہیں۔ کمانا اس کے ذمہ ہے۔ عورت کا کام گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں۔ انہیں کم مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لہذا مرد کو برتری حاصل ہے اس کی مثال موجودہ دور میں بھی ملتی ہے کہ دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ اقوام میں سے صرف امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو ویٹو پاور حاصل ہے ان میں سے کوئی ایک ملک باقی پوری دنیا کے متفقہ فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ کہ اس کو یہ طاقت حاصل ہے۔ اسی طرح گھر کی چار دیواری میں مرد کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ یہ پاور عورت کو یا بچوں کو حاصل نہیں ایک باپ اپنے سارے بیٹوں کے متفقہ مطالبہ

کو رد کر سکتا ہے۔

طلاق کا حق
مرد کو ہے

اسی طرح طلاق کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ عورت اس سے محروم ہے اس میں بھی مصلحت ہے "بَيْدَهُ عُقْدَةُ النِّكَاحِ" نکاح کی گھرہ چونکہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس گھرہ کو کھولنے کا اختیار بھی مرد کو حاصل ہے۔ مگر قدرت کے اس قانون کے خلاف جب برطانیہ میں عورت کو طلاق کا حق مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہاں پچاس فیصد سے زیادہ طلاقیں ہونے لگیں ہیں۔ ہر عورت معمولی کر سکتی ہے کہ اُسے طلاق ملنی چاہیے؟ محض اس لیے کہ اس کا خاوند سوتے میں خراٹے لیتا ہے۔ اور اس کی نیند خراب ہوتی ہے۔ دوسری کہتی ہے کہ میرا خاوند میرے کبوتر یا میرے کتے سے محبت نہیں کرتا۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی ایسی معمولی باتوں پر طلاق روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کیا ہے۔ یہ اس مساوات کا نتیجہ ہے۔ جو عورت کو مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اس مساوات کی بنا پر دفتروں میں، فوج میں ہر جگہ عورتیں ملازمت کر رہی ہیں، حالانکہ فوجی خدمات عورت کے فرائض سے بالکل باہر ہیں۔ اسی خلط ملط کی وجہ سے طرح طرح کی معاشرتی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اکثر اداے بدکاری کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی صحیح نسل قائم نہیں رہ سکی۔ گزشتہ صدی میں ایک انگریز مصنف ڈاکٹر لکھتا ہے کہ یورپ کی پینتالیس کروڑ کی آبادی میں سے پینتالیس آدمی بھی ایسے نہیں نکالے جاسکتے جن کو یقین کے ساتھ نطفہ حلال تسلیم کیا جائے یہ اس کی اپنے قانون کے متعلق رائے ہے۔ کہ اتنا گندہ قانون وضع کیا گیا ہے جب شاپنگ کے لیے عورتوں کو آزادی ہوگی اور غیر مردوں کے ساتھ میل جول کریں گی۔ ائمہ ہوٹس بن کر ساری دنیا کا سفر بغیر محرم کے کرینگی، دفتروں میں مردوں کے ماتحت کام کریں گی، تو پھر اچھے نتائج کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے جہاں تک فوجی خدمات کا متعلق ہے صرف غیر معمولی (AB NORMAL) حالات میں

عورت کو حصہ لیتے کی اجازت ہے، وگرنہ عام حالات (NORMAL) میں عورت کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، کیونکہ مرد کا دائرہ کار اور ہے عورت کا اور ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عورت پر جمعہ فرض نہیں کیا۔ اس کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ تاہم وہ خاوند کی اجازت سے نماز کے لیے مسجد میں جا سکتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی فضیلت ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ نسا میں آئیگی۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک اور حکیم ہے۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ لہذا اس کے احکام پر عمل درآمد کرنا چاہیئے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۹

درس نو دوشش (۹۶)

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ط
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْهُمَا اَتِيْتُمْوهُنَّ شَيْئًا اِلَّا
اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ۝۲۲۹

ترجمہ: طلاق زوجی دومرتبہ ہے۔ پھر اس کے بعد یا تو رد کر رکھنا ہے اس کو دستور
کے مطابق یا اسکو آزاد کر دینا ہے سچی کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے
کہ تم ان عورتوں سے اس چیز میں سے کچھ لے لو جو تم نے ان کو دی ہے۔ سولے
اس صورت کے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اس بات سے خوف کھاتے ہوں کہ وہ
اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں خطرہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی
حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ عورت
اپنی جان چھڑائی کا ذریعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ
بڑھو۔ اور جو شخص بھی اللہ کی حدود سے آگے بڑھیں گا۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں ۝۲۲۹

ربط آیات

گزشتہ آیت کریمہ میں عدت کا مسئلہ بیان ہوا تھا جس کا مقصد یہ ہے کہ
طلاق اور دوسرے نکاح کے درمیان عورت وقفہ کرے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ امید
سے ہے یا نہیں۔ پھر اگر امید سے ہے تو وضع حمل تک نکاح ثانی نہ کرے
اور امید سے نہیں تو تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھے۔ کم سن اور معمر عورتوں
کی عدت تین ماہ مقرر کی گئی ہے۔ اور بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن عدت ہے

یہ بھی گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے وہ اُن کے نگران اور کفیل ہیں۔ باقی حقوق میں مساوات ہے۔ کچھ حقوق مرد کے ہیں اور کچھ عورت کے، اپنے اپنے دائرہ کار میں زوجین حقوق و فرائض کے ذمہ دار ہیں۔ آج کے درس میں طلاق کی تعداد اور ان سے متعلق احکام کا ذکر ہے۔ کل بیان کیا تھا کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے ضروری ہے۔ تاہم عام معاہدات اور نکاح کے معاہدہ میں قدرے فرق ہے کسی دو پارٹیوں کے درمیان لین دین کے سلسلہ میں، کاروبار میں، یا شرکت کے متعلق معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ محض معاملہ کی حد تک ہوتا ہے۔ مگر نکاح کے معاہدہ میں معاملہ کے علاوہ عبادت اور سنت کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اکثر نکاح کے موقع پر خطبہ سنتے ہیں اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ یعنی نکاح کرنا میری سنت ہے، جو اس سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِ الرَّسُوْلِ (۱) نکاح سائے نبیوں کی سنت ہے قرآن پاک میں بھی انبیاء علیہم السلام کی حیثیت کے متعلق آتا ہے کہ سب نبیوں کی بیویاں تھیں اور بچے تھے۔ اُن میں سے ایسا کوئی نہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو۔ اور معاملہ نہ کرنا ہو۔ اس کو نکاح وغیرہ سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ البتہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اُن کو نکاح کا موقعہ نہیں مل سکا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا۔ البتہ جب وہ قریب قیامت میں دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو پھر نکاح بھی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی، اس کے بعد ان کی طبعی وفات بھی ہوگی اور وہ دفن بھی ہونگے بہر حال نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے۔

نکاح سنت
انبیاء ہے

نکاح اگرچہ ایک اجتماعی معاہدہ ہے مگر اس کی بھی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ شریعت مظہرہ نے کوئی سے مرد و زن کے درمیان نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ بلکہ

شرائط نکاح

میاں بیوی میں جدائی کے لیے شریعت نے طلاق کا طریق کار مقرر کیا ہے۔
فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی تین قسمیں ہیں۔

یعنی احسن، سنت اور بدعت۔ طلاق احسن سے مراد اچھی اور بہتر طلاق ہے اور یہ اُس طلاق کو کہتے ہیں جو عورت کو اُس طہر میں دی جائے۔ جس میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہوا ہو۔ اور ایک وقت میں ایک ہی طلاق ہو۔ ایسی طلاق کی صورت میں عدت کے اندر خاوند دوبارہ عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور رجوع کے لیے نکاح کی ضرورت نہیں۔ اگر عدت گزر جائے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص اب بھی رجوع کرنا چاہے۔ تو دوبارہ نکاح کر کے عورت کو گھر لاسکتا ہے۔ عدت کے بعد عورت کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کی بھی مجاز ہے۔

اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ یعنی دو یا زیادہ سے زیادہ تین طلاقیں دینا چاہتا ہے یعنی اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ عورت کو کسی صورت میں بھی نہیں رکھنا۔ تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور اگر تیسری طلاق دے دی تو پھر یہ طلاق مغلطہ ہو جائے گی، اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس طلاق کو طلاق سنت کہتے ہیں، کہ یہ سنت کے مطابق ہے۔

تیسری قسم طلاق، طلاق بدعت کہلاتی ہے۔ اور یہ ایسی ہے کہ یا تو طہر کی بجائے حیض کے دوران طلاق دے دے یا تینوں طلاقیں بیک وقت دیدے۔ اس طرح طلاق تو واقع ہو جائے گی مگر مینے والا گنہگار ہو گا۔ کیونکہ اس نے صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا۔

اس آیت میں فرمایا الطَّلَاقُ مَثَلَتْنِ یعنی رجعی طلاقیں دو ہیں۔ ایک طلاق مینے کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر دوسری طلاق دے دی تو پھر بھی رجوع کی گنجائش ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں طلاق رجعی میں رجوع دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اگر طلاق صریح الفاظ میں دی گئی ہے۔ تو بغیر

نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر اشائے کناہ سے طلاق دی ہے۔ اور نیت قطعی علیحدگی کی ہے تو یہ طلاق بائن ہو جائے گی۔ اس میں رجوع کے لیے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ خواہ ایک طلاق کے بعد رجوع مقصود ہے یا دوسری طلاق کے بعد۔ تیسری طلاق کا ذکر تو آگے آئیگا۔ یہاں فرمایا کہ رجوع کے لیے زیادہ سے زیادہ در طلاقیں ہیں۔

علحدگی کا طریق کار

فرمایا دوسری طلاق کے بعد فَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ مَالٌ فَادْرِكُوهُنَّ یا تو دستور کے مطابق روک لو۔ اور اس سے اچھا سلوک کرو۔ اس کا خرچہ ادا کرو۔ بشرطیکہ ارادہ اصلاح کا ہو، تنگ کرنے کا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نہ تو عورت کا حق ادا کیا جاوے اور نہ اس کو آزاد کیا جائے۔ بلکہ دستور کے مطابق اس سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ شریعت مطہرہ نے عورت کے جو حقوق مقرر کیے ہیں، انہیں ادا کرو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اَوْ تَسْتَبِیْحُ بِاِحْسَانٍ اسے نیکی کے ساتھ جدا کرو۔ لڑائی جھگڑے میں نہ پڑو بلکہ لین دین کا جو معاملہ ہے اسے احسن طریقے سے نبٹا کر مطلقہ کو رخصت کرو۔ هٰذَا مَا لَكُمْ مِمَّا لَكُنَّ يَدْعُوْنَ اور تمہارے لیے یہ چیز حلال نہیں ہے اَنْ تَاْخُذُوْا مِنْهَا شَيْئًا کہ تم ان عورتوں سے کوئی چیز واپس لے لو، جو تم نے انہیں دے رکھی ہے۔ مثلاً اگر مراد کر دیا تھا، تو طلاق کے وقت واپس لینے کی کوشش کی ہے یا کوئی تحفہ دیا تھا، تو اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عطیہ دے کر اس کو واپس لینا ایسا ہے۔ جیسے کتے کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ فرمایا ہمارے مسلمانوں کی مثال بُری نہیں ہونی چاہیے۔ لَيْسَ لَنَا مِثْلُ السَّوْدِ سورۃ نسا میں آتا ہے کہ وَالتَّيْتُمُ احَدُ الْاِهْلِ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر مال بھی دے رکھا ہے تو ان سے کوئی چیز واپس نہ لو۔ خاص طور پر کوئی بہتان لگا کر مال واپس لینا اور بھی بُرا ہے۔ یہ چیز مسلمان کے شایان نہیں ہے۔ لہذا اگر تم نے طلاق کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ تو پھر دستور کے مطابق اچھے طریقے سے رخصت کرو۔

یہ بات گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے۔ عورت کو نہیں دیا۔ اور اس میں بھی اس کی مصلحت کا فرما ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ حیض و نفاس یا حمل کے دوران عورت کے اعصاب پر خاص اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلد بازہ واقع ہوئی ہے۔ اگر طلاق کا حق عورت کو مل جاتا تو طلاق کے معاملات کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جن ممالک میں عورت کو یہ حق دیا گیا ہے۔ وہاں کس قدر معاشرتی برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔ تو بہر حال طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ اور اُسے عورت پر ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ البتہ بعض غیر معمولی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ اگر خاوند ظلم کرتا ہے۔ اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ عدالت مجازہ کی طرف رجوع کر کے اپنا معاملہ پیش کرے۔ عدالت فریقین کے دلائل سننے کے بعد اگر مناسب سمجھے تو میاں بیوی میں علیحدگی کر سکتی ہے اس صورت میں طلاق کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ اگر فریقین رضا مند ہو جائیں۔ کہ خاوند اتنے مال کے عوض خلع پر راضی ہوگا۔ تو عورت اتنا مال مرد کو ادا کر کے خلع حاصل کر لے گی۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ عام حالات میں تو مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ ادا شدہ مال عورت سے واپس لے لے۔ إِلَّا أَنْ يَتَخَفَ الْإِثْمَ مَا حُدَّ اللَّهُ سَوَاءً اس صورت کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان کا نباہ مشکل ہو گیا ہے۔ اور علیحدگی ضروری ہے۔ تو جب دونوں فریق خلع کے بدلے کسی مال کی ادائیگی پر رضا مند ہو جائیں، تو ایسا مال خاوند لے سکتا ہے۔

اس قسم کا واقعہ خود حضور علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ رئیس المنافقین عبد اللہ ابن ابی کی بلہی حبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے نکاح میں تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ باپ دشمن اسلام ہے۔ اور اس کا بیٹا اور بیٹی جان نثاران اسلام ہیں۔ حضرت ثابتؓ بڑے نیک آدمی تھے۔ مگر شکل و صورت کے لحاظ سے حبیلہؓ کو قابل قبول نہ تھے۔ انہیں احساس کمتری اس طرح پیدا ہوا کہ کسی

موقع پر حضرت جمیلہؓ نے کسی مقام پر پردہ اٹھایا تو وہاں ایک جماعت موجود تھی جن میں حضرت ثابتؓ بھی موجود تھے۔ حضرت جمیلہؓ نے محسوس کیا کہ اُن کا خاوند رنگ روپ اور شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے کم تر ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کہ حضور ہم دونوں بطور میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ثابتؓ میں کوئی اخلاقی کمزوری واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے تو متنفر ہو گئی ہے۔ تو اُس نے عرض کیا۔ حضور! ایسی بات نہیں۔ وہ بڑا با اخلاق ہے۔ وَلَٰكِنِّي اَكْرَهُ الْكَفْرَ فِي الْاِسْلَامِ مگر میں اسلام میں رہ کر کفر کو پسند نہیں کرتی۔ مقصد یہ کہ وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اس سے گلو خلاصی چاہتی ہوں۔ کیوں کہ اگر میں بادلِ نحواستہ اس کے ساتھ رہوں گی تو اس کی فرمانبرداری میں فرق آئے گا۔ اور یہ چسپنہ اسلام کی تعلیمات کے منافی ہوگی۔ لہذا آپ ہماری علیحدگی کی کوئی صورت پیدا فرما دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ثابتؓ نے آپ کو حق مہر میں یا تنہا کے طور پر جو باغ دیا تھا۔ کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو۔ حضرت جمیلہؓ نے کہا کہ ہاں میں ایسا کرنے پر رضامند ہوں۔ اس کے علاوہ اگر ثابتؓ کا اور بھی مطالبہ ہو تو میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ باغ کی واپسی کی شرط پر حضور علیہ السلام نے خلع کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اُن دونوں کی علیحدگی کرادی۔

بہر حال خلع میں طلاق کے الفاظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ طلاقِ بائن کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور طلاق کی طرح اس میں بھی عورت کو عدت گزارنا ہوتی ہے۔ البتہ عدت کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعض فقہائے کرام کا خیال ہے کہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔ تاہم جمہور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی مانند خلع کی عدت بھی تین حیض یا تین ماہ ہے جیسی صورت بھی ہو۔

طلاق بالمال خلع کے علاوہ علیحدگی کی ایک اور صورت بھی ہے جسے طلاق بالمال کہتے ہیں۔ خاوند مال کا مطالبہ کرے کہ اتنا مال مجھے دو تو میں طلاق دیتا ہوں۔ اگر فریقین

رضامنہ ہو جائیں۔ تو مقرر مال کے عوض خاوند باقاعدہ طلاق دے دیگا۔ اور وہ طلاق کے حکم میں آئے گی۔ خلع نہیں ہوگا۔

آیت کے اگلے حصے میں روئے سخن مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف سے فرمایا فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ اے لوگو! اگر تم کو ڈر ہے کہ یہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اب ان کامیاں بیوی کی حیثیت سے گزر اوقات ممکن نہیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے۔ یعنی عورت فدیہ دے کہ مرد سے خلع حاصل کرے۔ ہاں یہ بات یاد ہے۔ کہ اگر خاوند بے قصور ہے۔ اور عورت اُس سے بلا وجہ علیحدگی چاہتی ہے۔ تو وہ گنہگار ہوگی اور اگر خاوند بلا وجہ عورت کو تنگ کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ تاہم دونوں صورتوں میں خلع واقع ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس قسم کا مال لینا مکروہ ہے۔ بخیرہ حال جائز ہے دوسرے فقہائے کرام کا کہنا ہے۔ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاص حالات میں خلع کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے اس کے عوض مال وصول کرنا بالکل جائز ہے۔ اس میں کوئی کڑہت نہیں۔

فَرَمَا يَتْلُكَ حُدُودَ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ یہ نکاح، طلاق، ایلا، خلع وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قوانین ہیں ان کی پاسداری کرو۔ اور ان کے خلاف کر کے اللہ کی حدود کو نہ توڑ بیٹھنا۔ رمضان المبارک میں جہاں روزوں کی فرضیت کا ذکر تھا، وہاں فرمایا کہ روزہ رکھ کر کھانا پینا اور مباشرت حرام ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوهَا۔ اُن کے قریب بھی نہ جانا۔ اور یہاں فرمایا فَلَا تَعْتَدُوهَا ان کو عبور نہ کرنا۔ ظاہر ہے۔ کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا انسان کی غایت درجہ کی خواہشات ہیں۔ اور انسان کسی وقت بھی ان کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے وہاں پخت حکم دیا۔ کہ ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ، کہیں پھسل کر حدود اللہ کو ضائع نہ کر بیٹھو۔ اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسئلہ میں تنازعہ ہوتا ہے

حدود اللہ
کا احترام

دو فریق ملوث ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں پر حدود کی خلاف ورزی کا اتنا خطرہ نہیں ہوتا۔ جتنا روناہ کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ اللہ کی حدود پار نہ کر جانا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اور یاد رکھو وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ جو اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدود سے آگے بڑھے گا۔ ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ ظاہر ہے۔ ظالم مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اللہ کی گرفت میں آتا ہے۔ اس لیے فرمایا جو اللہ کی حدود کو توڑے گا۔ وہ ظالموں میں شمار ہو کر سزا کا مستحق ہو گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس نو و ہفت (۹۷)

آیت ۲۳۰

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ
 فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ
 يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
 يَعْلَمُونَ ۝ (۲۳۰)

ترجمہ: پھر اگر اُس نے طلاق دیدی عورت کو (یعنی تیسری مرتبہ) پس اس کے بعد اُس کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک وہ اس کے علاوہ کسی خاوند کے ساتھ نکاح نہ کر لے۔
 پھر اگر اُس نے بھی طلاق دیدی اس عورت کو تو کوئی گناہ نہیں ہے اُن دونوں پر کہ رجوع کر لیں، اگر وہ گمان کریں کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اُس قوم کے لیے بیان کر رہا ہے جو علم رکھتے ہیں (۲۳۰)

گزشتہ درس میں طلاق کا مسئلہ بیان ہوا تھا اور اس کے بعد خلع کا بیان آیا۔ آج کی آیت کا تعلق بھی مسئلہ طلاق سے ہے۔ وہاں یہ بیان ہوا تھا کہ طلاق دو مرتبہ ہے جس کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اس درس میں تیسری طلاق اور اس کے نتائج کا ذکر آ رہا ہے۔ فرمایا فَإِنْ طَلَّقَهَا یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری مرتبہ طلاق دے دے۔ تو اب رجوع کا حق ختم ہو گیا۔ فَذَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اب اس مرد کے لیے عورت حلال نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے۔ اب یہ عورت پہلے خاوند کے لیے منعظ ہو گئی۔ اگرچہ یہاں پر عدت کا ذکر نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات پہلے آچکی ہے کہ طلاق یا بیوگی کے بعد عورت کے لیے عدت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر نکاح ثانی نہیں کر سکتی۔ یہاں پر بھی وہی صورت ہے۔ جب کوئی شخص تیسری طلاق دے دے، تو پھر وہ عورت عدت کے اہم پڑے کرے گی۔ اور اس کے بعد

حلالہ

دوسری جگہ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا اور اگر اب دوسرا خاوند بھی اس کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے۔ تو عورت کو پھر دوسری عدت گزارنا ہوگی۔ اس کے بغیر تیسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ جب یہ دوسری عدت بھی پوری ہو جائے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا تو پہلے خاوند اور عورت پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر رجوع کر لیں بشرطیکہ اِنْ ظَنَّا اَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ وہ گمان کریں کہ اللہ کی حدود کو قائم کریں گے مطلب یہ کہ اُن دونوں کو اس بات کا احساس ہو جائے۔ کہ انہوں نے علیحدگی اختیار کر کے سخت پریشانی اٹھائی ہے۔ لہذا آئندہ ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دیں گے۔ تو وہ دوبارہ نکاح کر کے زوجین کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

طلاق کی
مختلف صورتیں

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان آچکا ہے۔ اَنْطَلَقَ مَرَّتَيْنِ طلاق دراصل دو ہی ہیں۔ جن میں رجوع کی گنجائش ہے۔ اور اس کی آخری حد تین ہے۔ جس کے بعد جدائی لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اہم ماہک تیسری طلاق کو پسند نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔ کہ تیسری طلاق دیتی ہی نہیں چاہیے۔ تاہم طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے۔ کہ ایسے طہر میں ایک طلاق دی جائے جس میں مباشرت نہ کی ہو۔ جب تین حیض یا تین ماہ (جیسی بھی صورت ہو) گزر جائیں گے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ لہذا دوسری اور تیسری طلاق دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک یا دو طلاق کی صورت میں عدت کے دوران بغیر دوبارہ نکاح کئے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر عدت گزر جائے۔ تو پھر بھی دوبارہ نکاح کر کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت نہیں اور کوئی قباحت نہیں۔ اس طریقہ طلاق کے مطابق اگر ایک طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دی جاسکتی ہے۔ اب بھی سوچنے سمجھنے کا موقع موجود ہے۔ انسان ٹھنڈے دل سے عذر کر کے متنازعہ امور کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص تیسری طلاق ضرور ہی دینا چاہتا ہے۔ تو پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیدے۔ بہر حال بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ تین طہر میں تین طلاق دے حیض کی حالت میں طلاق دینے سے اگرچہ

طلاق تو واقع ہو جاتی ہے۔ مگر انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ طلاق بدعت کہلاتی ہے
 بیک وقت تین طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ آدمی گنہگار ہوتا ہے۔ سنت کے خلاف ہے
 حیض کی حالت میں طلاق دینے، تین طلاقیں بیک وقت دینے یا ایک ہی طہر میں
 تین طلاقیں دینے کے متعلق فقہائے کرام کے تین مختلف مسلک ہیں۔ شیعہ حضرات کے
 نزدیک حیض کی حالت میں تین طلاقیں اکٹھی دینے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، صرف
 ظاہر یہ جن میں اہل حدیث بھی شامل ہیں، ان کا مسلک یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی
 شمار ہوتی ہیں۔ انہیں طائوس، مقاتل، نخعی وغیرہ شامل ہیں۔ اور تیسرے مسلک ائمہ اربعہ کا ہے جسے اکثر صحابہؓ
 اور تقریباً تمام تابعین اور جمہور ائمہ کی تائید حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین طلاق بیک وقت دینے
 کا طریقہ تو بلاشبہ غلط ہے اور ایسا کرنے والا گنہگار بھی ہوتا ہے مگر تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

طلاق ثلاثہ
 کی تحقیق

جو حضرات تین طلاق کو ایک تصور کرتے ہیں وہ مسلم شریف میں منقول حضرت
 عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور
 علیہ السلام، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک تین طلاقیں ایک
 ہی طلاق تصور ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا۔ جو شخص بیک وقت تین
 طلاقیں دے گا، وہ تین ہی سمجھی جائیں گی۔ اس حدیث کے متعلق جمہور فقہاء اور ائمہ کرام
 فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا
 بیان ہے کہ فلاں فلاں زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، یہ خود حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے
 اس استدلال میں کمزوری یہ ہے کہ اس حدیث کے برخلاف خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور یہ اصول حدیث
 کا کلیہ ہے کہ جب کوئی راوی خود اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے یا عمل کرے تو وہ
 روایت ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حضرت ابوبکرؓ والی حدیث ہے جس
 میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو
 برتن سات دفعہ دھونا چاہیے جس میں ایک مرتبہ مٹی مل کر دھونا بھی شامل ہو۔ اب حضرت
 ابوبکرؓ کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ صرف تین دفعہ دھونے سے برتن پاک ہو جاتا ہے

چونکہ کتے کے دہن کا لعاب جراثیم آلود ہوتا ہے۔ اس لیے ایک دفعہ مٹی بھی مل لی جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ تین دفعہ پانی کے ساتھ دھو لینا کافی ہے۔ لہذا سات مرتبہ دھونے والی حدیث ناقابل عمل ہو گئی۔ اتنی دفعہ دھونا ضروری نہ رہا۔ بلکہ اگر احتیاطاً کوئی سات دفعہ بھی دھو لے تو وہ استنجاب کے درجہ میں آئیگا، لازم نہیں رہا۔ لہذا حضرت ابن عباسؓ کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تصور کرنے والی روایت کے استدلال میں کمزوری واقع ہو گئی۔

اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کے اکثر شاگرد مذکورہ روایت ہی بیان کرتے ہیں۔ جس میں تین طلاق کو ایک تصور کیا گیا ہے۔ مگر ابو داؤد شریف کی روایت کے مطابق آپ کے ایک شاگرد ایک دوسری روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دی ہیں۔ آپ نے برہتہ فرمایا عَصِیْتَ رَبِّکَ وَبَانَکَ مِنْکَ اِمْرَاُتُکَ یعنی تو نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور تیری عورت بھی تجھ سے جدا ہو گئی۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ خود حضرت ابن عباسؓ تین طلاق کو تین ہی تصور کرتے تھے۔ جبھی تو فرمایا۔ کہ اگرچہ تو گنہگار ہوا ہے۔ مگر طلاق واقع ہو گئی۔ اور تیری بیوی تجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

طحاوی شریف میں ایک اور روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا اِنَّکَ عَصَیْتَ اللہَ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ وَاطَاعَ الشَّیْطٰنَ اور شیطان کی بات مانی۔ وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًا مگر اب خلاصی کی صورت بھی باقی نہیں رہی۔ عورت کو طلاق واقع ہو گئی۔

موطا امام مالکؒ میں محمود بن لبیدؓ سے روایت منقول ہے۔ آپ چھوٹی عمر کے صحابی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں اکٹھی دے دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اللہ کی کتاب کو کھیل اور مشغلہ بنانا درست نہیں۔

آپ سخت ناراض ہوئے۔ اتنے میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی، حضور! کیا میں اس کو مار نہ ڈالوں۔ مگر آپ خاموش ہے۔ آپ نے مزید کچھ نہیں فرمایا۔ مگر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ بیک وقت طلاق ثلاثہ سے آدمی گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ مگر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

موطا امام مالک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا طَلَّقْتُ مَائَةً میں نے اپنی عورت کو سو طلاقیں دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین طلاقوں کے ساتھ تو عورت علیحدہ ہو گئی، باقی ستائیس طلاقیں دیگر تم نے اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔

لہذا تین طلاقوں کے ایک طلاق واقع ہونے والی روایت قابل عمل نہیں رہی۔ البتہ اس کے متعلق فقہائے کرام یہ توجہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام، حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی دور تک لوگ ایک ہی طلاق دیتے ہوں۔ تین کا رواج ہی نہ تھا۔ پھر جب لوگوں نے تین طلاقیں دینا مشروع کیں تو حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا کہ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا۔ وہ تین ہی شمار ہوں گی۔ لہذا کوئی غلط فہمی میں نہ ہے۔ کہ تین طلاق بیک وقت دینے سے ایک ہی واقع ہوگی اور وہ رجوع کر سکے گا۔ لہذا لوگ خبردار رہیں۔

ابوداؤد شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ تین طلاقوں کا ایک طلاق شمار کرنا اس عورت کے لیے ہے جس کا نکاح ہوا مگر خاوند سے خلوت نہیں ہوئی۔ وہ شخص اگر ایک وقت میں تین طلاق بدیں الفاظ دیتا ہے۔ کہ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تو ایسی عورت پہلی طلاق پر ہی جدا ہو جائے گی۔ اس کی دوسری اور تیسری طلاقیں لغو ہیں۔ کیونکہ عورت کے غیر مدخولہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ایک طلاق ہی کافی ہے۔ یہاں دوسری اور تیسری طلاق کا کوئی موقع محل نہیں ہے۔
العقد ص! تین طلاقوں کو ایک تصور کرنے کے متعلق صرف حضرت عبداللہ

بن عباسؓ والی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص روایت نہیں۔ اس روایت کے متعلق معلوم ہو گیا۔ کہ یہ استدلال کمزور ہے اور روایت مؤول ہے البتہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت آتی ہے۔ کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ حضرت! اگر کوئی حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دیدے تو اس کا کیا حکم ہے۔ فرمایا اگر کوئی ایسی بیوقوفی کر لے تو عورت تو جدا ہو جائیگی البتہ طلاق دینے والا گنہگار ہوگا۔ کہ اس نے غلط موقع پر طلاق دی۔ ابن حزمؒ اور بعض دوسرے ائمہ یہ نکتہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ پہلی آیت میں فرمایا "الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ" یعنی طلاق دو مرتبہ ہے۔ جس میں رجوع ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا "فَإِنْ طَلَّقَهَا" اگر اس نے (تیسری) طلاق دیدی۔ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر "فَإِنْ" کی بجائے "ثُمَّ" کا لفظ بھی آسکتا تھا۔ مگر اس میں حکمت یہ ہے کہ فِی الْاِصْطِلَاحِ کے لیے آتا ہے۔ جب کہ "ثُمَّ" میں یہ معنی نہیں پایا جاتا۔ تو یہاں پر "فَإِنْ طَلَّقَهَا" کا معنی یہ ہوگا کہ دو طلاق کے بعد اگر متصلاً تیسری طلاق دیدے یعنی بیک وقت تین طلاقیں دیدے۔ تو عورت حرام ہو جائے گی۔ جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کر لے۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ متصل تین طلاقیں تین ہی تصور ہوں گی۔

اس وقت ہر وجہ حلالہ کی جو صورت ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہے۔ یہ مشروط نکاح حلالہ مشروط نکاح کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں۔ کہ اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ تو کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پر نکاح کر دیا۔ کہ وہ طلاق دیدے گا۔ اور پھر پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے گا۔ اگرچہ اس طرح قانونی جواز تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اس شرط کے تحت نکاح گناہ کبیرہ ہے۔ ایسے حلالے پر لعنت کی گئی ہے۔ اَلْعَنَ اللّٰهُ الْمَحْلِلَ وَالْمَحْلِلَ لَہ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا۔ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

بہر حال یہ حلال حرام کا مسئلہ ہے۔ اور اگر حلال و حرام میں اختلاف پیدا ہو جائے
 تو کلیہ یہ ہے کہ حرام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں تین طلاق پر عورت
 حرام ہو جائیگی، خواہ بیک وقت تین طلاق دی ہوں۔ ایک ہی طہر میں دی ہوں یا
 حیض کے دوران دی ہوں۔ اب عورت اس مرد کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ جب
 تک کہ وہ دو سکر خاوند سے نکاح نہ کرے۔ پھر وہ خاوند فوت ہو جائے یا طلاق
 دے دے تو دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔

فَمَا يَوْمَ تَأْتِيكُمُ الۡحُدُودُ ۚ يٰۤاَلۡلّٰہُ ۚ یَاۤاَللّٰہُ تَعَالٰی کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ یُبَیِّنُہَا
 لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ جو کہ اہل علم قوم کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ مسئلہ نکاح کا ہو،
 طلاق یا عدت کا ہو۔ ایلا یا ظہار کا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے واضح حدیں
 مقرر کر دی ہیں۔ ان حدود کا احترام کرنا چاہیے اور ان کو عبور نہیں کرنا چاہیے۔
 ورنہ انسان گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نود و ہشت (۹۸)

آیت ۲۳۱ تا ۲۳۲

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ
 أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تَسْكُوهُنَّ ضَرَارَ التَّتَعُّدِ وَاجِبٌ
 وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا
 آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَإِذْ كُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا
 أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ
 وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۚ
 وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ
 أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَلِكَ
 يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ
 ذَلِكَُمَ أَنْزَلْنَاهُ لَكُمْ وَظَهَرَ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
 لَا تَعْلَمُونَ ۚ

ترجمہ :- اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت تک پہنچیں۔ پھر ان
 کو دستور کے مطابق روک نہ کھو یا ان کو چھوڑ دو دستور کے مطابق۔ اور ان کو ضرر پہنچانے
 کے لیے نہ روکو، تاکہ تم ان پر زیادتی نہ کرو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ بیشک اس نے اپنی
 جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بھڑاؤ۔ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو۔
 جو اس نے تم پر کی ہے۔ اور جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں
 کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 ہر چیز کو جاننے والا ہے ۚ (۲۳۱) اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پھر جب وہ

عدت کو پہنچیں۔ تو تم ان عورتوں کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح
کریں۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہو جائیں۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ ان کے
ساتھ نصیحت کی جاتی ہے۔ اس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین
رکھتا ہے۔ یہ بات تمہارے لیے زیادہ شائستہ ہے اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے (۲۳۲)

طلاق برائے
ایذارسانی

گزشتہ درس میں یہ مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ طلاقیں اصل میں دو ہی ہیں۔ جب
یسری طلاق دیدی جائے تو پھر بغیر حلالہ کے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا
آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق اور عدت سے متعلقہ دو اور مسائل بیان
فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری طلاق کے بعد جب عدت پوری ہو جائے
تو پھر عورتوں کو بلا وجہ تنگ نہ کرو۔ اگر انہیں روکنا ہے تو معروف طریقے سے اور
اگر رخصت ہی کرنا ہے تو بھی اچھے طریقے سے انہیں رخصت کر دو۔ اور دوسرا
مسئلہ یہ ہے کہ کسی مطلقہ یا بیوہ کو نکاح ثانی کرنے سے منع نہ کرو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے
بلکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق نکاح کی اجازت دو۔

زمانہ جاہلیت میں ایک غلط رسم جاری ہو گئی تھی کہ عورتوں کو تنگ کرتے تھے
طلاق دے دیتے، جب عدت قریب الاختتام ہوتی تو رجوع کر لیتے۔ کچھ عرصہ بعد
پھر طلاق دے دیتے اور جب عدت پوری ہونے کو آتی تو رجوع کر دیتے۔ مقصد یہ
کہ نہ تو عورت کو معقول طریقے سے آباد کرتے اور نہ اُسے رخصت کرتے کہ وہ دوسری
جگہ نکاح کر سکے۔ یہ سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہتا۔ جس کی وجہ سے بے گناہ
عورتوں کو سخت اذیت ہوتی۔ اس قسم کی قباحت کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد
فرمایا۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دیدو
اور پھر ان کی عدت پوری ہو جائے۔ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ پھر یا انہیں
دستور کے مطابق روک لو یعنی رجوع کر لو۔ یعنی اگر تمہیں اپنے سابقہ فعل پر واقعی
ندامت ہوئی ہے تو اپنا گھر دوبارہ آباد کر لو اور اس میں نیت اصلاح کی ہونی چاہیے

محض ایذا رسانی اور عورت کو حق سے محروم کرنے کے لیے ایسا مت کرو۔ بالکل نیک نیتی سے رجوع کرو۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو۔ صلح صفائی کی صورت نظر نہ آتی ہو۔ اَوْسَرَّ حَوْضًا بِمَعْرُوفٍ تو پھر انہیں معروف طریقے سے رخصت کرو دو تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرے خاندان کے ساتھ نکاح کر سکیں سَرَّحَ کا معنی چھوڑ دینا یا آزاد کر دینا ہے جانوروں کو جنگل میں چرنے کے لیے چھوڑ دینا تَسَرَّحَ کہلاتا ہے۔ اور جب جانور شام کے وقت جنگل سے واپس پلٹتے ہیں۔ تو اس وقت تَسَرَّحَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "حِينَ تَسَرَّحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ" یعنی جب تم جانوروں کو واپس پلٹاتے ہو اور جب انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو۔ کنگھی کرنے کو بھی تَسَرَّحَ کہتے ہیں۔ اس سے بالوں کی الجھن دور ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ تو پھر مطلقہ عورتوں کو بلا وجہ دست رو کو بلکہ انہیں احسن طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو۔ انہیں طعن تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ۔ گالی گلوچ نہ کرو۔ بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ کرو۔ فرمایا وَلَا تَصْسِكُوهُنَّ خِيَارًا لِّتَعْتَدُوا اور انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر دست رو کو یہ زیادتی کی بات ہے۔ عورتوں پر زیادتی مت کرو۔ اس طریقہ سے انہیں روکنا حرام ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ جِوًّا يَكْرِهْ۔ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ دوسری جگہ واضح طور پر آتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ۔ ہاں اللہ تعالیٰ بعض اوقات ظالموں کو مہلت دے دیتا ہے۔ مگر بالآخر وہ گرفت میں آجاتے ہیں۔ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ فرمایا کہ اللہ کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی نہ کر کے وَلَا تَسْتَحْذُوا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُوَ اللّٰهُ کی آیات کو تمسخر کا نشانہ نہ بناؤ۔ یہ بہت بڑی بات ہے تمسخر کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص غلام کو کہہ دے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ اور پھر کہے کہ یہ تو میں نے مذاقاً کہا تھا۔ میری نیت تو آزاد کرنے کی نہ تھی۔ یاد رکھو اگر کوئی دل لگی کے لیے بھی غلام کی آزادی کا اعلان کرتا ہے تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ٹھٹھا

کے طور پر کہتا ہے کہ میں نے طلاق دی۔ تو بھی طلاق ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ ان پر سختی سے عمل کرو۔

فرمایا وَاذْكُرُوا النِّعَمَ الَّتِي عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان یاد کرو۔ جو اُس نے تم پر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔ تمہارے درمیان عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا ہے۔ جو تمہاری تربیت کرتا ہے اجتماعی لحاظ سے تمہیں حکومت عطا کی ہے۔ مال و دولت دیا ہے۔ جاہ و اقتدار بخشا ہے۔ عزت و آبرو دی ہے۔ ان احسانات کو یاد کر کے اس کے شکر گزار بن جاؤ۔ اور پھر ایک خاص احسان یہ کیا وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ تم پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آخری پر و گرام ہے۔ جس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ کوئی نبی نہیں اور کوئی پر و گرام نہیں۔ اور پھر اس کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی۔ قرآن پاک خود سرِ حکمت ہے۔ مگر اس کے ساتھ نبی کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات پر از حکمت ہیں۔ حکمت کا لفظ حضور علیہ السلام کے ارشادات پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں دو جگہ پر موجود ہے کہ اس انعام کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کتاب و حکمت کی صورت میں کیا ہے۔ اہم مالک فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت اور اس کا اتباع حکمت ہے۔ اور یہ نہایت بصیرت افروز اور حکمت آمیز باتیں ہیں، دانش وری کی باتیں ہیں، اسی لیے فرمایا وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، وہ خیر کثیر یعنی بہت زیادہ بھلائی سے نوازا گیا۔ آگے اسی سورۃ میں اس کی مزید وضاحت آئیگی۔ فرمایا يُعْظُمُ بِهِ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ کہ بُرے چیزوں کی طرف راغب نہ ہو۔ بلکہ وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ کہیں اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھو۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اپنی نیت کو پاک صاف رکھو وَاَعْلَمُوا اور یاد رکھو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں وہ تمہارے دلوں کے ارادے

اور نیتوں کو بھی جانتا ہے تم خدا کو کسی طرح دھوکہ نہیں دے سکتے۔

نکاح میں عورت
کی رضامندی

آگے دو سکر مسئلہ کا بیان ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی عدت ختم ہو جائے فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ تو انہیں اس بات سے مت روکو أَنْ يَتَّكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں إِذَا تَرَاصُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ جب ان کے درمیان دستور کے مطابق راضی نامہ ہو جائے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ کی بہن کا نکاح ایک شخص سے ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اُس شخص نے طلاق دیدی۔ صحابی رسول نے اُسے رجوع کے لیے کہا مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اور مد پوری ہو گئی۔ تاہم یہ طلاق مغلط نہیں تھی دوبارہ نکاح ہو سکتا تھا۔ جب عورت آزاد ہو گئی۔ تو بعض دو سکر لوگوں نے بھی نکاح کے پیغام بھیجے۔ اتنے میں اُس شخص کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور اس نے بھی دوبارہ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ عورت بھی اس پر رضامند ہو گئی۔ کہ چلو کسی غیر کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں فَهَوِيَ مَا هَوَيْتَ یعنی دونوں کی خواہش تھی۔ کہ ان کا دوبارہ نکاح ہو جائے۔ مگر حضرت معقلؓ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کا استدلال یہ تھا۔ کہ جس شخص نے اُس کی بہن کو طلاق دی اور پھر کہنے کے باوجود رجوع نہیں کیا۔ ایسے کھینے شخص کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ اسی دوران یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام نے انہیں بلا کر اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا۔ کہ اگر مرد اور عورت نکاح پر رضامند ہیں۔ تو پھر ولی کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے جب حضرت معقل بن یسارؓ نے یہ حکم سنا تو کہا سَمِعْتُ الرَّبِّيَّ وَطَاعَةً ہم اپنے رب کی بات سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہی مشاء ہے تو میں اپنے رب کی اطاعت کروں گا۔ چنانچہ ان دونوں کا دوبارہ نکاح ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ اگر کوئی مرد اور عورت نکاح پر رضامند ہوں۔ تو بلا وجہ انہیں اس کام سے نہ روکو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت صرف

پہلے خاوند سے ہی نکاح کر سکتی ہے بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عاقل بالغ عورت اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ درمیان میں بلاوجہ رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ دونوں دستور کے مطابق صحیح طریقہ سے نکاح پر رضا مند ہوں۔ اگر عورت کی رضامندی کے خلاف دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔ تو کئی قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ جن کی وجہ سے یہ گنہگار ہوں گے۔ لہذا اُسے اپنی مرضی سے نکاح کر سکی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ صرف ایک شرط ہے۔ کہ عورت کا مجوزہ خاوند اُس کا کفو (میسر) بھی ہو۔ اور اسے حق ہر بھی پورا میسر آتا ہو اور اور بھی کوئی چیز باعث تحقیر نہ ہو۔ تو انہیں نکاح کی اجازت دے دینی چاہیئے۔

مسئلہ ولایت

اس موقع پر مسئلہ ولایت کا مختصر بیان بھی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف ہے کہ آیا عاقل بالغ عورت بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کے حق میں ہیں۔ جب کہ امام شافعیؒ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ تاہم امام عظیمؒ کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ نابالغ عورت کا نکاح تو بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ البتہ عاقل اور بالغ عورت باکرمہ ہو یا یتیمہ بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے۔ فرمایا یہ نکاح تو ہو جائے گا۔ مگر یہ ناپسندیدہ فعل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک چیز کی گنجائش ہے۔ اگر عورت نے اپنی مرضی سے غیر کفو کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ تو ولی یا سرپرست ایسے معاملہ کو عدالت میں لے جاسکتا ہے۔ اور اگر عدالت مناسب سمجھے تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بات بڑی قیمتی ہے۔ اگر عورتیں خود بخود نکاح کرنے لگیں تو پھر تو یہ دھاندلی ہوگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ نکاح سرپرست کی معرفت سے ہونا چاہیئے۔ لڑکی کا باپ ہے یا بڑا بھائی یا چچا ہے، وہ خود دیکھ بھال کر نکاح کا فیصلہ کریں۔ تاہم نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ بہر حال اگر عورت اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہے۔ تو نکاح جائز ہوگا۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے۔ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ یعنی ولی کے بغیر نکاح ہی نہیں ہوتا ہے۔ بعض فقہانے کراہت کہتے ہیں کہ اس روایت کی رو سے بغیر ولی کے نکاح باطل ہوگا۔ پوری روایت اس طرح ہے۔ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَبِشَاهِدَي عَدْلٍ وَدُلٍّ اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے لیے دو عادل گواہ ضروری ہیں۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ولی کا ہونا لازمی نہیں۔ دو گواہ ضروری ہیں۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ ولی کی رضا مندی اور اسکی سرپرستی بہتر ہے اب آگے دوسرا مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جائے اور وہ دوسرا عقد کرنا چاہے۔ تو اسے اجازت دے دینی چاہیے۔ نکاح میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ فرمایا وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ حَبْ تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں۔ فَلَا تَقْضُوا لَهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَنْ وَاجِهْنَ انہیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوند سے نکاح کریں۔ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق راضی ہو جائیں۔ امام شافعیؒ یہاں بھی پہلے لفظ تَقْضُوا لَهُنَّ سے استدلال کرتے ہیں کہ یہ ولی کو کہا جا رہا ہے کہ نکاح میں رکاوٹ نہ بنیں۔ گویا ولی کا دخل ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ لفظ يَنْكِحْنَ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نکاح کرنا عورت کا حق ہے۔ یہ اسے اختیار ہے کہ وہ اپنی حسبِ مشاء نکاح کرے۔ اس کی مثال حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ میں بھی ملتی ہے کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور پھر یہاں آگے آتا ہے ذَلِكْ يُوعَظُ بِهِ اس بات کی نصیحت کی جاتی ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط تم میں سے اُس شخص کو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں دخل نہ بنے۔ ذَلِكُمْ أَزْكَ لَكُمْ وَأَطْهَرُ یہ چیز تمہارے لیے زیادہ شائستگی اور زیادہ پاکیزگی والی ہے۔ عورتوں کو نکاح ثانی سے مت روکو۔ ورنہ کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ یہاں

نکاح ثانی میں
رکاوٹ نہ بنو

پہ طہارت سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی پاکیزگی ہے۔ نکاح کر لینے سے ان کے دل بھی مطمئن ہو کر پاک ہو جائیں گے اور ظاہر کسی گناہ میں ملوث ہونے کا احتمال بھی نہیں ہوگا۔ فرمایا واللہ یعلم و انتم لا تعلمون اللہ تعالیٰ جو ایسے احکام نازل کر رہا ہے۔ ان کی حکمت کو بھی وہی جانتا ہے۔ تم اس کی گہرائی سے واقف نہیں ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عورت کو نکاح ثانی کی اجازت دو، اس میں رکاوٹ نہ بنو۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
 أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
 بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ
 بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ
 فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ
 وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۲۳۳

ترجمہ :- اور مائیں یعنی بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں
 یہ اس شخص کے لیے ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور والد کے
 ذمہ ہے۔ ان کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق۔۔۔ نہیں تکلیف دی جائیگی کسی
 نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق، نہیں نقصان پہنچایا جائے گا والدہ کو اس کے بچے
 کی وجہ سے اور نہ والد کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی طرح لازم
 ہے۔ پس اگر بچے کے والدین دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں آپس کی رضا مندی اور
 مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم ارادہ کرتے ہو اپنی اولادوں کو
 دودھ پلانے کا دوسری عورتوں سے، تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب کہ تم دیدو
 وہ چیز جو مقرر کی ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک
 اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۝۲۳۳

اس درس میں طلاق ہی کے ضمن میں مسئلہ رضاعت بیان ہوا ہے۔ مسئلہ رضاعت

یعنی طلاق کے بعد اگر عورت کی گود میں بچہ ہو، تو اس کی پرورش کس طرح ہوگی۔ بچے کی ذاتی دیکھ بھال کون کریگا اور اس کا خرچہ کون برداشت کریگا۔ رضاعت کا لفظی معنی 'دودھ پلانا' ہے۔ چونکہ بچہ مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور دودھ عورت پلاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد و زن کی علیحدگی کی صورت میں بچے کی پرورش کیسے ہوگی۔ جب کہ اصولاً بچے کو مرد کی تحویل میں چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال لُحْنِ اَرَادَ اَنْ تُتِمَّ الرِّضَاعَةُ یہ اس شخص کے لیے حکم ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ علیحدگی کی صورت میں اپنی ماں کا دودھ پلانے میں خاص حکمت کا فرما ہے۔ اگرچہ بچہ اپنی ماں کی بجائے کسی دوسری عورت کا دودھ پئے گا۔ تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی۔ نکاح کے متعلق رضاعی ماں کے بھی وہی احکام ہیں۔ جو حقیقی ماں کے ہیں۔ لہذا جب بچہ نکاح کے قابل ہو گا، تو جس طرح اس کا نکاح حقیقی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے بعض عورتوں سے حرام ہے، اسی طرح رضاعی ماں کی وجہ سے جو رشتہ دار بہن، چچی، بھتیجی، خالہ، بھانجی وغیرہ ہوں گے۔ اُن سے بھی نکاح نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ترغیب دی کہ طلاق کی صورت میں جہاں تک ممکن ہو مصلقہ عورت کا بچہ اپنی ماں کا دودھ پئے۔ لہذا اس کے لیے احکام نازل فرمائے۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ نسا میں آئیگی۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ۔

ت عبت
قد رضاعت

رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت کے متعلق فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ جن فقہائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ رضاعت کی مدت دو سال بتاتے ہیں حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ مگر اہم ماہات دو سال تین ماہ کے قائل ہیں۔ اہم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کی انتہائی مدت اڑھائی سال ہے۔ وہ سورۃ احقاف کی آیت وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا یعنی حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے جو کہ اڑھائی سال

بنتے ہیں۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو دو سال کا ذکر آیا ہے، تو یہ قانونی
 مدت رضاعت ہے۔ قانونی حیثیت سے دو سال تک دودھ پلانا ضروری ہے تاہم
 زیادہ سے زیادہ مدت پڑھائی سال ہے۔ تاہم کسی کو دو سال سے زیادہ عرصہ کے لیے
 دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقی طور پر اگر ماں رضامنڈ ہو تو ایسا ہو سکتا ہے
 اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا وَالْوَالِدَاتُ
 يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ۔ اور حقیقی ماں کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے
 کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہے۔ دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی بیماری
 بھی لاحق نہیں۔ تو ایسی حالت میں دودھ پلانا ماں پر واجب ہے۔ اور اس کے
 خرچہ کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو چکی ہے
 مگر ابھی عدت میں ہے تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہے۔
 البتہ ماں اور بچے کا خرچہ مرد کے ذمے ہے۔ جب تک عدت ختم نہ ہو ہر قسم کا خرچہ
 خوراک، لباس، رہائش علاج وغیرہ سب آدمی کی ذمہ داری ہے۔ اب تیسری صورت
 یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو کہ عدت ختم ہو چکی ہے۔ تو اس حالت میں عورت کی ذمہ داری
 ساقط ہو جاتی ہے بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اسکے باپ پر عائد ہوتی ہے اگر بچے کی حقیقی ماں
 دودھ پلانے پر رضامنڈ ہو تو باپ کو چاہیے کہ اسے اولیت دے اور اس کا خرچہ معمول کے مطابق
 برداشت کرے ہاں اگر عورت معمول سے زیادہ خرچہ طلب کرے تو پھر اسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری
 نہیں۔ مرد کسی دوسری عورت کو اجرت دے کہ بچے کو دودھ پلوا سکتا ہے۔ بعض
 اوقات حقیقی ماں کا دودھ کسی عارضہ کی وجہ سے مضر صحت ہوتا ہے۔ یا دودھ اتنا کم
 ہے کہ بچے کی پرورش ٹھیک طور سے نہیں ہو سکتی۔ تو ایسی صورت میں بھی باپ
 کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے۔
 فرمایا وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يَرْضِعُ وَيَكْسُوْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ
 جب یہ طے ہو جائے کہ باں ہی بچے کو دودھ پلانے کی تو پھر ایسی ماؤں کی خوراک
 اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق بچے کے باپ پر ہوگی۔ عورت خواہ مرد کے

نکاح میں ہے یا مطلقہ ہو کر عدت گزار رہی ہے۔ اُس کے اخراجات مرد بہداشت کرے گا۔ اور اگر عورت عدت پوری کر کے بائٹل جدا ہو چکی ہے۔ تو پھر اُس کو اُسی طرح اجرت دی جائیگی جس طرح کسی غیر عورت کو دی جاتی ہے۔ معاوضہ دستور کے مطابق معقول ہونا چاہیے، نہ کم نہ زیادہ اور اس معاملہ میں لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا رَأً وَسَعَهَا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائیگی۔ مثلاً عورت کو کوئی عارضہ ہے اور دودھ پلانے کے قابل نہیں ہے۔ یا دودھ پلانے سے اس کی صحت کو خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اُسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مرد کی مالی حالت کمزور ہے۔ تو اس کی حیثیت سے زیادہ اجرت طلب نہیں کی جائیگی اسی لیے فرمایا لَا تُضَارُّ وَالِدَةُ كَبُولَدِهَا والدہ کو اس کا اپنا بچہ ہونے کی بناء پر نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چونکہ اس کو بچے سے محبت ہے اور اُس کی مامتا کا تقاضا ہے۔ کہ اُسے خود دودھ پلانے تو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مال کو کم اجرت پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ وَلَا مَوْلُوهُ لَهٗ كَبُولَدِهِ اور نہ باپ کو محض اس وجہ سے تکلیف دی جائیگی۔ کہ وہ بچے کا باپ ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہے۔ مگر وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اجرت نہیں دے سکتا۔ لہذا مال کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچے کے باپ کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ معاملہ افہام و تفہیم کے ذریعے دستور کے مطابق اور باپ کی مالی حالت کے پیش نظر طے کرنا چاہیے۔

اسلام میں یہ ایک عام قانون ہے۔ کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا دستور بھی یہ ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا رَأً وَسَعَهَا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ عبادات میں دیکھ لیں۔ اگر کوئی شخص معذور ہے یا مجبور ہے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ جائے۔ لیٹ کر پڑھ سکتا ہے، اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بیمار ہے یا مسافر ہے تو روزہ کو قضا کر سکتا ہے۔ دودھ پلانے کے معاملہ میں بھی فرمایا کہ کوئی فریق دوسرے فریق کو تنگ نہ کرے، بلکہ معمول کے مطابق احسن طریقہ

سے یہ کام انجام دیا جائے۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچے کا باپ فوت ہو چکا ہو، تو اس کی یتیم بچے کی رضاعت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ جس طرح باپ بچے کی پرورش کا ذمہ دار تھا اُسی طرح اسکی عدم موجودگی میں وارث اس کی ذمہ داری قبول کرے گا۔ اب وارث سے کون سا وارث مراد ہے۔ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں۔ وارث اگر بطور اسم جنس لیا جائے۔ تو اس کے معنی تمام وارث ہوں گے۔ ہر وارث ترکہ سے جس قدر وراثت کا حق دار ہے، اسی نسبت سے وہ یتیم بچے کی پرورش کا خرچہ بھی برداشت کرے گا۔ اہم بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد باپ کے وارث ہیں اور ان میں خود کچھ بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے بچے کی پرورش یعنی اس کی ماں کا نان نفقہ بچے کی جائیداد سے ادا کیا جائیگا۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وارث بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ فوت ہو جائے۔ تو اس کا ترکہ کن کن وارثوں کو پہنچتا ہے اس لحاظ سے جو وارث بنتے ہیں۔ وہی رشتہ دار بحساب حصہ رسدی وراثت بچے کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ یعنی جس وارث کو بچے کی جائیداد سے آدھا حصہ مل سکتا ہے۔ وہ بچے کے نصف خرچہ کا ذمہ دار ہوگا اور جس کو ایک تہائی، چھٹا حصہ یا آٹھواں حصہ پہنچتا ہے۔ وہ اُسی قدر بچے کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مولانا مہناویؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کی اپنی جائیداد نہ ہو، تو پھر اُس کے مالدار عزیزوں میں سے جو اس کے وارث اور محرم ہوں وہ اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ محرم سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے اور اس کے عزیزوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے، تو دونوں کا نکاح درست نہ ہو اس لحاظ سے بچے کی ماں پر بھی ذمہ داری آتی ہے۔ مثلاً یتیم بچے کی ماں موجود ہے اور اس کا دادا بھی ہے۔ تو وراثت کے حصہ رسدی کے مطابق بچے کی کفالت ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگی۔ اس لحاظ سے بچے کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ بھی بحیثیت وارث اور محرم اس کی پرورش کے ذمہ دار ہیں

تفسیر روح البیان کے مطابق متوفیؒ کے عصبت بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی چچا، تایا، دادا وغیرہ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔

یہاں پر مطلق وارث کا لفظ استعمال کرنے میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ حالات کے مطابق شرعی عدالت یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری کسی بھی وارث پر ڈال سکتی ہے تاہم عدالت کو یہ بات مدنظر رکھنا ہوگی کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری بچے کی اپنی جائداد پر ڈالی جائے۔ پھر بچے کے قریبی وارثوں پر اور پھر متوفی کے عصبیات پر کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ حق ادا کرنے کا حق بھی اسی پر عائد ہوتا ہے۔ جو حق وصول کرنے کا حق رکھتا ہے ایک صورت اور بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ نہ تو بچے کی اپنی کوئی جائداد ہو اور نہ اس کا کوئی وارث ہو۔ ایسی صورت میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری حکومت وقت پر ہوگی۔ اگر دین سے بے بہرہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ تو پھر یہ ذمہ داری مسلمانوں کی عام جماعت کے سر پر ہے۔ کیونکہ اگر مناسب دیکھ بھال کے بغیر بچہ ضائع ہو گیا۔ تو مسلمانوں کی پوری جماعت عند اللہ مأخوذ ہوگی۔

فرمایا اگرچہ رضاعت کی مدت عام طور پر دو سال مقرر کی گئی ہے۔ تاہم
فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
اگر بچے کے مال باپ یا بیوی رضامندی اور مشاورت سے بچے کا دودھ دو سال سے پہلے
چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ بچے کی بہتری مطلوب ہو۔ اگر وہ دونوں
سمجھتے ہیں۔ کہ ایک سال بعد یا ڈیڑھ سال بعد بچہ ماں کے بغیر بخیر و خوبی پرورش پاسکتا
ہے۔ تو باپ کو حق ہے کہ وہ اسے لے جائے۔

فرمایا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ اگر تم بچے کی حقیقی
 ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے بچے کو دودھ پلانا چاہو۔ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ تو اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ إِذَا اسْلَمْتُمْ
مَا أَتَيْتُمُ بِالْمَعْرُوفِ جو کچھ ان سے مقرر کیا ہے۔ اُسے دستور کے مطابق
 ادا کرو۔ اس میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کرو۔ جو اجرت طے کر لو، وہ ادا کرو۔

مدت رجعت
میں برعایت

۱ جنہی عورتوں
سے رضا سنت

تاہم دودھ پلانے کا اولین حق ماں کو ہے۔ کیونکہ جو مانتا حقیقی ماں کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ تاہم اگرچہ خاص مجبوری کی وجہ سے حقیقی ماں سے دودھ پلانا ممکن نہ ہو، تو دوسری عورت کو مقرر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ماں بیمار ہے۔ اور اس کا دودھ مضر صحت ہے۔ یا دودھ بالکل کم ہے جس سے بچہ کی خوراک پوری نہیں ہوتی۔ تو ایسی صورت میں غیر عورتوں سے دودھ پلانا درست ہو گا۔

فرمایا اس معاملہ میں **وَاتَّقُوا اللَّهَ** اللہ سے ڈرتے رہو کہیں اس کی نافرمانی نہ کر بیٹھنا، اس کے احکام بلاوجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس نے یہ احکام اپنی خائن حکمت اور انسان کی بستری کے لیے دیے ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو۔ اور پھر یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ہیرا پھیری سے اللہ تعالیٰ کے احکام کو طال سجو گے۔ **وَاعْلَمُوا** خوب یاد رکھو **أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ تم اُسے دھوکا نہیں دے سکتے۔ لہذا اُس کے احکام کی نافرمانی کا ارادہ کرتے وقت اس کے عذاب کو بھی نگاہ میں رکھ لینا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس صد (۱۰۰)

آیت ۲۳۴ تا ۲۳۵

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ
 بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
 فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالسَّعْرِ وَفٍ ۖ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۲۳۴) وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا
 عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ
 عِلْمَ اللَّهِ أَنْكُمْ سَتَذَكَّرُونَ ۖ وَلَكِنْ لَا تُؤَاعِدُوهُنَّ سِرًّا
 إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۖ وَلَا تَعْزِمُوا عَقْدَ النِّكَاحِ
 حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
 أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۲۳۵)

عَلَمُ

ترجمہ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ
 اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں چار ماہ اور دس دن۔ اور جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں
 تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو کچھ وہ عورتیں اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں
 اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھنے والا ہے (۲۳۴) تم پر اس بات میں
 کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم اشارہ کرو اس بات کے ساتھ عورتوں کے لیے پیغام
 نکاح کا، یا پوشیدہ رکھو تم اس بات کو اپنے نفوس میں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ
 بیشک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے وعدہ نہ کرو نکاح کا پوشیدہ
 طور پر۔ مگر یہ کہ تم دستور کے مطابق بات کہو۔ اور نہ ارادہ کرو نکاح کی گمراہی
 کا یہاں تک کہ کتاب اپنی مدت تک پہنچ جائے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 جانتا ہے، جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے اس سے ڈرتے رہو، اور جان لو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور بردبار ہے (۲۳۵)

ربط آیات

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضاعت کا مسئلہ بیان فرمایا تھا کہ اگر ماں کو طلاق ہو جائے تو بچے کو دودھ کون پلائے گی۔ رضاعت کی مدت اور دودھ پلانے والی عورت کے حق کا بیان تھا۔ یہ بھی آچکا ہے کہ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو رضاعت کا خرچہ وغیرہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر باپ نہیں ہے تو یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جو بچے کے وارث بن سکتے ہیں۔ اگر بچے کی اپنی ماں دودھ پلانے سے قاصر ہے، وہ خود بیمار ہے یا اس کا دودھ مضر صحت ہے، تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تاہم ایسی عورت کے ساتھ جو اجرت ملے ہو جائے اُسے دستور کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ماں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ لازماً بچے کو دودھ پلائے، اگرچہ بغیر غرض بچے کو دودھ پلانا ہی کے ذمہ واجب ہے۔ اسی طرح باپ کو بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صرف بچے کی ماں سے ہی دودھ پلوائے۔ وہ کسی اور عورت کی طرف بھی رجوع کر سکتا ہے اور بلا وجہ بچے کو ماں سے چھیننا بھی درست نہیں۔ یہ ساری باتیں سابقہ آیت میں واضح کر دی گئی ہیں۔

عدت کی مختلف اقسام

دوسرا مسئلہ عدت کا ہے۔ بعض قسم کی صورتوں کی عدت پہلے بیان ہو چکی ہے مثلاً جن مطلقہ عورتوں کو ماہواری آتی ہے۔ ان کی عدت اللہ تعالیٰ نے تین حیض مقرر فرمائی ہے اور جن کو حیض نہیں آتا۔ ابھی چھوٹی عمر ہے۔ یا کبر سنی کی وجہ سے خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی عدت تین مہینے ہے۔ جس عورت کا نکاح ہو گیا مگر میاں بیوی میں خلوت نہیں ہوئی اور طلاق واقع ہو گئی۔ ایسی عورت کے لیے کوئی عدت نہیں۔ اس کا بیان سورۃ احزاب میں ہے۔ ایسی عورت طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ طلاق میں اللہ نے حاملہ عورتوں کی عدت بھی بیان فرمائی ہے "وَأَنَّ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو گا۔ عدت ختم ہو جائے گی۔ اس

بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ کچھ چند دن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا نو دس مہینے لگ جاتے ہیں
 آج کے درس والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی عدت بیان فرمائی
 ہے جن کے خاوند فوت ہو جاتے ہیں۔ متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے بیشتر مسائل قرآن
 پاک میں بیان ہوئے ہیں۔ حدیث میں بھی بہت سی تفصیلات موجود ہیں۔ اب بیوہ بھی
 دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ اگر بیوہ حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ بچہ
 جلد ہی پیدا ہو جائے یا نو ماہ بعد، حضرت سعد ابن خولہؓ حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹنی
 سے گر کر شہید ہو گئے تھے۔ اُن کی بیوی حاملہ تھی۔ وفات کے ۲۲ دن بعد اس کے ہاں
 بچہ پیدا ہوا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کو نکاح
 ثانی کی اجازت ہے۔ ہاں نفاس کا گزرنا ضروری ہے (مقاربت کے لیے)

اور اگر عورت حاملہ نہیں ہے۔ تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس کے
 اندر مصلحت یہ ہے کہ اگر اس کو حمل ہے۔ تو اس عرصہ میں ظاہر ہو جائے گا۔ اگر معلوم ہو جائے
 کہ عورت حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت جیسا کہ پہلے بیان ہوا، وضع حمل ہوگی۔ اگر حمل نہیں ہے
 تو اُسے چار ماہ اور دس دن تک عدت پوری کرنا ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ وَالَّذِينَ
 يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا تَمُّ مِنْ سِنِّهِنَّ كَوَفَاتٍ دَى جَاتِیْ ہِے۔
 اور وہ پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ یَتَرَكْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ
 وَعَشْرًا جو وہ روکے رکھیں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن۔ یہ ان کی عدت ہے
 یہودیوں میں عدت کا کوئی نظریہ نہیں۔ ان کی عورتیں طلاق یا بیوگی کی صورت
 میں فوراً دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہیں۔ ہندوؤں میں ایسی عورتیں ساری عمر سوگ مناتی ہیں۔
 انہیں نکاح ثانی کی اجازت نہیں اول تو وہ خاوند کے ساتھ ہی زندہ جل جاتی ہیں۔ اگر الیا
 نہیں کیا، تو ساری عمر یونہی بیٹھی رہیں گی۔ بہر حال یہ افراط و تفریط ہے۔ اسلام دین فطرت
 ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اس میں نکاح کے حقوق اور نسب کا لحاظ رکھا گیا ہے
 اسلام نے ایسے احکام جاری کیے ہیں کہ نہ تو انسان کا نسب خراب ہو۔ نہ اخلاق میں
 بگاڑ پیدا ہو۔ اور نہ ہی کوئی چیز حیا کے خلاف ہو۔

غیر مذہب
 میں قباحیتیں

جاہلیت کے زمانہ میں بیوہ سال بھر تک سوگ مناتی تھی، بیوہ عورت عام لوگوں کے ساتھ مکان میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بلکہ اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ نہ وہ غسل کر سکتی تھی اور نہ کپڑے تبدیل کرنے کی مجاز تھی۔ اس کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سال گزرنے کے بعد اسے کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور گدیہ یا اونٹ پر سوار کیا جاتا مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ مرغ یا کوئی دوسرا جانور ایسی عورت کو لاکر دیا جاتا جسے وہ اپنے اعضائے تناسلیہ کے ساتھ ملتی۔ اکثر اوقات وہ جانور تعفن اور زہریلے جراثیم پیدا ہو جانے کی وجہ سے مر جاتے۔ نہ استنجانہ طہارت۔ پھر اس عورت کے ہاتھ میں اونٹ یا بکری کی مینگنیاں پکڑ دیتے، وہ اپنے ہاتھ سے مینگنیاں پھینکتی، تو اس کے لواحقین کہتے کہ اب اس کی عدت پوری ہو گئی ہے۔ اب یہ نہادھو کر صاف لباس پہن سکتی ہے۔ خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔ گویا جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کا برا دستور تھا۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا، حضور! میری بیٹی کا خاندن فوت ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں تم سال بھر سخت مشقت اٹھاتی تھیں مگر اسلام کی عائد کردہ چار ماہ دس دن کی معمولی پابندی بدداشت نہیں کر سکتی بمقصد یہ کہ عورت عدت کے دوران سرمہ نہیں لگا سکتی۔ رنگین کپڑے نہیں پہن سکتی۔ خوشبو نہیں لگا سکتی۔ زیور نہیں پہن سکتی زینت کا سامان استعمال نہیں کر سکتی۔ البتہ صاف لباس پہن سکتی ہے غسل کر سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک مکان میں رہ کر اکٹھا کھاپی سکتی ہے۔ یہ سب جائز ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو عورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت پر ایمان رکھتی ہے وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائے مگر خاندن پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانے کا حکم ہے۔ ام المؤمنین حضرت زینبؓ اور ام حبیبہؓ کے واقعات ملتے ہیں۔ ایک کے والد فوت ہو گئے اور دوسری کے بھائی انہوں نے تین دن گزرنے کے بعد خوشبو منگائی۔ اور کچھ بچی کے سر پر لگا دی اور کچھ اپنے ہاتھوں کو مل لی۔ عورتوں کے مجمع میں فرمایا۔ مجھے خوشبو کی حاجت نہ تھی۔ مگر میں تمہیں مسئلہ سمجھانا چاہتی تھی۔ کہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی عورت کے لیے روانہ نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے خاوند کی فوتیدگی پر جب کہ چار ماہ دس دن تک سوگ ہے۔

نکاح کی
اجازت

فرمایا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجْلَهُنَّ جَبَّ اُنْكِي عِدَّتٍ پوری ہو جائے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو اب تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ عورتیں اپنے بارے میں دستور شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ یعنی اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔ کہیں نکاح کا پیغام بھیجنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں، وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کو اس کام سے منع کرے یا ان کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے۔ فرمایا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھتے ہیں۔

عہ میں اشارے
کنائے کی اجازت

اگر عورت مطلقہ ہے۔ تو دورانِ عدت کسی دوسرے شخص کو اجازت نہیں کہ وہ اشارہ کنایہ سے بھی مطلقہ کے ساتھ بات کرے۔ صرف اس کے خاوند کو اجازت ہے وہ بھی اس صورت میں کہ طلاق مغلطہ نہ ہو۔ بیوہ کے لیے حکم یہ ہے کہ عدت کے دوران نکاح کا وعدہ نہ نالاحلال نہیں ہے۔ اگر اُسے کوئی ایسا پیغام بھی ملے۔ تو وہ کہلا بھیجے کہ عدت کے اختتام کا انتظار کرو۔ البتہ عدت کے دوران اشارے کنائے سے بات ہو سکتی ہے جبکہ اس میں صراحت نہ ہو۔ اس قسم کا ایک واقعہ ملتا ہے۔ ایک عورت بیوہ ہو گئی۔ امام جعفر صادقؑ کے فرزند نے اس سے کہا کہ تم جانتی ہو کہ میرا تعلق حضور علیہ السلام کے ساتھ کیا ہے۔ اور جو میری قرابت حضرت علیؑ سے ہے اس کو بھی جانتی ہو عام لوگوں میں میرا جو مقام ہے۔ اس سے بھی تم واقف ہو۔ اس عورت نے کہا، خدا کا خوف کھاؤ میں عدت میں ہوں اور تم مجھے نکاح کا پیغام دے رہے ہو۔ انہوں نے کہا۔

میں پیغام نکاح تو نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف اپنی حیثیت واضح کر رہا ہوں کہ میرا فلاں فلاں ہستی سے کیا رشتہ ہے۔ اس کو کنایہ کہتے ہیں کہ صراحتاً نکاح کی بات نہ کرے۔ صرف اشارے سے دل کی بات

کہ دے۔ مثلاً یوں کہ دے کہ میرا خیال ہے۔ کہ اگر کوئی اچھی دین دار عورت مل جائے تو نکاح کر لوں۔ یا کوئی متدین اور صالح عورت مل جائے تو اس کے ساتھ نکاح کر لوں یا تیر ہی جیسی خوش بخت کسی نصیب والے ہی کو میسر ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ تاہم صریح الفاظ میں نکاح کا وعدہ لینا حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ تم یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم عورتوں کے ساتھ پیغام نکاح کے سلسلہ میں اشارہ کرو۔ خطبہ عورتوں کے لیے نکاح کے پیغام کو کہتے ہیں مقصد یہ کہ تم اشارے کناے سے بات کر سکتے ہو۔ ایک اور لفظ خطبہ جس کا معنی خطاب کرنا ہے، وعظ نصیحت وغیرہ کرنا۔ ان دونوں لفظوں کا باب ایک ہی ہے۔ جب یہ مصد کے طور پر آتا ہے تو اس سے مراد خطاب کرنا ہوتا ہے۔

فرمایا اشارے کناے سے اپنا مقصد بیان کر دو۔ أَوْ أَكُنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ یا اس کو دل میں پوشیدہ رکھو۔ اس کا بھی کوئی گناہ نہیں ہے فرمایا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے۔ کیونکہ فطرۃً مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں کو قائم رکھو۔ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا ان سے خفیہ طور پر نکاح کا وعدہ نہ لے لینا۔ یہ بالکل جائز نہیں۔ عدت کے دوران عورت سے یہ کہنا کہ عدت کے بعد میرے ساتھ ہی نکاح کرنا، کسی اور کے ساتھ نہ کرنا، یہ جائز نہیں ہے۔ اس کی قطعاً ممانعت ہے۔ إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ہاں اچھے طریقے سے دستور کے مطابق بات کر سکتے ہو۔ اشارے کناے کے ذریعے مدعا بیان کر دو جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہو۔ فرمایا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ جب تک عدت پوری نہ ہو جائے۔ نکاح کی گمرہ باندھنے کا ارادہ بالکل نہ کرو۔ یہاں کتاب سے مراد وہ نوشتہ عدت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے قانون میں مقرر ہے۔ عدت کے اندر تو ویسے ہی نکاح نہیں ہو سکتا۔ ایسا کہ تا تو زنا کا ارتکاب کرنا ہے۔ اور قطعی حرام ہے۔ فرمایا وَأَعْلَمُوا جَانَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر دل میں بھی قانون کی خلاف ورزی کا خیال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے۔ فَاَحْذَرُوْهُ لَهْذَا اَسْ سے ڈرتے رہو۔ اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ وَاعْلَمُوْا اور یاد رکھو اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ غفور یعنی بخشنے والا بھی ہے۔ اور بہ دیار بھی ہے۔ تحمل کرنے والا ہے۔ بسا اوقات وہ گرفت نہیں کرتا مگر جب مجرموں کو پکڑتا ہے۔ تو پھر خوب پکڑتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کے تحمل کی وجہ سے لاپرواہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ کہ ایک دفعہ بچ گیا۔ تو ہمیشہ ہی بچتا رہے گا بلکہ وہ اپنے وقت پر ضرور پکڑ جائیگا۔ اگر خدا کے قانون کو توڑ دے تو اسی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد یک (۱۸۱)

آیت ۲۳۶ تا ۲۳۷

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمْ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ
قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۖ (۲۳۶) وَإِنْ طَلَقْتُمْ نِسَاءً مِنْ قَبْلِ أَنْ
تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ
النِّكَاحِ ۖ وَإِنْ تَعَفَّوْا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ۖ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ
بَيْنَكُمْ إِنْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۖ (۲۳۷)

ترجمہ: تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب کہ تم نے ان کو ہاتھ نہیں
لگایا۔ یا ان کے لیے مہر مقرر نہیں کیا۔ اور ان کو فائدہ پہنچاؤ طاقیت رکھنے والے پر اسکی طاقت
کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق فائدہ پہنچانا دستور کے مطابق یہ
لازم ہے نیکی کہنے والوں پر (۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ تم نے
ان کو چھوا ہو۔ اور بیشک تم نے ان کے لیے مہر مقرر کیا ہے۔ پس ادھا مہر لازم ہوگا۔
جو تم نے مقرر کیا ہے۔ الا یہ کہ وہ عورتیں ہی درگزر کر لیں یا درگزر کرے وہ شخص جس
کے ہاتھ میں نکاح کی گمہ ہے۔ اور یہ کہ تم درگزر کر دو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے
اور اس فضیلت کو نہ بھلاؤ، جو تمہارے درمیان ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا
ہے جو کچھ تم کام کرتے ہو (۲۳۷)

ربط آیات

گزشتہ دروس میں عدت کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ دوران
عدت نکاح نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو بار عدت عورت سے

نکاح کا وعدہ لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ البتہ اثاثے کنایت سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ مقصد یہ کہ جس طرح عدت میں نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح نکاح کا وعدہ لینا بھی حرام ہے۔ طلاق کے دوران اور اس کے بعد بچے کی رضاعت کا مسئلہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ طلاق کے وقت اگر دودھ پیتا بچہ ہو، تو اس کی پرورش کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اگر بچے کا باپ بھی نہیں ہے۔ تو پھر اس کا بار کون اٹھائے گا۔ نیز یہ کہ دودھ کس عورت سے پلانا چاہیے۔ یہ سب مسائل بیان ہو چکے ہیں۔

حق مہر لازمی ہے

آج کے درس میں حق مہر اور اس کی ادائیگی سے متعلق مسئلہ بیان ہوا ہے۔ حق مہر نکاح کے لوازم میں سے ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے "قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْكُمْ فِي أَنْوَاعِهِمْ" ہم اُس چیز کو جانتے ہیں جو ہم نے عورتوں کے متعلق مردوں پر ضروری قرار دی ہے۔ اس میں حق مہر اور عورت کے دیگر اخراجات، روٹی، کپڑا، رہائش، علاج وغیرہ سب خاندان کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نسا میں ہے "وَاجِلٌ لَّكُمْ مَّا وَرَاءَ ذَلِكَُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ" یعنی جن محرمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے علاوہ تم باقی عورتوں سے مال صرف کر کے نکاح کر سکتے ہو۔ مال خرچ کرنے کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلے نمبر پر حق مہر آتا ہے۔ سب سے پہلے اُس کا خرچہ ہے جو مرد ادا کرے گا۔ پھر عورت کی باقی ضروریات پر اخراجات ہیں۔ وہ بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نسا ہی میں مزید وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ "وَالنِّسَاءُ النَّسَاءُ صَدُقَتِهِنَّ مَخْلَّةٌ" عورتوں کے حق مہر خوشی خوشی ادا کیا کہو۔ اس میں پس و پیش نہ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ الغرض! حق مہر نکاح کے لیے لازمی ہے۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین کی تفسیر ربیعہ میں ہے کہ مہر نکاح کا لازم جزو ہے۔ لہذا اس کے بغیر نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہ کرنا ضروری نہیں ہے اگر اس کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جائے تو کافی ہے۔ مثلاً صرف اتنا کہ دیا جائے۔ کہ ہم بعد میں آپس میں طے کر لیں گے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر کا تقریر بھولے سے رہ گیا۔ تو بھی نکاح درست ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سرے سے

حق دہر کا انکار ہی کر دے، تو نکاح نہیں ہو گا۔

خلدان حضرت
شاہ ولی اللہ

ہندوستان میں خاندان شاہ ولی اللہ کی دینی خدمات، ناقابل فراموش ہیں۔ یہ آپ کا خاندان ہی ہے۔ جس نے قرآن پاک کے علم کو مقامی زبان میں پھیلایا۔ خود شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے "فتح الرحمن" کے نام سے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا۔ اور اس کے ساتھ مختصر حاشیہ بھی تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ اصول تفسیر پر آپ کی کتاب "الفوز البکیر" بے نظیر چیز ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج بھی تمام دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایم اے (اسلامیات) کی جماعتوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ فہم قرآن سے متعلق آپ نے نہایت بلند پایہ اصول مرتب کیے ہیں آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز نے قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور سورۃ بقرہ کے نصف تک کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی۔ آپ نابینا ہو گئے تھے اس لیے بولتے جاتے تھے اور آپ کے شاگردان رشید اس کو قلمبند کرتے تھے۔ اپنی وفات تک اس سے زیادہ تفسیر کا کام نہیں کر سکے۔ آپ ہفتہ میں ایک روز قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ یہ درس بھی لوگوں نے سیکھے۔ آج کل طبع شدہ نسخے نہیں ملتے۔ تاہم قلمی نسخے کہیں موجود ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے جو عام پڑھا جاتا ہے مختلف اشاعتی اداروں مثلاً تاج کھپنی، انجمن حمایت اسلام وغیرہ نے اس ترجمہ کے بشمار ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ آپ قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ جس کو آپ کے شاگردان نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے چالیس پچاس سال بعد یعنی آج سے سو سال پہلے صرف سورۃ بقرہ والا حصہ شائع ہوا، جو کہ تفسیر رفیعی کہلایا۔

آپ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا ہے اس میں بعض مشکل الفاظ بھی آئے ہیں جو محاورہ استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری فرمایا کرتے تھے کہ اسیری کے دوران میں شاہ عبدالقادر

کا اردو ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ کہ اللہ الصمد کا ترجمہ نرادرہار نظر سے گزرا۔ چونکہ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس لیے میں اسے سمجھ نہ سکا۔ جیل میں موجود ایک بہت بڑے پنڈت سے میں نے اس لفظ کا معنی دریافت کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ تم کیوں پوچھتے ہو، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے۔ میں نے کہا پہلے تم اس کا معنی بتاؤ۔ چنانچہ اس پنڈت نے بتایا کہ نرادرہار سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اور یہ اس ذات کے لیے بولا جاتا ہے جس کی طرف سب چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے ایسے عجیب و غریب مگر بالکل صحیح الفاظ اپنے ترجمہ میں استعمال کیے ہیں۔ آپ نے دہلی کی کنگ ایڈورڈ روڈ پر واقع اکبری مسجد میں بارہ سال اعتکاف کیا تھا۔ بعد میں اس مسجد کو انگریزوں نے نیست و نابود کر دیا۔ یہ ترجمہ آپ نے اسی اعتکاف کے دوران لکھا تھا، ساتھ تھوڑا تھوڑا حاشیہ بھی ہے۔ اس ترجمہ کو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن نے نسبتاً آسان زبان میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ کام آپ نے مالٹا جیل میں اسیری کے زمانہ میں انجام دیا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اردو زبان ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اور اس میں بھی اتنا تسلسل نہیں تھا۔ دو سو سال کے عرصہ میں اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ لہذا شیخ الہند نے شاہ صاحب کے اردو ترجمہ کو آسان بنا دیا۔ اور آجکل اس کی اشاعت عام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے اور چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی ہیں۔ آپ نے درس و تدریس کے ذریعے تو دین کی بہت خدمت کی ہے مگر آپ کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ البتہ آپ کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ آپ کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ اور آپ نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف عملی جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اور پھر بالاکوٹ کے مقام پر جہاد شہادت نوش فرمایا۔

اوزنگ عالمگیرؒ شاہ ولی اللہؒ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جب کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ ۱۶۵۷ء میں وفات پا گئے۔ یہ اپنے خاندان کے واحد بادشاہ تھے جنہوں نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ کابل سے لیکر برما تک کا وسیع علاقہ انکی سلطنت میں شامل تھا

عالمگیرؒ کے انچاس سال تو لڑائیوں میں گزر گئے۔ انہیں صرف ایک سال امن و امان کا ملا۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرنے کی از حد کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دس بادشاہوں کو مندرقتدار پہ آتے دیکھا، مگر ان میں سے کوئی بھی لائق ثابت نہ ہوا۔ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور انگریزوں کو مداخلت کا موقع مل گیا اور آخر انہوں نے ہندوستان میں پاؤں جمالیے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ بڑے متدین آدمی تھے۔ مگر انگریزوں نے انہیں خوب بدنام کیا۔ انہوں نے عالمگیرؒ کو ایک ظالم بادشاہ کی حیثیت دینے کے سامنے پیش کیا۔ اور یہاں تک مشہور کیا۔ کہ عالمگیرؒ اس وقت تک ناشتہ نہیں کرتا تھا۔ جب تک ہزاروں ہندوؤں کو قتل نہیں کر دیتا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان میں کوئی ہندو باقی نہ رہتا۔ آپ نے پچاس سال حکومت کی۔ اور ہندو دارالسلطنت دہلی میں بھی موجود تھے۔ آپ نے بعض سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ لڑائی کی۔ کیونکہ شورش پسند تھے مگر آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ شریعت کا پابند پکا سچا مسلمان تھا۔ جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہوا، اپنے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔ آپ کے بھائی نے شہزادگی کے زمانہ میں ایک غریب شخص کے بچے کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہ آسکا۔ جب عالمگیرؒ کا دور آیا تو اس بچے کے باپ نے مقدمہ دائر کر دیا اور درسی چاہی۔ باقاعدہ مقدمہ چلا۔ قتل کا ثبوت فراہم ہوا۔ اور پھر قصاص میں شہزادے کو سزائے موت ہوئی۔ عالمگیرؒ اس کردار کا آدمی تھا۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ نکاح کے لیے حق ضروری ہے۔ البتہ بوقت نکاح اس کا تقرر ضروری نہیں ہے۔ یہ بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ اس آیت کے بعد یہ ایسی ہی صورت کا تذکرہ ہے۔ فَرَمَا لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمْ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً تم چہ کوئی گناہ نہیں ایسی صورت میں کہ تم طلاق دے دو عورتوں کو اس حالت میں کہ تم نے ان کو چھوا

حق و ہر کا
عدم تقرر

نہیں اور اُن کا مہر بھی مقرر نہیں کیا۔ فرمایا بغیر مہر مقرر کیے نکاح بھی ہو گیا تھا اور اب طلاق بھی واقع ہو گئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم عورتوں کو اُن کے حق سے بالکل محروم کرو۔ بلکہ وَمَتَّعُوهُنَّ اَنْ كُوْنَا فَاِنَّهٗنَّ پَنچاؤ۔ یعنی کچھ دے دلا دو۔ مگر کس قدر فرمایا عَلٰی الْمَوْسِعِ قَدْرُهٗ صاحب حیثیت پر اسکی حیثیت کے مطابق۔ اگر کوئی طاقت والا ہے۔ تو وہ اس کے مطابق ادا کرے وَعَلٰی الْمُقْتِرِ قَدْرُهٗ اور اگر کوئی مالی لحاظ سے کمزور ہے۔ تنگ دست ہے۔ تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق مطلقہ کو ادا کرے۔ اس مقام پر فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عورت کو کم از کم ایک جوڑا کپڑے دینا ضروری ہے۔ جس میں تین کپڑے شامل ہوں ایک بڑی چادر، ایک دوپٹہ اور ایک کمرہ۔ جو جسم کو ڈھانپ لیں۔ تاہم یہ ہے۔ کہ مالدار اچھا قیمتی جوڑا لے دے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کر دے یہ تو ایسی عورت کیلئے ہے جس کا مہر مقرر نہیں ہو سکا اور طلاق واقع ہو گئی۔ البتہ جن کے مہر مقرر ہوں ان کو حق مہر تو ادا ہو گا، اس کے علاوہ کپڑے دینا بھی مستحب ہے، اسی کو فرمایا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ یہ متاع دستوں کے مطابق دو مطلقہ عورت کا حق غصب نہ کرو۔ فرمایا حَقًّا عَلٰی الْمُحْسِنِينَ یہ چیز صاحب ایمان نیکو کاروں پر لازم ہے۔ لہذا اس میں کوتاہی نہ کریں۔ بلکہ مطلقہ کو ضرور اس کا حق ادا کریں۔

مہر مثل

طلاق کے علاوہ ایک صورت بیوگی کی بھی ہے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہیں ہوا اور میاں بیوی کی خلوت بھی نہیں ہوئی اور خاوند مر گیا تو اب عورت کس چیز کی حقدار ہے۔ ایسی صورت میں عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی۔ شریعت میں مہر مثل سے مراد ایسا مہر ہے۔ جو ایسی عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا عام طوع پر مقرر ہوتا ہے۔ جب ایسی صورت پیش آجائے تو پھر دیکھا جائے کہ اس خاندان یا برادری میں اس حیثیت کی عورتوں کا کیا مہر مقرر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اس عورت کو بھی مہر ادا ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ عورت خاوند کی وراثت کی بھی حق دار ہوگی۔ اور اسے چار ماہ دس دن کی مقررہ عدت بھی گزارنا ہوگی۔

نصف مہر

آج کے درس کی دوسری آیت کریمہ نصف مہر کے متعلق ہے۔ یہ کس حالت میں ادا کیا جاتا ہے۔ فرمایا وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً اور اگر تم ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دو کہ ان کے قریب نہیں گئے۔ مگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر کیا تھا۔ اور وہ طلاق ہونے سے قبل ادا نہیں ہوا۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ پس نصف ہے جو تم نے مقرر کیا تھا یعنی اگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا۔ یہ تو حکم ازکم ہے۔ کہ اتنا ضرور ادا کرو۔ البتہ سلف میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ کہ انہوں نے واجب الاہر سے زیادہ بھی دیا مثلاً حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کے متعلق آتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا۔ بغیر مجامعت کے عورت کو طلاق دے دی۔ تو ایک روایت کے مطابق انہوں نے دس ہزار درہم ادا کیے اور دوسری کے مطابق بیس ہزار درہم کی رقم حق مہر کے طور پر ادا کی یہ مقصد یہ تھا۔ کہ جدا ہونے والی عورت کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ لہذا اُسے احسن طریقے سے رخصت کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کر دیا۔ کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو اور طلاق واقع ہو گئی تو عورت کو کم از کم کپڑوں کا ایک جوڑا دے دو۔ اور اگر مہر مقرر ہوا تھا۔ تو کم از کم اس کا نصف ادا کرو۔

معافی تقویٰ کی علامت ہے

إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ البتہ ایک صورت میں ادائیگی مہر سے بچ سکتے ہو کہ وہ عورتیں خود مہر معاف کر دیں۔ کہ ٹھیک ہے ہم نہیں لیتیں جاؤ معاف ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گمہ ہے یعنی طلاق دینے والا مرد معاف کر دے۔ مردوں کا معاف کر دینا بدین معنی ہے۔ کہ وہ نصف کی بجائے پورا حق مہر ادا کر دیں۔ یا اگر پورا ادا کر چکے ہیں۔ تو نصف واپس نہ لیں بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ سے اکثر مفسرین نے خاوند مرد لیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں طلاق کی گمہ ہے۔ یعنی طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے۔ عورت تو زیادہ سے زیادہ عدالت سے خلع حاصل کر سکتی ہے مگر طلاق مرد کا ہی حق ہے۔ بعض نے اس سے مراد عورت کا ولی بھی لیا ہے۔ مگر

راج قول پہلا ہی ہے۔ فرمایا اے مردو! اِنَّ تَقُوْا اَکْرَمَ مَعَاوٰتِ کَرُوْا اَقْرَبَ لِلتَّقْوٰی
یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے لہذا اگر یہ بہنرکاری اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو معاف ہی
کر دیا کرو۔

فضیلت کی
پاسداری

پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے قوام یعنی قوی بنایا۔ نیز یہ
بھی بیان ہو چکا ہے کہ لِلرِّجَالِ عَلَیْہُمْ دَرَجَةٌ مَّرَدُوْنَ کو عورتوں پر ایک درجہ
فضیلت حاصل ہے۔ لہذا اے مردو! تمہاری اس فضیلت کا تقاضا ہے کہ
وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ تَمَّارَے درمیان اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت
رکھی ہے۔ اس کو مت بھولو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عورتوں پر برتری عطا کی ہے تو اس
برتری کا تقاضا ہے کہ تم عورتوں پر زیادہ احسان کرو۔ اور طلاق کی صورت میں آدھے
کی بجائے پورا مہر ادا کرو، یا اگر پورا ادا کر چکے ہو، تو آدھا واپس نہ لو۔ بلکہ معاف کر دو۔
فرمایا اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ بیشک تمہارے سب کام اللہ تعالیٰ کی نگاہ
میں ہیں۔ وہ تمہارے ہر خیر و شر کو دیکھ رہا ہے۔ لہذا اس کے احکام کی پابندی کرو گے
تو اس کے مقرب بن جاؤ گے۔ اگر خلاف ورزی کرو گے، تو پھر اس کی گرفت بھی
زیادہ دور نہیں ہے۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ
 قَنِتِينَ ۚ (۲۳۸) فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا
 أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا
 تَعْلَمُونَ ۚ (۲۳۹) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ
 أَزْوَاجًا ۚ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مِّمَّا عَالَى الْحَوْلِ غَيْرِ
 إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ
 فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ (۲۴۰)
 وَلِلَّهِ طَلَّقَتْ مَتَاعٌ ۚ بِالسَّعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۚ (۲۴۱)
 كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ (۲۴۲)

۲۳۵/۵

ترجمہ: حفاظت کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے
 سامنے عاجز و خائف کی حالت میں ہو، پس بیدل یا سواری پر نماز
 ادا کرو۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو۔ پس اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تم کو تعلیم دی
 جو تم نہیں جانتے تھے (۲۳۹) اور وہ لوگ جو تم میں وفات پزیر جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی
 بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں وصیت کر جائیں ایک سال تک
 فائدہ اٹھانے کی بغیر نکالے۔ اور اگر وہ عورتیں خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اُس
 بات میں جو وہ اپنے حق میں کہیں دستور کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک
 اور حکمت والا ہے (۲۴۰) اور طلاق والی عورتوں کے لیے فائدہ اٹھانا ہے۔ دستور کے
 مطابق۔ یہ بات لازم ہے متقیوں پر (۲۴۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے

لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ (۲۳۲)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں طلاق، عدت اور حق مہر کے مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اب درمیان میں دو آیتیں نماز کے متعلق ہیں۔ اور اس کے بعد پھر طلاق اور عدت کے مسائل ہیں۔ بظہر ایک ہی نوعیت کے مسائل کے درمیان نماز کی یہ آیتیں بے ربط معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور بعض دیگر بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہاں یہ بات سمجھانا چاہتا ہے کہ دیکھو، نکاح، طلاق، عدت کے مسائل میں مشغول ہو کر کہیں نماز سے غافل نہ ہو جانا۔ نکاح طلاق کے مسائل ہی ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات گفتگو طول پکڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہاری نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اس کا ہر حال میں خیال رکھو۔ اس طرح گویا نماز والی آیات دوسری آیات سے مربوط ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ نماز کی آیات کو دیگر آیات سے اس طور ربط ہے کہ گذشتہ اور آئندہ آیات میں نکاح، طلاق، عدت وغیرہ جیسے معاشرتی مسائل کا تذکرہ ہے۔ اور یہ مسائل تدبیر منزل کے مسائل کہلاتے ہیں۔ درحقیقت ان مسائل پر عدل کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یعنی احکام کی پابندی کمزور تقویٰ اختیار کرو۔ ظلم و زیادتی نہ کرو، بچوں والی اور مطلقہ عورتوں کا حق ضائع نہ کرو۔ بیویوں کے حقوق ادا کرو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا حکم دیا ہے یعنی عدل اور احسان "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" یعنی معاشرے میں عدل و انصاف کو قائم کرو اور احسان بھی کرو۔ تو یہ معاشرتی مسائل عدل کے تحت آتے ہیں۔ جب کہ نماز کی ادائیگی احسان کی تعریف میں آتی ہے کہ نماز ادا کرنے سے انسان محسن بنتا ہے، نیکی کاری اختیار کرتا ہے تو یہاں پہ دونوں طرح کے مسائل کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عدل و احسان کے تقاضے بیک جا پورے کیے جاسکیں۔ اس طرح یہ آیات آپس میں مربوط ہیں۔

عدل کے مسائل تو گذشتہ کئی دروسوں میں آئے ہیں۔ اور آئندہ بھی آئیں گے۔

صلوٰۃ و سلا

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے احسان کا مسئلہ بیان فرمایا حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ
الْوُسْطَىٰ ساری نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ کی۔ درمیان نماز
کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے اُسے فجر کی نماز بتایا ہے۔ کسی نے ظہر کی کہی
نے مغرب کی اور بعض نے عشاء کی، مگر رائج قول یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی
نماز ہے۔ اور یہ نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس نماز کی اہمیت اس وجہ سے ہے
کہ یہ نماز دو رات کی (مغرب اور عشاء) اور دو دن کی (فجر اور ظہر) کے درمیان واقع ہے
اور یہ وقت نسبتاً زیادہ مشغولیت کا ہوتا ہے۔ کاروبار کی وجہ سے اس نماز کے ضائع
ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی حفاظت کی زیادہ تاکید فرمائی گئی
ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فجر کی نماز کے وقت اور پھر عصر کی نماز کے وقت ان
فرشتوں کی ٹرپٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ جو بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں لے جاتے
ہیں۔ لہذا یہ وقت بڑا اہم ہے، تہذیب شریف کی روایت میں آتا ہے۔ مَنْ قَاتَلَهُ
صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَانَ كَأَنَّهُ قَاتَلَ أَهْلَهُ وَتَرَاهُ یعنی جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی گویا
اس کا اہل اور مال سب کچھ ہلاک کر دیا گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمام نمازوں کی حفاظت کرو
مگر خاص طور پر درمیان نماز کی حفاظت کرو۔ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ اور اللہ تعالیٰ کے
سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نماز میں پوری توجہ اسی طرف لگا دو۔ ادھر
ادھر کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ بلکہ یہ تصور کرو کہ تم احکم الحاکمین کے حضور دست بستہ کھڑے
ہو، لہذا پوری توجہ کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ ایسی ہی حالت کے متعلق حضور علیہ السلام نے
فرمایا تھا کہ احسان اس بات کا نام ہے۔ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ یعنی عبادت
کے وقت تیری کیفیت یہ ہونی چاہیے گویا کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ جب
اس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑا ہے تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا
ہے۔ فرمایا اگر یہ کیفیت بیدار نہ ہو سکے۔ تو کم از کم اتنا تو ہے۔ فَإِنَّهُ يَرَاكَ
کہ وہ تو تجھے بہر حال دیکھ رہا ہے۔ لہذا نماز کے لیے نہایت مودب طریقے سے
کھڑے ہو کہ تمہارے دل میں خشیت الہی ہو۔ اور تمہاری حرکات و سکنات سے عاجزی کا اظہار ہو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ إِنْ كُنْتُمْ خَوْفًا ۖ أَوْ رُكْبَانًا ۖ إِنْ كُنْتُمْ خَوْفًا ۖ أَوْ رُكْبَانًا ۖ إِنْ كُنْتُمْ خَوْفًا ۖ أَوْ رُكْبَانًا ۖ

یا ساری پر نماز ادا کر لو۔ خوف سے سر اور دشمن کا خوف ہے۔ جب دشمن کے ساتھ حالت جنگ ہو۔ اور میدان کارزار میں نماز کا وقت آجائے تو جنگ سے فارغ ہونے تک نماز کو مؤخر نہ کرو۔ بلکہ اُس وقت اگر تم پیدل چل رہے ہو یا ساری پر ہو اور دشمن کا ہر آن خطرہ ہے۔ تو ساری کے اوپر پھپھکتے پھپھکتے ہی نماز ادا کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ وہ قبول کرے یا لا ہے۔ بغیر ساری کے پیدل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز درست نہیں ہے۔

عین جنگ کی حالت میں مجاہدین کے دو گروپ بنا کر نماز کی ادائیگی کا ذکر آتا ہے۔ ایک گروپ دشمن سے لڑتا ہے اور دوسرا نماز ادا کر لے۔ پھر دوسرا دشمن کے مقابلے پر ہو اور پہلا نماز ادا کر لے۔ اور اگر مجاہدین ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں جیسا کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی خواہش ہوتی تھی۔ تو پھر دونوں گروپ آدھی آدھی نماز امام کے ساتھ پڑھیں گے اور باقی آدھی خود پوری کریں گے۔ اگر دو رکعت نماز ادا کرنا ہے تو ایک گروپ امام کے پیچھے کھڑا ہوگا اور دوسرا دشمن کے مقابلے میں رہے گا۔ جب امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل ہو جائے گی تو پہلا گروپ پیچھے ہٹ کر سوچے سمجھا لے گا اور حفاظت پر مامور دوسرا گروپ امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو جائے گا۔ اس طرح دونوں گروپ ایک ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کریں گے اور دوسری رکعت خود پوری کریں گے۔ اگر نماز چار رکعت والی ہے۔ تو ہر گروپ دو دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا۔ اور باقی دو دو رکعت خود مکمل کر لے گا۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ مجاہدین کسی خاص نیک آدمی کے ساتھ جماعت میں شامل ہونا چاہیں۔ ورنہ ہر گروپ اپنی اپنی پوری نماز بیک وقت ادا کرے گا۔

حضور علیہ السلام نے سفر اور اقامت ہر دو حالتوں میں چھ یا دس دفعہ صحابہ کرامؓ کو صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ آپ نے سفر کی حالت میں دو رکعت اور اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز پڑھائی۔

فرمایا فَإِذَا أَمِنْتُمْ جب تم امن کی حالت میں ہو۔ خوف دور ہو جائے۔

فَإِذْ كُرِّمُوا بِاللَّهِ کما علمکم تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں تعلیم دی ہے۔ یعنی رکوع، سجود، قعدہ وغیرہ جو بھی بشرائط ہیں، فرائض، واجبات سنن اور استحبات ہیں سب کی رعایت رکھو۔ اللہ نے تمہیں ایسی تعلیم دی ہے۔ مَّا كُنْتُمْ تَكُونُونَ جو تم نہیں جانتے تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ اُس نے اپنی عبادت کا وہ طریقہ بھی بتلادیا ہے۔ جسے وہ پسند کرتا ہے۔ پس اس طریقے کے مطابق اللہ کا ذکر کرو۔

بیواؤں پر چل

نماز کے تذکرے کے بعد اب پھر عورتوں کے مسائل کا بیان ہے فرمایا وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ ازواجاً۔ تم میں سے جو لوگ وفات پے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وَصِيَّتَهُنَّ ازواجہم وہ اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کر جائیں مَّتَاعًا لِّیْ الْحَوْلِ غَیْرِ اخْرَاجٍ کہ وہ ایک سال تک فائدہ اٹھائیں بغیر گھر سے نکلنے کے فَإِنْ خَرَجْنَ اور اگر وہ خود بخود نکل جائیں فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ تو تم پر کوئی گناہ نہیں فِی مَا فَعَلْنَ فِیْ أَنْفُسِهِنَّ مَعْرُوفٍ کہ جو کچھ وہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق کرنا چاہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مردوں پر یہ لازم ہے کہ عورتوں کیلئے وصیت کریں کہ کم از کم ایک سال تک اُن کے گھر میں معمول کے مطابق بھیڑ رہیں۔ اُن کے تمام اخراجات بھی پورے کیے جائیں۔ ہاں اگر عورتیں خود اپنے متعلق کوئی دوسرا فیصلہ کر لیں۔ یعنی دوسرا نکاح کرنا چاہیں۔ تو پھر وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ تم پر اس کا کچھ گناہ نہیں۔ انہیں اپنا فیصلہ خود کرنے دیں۔ اس میں رکاوٹ بھی نہ بنیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایک سال کی وصیت کا قانون اُس وقت تک تھا جب تک بیواؤں کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت مقرر نہیں ہوئی تھی اس وقت عورتیں سال بھر خاوند کے گھر رہ سکتی تھیں۔ پھر جب اللہ نے عدت کی آیات نازل فرمائیں۔ تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بعض دوسرے مفسرین کرام کا قول ہے

کہ کوئی بھی حکم فسخ نہیں ہے۔ بلکہ اصل عدت تو چار ماہ دس دن ہی ہے۔ مگر یہ ایک سال کی وصیت عورت کے ساتھ مزید احسان ہے۔ کہ اُسے عدت کے فوراً بعد گھر سے نہ نکال دیا جائے۔ بعض اوقات عورت کے مال باپ بھی نہیں ہوتے جن کے پاس چلی جائے اور نکاح ثانی کا بھی فوری بندوبست نہیں ہو سکتا، لہذا ایک سال تک انہیں گھر سے نہیں نکالنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بیوہ ہو چکی ہے وہ پہلے ہی غم و اندوہ سے نڈھال ہے۔ اس کے ساتھ مزید سختی نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ ایک سال بٹھرنے کی رعایت عورت کو اس وقت تک حاصل تھی جس وقت تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سورۃ نسا میں مذکور تمام شتے داروں کے حصے مقرر کر دیے گئے۔ اگر خاوند مر جائے تو بیوی کا حصہ بھی مقرر ہوا۔ یعنی اگر اولاد موجود ہے تو کل وراثت کا اٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ مقرر ہوا۔ لہذا اب سال بھر کی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کو وراثت میں حصہ مل گیا ہے۔ فرمایا **وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ** یہ احکام خداوند تعالیٰ نازل کر رہا ہے۔ جو کمال قدرت کا مالک ہے۔ اور حکمت والا ہے۔ نہ کوئی کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور نہ ہی کوئی کام حکمت سے خالی ہے اس لیے ان احکام پر پورا پورا عمل کرنا چاہیئے۔

فرمایا **وَلِلْمُطَلَّاتِ مَتَاعٌ بَالِغٌ مِّمَّا كَسَبْنَ** مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے دستور کے مطابق۔ یعنی طلاق کی مختلف صورتوں کی نسبت سے ان کے حقوق ادا کرو۔ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ ایسی عورت جسے مقاربت سے پہلے طلاق ہو گئی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اُس کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک جوڑا کپڑے دو، جس میں ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک بڑی چادر ہو۔ یا ایک دوپٹہ اور دو چادریں ہوں۔ یہ واجب ہے۔ ایسی عورت جس کا مہر مقرر ہو چکا ہے۔ مگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی۔ اس کو نصف مہر ملیگا۔ یہاں یہ جن عورتوں کا ذکر ہے

مطلقہ کے
حقوق

وہ عام طلاق یافتہ ہیں۔ جو مهر مثل یا پوکے مهر کی حقدار ہیں۔ فرمایا کہ اُن کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاؤ۔ یہ مستحب ہے۔ ان کو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ وہ طلاق کے غم میں مغموم ہیں۔ اُن کی دل جوئی ہونی چاہیئے۔ ان کے لیے بھی ایک جوڑا کپڑے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یہ بات متقیوں پر لازم ہے۔

فرمایا کَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے۔ آیت کے مختلف معانی آتے ہیں مثلاً دلیل، معجزہ، نشانی وغیرہ تاہم یہاں پر آیت سے مراد اس کے احکام ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نازل کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ تاکہ تم انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر احکام پر چلتے ہو گے تو سعادتمند کی منزل پا لو گے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۴۲ تا ۲۴۵

درس یکصد و سہ (۱۰۳)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ
 حَذِرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا فَقَفَّ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ
 إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا
 يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
 سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا
 حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۖ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصِطُ
 وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۴۵﴾

تو جبرہہ کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کو جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ
 ہزاروں کی تعداد میں تھے موت کے ڈر سے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا مر جاؤ
 پھر اُن کو زندہ کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر
 لوگ شکریہ ادا نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ
 اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ
 کو قرض دے، اچھا قرض۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے دگنا کر دے گا۔ کئی گناہ
 اور اللہ تعالیٰ تنگی کرتا ہے۔ اور کشائش کرتا ہے۔ اور تم سب اُسی کی طرف لوٹاؤ گے ﴿۲۴۵﴾
 وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا ۖ سَلِّ عَلَىٰ كَرَامَتِ

ربط آیات

نے بہت سے احکام بیان فرمائے ہیں جن کا تعلق برہمنی نبی کے ساتھ ہے۔ ان میں
 نکاح، طلاق، عدت اور ان کے متعلقات بیان ہوئے ہیں۔ عدت اور حرمت کا
 مسئلہ بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق مسائل
 کا بیان ہوا ہے۔ اب یہاں سے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا تذکرہ شروع ہو

ہو رہا ہے۔ پہلی آیت مسئلہ جہاد فی سبیل اللہ میں تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد حاکم کے انتخاب اور اس کے تحت جہاد میں حصہ لینے کا تذکرہ ہے کسی پہلی امت کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے راستے میں اُن پر موت طاری کر دی۔ پھر انہیں عجیب و غریب طریقہ سے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

اسلوب خطاب

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا اے مخاطب۔ تَرَ کا لفظ رویت سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں مگر رویت بھی دو قسم کی ہے۔ ایک برویت بصری یعنی اس ظاہری آنکھ سے دیکھنا اور دوسری قسم ہے روایت قلبی یعنی علم کے ذریعے کسی چیز کو جان لینا۔ جیسے کسی کو کہا جائے "اَلَمْ تَعْلَمْ کیا تو نہیں جانتا۔ تجھے یہ بات معلوم نہیں۔" دوسرے لفظوں میں تجھے یہ بات ضرور معلوم ہے۔ چنانچہ موقع محل کے مطابق بعض اوقات رویت کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے اور بعض اوقات علم سے جانتا۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر اَلَمْ تَرَ سے مراد علم کے ذریعے جانتا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھ سے ظاہر ہے کہ اب جو واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ وہ پہلی امتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اس زمانہ میں اس واقعہ کو آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں، البتہ بعد میں اس کا علم ہوا ہے۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے زمانہ یعنی نزول قرآن سے بھی پہلے کا ہے اس لیے اُس وقت بھی یہ رویت بصری نہیں تھی۔ بلکہ رویت قلبی یا برویت علمی تھی۔ اس طرح کا اسلوب بیان بعض دوسری آیات میں بھی ملتا ہے۔ جیسے اَلَمْ تَرَ اِلٰی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰہِیْمَ فِیْ رَبِّہٖ کیا تو نے اُس شخص کی طرف نہیں دیکھا۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اُس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔ سورۃ فیل میں فرمایا اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ واقعات خود حضور علیہ السلام کے زمانے سے بہت پہلے کے ہیں۔ مگر لفظ اَلَمْ تَرَ ہی لایا گیا ہے مقصد یہ

کہ ہم نے علم کے ذریعے آپ کو بتا دیا ہے۔ کہ فلاں فلاں واقعہ ایسے ایسے پیش آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا۔ تو آخر میں فرمایا ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ آپ اُس وقت اُن کے پاس نہ تھے۔ گویا یہ بات آپ کو بذریعہ علم معلوم ہوئی۔

جہاد سے فرار
اور موت

الغرض فرمایا اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں جانا اُن لوگوں کا حال اِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے وَهُمْ اَلْوَفَّ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ کس وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے حَذَرَ الْمَوْتِ موت سے ڈر کر۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں موت کیوں نظر آرہی تھی۔ اس ضمن میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ تواریک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بنی اسرائیل سے تھے۔ اور انہیں ایک دوسری فلتی نامی قوم سے جہاد کا حکم ہوا تھا۔ مگر یہ لوگ جہاد پر آمادہ ہونے کی بجائے جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ دوسری جگہ چلے جائیں گے، تو موت سے بچ جائیں گے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اُن لوگوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے سے بھاگ کر پہاڑوں کے دروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ یہاں کی آب و ہوا نسبتاً بہتر ہے۔ اور اس پر فضا ماحول میں وہ طاعون سے بچ جائیں گے۔ جہاں تک اُن کی تعداد کا تعلق ہے، مستدرک حاکم کی روایت اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔ کہ وہ لوگ چار ہزار کی تعداد میں تھے۔ بعض روایتوں میں ستر ہزار تک کی تعداد کا ذکر آتا ہے۔ مگر ابن عباسؓ کی روایت زیادہ قوی ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے۔ کہ جس علاقہ میں طاعون پھیل جائے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ بھاگنے والے اپنے ساتھ وبائی اثرات لے جائیں اور اگلے علاقے میں وبا پھوٹ پڑے۔ نیز وبائی مرض سے باہر رہنے والے لوگوں کو فرمایا کہ وہ متاثرہ مقام پر جانے کی کوشش نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی

مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی روایت میں بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وہابی مرض والے خطہ سے باہر نکلوا اور نہ وہاں جانے کی کوشش کرو۔ بہر حال یہ احتیاطی تدبیریں بہرگہ جس کی موت لکھی جا چکی ہے۔ وہ رک نہیں سکتی۔ وہ جہاں بھی ہوگا، اُس پر موت طاری ہو جائے گی۔ اور پھر یہی حال ان بھاگنے والوں کا ہوا۔ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا اللَّهُ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ مر جاؤ۔ وہ جس وجہ سے بھی بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچے اللہ نے اُن پر وہیں موت طاری کر دی، اور ان کا اپنے گھروں سے بھاگ نکلنا کچھ کام نہ آیا۔

دوبارہ زندگی

ان لوگوں کی دوبارہ زندگی کے متعلق کئی ایک روایتیں ہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے بنی حزقیل علیہ السلام موجود تھے جن پہاڑی دروں میں یہ لوگ پناہ گزین ہوئے وہاں حزقیل علیہ السلام کبھی کبھی عبادت کے لیے آتے تھے ان لوگوں کی موت کے بعد جب اللہ کے بنی حسب معمول عبادت کیلئے گئے، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن دروں میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں، انہیں علم نہیں تھا کہ کوئی واقعہ پیش آیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اُن مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کر دیا۔

اس مقام پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دوبارہ زندگی ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور معجزانہ طور پر عطا ہوئی وگرنہ موت کے بعد دوبارہ میل ملاپ کی زندگی تو قیامت کو ہی ملے گی تاہم اس قسم کے غیر معمولی واقعات کچھ اور بھی ملتے ہیں۔ جیسے اسی سورۃ بقرہ میں عاقل کا واقعہ ہے۔ جسے اُس کے عزیزوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے ورثائے مقتول کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور گوشت کا ٹکڑا امرئے کو لگانے سے وہ زندہ ہو گیا۔

یہاں سوال کہ یہ لوگ کتنا عرصہ موت کی آغوش میں رہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے۔ اس بات میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن کی موت کے آٹھ دن بعد حضرت حزقیل علیہ السلام آئے تو انکی دعا سے اُن لوگوں کو دوبارہ زندگی

مٹی۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں کو مرنے کے بعد کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اور ان کے جسم گل سٹر چکے تھے صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب کہ اللہ نے انہیں زندہ کیا۔

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں امام ابو جبر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ عذاب قبر کا انکار کرنے والے باطل پر ہیں۔ جس طرح اس قوم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پھر زندہ کر دیا تھا۔ اسی طرح ہر مرنے والے کو برزخ میں زندگی عطا کرتا ہے۔ نیکو کاروں پر انعام ہوتے ہیں۔ اور گنہگاروں کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ بعض دوسری آیات اور احادیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ کہ برزخ میں بھی لوگوں کو سزا و جزا جھگٹا پڑتی ہے۔ اگرچہ حقیقی جزا و سزا تو قیامت کو ہی ہوگی، تاہم قبر میں بھی سکون و راحت یا سزا و عذاب ہوتا ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا **ثُمَّ أَحْيَاهُمْ** پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ بائبل کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت و زندگی کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ حقیقت حال کو سمجھ گئے۔ اللہ سے معافی مانگی، جہاد میں حصہ لیا فلسطینیوں کے خلاف جواں مردی کے جوہر دکھائے اور آخر اُن کو فتح حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کیا۔

موت و حیات قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کی جتنی زندگی مقرر کی ہے۔ اس سے پہلے انسان کی موت واقع نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا اس خوف سے جہاد سے گریز نہ کرنا کہ موت آجائیگی، یہ حرام ہے۔ حضور کا فرمان ہے **لَنْ تَمُوتَ نَفْسٌ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا** جب تک انسان اپنی روزی پوری نہیں کر لیتا، اس کی موت نہیں آتی۔ لہذا حرام روزی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا **فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا إِلَيْهِ** ڈرو اور اچھے راستے پر چلو۔ چاہے کتنے بڑے حادثات پیش آجائیں موت قبل از وقت نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے لیے وقت متعین ہے۔ انسان کو اپنا فرض ادا کرتے

جہاد کرنا
حرام ہے

رہنا چاہیے خواہ جہاد میں سر دھڑکی بازی لگانا پڑے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے اُسے موت نہیں آسکتی۔ نہ دشمن اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی موت بستر پہ واقع ہوئی، حالانکہ آپ نے زندگی میں جی بھر کر جہاد کیا۔ بڑی بڑی جنگوں میں لشکر کی کمانڈ کی۔ آپ کہا کرتے تھے، خدا تعالیٰ بندوں کی آنکھ کو کھٹھڑا نہ کرے، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جس پر تیرا تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو آرزو تھی کہ میدان جہاد میں شہادت نصیب ہو، مگر افسوس کہ آج بستر پر موت آ رہی ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی ساری زندگی بھی جہاد میں گزری، اُن کے جسم کا کوئی حصہ بھی زخموں سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ اعضا مستورہ پر بھی نیزے کا زخم تھا، مگر اُن کو بھی میدان جہاد میں شہادت کی موت نہ مل سکی۔ لہذا انسان کا فرض ہے کہ موت کے خوف کو دل سے نکال دے اور فریضہ جہاد کو انجام دیتا ہے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلٰی النَّاسِ اللّٰهُ تعالیٰ بڑا افضل کریم والا ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ مگر اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی اس کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کر کے موت و حیات کی حقیقت کو سمجھا دیا۔ سند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مال خرچ کرنا چاہے تو شیطان کہتا ہے دیکھنا تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اور اگر کوئی جہاد میں شرکت کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس کے کان میں کہتا ہے سوچ سمجھ لو، تمہارے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موت و حیات ایک اہل حقیقت ہے۔ انسان کو لانا ہم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فریضہ کو انجام دیتا ہے اور موت کو خاطر میں نہ لاتے۔

جہاد کے اس تمہیدی طور پر ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جان و مال کے ذریعے جہاد کا صریح حکم دیا۔ وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اس کے دین کی سر بلندی کے لیے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ

کیونکہ موت و حیات تو اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وقتِ معین سے پہلے نہ موت آسکتی ہے اور نہ وقتِ معین کے بعد زندگی باقی رہ سکتی ہے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا ہے۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ کوئی شے اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں، لہذا اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کر دو۔ اس کا حکم ہے جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ اگر اس مالکِ الملک نے جان کی قربانی قبول کر لی۔ تو اس سے اچھا سودا کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کا تو اعلان ہے إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ اُس نے تو مومنوں کے جان و مال جنت کے بدلے خرید رکھے ہیں۔

جہاد بالمال کے متعلق فرمایا مَنْ ذِي الْأَذَىٰ يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا

جہاد بالمال

کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے۔ قرض حسن۔ اللہ کو قرض دینا یہ ہے کہ اُس کے راستے میں مال کے ذریعے جہاد کیا جائے اس کو قرض حسن اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو یقین کامل ہو جائے کہ جہاد میں لگائی ہوئی اُسکی رقم ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا بدلہ اُسے بڑھا چڑھا کر مل جائے گا فِيضْعَفَهُ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيرَةً اس قرض حسن کو اللہ تعالیٰ دُگنا بلکہ کئی گنا کر دے گا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خلوص کے ساتھ دیا ہوا کھجور کا ایک دانہ، اُحد ہار کے برابر بڑھ کر واپس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر و ثواب کو اس قدر بڑھا دیں گے۔ جو شخص فِي سَبِيلِ اللَّهِ ایک پیسہ خرچ کرے گا، اُس کو کم از کم دس گنا تو ضرور ملیگا کہ یہ قطعی قانون ہے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرٌ مِّثْلِهَا البتہ جہاد میں خرچ ہونے والے مال کے بدلے کی کم از کم مقدار سات سو گنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی کوہان کی بلندی جہاد میں مضمر ہے۔

جہاد بالمال اور جہاد بالنفس دونوں بڑھی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ اگر جہاد

جہاد کی اہمیت

سے گریز ہو گا، تو نہ عزت ہوگی اور نہ دین کا غلبہ باقی رہے گا۔ بے دین اور کافر

طاقتیں غالب آجائیں گی، حضور علیہ السلام کے ارشاد سے اور قرآن کریم کے مطابق جہاد سے گریز کرنے والے فاسق ہو جاتے ہیں یا منافق ہو جاتے ہیں۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے کہ اگر تم جہاد کو ترک کر کے تجارت، کھیتی باڑی یا دوسرے کاموں میں منہمک ہو گئے یُسَلِّطُ اللہُ عَلَیْکُمُ الذِّلَّةَ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیگا حَتّٰی تَرْجِعُوْا اِلٰی دِیْنِکُمْ اور جب تک دین کی طرف واپس نہیں آؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تم سے ذلت کو دور نہیں کریں گے۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود تھا ان کو عزت اور غلبہ حاصل تھا۔ جب جذبہ جہاد میں سستی واقع ہوئی تو نہ عزت رہی غلبہ غیر اقوام کی ملی بھگت سے مسلمان آپس کی جنگ و جدال میں مصروف ہیں۔ یہ انگریز ہی تہذیب کا اثر ہے کہ ہم اپنے اکابرین کو بھول کر غیر اقوام کے گن گاہے ہیں۔ دنیا میں چالیس سے زیادہ اسلامی سلطنتیں ہونے کے باوجود ان پر سپر پاورز کا غلبہ ہے۔ اس قسم کے تجربات گزشتہ تاریخ میں بھی ملتے ہیں۔ جب عیسائیوں نے سپین (اندلس) پر قبضہ کیا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی۔ مگر بعد میں وہاں صرف گیارہ ہزار باقی رہ گئے، کچھ مائے گئے، کچھ جبراً عیسائی بنائے گئے۔ یہ مسلمانوں کی آپس کی نا اتفاقی ہے کہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ایران اور عراق کئی سالوں سے دست و گریباں ہیں۔ دونوں اسلامی ملکوں کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کسی غیر مسلم قوم کو موقع مل جائے۔ اور یہ دونوں ان کے قبضہ میں چلے جائیں۔ روس اور امریکہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ افغانستان میں کیا ہوا۔ یکے بعد دیگرے کتنے سربراہ قتل ہوئے، ملک کمزور ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس بنزدک کشمیر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ "فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ"۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق ان دروس میں کئی دفعہ بیان آچکا قرضِ حسن ہے۔ یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اتفاق فی سبیل اللہ کو قرضِ حسن سے تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اُس کو قرضِ حسن دینے کے مترادف ہے جو وہ کئی گنا بڑھا کر دیگا۔ اس سے پہلے اس ضمن میں آچکا ہے وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ

اِلَى التَّهْلُكَةِ مال کو روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ قرض حسن وہ قرض ہے جسکی واپسی کا تقاضا نہ کیا جائے۔ مقرض پر احسان نہ جتایا جائے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو قرض لینے سے مراد جہاد میں خرچ ہے۔ یا غریبوں، محتاجوں کی اعانت ہے۔ اس کا بدلہ قطعی طور پر آخرت میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائیگا۔ ایک شخص نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیش کی۔ جس کے ساتھ مہار تھی اور اس پر پالان کسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بہت اچھا کام ہے۔ قیامت کے روز اسے ایسی سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔

قبض و بطن بظاہر خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کو جان لینا چاہیے وَاللّٰهُ يَغْبِضُ وَيَبْغِضُ قَبْضٌ وَبِغْضٌ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا چاہتا ہے مال قبض کر لیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ یہ اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کتنا مال دینا ہے۔ چنانچہ وہ اُس کے مطابق رزق میں کمی اور زیادتی کرتا ہے۔ لہذا انسان کا یہ وہم کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مال کم ہو جائیگا، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ تو اُسے زور بازو کا نتیجہ کہتا ہے اور جب وہ کم کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ کہ تنگی کے لیے میں ہی رہ گیا تھا۔ خدا پر شکوہ کرتا ہے۔ مگر اپنے کرتوت کو نہیں دیکھتا۔ کہ میرے افعال کیسے ہیں فرمایا یہ بات یہیں ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وَالَّذِي تَرْجِعُونَ تم سب کو اُسی مالک الملک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہذا جہاد بال نفس اور جہاد بال مال ہر دو طریقوں سے اللہ کو راضی کرو۔

سَيَقُولُ ۲

درس یکم چارہ (۱۰۴)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۴۶

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ
 قَالُوا لِلنَّبِيِّ إلهنا أبعث لنا ملكاً نقاتل في سبيل الله
 قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا
 تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَالَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ
 أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ
 الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۲۴۶

توجہ فرمائیے کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام
 کے بعد، جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں
 تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اُس پیغمبر نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید
 تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے
 گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ پھر جب اُن پر لڑائی فرض کر
 دی گئی تو اُن لوگوں نے روگردانی کی مگر بہت تھوڑے لوگوں نے ان میں سے۔

اور اللہ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو (۲۴۶)

گزشتہ درس کی آیت کریمہ جہاد کے مسئلہ میں بمنزلہ تمہید تھی۔ اس میں جہاد بالمال
 اور جہاد بالنفس کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ہوا۔ جب کہ
 کچھ لوگ جہاد کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک
 کر دیا۔ اور نبی زمانہ کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر زندہ کیا۔ اس سے یہ ثابت
 ہوا تھا کہ لڑائی سے راہ فرار اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ موت و حیات تو
 قبضہ قدرت میں ہے۔ موت اپنے وقت معینہ پر ہی آتی ہے۔ اس میں تقدیم و

و تاخیر کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اُسی آیت کے اگلے حصے میں لڑائی کا واضح حکم بھی دیا۔ کیونکہ جو قوم جہاد سے جی چراتی ہے۔ وہ مغلوب ہو کر قعر مذلت میں جا گرتی ہے۔

آج کے درس میں جہاد ہی کے متعلق تنظیم کا تذکرہ ہے جہاد ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے لئے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ گویا یہاں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سیاسی نظام کے اصول و قواعد بیان فرمائے ہیں اور اس کے طریق کار کی وضاحت فرمائی ہے۔

دنیا بھر کا سیاسی نظام اجتماعیت سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن پاک نے اسلام کے سیاسی نظام کے حوالہ سے سورۃ بقرہ کے علاوہ بعض دوسری سورتوں مثلاً سورۃ صف، سورۃ حج، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ وغیرہ میں بیان کیے ہیں بلکہ ان سورتوں کے بعض مقامات تو اس نظام کے متعلق مستقل ابواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اس لیے اس نظام کو چلانے کے لیے حاکم یا امیر کا تقرر لازمی ہے۔ خصوصاً جہاد جیسے اجتماعی کام کے لیے امیر لشکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی سرکردگی میں قوم جہاد میں حصہ لے سکے۔ بخاری، مسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں امارت یا خلافت پر باب موجود ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے مکمل تعلیم ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک مثال کے ذریعے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بنی اسرائیل کے حالات درست رہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں کہیں کہیں کوئی قباحت بھی پائی گئی مگر مجموعی طور پر ان کے حالات اچھے رہے۔ وہب ابن منبہ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے حالات بڑی دیر بعد بگڑنے شروع ہوئے۔ ان میں بھی شرک کی بیماری پیدا ہو گئی۔ انبیاء کی نافرمانی اور ان کا قتل قرآن پاک میں مذکور ہے۔ فسق و فجور بہت بڑھ گیا۔ جس طرح اس زمانہ میں مسلمانوں میں ہر قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں اس زمانہ میں بنی اسرائیل طرح طرح کی خرابیوں میں ملوث تھے۔ جب وہ نیچی کو چھوڑ کر بدی کی طرف راغب ہو گئے، تو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں عمالقہ بڑی طاقتور قوم تھی۔ انہوں نے بنی اسرائیل

اسلام کا
سیاسی نظام

بنی اسرائیل
کا زوال

کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قوم بنی اسرائیل کی قریبی ہمسایہ تھی، لہذا وہ آسانی سے ان پر غالب آگئے ان کے مردوں کو قتل کیا، عورتوں کو لونڈیاں بنایا۔ اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ عمالقہ نے تیس ہزار نوجوان لڑکیوں کو لونڈیاں بنالیا۔

حضرت سمویل
علیہ السلام
(SAMUEL)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت کا سلسلہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں جاری رہا۔ حتیٰ کہ لاوی خاندان میں کوئی نیک آدمی باقی نہ رہا۔ تمام کے تمام مرد نالائق اور نابکار تھے۔ ایک نیک آدمی دشمنوں کے مقابلہ میں مارا گیا، اس کی بیوی اس وقت حاملہ تھی۔ قحط الرجال کے اس زمانہ میں اس عورت نے دعا کی کہ مولا کریم! مجھے نیک اور صالح بیٹا عطا کر۔ اتفاق کی بات کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا کر دیا۔ جب کا نام اس نے سمائل یا سمویل رکھا۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو سن لیا اور بیٹا عطا کیا گو یہ لفظ اسماعیل کا ہم معنی ہے جب یہ لڑکا بڑا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے بنی بنایا اس پر یہی نام ل فرمائی یہ واقعہ جو بیان ہو رہا ہے یہی بنی سمویل علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام مسیح علیہ السلام سے گیارہ بار یا تیرہ سو سال پہلے مبعوث ہوئے اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تہرین لائے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ الغرض بنی اسرائیل اپنے نبی سمویل علیہ السلام کے پاس بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اور ان سے درخواست کی کہ ہمارے لیے تنظیم بنائیں ہمارا امیر مقرر کریں جس کی سرکردگی میں ہم دشمن کا مقابلہ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں۔

آغاز واقعہ

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَدْرَا اِلَى الْمَلِكِ مِنْ بَنِي إِسْرَآئِيلَ مَنْ كَعَدِ مُوسَى
کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَّهُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا جَبَّاسُہُنَّ نے اپنے نبی سے کہا۔ کہ ہمارے لیے ایک امیر یا بادشاہ مقرر کریں جس کی سرکردگی میں نُقَاتِلُ فِی سَبِيلِ اللّٰہِ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

لفظ ملک
کی تشریح

لفظ ملک وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ملک، سردار، امیر، حاکم یا خوشحال آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے

پاس کچھ لوگ آئے، اپنی مالی حالت کا تذکرہ کیا اور مدد کی درخواست کی۔ فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے ملک (حاکم) کے پاس سفارش کیے دیتا ہوں، اور اگر چاہو تو ہمارے پاس ٹھہرو حسبِ توفیق ہم تمہاری خدمت کریں گے، یا اگر چاہو تو صبر کرو کیونکہ صبر کا نتیجہ آخرت میں بہترین ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سوال کرنے کی بجائے صبر کو پسند کیا۔ یہاں پر ملک معنی حاکم استعمال ہوا ہے۔

ایک اور شخص آیا۔ کہنے لگا میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میری کچھ مدد کریں آپ نے فرمایا۔ کیا تمہارے پاس مکان ہے، کہا ہے۔ پھر پوچھا تمہاری بیوی ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں بیوی بھی ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا۔ تیرے پاس کوئی خادم بھی ہے تو اُس نے اس بار بھی اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ تیرے پاس مکان ہے۔ تیری بیوی موجود ہے۔ خدمت کے لیے نوکر بھی ہے۔ تو پھر تو کیا فقیر ہے۔ اَنْتَ مِنَ الْمُلُوكِ تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ مطلب یہ کہ تو خوشحال آدمی ہے جس کے پاس ضروریات کی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ ملک کہلانے کا مستحق ہے۔

ملوکیت کا تصور

بہر حال عربی زبان میں ملک کے مختلف معانی ہیں جن میں بادشاہ یا امیر بھی شامل ہے صاحبِ امر یعنی حاکم وقت بھی مراد ہے۔ مگر ملکیت کا جو تصور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اسلام ہرگز اس کی تائید نہیں کرتا۔ آج ہم سمجھتے ہیں کہ بادشاہ وہ ہے جو کسی ملک کے ہر سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ جو چاہے کمرے اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا حربہ رکھتا ہو۔ مگر ملکیت کا یہ تصور غیر فطری اور اسلامی تعلیم کے سرسرنمائی ہے اور ڈکٹیٹر شپ بھی اسی حاکمیت کا نام ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شہرانی نظام سیاست عطا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات نازل فرمائی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام (POLITICAL SYSTEM) کیا ہے۔ ان کا امیر کیا ہو، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور وہ کن امور کا پابند ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی

جماعت کن اوصاف کی حامل ہونی چاہیے۔ اس کے حقوق و فرائض کیا ہونگے
وغیرہ وغیرہ مگر افسوس کہ انہی دور کے بعد مسلمانوں میں بھی غیر اسلامی تصور ملکیت
سرایت کر گیا۔ اور یہ آج بھی مسلمانوں میں موجود ہے۔

ہم اے قریبی زمانہ میں چودہویں افضل حق بڑے فاضل آدمی ہوئے ہیں۔ زمین و
مکانات کی صورت میں لاکھوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ انگریزی دور میں اسمبلی کے
ممبر تھے۔ سرکاری ملازمت میں انسپکٹر بھی ہے۔ مگر انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار
کر ان کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے۔ مجلس احرار سے منسلک ہوئے۔ زمین و
مکان ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دی، حتیٰ کہ ان کا جائزہ مجلس احرار کے دفتر سے
اٹھایا گیا۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ
پر بھی ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ فرقہ داریت کے خلاف کتاب لکھی، سورۃ
فاتحہ کی تشریح قلبند کی۔ آپ نے ملکیت کے متعلق ایک نہایت عمدہ بات کی
ہے۔ فرماتے ہیں: "افسوس کہ بنو امیہ کے بعد مسلمانوں نے اسلام کا اجتماعی اور شوریٰ نظام
چھوڑ کر اس کی جگہ شہنشاہیت کا ٹاٹ بچھا دیا ہے۔ وہ ملکیت اور شہنشاہیت جو قصور
و کسر ہی کا طرہ امتیاز تھا اور جس کو مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری
نبی کو مبعوث فرمایا۔ یہی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسلمانوں میں پھر
راج ہے۔"

کابل کے امیر امان اللہ خان مرحوم کا باپ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اپنے وقت
کا بادشاہ تھا۔ اس کے متعلق حضرت مولانا عبد اللہ سندھی لکھتے ہیں کہ آخری دور
میں اسکی حالت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ متعدد بیویاں (تین صد بیویاں) رکھنے کے
باوجود شریف لوگوں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ مارتا تھا۔ ایسا عیاش آدمی تھا۔ بڑی حیثیت
کا مالک تھا مگر اس قسم کی حرکتیں شہنشاہیت کا خاصہ ہوتا ہے۔ آخر وہ قتل ہوا، مگر
قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ باقی نوابوں اور بادشاہوں کا بھی یہی حال ہے۔ نواب حیدر آباد
جب مراٹھوں کے ساتھ اس وقت اس نے بھی تقریباً پورے دو سو عورتیں (دراشتہ) اکٹھی کر رکھی تھیں۔

بہر حال بنی اسرائیل نے حضرت سیمول سے کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی امیر مقرر
یا ملک مقرر کر دیں، جس کی کمان میں ہم دشمن سے جنگ کر سکیں۔ اگرچہ اُس وقت اللہ
کے نبی موجود تھے۔ مگر وہ کافی بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اور جنگ میں بنفس نفیس
شرکت سے معذور تھے۔ البتہ ہدایات دینے کے لیے وہ کافی تھے۔ لہذا انکی
قوم نے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی قابل امیر مقرر کر دیں، جو جنگ میں ہماری قیادت
کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور اسلام میں جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کے بغیر سیاسی نظام چل
ہی نہیں سکتا۔ جیسے فرمایا لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے بغیر اسلام کا
کوئی تصور نہیں اور لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاِمَامِ اور امیر کے بغیر جماعت کسلیں نہیں
اسی لیے فرمایا کہ سفر میں اکیلا آدمی نہ جائے۔ اس کے ساتھ جماعت ہونی چاہیے۔
ایک اور دو _____ شیطان ہیں مگر تین کی تعداد

جماعت ہے۔ اور اگر چار آدمی جمع ہو جائیں تو فرمایا۔ خیر الجماعۃ اربعۃ
بہتر جماعت چار آدمیوں کی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جب سفر پر روانہ ہونے لگو
تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لو، اسکی سرکردگی میں، اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرو۔
انفرادی حالت میں شیطان کے غلبے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سفر بھی بحیثیت جماعت
اختیار کرو۔ شیطان کے شر سے محفوظ رہو گے۔

الغرض! جب قوم نے خود نبی سے درخواست کی کہ اُن کے لیے ایک امیر
مقرر کر دیا جائے جسکی سرکردگی میں وہ جہاد کریں۔ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ
عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ اَلَّا تَقَاتِلُوْا تو نبی نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے
تو شاید تم نہ لڑ سکو، نبی نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ جنگ فرض ہونے کے بعد اگر
تم نے اس میں لیت و لعل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جاؤ گے۔ لہذا فرضیت جہاد
سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ قَالُوْا وَمَا كُنَّا اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قوم کہنے لگی کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم لڑائی نہ کریں اللہ کے راستے میں وَقَدْ اَخْرَجَنَا

مِنْ دِيَارِنَا حَالَانِکَ ہم اپنے گھروں سے نکال دیے گئے ہیں۔ دشمن نے ہماری زمین اور ہمارے مکانات پر قبضہ کر لیا ہے وَاَبْتَکَاؤُنَا اور انہوں نے ہمیں ہماری اولادوں سے جدا کر دیا ہے۔ ہماری عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنا لیا ہے۔ اب نہ لڑنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ لہذا ہم ضرور اپنے دشمن سے جنگ کریں گے۔ آپ ہمارے لیے امیر لشکر مقرر کر دیں۔

بنی اسرائیل کی
روگردانی

بنی اسرائیل کے اس قدر اصرار کے بعد فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی، تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ تو ان میں سے ایک قلیل تعداد کے سوا سب اپنے وعدے سے پھر گئے۔ انہوں نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ اس کی تفصیلات اگلے رکوع میں آرہی ہیں۔ تاہم آگے وہ بیان بھی آرہا ہے جس میں تھوڑے لوگوں نے ہمت اور جواخروی سے دشمن کا مقابلہ کیا اور پھر وہ غالب آئے۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی اُس زمانے کے بنی اسرائیل سے کم خراب نہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات اس قدر بگڑے ہوئے ہیں۔ کہ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وجہ ایک ہی ہے کہ جہاد سے روگردانی کر رہے ہیں۔ دوسروں کے دست ننگ ہیں۔ مگر آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ذرا غور کریں فلسطینیوں کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُن کی ہزاروں لڑکیاں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ انہیں ہسنے کے لیے زمین پر کوئی ٹھکانہ میسر نہیں آرہا ہے۔ فلپائن کی عیسائی اکثریت نے مسلمان اقلیت کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مار دینے کا کوکے ہیں۔ حالانکہ وہ بیچارے قلیل تعداد میں ہیں مگر انہیں بھی جینے کا حق نہیں دیا جا رہا ہے۔ قبرص میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ صرف چند سال پہلے چالیس ہزار قبرصی تہ کوں کو ختم کر دیا گیا۔ اب انہوں نے ایک جزیرہ میں پناہ لے رکھی ہے۔ مگر عیسائی قوتیں انہیں وہاں بھی اکٹھا نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی سکیم یہ ہے۔ کہ کسی طرح ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی جمعیت کو ختم کر دیا جائے۔

فرمایا وَاللّٰهُ عَلَیْکُمْ بِالظَّالِمِیْنَ اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ظالم اور عادل

ظالم تبدیل ہوتا ہے اور جہاد سے جی چراتا ہے۔ وہ خود بھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا بلکہ برائی کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اس سے اچھے نظام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیڈر ظالم ہیں۔ اس قسم کے مولویوں، مشائخ، امیروں تاجروں سے اچھائی کی کیا امید ہو سکتی ہے البتہ اچھائی کی امید عادل شخص سے ہو سکتی ہے۔ وہی نظام اسلام قائم کر سکتا ہے۔ وہی جہاد کر سکتا ہے۔ اور قوم کو ذلت سے نکال کر عزت و آبرو کی زندگی دے سکتا ہے۔

اس ایک جملہ وَاللّٰهُ عَلٰیكُمْ بِالظّٰلِمِیْنَ میں ان سب چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

امام بیضاوی منافقین کے متعلق لکھتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا راز فاش کرتے ہوئے فرمایا اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ اصل فساد ہی لوگ ہیں ان کا اصلاح کا دعویٰ محض فریب ہے۔ کفر، شرک، معصیت، حدود اللہ کو توڑنا، بدعت کا اجراء، چوری، ڈاکہ، قتل، دوسروں کے حق کا ضیاع وغیرہ سب ظلم کی مختلف شاخیں ہیں۔ ظالم سے اسی قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔ البتہ جب عادل حاکم آئے گا، تو تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ حق و عدل کا دور دورہ ہو گا کہ عدل نظام اسلام میں سب سے بڑا ستون ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایمان چار ستونوں پر قائم ہے یعنی صبر، عدل، جہاد اور یقین، لہذا عادل شخص کے ایمان کی گواہی دی جاتی ہے۔ اور ظالم آدمی بے ایمان اور کافر ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاللّٰهُ عَلٰیكُمْ بِالظّٰلِمِیْنَ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا
 قَالُوا آلِي يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ
 وَلَمْ يُولَدْ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ
 وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن
 يَّشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۸﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ
 إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
 مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ
 تَحْمِلُهَا الْمَلَائِكَةُ إِن فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ
 مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۴۹﴾

۲۴۸ تا ۲۴۹

ترجمہ: اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا: بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے
 طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے، ہم پر اُس کی حکومت کیسے ہوگی۔ اور
 ہم اُس سے حکومت کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور وہ مال میں وسعت بھی نہیں دیا گیا۔ اُنکے
 پیغمبر نے اُن سے کہا، بیشک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اُوپر منتخب کیا ہے
 اور اس کو علم اور جسم کی فراخی کے لحاظ سے زیادہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 جس کو چاہے بادشاہی دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے
 والا ہے ﴿۲۴۸﴾ اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ بیشک اُس کی بادشاہی کی

نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا۔ جس میں تمہارے رب
 کی طرف سے دل کی تسلی ہے۔ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن کو موسیٰ اور
 ہارون علیہما السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ اس کو فرشتے اٹھا کر لائیں گے

بیشک اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم یقین رکھتے والے ہو (۲۲۸)

رابط آیات

گتہ شدہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ دو مغلوب ہو گئے۔ دشمن نے ان کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان کے بچوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا۔ انہوں نے بنی وقت حضرت سمویل علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں۔ جس کی سرکردگی میں ہم دشمن سے جنگ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں اور اپنے گھروں کو لوٹ سکیں نیز اپنے مردوں اور عورتوں کو دشمن کی غلامی سے نجات دلائیں۔ ان کے نبی نے فرمایا کہ دیکھنا کہیں اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم آپ کی طرف سے مقرر کیے گئے بادشاہ یا امیر کی اطاعت کریں گے۔ آج کے درس میں بنی اسرائیل کے لیے طالوت بادشاہ کے تقرر اور بنی اسرائیل کے انکار کا بیان آرہا ہے۔

طالوت لبطو
بادشاہ

ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ كَيْفَ بَدَأَ سے کہا اِنَّ اللہ فَ دُبْعَتْ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ لہذا تم اس کی سرکردگی میں اپنی تنظیم قائم کرو اور پھر دشمن سے جہاد کرو۔ مگر اُس قوم کے آسودہ حال لوگوں کو طالوت کا انتخاب پسند نہ آیا۔ قَالُوا كَيْفَ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا طَالُوتَ ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو غریب اور کمزور حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ بننے کا اہل نہیں وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ اس سے زیادہ بادشاہ بننے کا ہمارا حق ہے۔ وَلَكِنْ يُوْتِي سَاعَةً مِّنَ الْمَالِ ان کے پاس تو مال بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارے سردار یا امیر بننے کے بالکل اہل نہیں ہے۔

در اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہی تو زیادہ تر یہود کے خاندان میں رہی جن میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ اور نبوت زیادہ تر لاوی خاندان میں رہی جس سے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ یہ طالوت بن کش حضرت یوسف علیہ السلام

کے چھوٹے بھائی بن یامین کی اولاد سے تھا اور یہ نسبتاً چھوٹا خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت سمویل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اُسے بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر فرمادیا ان کے خاندان کو دیگر خاندانوں کی طرح عزت حاصل نہیں تھی، یہ کم تر لوگ تھے۔ خود طاقتور کپڑے رنگنے کا کام کرتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ تیل تھا۔ لہذا بنی اسرائیل اس کے بطور امیر تقرر پر رضامند نہ ہوئے۔ دراصل مالی کمزوری نبوت کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہے۔ جب بھی کسی نبی نے نبوت کا دعوے کیا۔ تو اس کی قوم نے یہی جواب دیا کہ تو تو ہماری قوم کا گھٹیا آدمی ہے۔ تیرے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ زمین و مکانات ہیں۔ نہ سونا چاندی ہے۔ تو نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی چیز طاقت کو بادشاہ تسلیم کرنے میں مانع ہوئی کیونکہ وہ شخص قوم کا ایک ادنیٰ فرد سمجھا جاتا تھا۔ اور دنیاوی مال و متاع سے محروم تھا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے امیر مقرر کرنے کی درخواست کی، اُس وقت طاقت کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ یہ سب لوگ پیغمبر کے پاس جمع تھے اور اُن سے سوال و جواب کر رہے تھے طاقت کے باپ کا گدھا گم ہو گیا تھا، وہ تلاش کرتا ہوا اُس طرف جانکلا جہاں بنی اسرائیل کے لوگ جمع تھے۔ چنانچہ وہ بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُدھر اللہ کے نبی کو وحی کے ذریعے خبر دی جا چکی تھی۔ کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے۔ جس کا قد نبی کے پاس موجود لاٹھی کے برابر ہو۔ نیز یہ کہ وہ آدمی آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے پر نبی کے پاس خوشبودار تیل والی شیشی میں جوش پیدا ہو گا۔ لہذا جس شخص پر یہ نشانیاں صادق آجائیں اُسے امیر مقرر کر لیا جائے۔ جب طاقت اُس مجمع میں پہنچا تو تیل کی شیشی میں جوش پیدا ہو گیا۔ جب اُس کا قد ماپا گیا، تو لاٹھی کے برابر نکلا، چنانچہ اللہ کے نبی نے طاقت کو بادشاہ یا امیر مقرر کر دیا مگر بنی اسرائیل نے اُسے اپنا امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

امیر کی خصوصیات

اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ محض مال و دولت یا اعلیٰ خاندان کا ہونا

ہی امارت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اصول مقرر ہیں جن کی بناء پر کسی شخص کو امارت کے عہدے پر فائز کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات جو پیغمبر نے کہی قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے۔ لہذا اس میں کسی کے ذاتی اختلاف کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ اللہ نے اُسے علم اور جسم میں وسعت دی ہے۔ یعنی اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ علم میں بھی تم سے زیادہ ہے۔ اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی تم میں سے زیادہ قوی ہے۔ یہاں پر علم سے مراد سیاسی علم یعنی نظام حکومت چلانے کی صلاحیت ہے۔ جہاں تک دینی علم کا تعلق ہے۔ وہ تو نبی کے پاس تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے سیاسی علم طاوت کو عطا کیا تھا۔ امیر کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر صحت مند یا بیمار اور لاغر شخص نظام حکومت کو بطریق احسن انجام نہیں دے سکتا۔ طاوت تیس سال کا وجہ نوجوان تھا۔ قد اور اور صحت مند تھا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی منتخب فرمایا۔ اسی طرح اُس نے طاوت کو بادشاہت کے لیے منتخب فرمایا۔

خلیفہ کا انتخاب

بعض اوقات اللہ تعالیٰ خلیفہ کا انتخاب بھی خود کرتا ہے جیسے دنیا میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام تھے۔ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا يَا دَاوُدَ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ اے داؤد علیہ السلام ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ سلیمان علیہ السلام کی خلافت کا ذکر بھی آتا ہے۔

چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب یہ تو ممکن نہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے اللہ تعالیٰ خود کسی کو خلیفہ منتخب فرمائے۔ اب خلیفہ کے انتخاب کے لیے کئی ایک صورتیں ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ سمجھدار، دانا اور صاحب حل و عقد مسلمان خود خلیفہ کا انتخاب کریں۔ جس طرح حضور علیہ السلام کے

بعد لوگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو منتخب کیا تھا۔ انتخاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ خلیفہ خود اپنا جانشین مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ خلیفہ خود مستحق ترین شخص کو اس کام کے لیے نامزد کر دے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت کے زور پر خود بخود اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کی مثال حضرت امیر معاویہؓ کی ہے۔ جنہوں نے غالب آکر خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اس طرح مسند اقتدار پر آنے والا شخص اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلائے۔ تو یہ صورت بھی قابل قبول ہے۔ خلافت کے معاملہ میں اہل اسلام میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمانوں کی جماعت پر واجب ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی یہی جماعت اُسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ خلیفہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور وہ بھی غلطی کر سکتا ہے۔

بر خلاف اس کے شیعہ کا عقیدہ یہ ہے۔ خلیفہ یا امام معصوم ہوتا ہے۔ اور اُس کا انتخاب من جانب اللہ ہوتا ہے اس کی خلافت مستقل ہوتی ہے اور کوئی اُسے معزول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ عقیدہ درست نہیں ہے۔ خارجی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حاکم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

خلیفہ کا انتخاب اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے یہ مسئلہ آپ کے کفن دفن سے پہلے طے کر لیا۔ کیونکہ ہر جماعتی کام میں امیر کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تمام امور اس کے احکام کے تحت انجام دیے جاتے ہیں۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے کہ جب تین آدمی سفر پر روانہ ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں تاکہ سفر کے تمام معاملات تنظیم کے تحت حل ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھی اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ملک کا نظام ایسے ہاتھوں میں دیں جو اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کر سکیں۔ اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے جو خود ایماندار اور عادل ہوں۔ مولانا تشریح فرماتے ہیں کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو، مگر جب حکومت منتخب کرنے کا وقت آتا ہے۔ تو ہمیشہ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ اسمبلی کا ممبر اس شخص کو چننا جو کتاب اللہ کا عالم اور حضور علیہ السلام کی سنت اور خلفائے راشدین کے دور کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جو شخص کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے واقف نہیں، وہ اسلامی نظام کیسے لایگا ممبر ایسا ہونا چاہیے۔ جو قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کر دے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور آخرت میں محاسبے کا ڈر ہو۔ صرف ایسے لوگ ہی اللہ کا قانون جاری کر سکتے ہیں۔ وہ جب پارلیمنٹ میں جائیں تو سربراہ بھی صحیح منتخب کریں گے۔ اور قانون بھی ٹھیک ٹھیک وضع کریں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی ہمارے اکابرین میں سے ہیں۔ آپ اجتماعیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے۔ آپ سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سولہ سال کی عمر میں مسلمان ہو کر حضرت خواجہ محمد صدیقؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اس عمر میں ان کا ختنہ بھی کر لیا۔ مولانا بھی اپنے آپ کو خواجہ صاحب کا روحانی فرزند کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد صدیقؒ اپنے زمانے کے اس پایہ کے بزرگ تھے۔ جس پایہ کے حضرت جنید بغدادیؒ ہوئے ہیں۔ ان کے دو مرید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا غلام محمد دین پوریؒ اور دوسرے مولانا سید تاج الدین امر دہلیؒ۔ مولانا دین پوریؒ علم میں زیادہ وسعت نہیں رکھتے تھے تاہم حاجی امداد اللہؒ کی طرح نسبت بہت اونچی تھی۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں اس دور میں ان جیسا کوئی بزرگ نہیں ہوا۔ سید تاج الدین امر دہلیؒ میں دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں آپ عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ آپ کے ہاتھ پر تقریباً سات ہزار ہندو سکھ مسلمان

ہوئے شیخ المذہب مولانا محمود الحسنؒ کے دوست اور رفیق ان کی طرح انگریزوں کے سخت دشمن تھے، آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جب مولانا عبد اللہ سندھیؒ تحصیل علم کے لیے ہندوستان جا رہے تھے۔ تو حضرت خواجہ محمد صدیقؒ نے ان کے حق میں دعا کی۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صحیح عالم دین کے پاس پہنچائے اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ اور چلتے چلتے مولانا سندھی دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا شیخ المذہبؒ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جملہ علوم آپ کے حاصل کیے۔ اور حدیث کا درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے گنگوہ میں جا کر لیا آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے مگر قیام گنگوہ میں تھا۔ مولانا سندھیؒ کی ذہانت کا یہ عالم تھا۔ کہ خود لکھتے ہیں کہ علم میراث کی کتاب سرجی صرف دو گھنٹے میں پڑھ لی اور صحاح کستہ میں سے ابن ماجہ اور نسائی دو دن میں ختم کر لی۔ جب آپ علم حاصل کر کے واپس اپنے پیر صاحب کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے آخری وقت میں اپنے دونوں شاگردان کو وصیت فرمائی تھی۔ کہ جب عبد اللہؒ واپس آئے۔ تو اُسے اپنا بیٹا سمجھنا۔ چنانچہ ان دو بزرگوں نے آپ کو باپ کی سی شفقت دی۔

مولانا سندھیؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ تحصیل علم کے بعد میں نے اٹھارہ سال تک اپنے استاد محترم مولانا محمود الحسنؒ کی خدمت میں رہ کر اسلامی سیاست اور حکمت سیکھی۔ شیخ المذہبؒ سیاسیات کے بہت بڑے اہم تھے۔ مولانا سندھیؒ کا چھوٹا ساقہ مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں وہ صلاحیت رکھی تھی کہ انگریز جیسا جابر حکمران آپ کے بہت خائف تھا۔ آپ کے پیچھے ہر وقت جاسوس لگے رہتے تھے۔ آپ بارہ سال تک مکہ معظمہ میں رہائش پذیر رہے۔ عرب حکومت نے بھی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے طوفان اٹھنے کا خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے ایک مولوی کو جاہوی کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اللہ

کے گھر میں بھی میرا بیچا کر رہے ہو۔ تقسیم ہند سے پانچ سال قبل آپ نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے انگریز کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب یہ اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ زیادہ عرصہ ہندوستان میں ٹھہر گیا تو میری قبر پر تھوک دینا کہ تو نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اس کے بعد دو سال کے اندر اندر انگریز کو ہندوستان خالی کرنا پڑا۔

شرائط خلافت

جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلافت کے لیے اعلیٰ خاندان کا ہونا اور خلیفہ کے پاس مال و دولت کا ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طاقت کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ علم اور صحت کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر تھا۔ اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسی لیے اہم البو بخاری جصاص اور دیگر مفسرین کہہ رہے ہیں کہ خلیفہ کے لیے خاندان قریش سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ حدیث شریف الْأَخْمَصَةُ مِنَ الْقُرَيْشِ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کے علاوہ لوگ کسی دوسرے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت قریش میں خلافت کا کام انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ اگر دو آدمی بھی خاندان قریش سے باصلاحیت ہوں گے تو خلافت کسی اور طرف منتقل نہیں ہوگی۔ مگر عباسیوں کے دور میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا کہ دو آدمی بھی باصلاحیت موجود نہ رہے۔ لہذا خلافت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسری جگہ آتا ہے مَا أَقَامُوا حَبَّتَ الْإِصْفَاءِ پر قائم رہیں گے۔ خلافت ان کے پاس رہے گی۔ چنانچہ ساڑھے چھ سو سال تک خلافت اسی خاندان میں رہی پھر جب

اس

اہلیت سے محروم ہو گئے تو خلافت سے محروم ہو گئے۔ آج بھی من حیث القوم مسلمانوں میں صلاحیت ناپید ہے۔ مسلمان خود اپنا صحیح خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے۔ آج وہ مسلمان کہاں سے پیدا ہوں جو قومی درد کھنسنے والے ہوں۔ اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر سکیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ قوم عصرِ مذلت سے نہیں نکل سکتی۔

الغرض! فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض خصوصیات کی بنا پر طاقت کو بادشاہ منتخب فرمایا ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَّشَاءُ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے واللہ واسع علیہم اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے وہ جس کو بادشاہی دیتا ہے اس کو مال و دولت سے بھی نواز سکتا ہے۔ اور جس کے اندر خود اس نے صلاحیت رکھی ہے۔ اس کو امیر بنا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

اللہ کے نبی نے اللہ کے حکم سے اپنی قوم کے سامنے ایک معجزانہ نشانی کا اظہار فرمایا۔ تاکہ ان کی تسلی ہو جائے کہ طاقت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا انتخاب بالکل درست ہے۔ قوم جانتی تھی کہ جب دشمن نے ان پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ تو سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا وہ مقدس صندوق بھی اٹھا کر قریہ پاریم میں لے گئے تھے۔ جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے تبرکات تھے۔ جن میں حضرت موسیٰ کی لاٹھی، تختی کے ٹکڑے۔ تورات کا کچھ حصہ، آپ کا لباس اور پاپوش وغیرہ تھے۔ یہ ایسی بابرکت چیز تھی۔ کہ بنی اسرائیل سفر و حضر میں ہمیشہ اسے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ تابوت جنگ میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے جسکی برکت اللہ انہیں فتح دیتا۔ تابوت سیکینہ حضرت سلیمان کے زمانے تک بنی اسرائیل میں رہا۔ پھر آپ نے بیت المقدس میں سیکل سلیمانی کی تعمیر کے وقت ہاں رکھ دیا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ لپس چلتا۔ بعض کہتے ہیں کہ سیکل سلیمانی میں دفن ہے۔ غالباً اس لیے یہودی وہاں پر کھدائی کر رہے ہیں تاکہ وہ تابوت مل جائے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کو تبرکات کے گھو جانے کا بڑا قلق تھا مگر وہ مجبور تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اَنۡ كُنۡتُمْ اِيۡلَٰهَ مُلْكِهِ اَنۡ يَّآتِيۡكُمُ التَّابُوتُ تمہارے پاس وہ صندوق خود بخود آجائے گا فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ مِّنۡ رَبِّكُمۡ جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین قلب ہے۔ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰی وَاٰلُ هٰرُوۡنَ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ تَحْمِلُہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اسے فرشتے اٹھا کر لائیں گے۔

یہ صندوق بیس سال تک دشمن کے قبضہ میں رہا۔ اللہ کی قدرت وہ جس جہت میں

صندوق کو کھتے تھے۔ وہاں وہاں بھوٹ پڑتی اور وہ بستی تباہ ہو جاتی تھی۔ اس طرح پانچ بستیوں
تباہ ہو گئیں۔ تو ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو کسی طرح نکال دیا جائے، چنانچہ
انہوں نے صندوق بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ایک طرف ہانک دیا۔ بیل چلتے
چلتے طالوت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور اس طرح صندوق ان کے پاس آ گیا۔
شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صندوق اگرچہ بظاہر بیل گاڑی پر آیا تھا۔ مگر اللہ کے حکم
کے مطابق اسے فرشتے لائے تھے۔ جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے
ہی بیلوں کو طالوت کے دروازے پر لاکھڑا کیا تھا فرمایا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ اگر تمہیں یقین آیا،
ان نشانیوں کو دیکھ کر بنی اسرائیل طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے پر مطمئن ہو
گئے۔ چنانچہ قوم نے ان کی سرکردگی میں جہاد کرنے کا عزم بھی کر لیا۔ اب اللہ کا
نبی صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھا اور طالوت بادشاہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ وہ دشمن سے جنگ کے
لیے نکلے جس کا ذکر اگلے درس میں آئے گا۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ
 بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَّمْ
 يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ
 فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا مَعَهُ ۚ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلقُوا اللَّهَ ۚ كُمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
 غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً ۚ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝۲۴۹

ترجمہ: جب طالوت اپنے لشکر کے ہمراہ باہر نکلے، تو انہوں نے کہا، بیشک
 اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر سے۔ پس جس نے نہر سے پانی پی لیا وہ مجھ
 سے نہیں ہے۔ اور جس نے اس سے نہ چکھا بیشک وہ میرا ہے۔ ہاں جس نے ہاتھ
 سے پانی کا چلو بھریا وہ مستثنیٰ ہے۔ پس لوگوں نے اس میں سے پی لیا سوائے تھوڑے
 آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور اس کے ہمراہ اہل ایمان نہر سے پار ہوئے تو کہنے
 لگے کہ آج جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں ہے۔ جو
 لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے، کہنے لگے کہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے
 کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ
 صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۝۲۴۹

رابطہ آیات

گزشتہ درس میں طالوت کے بطور بادشاہ تقرر کا بیان آچکا ہے۔ جب اللہ کے
 نبی نے بنی اسرائیل کی درخواست کے مطابق طالوت کو بادشاہ مقرر کیا۔ تو انہوں نے اُسے
 اپنا رہبر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ تو ایک غریب آدمی تیس کے پاس

مال و دولت نہیں ہے۔ ہم اُسے اپنا بادشاہ کیسے تسلیم کر لیں۔ اس سے زیادہ تو بادشاہت کے ہم حقدار ہیں مگر اللہ کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طاہر کو علم اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ نیز یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہے جس کو چاہے بادشاہت دے دے۔ لہذا تمہیں اس پر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ دیکھو طاہر کے تقریر کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ تمہارا وہ مقدس صندوق جس میں انبیائے سابقین کے بعض تبرکات محفوظ ہیں۔ اور جسے تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے، وہ تمہارے پاس فرشتے لے کر آئیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ مقدس صندوق ایک بیل گاڑی کے ذریعے خود بخود طاہر کے دروازے پہنچ گیا۔ اب قوم نے طاہر کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اس کی سرکردگی میں دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ آج کے درس میں لشکر طاہر کی دشمن کے مقابلے کے لیے روانگی اور پھر راستے میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔

لشکر طاہر
اور جالوت

طاہر بادشاہ کی سرکردگی میں فوج کی تیاری شروع ہوئی۔ عام اعلان کیا گیا کہ تمام کے تمام صحت مند جوان فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ چنانچہ اسی ہزار کا لشکر تیار ہوا۔ دشمن بھی بڑا طاقتور تھا۔ قوم عمالقہ کا سردار جالوت تھا۔ دس فٹ قد کا یہ جوان بڑا طاقتور تھا۔ اُسے دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ بائبل کی روایتوں میں آتا ہے کہ جالوت کی ڈھال تین من وزنی تھی۔ چہرہ چھوڑ کر اس کا باقی سارا جسم زرہ میں محبوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کھیل جوان موجود تھے مگر سب کافر اور مشرک تھے۔ لشکر طاہر کا ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔

سپاہی کے
اوصاف

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی لشکر بعض مخصوص اوصاف کا حامل ہونا چاہیے تاکہ اُسے دشمن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہو۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی سپاہی میں حرص کا مادہ نہ ہو۔ اگر ان میں حرص اور لالچ پیدا ہو گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔ اس کے بجائے طبیعت میں استقلال ہونا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ اسلام کے سپاہی کے لیے مستقل مزاجی ایک اچھی علامت ہے۔

اس کے علاوہ صبر ثبات ابراہیمی کا بہت بڑا اصول ہے۔ صبر شکر، اللہ کا ذکر، نماز عقیقہ توحید پر پختگی، تعظیم شاعرہ اللہ اور دعا سب ایسے اصول ہیں۔ جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہیں۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کے صبر و استقلال اور مصائب کو برداشت کرنے کے کتنے واقعات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ انہوں نے جھوک، پیاس اور ہر قسم کے ابتلا کو برداشت کیا۔ مگر جہاد سے منہ نہیں موڑا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کی معیت میں ایک اسلامی لشکر جہاد پر روانہ ہوا۔ راستے میں راشن کی کمی واقع ہو گئی۔ اور اس کی مقدار مٹھی بھر فی کس رہ گئی۔ جب راشن بالکل محصور رہ گیا۔ تو ایک ایک کھجور حصے میں آنے لگی۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب کھجور کی گٹھلیوں کو چوس لیا جاتا اور اوپر سے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا۔ جب بالکل کچھ نہ رہا تو درختوں کے پتے کھانے شروع کر دیے۔ کھڑے پتے کھا کھا کر صحابہؓ کی باچھیں پھٹ گئیں۔ حدیث کے لفظ ہیں تَقَرَّقَتْ أَفْوَاهُهُمْ اِنْ كُنْ مِنْهُمْ بَحْثُ گئے۔ مگر اس قدر مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بلکہ دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

شکر کی
آزمائش

بعض اوقات سالار لشکر اپنے لشکر کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ فوج ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور بعض اوقات اس میں خاص مصلحت بھی ہوتی ہے۔ جو امیر لشکر کے ذہن میں ہوتی ہے۔ تو اس لحاظ سے امیر کو حق حاصل ہے۔ کہ وہ حالات کے پیش نظر فوج کو کوئی حکم دے۔ جس کی بظاہر کوئی افادیت نہ ہو۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر و ابن العاصؓ کو امیر لشکر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ فوج میں بطور سپاہی شامل تھے۔ جب دشمن کے قریب پہنچے تو ایک جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ رات سخت سرد تھی۔ مگر امیر لشکر نے حکم دیدیا کہ کوئی شخص آگ نہ جلائے۔ لوگ سخت حیران ہوئے کہ سردی میں کھڑے ہیں۔ مگر آگ جلانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ نہ آگ جلی، نہ کھانا پکا۔ لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ سے گزارش کی کہ امیر لشکر کے پاس سفارش کریں۔

کہ آگ جلانے کی اجازت دیں، مگر شیخینؒ نے یہ کہہ کر سفارش کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ اس شخص کو حضور علیہ السلام نے امیر مقرر کیا ہے۔ اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ آگ نہ جلانے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ آخر علی الصبح امیر نے دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا وہ لوگ اسلامی لشکر کی آمد سے بے خبر تھے۔ اچانک حملہ ہوا۔ تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اگر رات کو آگ روشن کرتے تو دشمن کو ہماری آمد کا پتہ چل جاتا اور وہ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔

طالوت نے بھی اپنے لشکر کو اللہ کے حکم سے آزمائش میں ڈالا۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ جب طالوت لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ کہا اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک چھوٹی سی نہر ہے جو حیرون میں شمالاً جنوباً بہتی ہے پیچ و خم کے راستے اس کی کل لمبائی دو سو میل کے قریب ہے۔ تاہم براہ راست قریب ترین فاصلہ پنیٹھ میل بنتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے جسے عبور کر کے دشمن کے مقابلہ پر جانا تھا۔ جب لشکر اس نہر کے قریب پہنچا۔ تو امیر لشکر نے اعلان کیا کہ تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ اگرچہ تم پیاس کی شدت میں مبتلا ہو، مگر اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہاں سے پانی نہیں پینا فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے نہر کا پانی پی لیگا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّيْ اور جس نے اس پانی کو بالکل نہ چکھا، بلاشبہ وہ مجھ سے ہے۔ یعنی وہ میرے لشکر میں شامل رہیگا۔ ہاں اتنی گنجائش ہے اِلَّا مَنِ اعْتَرَفَ عُرْفَةً بیکدہ کہ جو کوئی اپنے ہاتھ سے چلو بھرے تو اس کو اجازت ہے اس سے زیادہ پانی پینے کی اجازت نہیں۔

فَلَيْسَ مِنِّيْ کے الفاظ بہت سی احادیث مبارکہ میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں

کہیں حضور علیہ السلام نے امت کو کسی کام سے روکا، فرمایا جو ایسا کرے گا۔ فَلَيْسَ مِنِّي وہ مجھ سے نہیں ہے۔ جیسے فرمایا مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي جو میری سنت سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یا جیسے فرمایا مَنْ لَكُمْ يُكْرِمُ ضَيْفَنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو ہم سے نہیں ہے۔ یا جیسے فرمایا مَنْ لَكُمْ يَكْرِمُ ضَيْفَنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو کسی مسلمان کو دھوکا دے، وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اکثریت
ناکامی

غرض! طالوت کے پانی سے منع کرنے کے باوجود فَتَرَبُّوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ اسی ہزار کے لشکر میں سے اکثریت نے خوب پیٹ بھر کر پانی پیا، سوائے ایک قلیل تعداد کے جنہوں نے امیر لشکر کے حکم پر صبر استقامت کا دامن تھامے رکھا۔ کہتے ہیں کہ اس قلیل تعداد میں سے بعض نے تو بالکل نہ پیا اور بعض نے چلو بھر پانی لے لیا۔ جس کی اجازت تھی۔ حدیث شریف میں ان کی تعداد ۳۱۳ آتی ہے۔ اور یہ تعداد بدر کے جانثاروں کی تعداد کے برابر ہے۔ بعض روایتوں میں ۳۱۹ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی ہزار کے لشکر میں صرف یہ قلیل تعداد آزمائش میں پوری اترئی، باقی کی غالب اکثریت پانی پینے کے بعد سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ آگے بڑھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ اور نہر کے اس پار ہی رُک گئے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَبَ طَالُوتُ اور اس کے

ہمراہی اہل ایمان نہر سے پار پہنچے تو سامنے جالوت، کا لشکر موجود تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کرام کے حوالہ سے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت طالوت کا لشکر تین گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ پہلا گروہ ناقص الایمان تھا، جنہوں نے حکم کے خلاف سیر ہو کر پانی پیا اور لڑائی کے قابل نہ رہے۔ دوسرا گروہ کامل الایمان لوگوں کا تھا جنہوں نے چلو بھر پانی پیا۔ مگر یہ گروہ اپنی قلتِ تعداد کی بنا پر دشمن کے لشکر سے خوفزدہ تھا۔ کہ اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کیسے

ہو گا۔ کہتے ہیں۔ کہ تیسرا گروہ اکمل الایمان تھے۔ جن کا ایمان اتنا پختہ تھا۔ کہ قلت و کثرت ان کے نزدیک بے معنی چیز تھی۔

غرض! پہلا گروہ تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے تو جنگ کی طرف منہ کرنے

کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوسرا گروہ کہنے لگا قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ

وَجُنُودِهِ اپنی قلت تعداد کی وجہ سے ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی

طاقت نہیں رکھتے۔ اگر لڑائی شروع کی۔ تو ہم مغلوب ہو جائیں گے۔ اسی ہزار کا لشکر

لے کر نکلے تھے مگر اب صرف ۲۱۳ باقی ہیں۔ یہ دشمن سے کیسے نبرد آزما ہوں گے

رہا تیسرا گروہ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّسْلِمُونَ اللّٰهُ اور یہ الیا گروہ تھا۔ جسے

یقین کامل تھا۔ کہ انہیں ایک دین اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ اگر بددلی

سے مرجائیں گے تو بھی اللہ کے ہاں پیشی ہے۔ اور اسکی رضا کے لیے سرد صبر

کی بازی لگادیں گے تو پھر بھی جانا تو وہیں ہے۔ وہ ہماری نیتوں سے واقف

ہے۔ لہذا انہوں نے شکریوں کو تسلی دی کہ دیکھو تعداد کی قلت اور کثرت کی وجہ

سے جنگ نہیں لڑی جاتی بلکہ اس کے لیے بامقصد اور پُر خلوص جذبے کی ضرورت

ہے۔ تم اپنی ہمت کے مطابق پوری قوت کے ساتھ ٹکرا جاؤ اور نتیجہ اللہ تعالیٰ

پر چھوڑ دو۔ کیا تم تاریخی واقعات کو بھول چکے ہو۔ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ

کہتے ہی قلیل تعداد کے لشکر تھے غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ جو اللہ کے

حکم سے کثیر التعداد لشکروں پر غالب آئے۔

صحابہ کرامؓ کے ایسے کہتے ہی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں جن میں صحابہؓ کی

قلیل تعداد دشمن کی کثیر تعداد پر غالب آئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جنگ

کا جو نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس میں دشمن کا لشکر ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جب

کہ مسلمانوں کی تعداد صرف ساٹھ تھی۔ اس واقعہ کے متعلق کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

غَزَا سِتُّونَ وَهُمْ سِتُّونَ أَلْفًا

مَعَ هَذَا تَوَلَّوْا مُدْبِرِينَ

تاریخی واقعات

اس معرکہ میں ایک ایک مومن ایک ایک ہزار کافر کے مقابلہ میں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی۔ صرف دس مسلمان شہید ہوئے جب کہ کفار کے دس ہزار جہنم واصل ہوئے۔

بخاری شریف میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ آتا ہے آپؓ نے دو لاکھ کفار کے لشکر میں تنہا کود گئے اور تلوار چلاتے ہوئے ایک سر سے دوسرے سر تک چلے گئے۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پھر واپس آئے اور ہیشمار کفار کو ہلاک کیا۔ جنگ احد کے متعلق طبری کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایک بڑا سخت مرحلہ پیش آگیا۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ اور آپ اکیلے رہ گئے۔ اس نازک موقع پر انصار مدینہ میں سے حضرت ابو دجانہؓ نے حضور علیہ السلام کی حفاظت کے لیے اپنی پشت کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ اور تلوار اور نیزے کے چورسی زخم کھائے۔ مگر آپ کی حفاظت کی۔ ایک اور موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور فرمایا، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے گا۔ سب خاموش تھے کہ ابو دجانہؓ بول اُٹھے۔ حضور! یہ مجھے عطا فرمائیں، میں اس کا حق ادا کر دوں گا۔ اور پھر آپ نے واقعی اس کا حق ادا کر دکھایا۔

جب سیلہ کذاب نے دعویٰ نبوت کیا۔ تو اس کے پاس چالیس ہزار کا لشکر تھا جو قلعہ بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا ایک قلیل لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں سرکوبی کیلئے پہنچا۔ مگر مضبوط قلعہ سر نہیں ہوتا تھا۔ آخر حضرت ابو دجانہؓ نے ایک تدبیر بتائی۔ کہنے لگے، مجھے ٹوکری میں ڈال کر رات کی تاریکی میں کسی طرح قلعے اندر اتار دو، باقی کام میں خود کہہ لوں گا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت ابو دجانہؓ نے ٹوکری سے نکل کر بے دریغ تلوار چلا کر شروع کر دی۔ دشمن میں افراتفری پیدا ہو گئی، وہ سمجھے کہ مسلمانوں کا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا ہے۔ لہذا انہوں نے خود ہی قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس معرکہ میں سیلہ کے ۲۸ ہزار آدمی مارے گئے۔ کئی ہزار کفار صرف ابو دجانہؓ کی تلوار کا شکار ہوئے۔

غرض ! اُن اکمل الایمان لوگوں نے باقی سپاہیوں کو حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی کوئی
 بات نہیں۔ اللہ ہمارے قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غالب کرے گا۔ لہذا تم صبر و استقامت
 کے ساتھ جنگ میں کود جاؤ۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں
 کے ساتھ ہے۔ صبر ایسی ضروری چیز ہے۔ جس کے بغیر نہ نماز ادا ہو سکتی ہے نہ روزہ
 کی بھوک پیاس بے داشت ہوتی ہے۔ نہ جہاد میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی تبلیغ کا کام
 کما حقہ ادا ہو سکتا ہے۔ صبر ملتِ ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کو اپنانے والے
 ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پچھدہفت (۱۰۷)

آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ
ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُمْ
بِإِذْنِ اللَّهِ قَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّخَذَهُ اللَّهُ الْمَلِكَ وَ
الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾

ترجمہ : اور جب جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے
ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ۔ اور کافر قوم
کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۵۰﴾ پس اہل ایمان نے ان (کافروں) کو شکست دی اللہ
کے حکم سے اور قتل کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو
سلطنت اور حکمت دی۔ اور جو چاہا سکھایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے
ساتھ دفع نہ کرتا، تو زمین خراب ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ جہان والوں پر فضل کرنے والا ﴿۲۵۱﴾

گزشتہ درس میں طالوت کے لشکر کی روانگی کا تذکرہ تھا کہ جب وہ دشمن کی طرف
چلے تو راستے میں طالوت نے اپنی فوج کو آزمایا کہ یہ لوگ کس حد تک تکالیف
برداشت کر سکتے ہیں۔ راستے میں نہر پڑتی ہے۔ اللہ کے حکم سے طالوت نے
اپنے سپاہیوں کو اس نہر سے پانی پینے سے منع کر دیا۔ اور پیاس برداشت کر نہی
تلقین کی۔ ہاں البتہ سخت شدت کی صورت میں چلو بھر پانی پی لینے کی اجازت دی
مگر لشکر کی اکثریت پیاس برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا
جسکی وجہ سے ان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی اور وہ آگے سفر کرنے کے قابل نہ رہے

ربط آیات

لہذا تھک مار کر وہیں بیٹھ گئے۔ حالت صرف ۳۱۳ سپاہیوں کا لشکر لے کر نہر سے پار ہوئے۔ اب فوج تین گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ جنہوں نے خوب پانی پیادہ ناقص الایمان لوگ تھے اور وہ ادھر بہہ رہ گئے۔ جو نہر سے پار گئے۔ ان میں بھی دو طرح کے آدمی تھے جنہوں نے چلو بھر پانی پیاتھا وہ کمال الایمان تھے مگر ۳۱۳ کے مقابلے میں دشمن کی کثیر تعداد دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم حالت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ تیسرا گروہ جس نے بالکل پانی نہیں پیاتھا وہ اکمل الایمان لوگ تھے جنہوں نے دوسروں کو تسلی دی کہ تعداد کی کثرت اور قلت سے بہت گھبرو۔ دنیا میں کتنے ہی واقعات پیش آچکے ہیں۔ جن میں قلت نے اکثریت کو شکست دی۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لہذا تم صبر استقامت پر قائم رہ کر جہاد کرو اللہ تعالیٰ فتح دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آیات زیر درس میں دونوں لشکروں میں جنگ کا حال بیان ہو رہا ہے۔ کہ کس طرح بنی اسرائیل نے میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح سے نوازا۔

میدان جنگ
میں دعا

گزشتہ درس میں اسلامی سپاہ کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔ کہ ان کے اندر حرص کا مادہ نہیں ہونا چاہیے۔ نیز یہ لوگ صبر و استقلال کے پیکر اور اچھے اخلاق کے حامل ہونے چاہئیں۔ اور ان کا آخری وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کامیابی کے لیے درست بدعا ہتے ہیں۔ آج کے درس میں سب سے پہلے اسی دعا کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا بَدَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ جب بنی اسرائیل جالوت کے لشکر کے سامنے ہوئے قَالُوا تَوْأَنُوهُ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگے، رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر ڈال دے وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ وَأَفْضِرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

دعا ایک ایسی اعلیٰ وارفع چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے۔ خاص طور پر میدان جنگ میں غیر مسلم قوتیں اپنی طاقت کے غرور

میں شراب پی کر اور گانے گاتے ہوئے جنگ کا ابتداء کرتے ہیں۔ جب کہ ایمان والے جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر فتح کی دعائیں کرتے ہیں کیونکہ دعا ایسی چیز ہے جو ساری عبادت کا پتھر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا **الدُّعَاءُ مَعَ الْعِبَادَةِ** یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے تمام غزوات میں میدان جنگ میں پہنچ کر دعائیں کی ہیں۔ جنگ بدر کے متعلق بخاری، مسلم، نسائی اور حدیث کی دوسری کتب میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے کس قدر گڑ گڑا کر دعا فرمائی۔ آپ رات بھر عاجزی و انحراف کے ساتھ دعائیں مانگتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی چادر مبارک بھی کندھے سے سرک گئی۔ آپ فرماتے تھے **اللَّهُمَّ إِنْ تَهْلِكْ هَذِهِ الْعَصَابَةُ لَا تُعَبِّدْ فِي الْأَرْضِ** اے مولا کریم! میں نے یہ مٹھی بھرا ہل ایمان تیرے نام پر جنگ میں دھکیل دیے۔ اگر یہ ہلاک ہو گئے۔ تو اُنے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے گا۔ آپ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ جب بھی دشمن کے مقابلے میں نکلیں تو اس طرح دعا کریں **اللَّهُمَّ مَنِّدُ الْكِتَابِ وَمُجْبِي السَّحَابِ** اے کتاب نازل کرنے والے اور بادلوں کو چلانے والے اللہ! اھزم الأحزاب لشکر کفار کو شکست دے اور ہم کو فتح سے سرفراز فرما۔

حضور نے ایسی جامع دعا سکھائی کہ پہلے لفظ میں ہی اسکی حقیقت کو واضح فرما دیا۔ **اللَّهُمَّ مَنِّدُ الْكِتَابِ** یعنی اے اللہ! جس نے کتاب نازل فرمائی ہے مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جنگ اس لیے کرتے ہیں کہ اُس پر وگرام پر عمل درآمد کر سکیں جو تو نے کتاب اُتار کر ہمیں دیا ہے۔ اس جنگ سے ہماری کوئی ذاتی اغراض وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ تیری کتاب کے احکام لوگوں تک پہنچانے مقصود ہیں۔ اور اس راستے میں جو رکاوٹ آئے اس کو دور کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد ہوس ملک گیری نہیں۔ ہم مال غنیمت کے لیے نہیں آئے اور نہ لوگوں کو غلام بنانے کی خاطر آئے ہیں۔ بلکہ ہم نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھا ہے۔

اللَّهُمَّ اِنْ رَوْعَاتِنَا وَاسْتُرْعُوْا بَنَاتِنَا اے اللہ! ہمارے خدروں کو مال

مے اور ہمارے غیور سپاہیوں پر یہ دہ ڈال۔ غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کے لیے خود دعائیں کی ہیں۔ اور صحابہؓ کو سکھائی ہیں۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ بدر کے میدان میں سجدے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت عاجزی کے ساتھ یَا سَتِّیٰ یَا قَیُّوْمُ کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری رضا کی خاطر آتے ہیں۔ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہمارا غلبہ تیری مشیت پر منحصر ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ چلے گئے۔ میدان جنگ کا چکر لگا کر واپس آئے۔ تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام اسی طرح سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اللہ کے حضور دعائیں کہہ رہے ہیں۔

الغرض! طاوت مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان میں اترا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جاوت کا کثیر لشکر دیکھ کر دل دہل گیا۔ اس وقت گڑ گڑا کہ دُعا کی رَبَّنَا اے ہمارے پروردگار! دُعا کے ابتدا میں خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو مقدم رکھا۔ کیونکہ پالنا اور درجہ کمال تک پہنچانا صفت ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ رَبَّنَا کے لفظ کے ساتھ اپنی عاجزی اور انکاری کا اظہار کیا۔ جیسا کہ اکثر دعائوں کی ابتدا میں یہ لفظ آتا ہے۔ جیسے رَبَّنَا اِنْتَا فِی الدُّنْیَا جیسے رَبَّنَا هَبْ لَنَا یَا رَبَّنَا اَعْفِرْ لَنَا وَغَیْرَ، یہاں پر یہ دُعا کی رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا اے اللہ! ہم پر صبر ڈال دے یا صبر انڈیل دے۔ ہمیں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے وَثَبْتَ اَقْدَامَنَا اور ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ہم دلجمعی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ دشمن کی قوت

کو دیکھ کر اہل ایمان کو سخت پریشانی لاحق تھی حتیٰ کہ بَلَفَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرُ اُن کے دل اچھل کر گلے تک آ گئے تھے، کا منظر تھا تو اس حالت میں وہ رب العزت سے دُعا کر رہے تھے۔ کہ مولا کریم! ہمیں دشمن کے مقابلے میں صبر کی دولت عطا کر اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ اور پھر آخری باریت یہ کہ وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكَافِرِیْنَ کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما اور ان پر علیہ عطا فرما۔ کفار کفر کے پروردگار کے داعی ہیں۔ اور اہل ایمان حق کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ نیکی، اطاعت اور تیری رضا کا پروردگار

نافذ نہ پاہتے ہیں۔ لہذا ان کی نصرت فرما۔

جب جالوت نے دیکھا کہ مقابلے میں معمولی سا لشکر ہے تو کہنے لگا میری ساری فوج کو لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لشکر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اُس زمانے میں جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ ابتداء میں دونوں طرفوں سے ایک ایک آدمی نکلتا اور مقابلہ کرتا۔ پھر دونوں اطراف سے ایک ایک اور سپاہی نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ عام جنگ شروع ہو جاتی۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جنگ بدر میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کفار مکہ نے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو لڑکارا تو مسلمانوں کی طرف سے انصار مدینہ میں سے کچھ جانباز نکلے مگر کفار نے کہا کہ یہ تو مدینہ کے کاشتکار ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے ہم پہلے لوگ آئیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ادھر سے حضرت عبیدہؓ، رشید ہوئے اور کفار کے تین جوان جہنم واصل ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ

اہل اسلام کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد ایساع یا یسی بن عویہ بھی شامل تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے جن میں داؤد علیہ السلام سب سے کم سن تھے کہتے ہیں کہ آپ کم سنی کے باعث جنگ میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اپنے بڑے بھائیوں کو سامان پہنچانے کے لیے وہاں پہنچے تھے، ادھر اللہ کے نبی کو حکم ہوا کہ جالوت کے مقابلے کے لیے داؤد کو نکالو۔ آپ نے اُن کے باپ کو جمع چھ بیٹوں کے طلب کیا۔ اور مطابق حکم الہی داؤد علیہ السلام سے پوچھا کیا وہ جالوت کا مقابلہ کریں گے انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ اللہ کے نبی نے آپ کو جالوت کے مقابلہ کے لیے نکالا۔ آپ نے تلوار، تیر یا نیزہ استعمال کرنے کی بجائے دشمن پر پتھر پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ آپ کم سن تھے مگر بڑے ذہین اور پتھر چلانے میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تھیلے سے ایک پتھر نکالا اُسے فلاخن میں ڈالا اور زور سے گھما کر جالوت کی دھڑے مارا۔ جالوت سر تاپا لہے میں غرق تھا، صرف اُس کا ماتھا کھلا تھا۔ پتھر وہیں پہنچا کہ لگا۔ اور سر کے پار نکل

گیا۔ آپ نے دوسرا اور تیسرا پتھر چلایا تو جالوت زمین پر گر گیا۔ آخر داؤد علیہ السلام نے اس کا اوپر پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ جب لشکر نے دیکھا کہ اُن کا سردار مارا گیا ہے۔ تو اس کی جگہ دوسرے نے لینے کی کوشش کی مگر وہ بھی کیفر کر دار کو پہنچا۔ آخر دشمن کے لشکر میں بھگڑ مچ گئی۔ اہل ایمان نے ان کا تعاقب کر کے انہیں مکمل شکست سے ہم کنار کر دیا۔ اسی واقعہ کے متعلق یہاں ارشاد ہوا ہے۔ فَهَزَمُوهُمْ بِأَذْنِ اللَّهِ اللہ نے فلسطینیوں کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے سالار لشکر جالوت کو قتل کر دیا۔

مناقب
حضرت داؤد علیہ السلام

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اپنے باپ اور بھائیوں کے پاس میدان جنگ کی طرف آئے تھے۔ تو راستے میں درختوں کے پتوں سے آواز آئی، اے داؤد! تمہارے قریب یہ پتھر ہیں انہیں اٹھا لو، تمہارے کام آئیں گے چنانچہ آپ نے ان میں سے تین پتھر اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیے اور پھر یہی پتھر اپنے جالوت پر چلائے جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ آپ اتنے بہادر تھے کہ دشمن کے مقابلے میں کبھی پشت نہیں پھیری۔ آپ بچپن میں بکریاں چراتے تھے۔ جب کبھی کوئی بھیڑ یا شیر بکریوں پر حملہ کرتا تو آپ اُس کے جھڑپے پھاڑ دیتے۔ اللہ نے اتنی طاقت عطا کی تھی کہ اگرچہ قدمیں آپ چھوٹے تھے مگر جسم میں قوت بلا کی تھی۔ آپ نہایت خوش الحان تھے۔ جب آپ تلاوت کرتے تو پندے بھی آپ کی آواز سننے کے لیے ٹھہر جاتے، اُن کا لہجہ داؤدی آج بھی محاورتاً استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے لوسہ کو آپ کے ہاتھ پر موم کر دیا تھا۔ جدھر چاہتے موڑ لیتے۔ چنانچہ آپ لوسہ کی زرہیں بھی بناتے تھے۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ آپ کو عجب البشر کہا گیا ہے۔ یعنی آپ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔

وَاللَّهُ الْمَلِكُ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکومت بھی عطا کی، تفسیری روایات میں آتا ہے کہ طالوت کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے

آپ کو خلیفہ اللہ کہا جاتا ہے۔ يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا۔ بائبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بہادری سے متاثر ہو کر طالوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد سے کر دیا تھا۔ حکومت کے علاوہ فرمایا وَالْحِكْمَةُ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکمت بھی عطا کی۔ عام طور پر حکمت سے مراد غایت درجہ کی عقل مندی اور معاملہ فہمی ہوتا ہے تاہم بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر حکمت سے مراد نبوت ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے اسرائیلیوں میں حکومت اور نبوت دو مختلف شخصیتوں کے پاس ہوتی تھی جیسے نبی سموئیل علیہ السلام تھے اور حکومت طالوت کے پاس تھی مگر یہ دونوں چیزیں داؤد علیہ السلام پر آکر اکٹھی ہو گئیں۔ طالوت کے بعد آپ کو خلافت ملی اور حضرت سموئیل کے بعد آپ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے۔

ایک اور خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی، وہ ہے وَعَلَّمْنَاهُ یَسَاءً اللہ تعالیٰ نے جو چاہا حضرت داؤد علیہ السلام کو سکھا دیا۔ داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک میں سولہ مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختلف فنون اور علوم سے نوازا۔ پہندوں کی بولیوں کے علم کا تذکرہ تو سورۃ نمل میں موجود ہے عَلَّمْنَاهُ الطَّيْرِ ہمیں اڑتے جانوروں کی بولی سکھائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے جملہ علم کے متعلق فرمایا وَلَقَدْ اَتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عَلِمًا ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے سلیمان علیہ السلام بھی نبی ہوئے اور خلیفہ ہوئے۔ یہ دور بنی اسرائیل کا سنہری دور تھا۔ خلافت اور نبوت ایک جگہ پر جمع تھیں امن اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اچھائی کو غلبہ حاصل تھا۔ اور بُرائی دم توڑ چکی تھی۔

فلسفہ جہاد

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ بھی بیان فرمادیا۔ وَكُلُّا دَفَعَ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لِّفَسَادِ الْاَرْضِ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ ہٹاتے تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ یعنی جب کسی گروہ نے خدا کی زمین پر باہمی پھیلانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے

مقابلے میں دوسری جماعت کو بھیج کر مفسدین کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب قوم عمالiquہ کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے طاقت کے ذریعے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اسی لیے دشمن کے ساتھ جہاد کا حکم ہے "حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً" یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل ختم ہو جائے کفر و شرک کی ناپاکی دور ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہونے لگے اور اسلام کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہی وہ مشن ہے جسے جمال الدین افغانی لے کر اٹھے۔ اور اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ آپ نے مسلمانوں کو ذہن نشین کر دیا کہ عیسائی اور یہودی انگریز اسلام کی دشمن طاقتیں ہیں۔ وہ اسلام کی شمع کو بجھانا چاہتی ہیں۔ لہذا اہل اسلام کو اس بات کا نوٹس لینا چاہیے۔ اور اپنا دفاع کرتا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں دفاعی جہاد (DEFENSIVE) فرض ہے۔ اگر جہاد سے روگردانی کی گئی تو درندہ صفت طاقتیں دنیا میں چھائی رہیں گی۔ اور کسی کی جان، عزت و آبرو محفوظ نہ ہوگی۔ بزدلی دکھانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

بہر حال فرمایا کہ یہ سنت اللہ ہے کہ وہ کسی بے ایمانی کو ختم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا میں کتنے فرعون، ہامان اور نمرود پیدا ہوئے مگر آخر ختم ہو گئے۔ کبھی جرمنی کا طوطی بولتا تھا۔ اب امریکہ اور روس سپر پاورز ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے پیروگرام کے مطابق اول بدل کر رہتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ اہل جہان پر فضل کرے تو والا ہے۔ جب وہ کسی ظالم کی نیچ کنی کرتا ہے۔ تو یہ صحیح معنوں میں دنیا والوں پر اس کا فضل ہوتا ہے انہیں ظلم سے نجات مل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دنیا میں ظلم کو ختم کریں۔ حق و انصاف کا نظام قائم کریں عقیدہ توحید کو بچتے کریں۔ چنانچہ ظلم کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے۔ جہاد کی مشروعیت اگلی آیات اور کئی دوسرے مقامات پر آئیگی۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۚ
 تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ
 كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
 الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ
 الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ آتَى مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ
 اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
 مَا اقْتَتَلُوا قَفًّا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۚ

۲۵۱-

ترجمہ : یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سناتے ہیں۔ اور بیشک
 آپ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں (۲۵۲) یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض
 کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ بعض ان میں سے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے
 کلام کیا اور بعض کے درجات بہت بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام)
 کو واضح نشانیاں دیں۔ اور ہم نے اس کی روح القدس کے ساتھ تائید کی۔ اور اگر
 اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان نبیوں کے بعد آئے۔ بعد اس کے کہ ان کے
 پاس واضح باتیں آچکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض ان میں سے ایمان
 لائے۔ اور ان میں سے بعض نے کفر اختیار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو وہ نہ لڑتے

لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۲۵۳)

ربط آیات

بنی اسرائیل کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بطور خاص اور پھر تمام انبیاء کی نبوت
 کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں جہاد کی حکمت بیان فرمائی تھی۔ اور

معتزین کے اعتراض کا رد تھا۔ اور واضح کیا تھا کہ اگر جہاد فرض نہ کیا جاتا تو مفسدین زمین میں فساد برپا کر کے اس کو خراب کر دیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت فرمائی۔ اور بدامنی کے خاتمے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں جہاد کرتے آئے ہیں۔ اسی ضمن میں طائوت کا ذکر کیا۔ جو کہ سمویل نبی کے زمانے میں ہوا ہے۔ آپ کے نام پر یائیل میں دو صحیفے بھی موجود ہیں۔ آپ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو ایمان اور توحید کا راستہ بتانا، اور ان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کرنا ہے اس کے علاوہ رسومات باطلہ کو مٹانا اور رفع ظالم بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو فرو کرنا ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جہاد لازمی ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ میں ظلم و زیادتی برپا کرنے والے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں پھوڑا ہوتا ہے۔ جب تک اس پھوڑے کو کاٹ نہیں دیا جاتا، جسم تندرست نہیں ہو سکتا، اسی طرح جب تک فساد ہی لوگوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ دیا جاتا، معاشرے میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی آپریشن کا نام جہاد ہے۔ اس آیت کہ میر میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا۔ کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں موت سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ نے انہیں راستے میں ہی موت سے ہم کنار کر دیا۔ پھر اللہ کے نبی نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی دی۔ ان کی اپنی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے طائوت کو ان کا امیر مقرر کیا۔ اور اس کی سرکردگی میں جہاد کا حکم دیا۔ پھر راستے میں لشکر کی آزمائش ہوئی۔ اور ان میں سے بہت تھوڑے اس آزمائش میں پورے آئے۔ اکثریت نے بے صبری کا اظہار کیا۔ اور جہاد سے محروم ہے۔ جانثاروں کی ایک قلیل تعداد کو اللہ نے فتح سے ہم کنار کیا۔ اس موقع پر اللہ نے دعا کا فلسفہ سکھایا۔ اور پھر میدان جنگ میں دشمن کا سردار حضرت داؤد علیہ السلام کے پتھر سے ہلاک ہوا۔ طائوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ یہ تمام واقعات ہیں، جنہیں

بعثت انبیاء کا مقصد

تصدیق رسالت

بندے ہیں اور معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں گناہ سے پاک رکھتا ہے۔ البتہ باعتبار فضائل اور خصوصیات فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی۔ یہاں پر ایک غلبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ یعنی نبیوں کے درمیان تفضیل نہ کرو۔ یا مجھے بھی باقی نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو۔ یا یہ کہ یونس ابن متی کے مقابلہ میں کسی کو فضیلت نہ دو۔ اس کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنی عقل سے بات نہ کرو کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے لگو اور بعض کی توہین کرنے لگو، ایسا نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ فضیلت کا جو ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔ اُسی پر کاربند رہو۔ چنانچہ اس امر میں اجماع اور اتفاق ہے کہ حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر فضیلت دی ہے۔ آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے درجات ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے اَلْحَبِّ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا یعنی میں تم کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

اس مقام پر فضائل انبیاء کے متعلق ارشاد ہے مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا اور کوہ طور پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بالمشافہ کلام فرمایا۔ معراج کے واقعہ میں آتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اوّل النبیین یعنی سب سے پہلے نبی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر عرض کیا ہے حضور! کیا وہ نبی ہیں۔ فرمایا، ہاں وہ سب مَکَلَّمُ اللّٰهِ تَعَالٰی نے اُن سے بالمشافہ کلام کیا۔ آپ سب سے پہلے نبی ہیں اور سب سے آخری نبی حضور خاتم النبیین علیہ التّیّٰتہ والسلام ہیں۔ فرمایا وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجٰتٍ اور بعض کے درجات بلند کیے۔ اس آیت میں بعض کے درجات سے مراد حضور علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درجات سب نبیوں سے

زیادہ بلند کئے ہیں۔ اللہ نے آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمایا ہے۔ جس کا مظاہرہ قیامت کے روز ہوگا۔ آپ کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی ہے۔ آپ کو وسیلہ عطا ہوا ہے آپ کی امت کو اکثریت حاصل ہے آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے آپ کو کتاب بھی سب سے افضل دی گئی ہے اور آپ کو اللہ نے بیشمار معجزات عطا کئے ہیں غرضیکہ آپ کے درجات بہت بلند فرمائے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض کے درجات بلند کیے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے معجزات

فرمایا وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ قرآن میں اسکی وضاحت موجود ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھیوں کو تندرست کرنا، اللہ کے حکم سے غیب کی خبریں دینا۔ گھر سے کھا کر آنے والے کو بتا دینا کہ کیا کھایا ہے وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جہاں بھی قرآن میں ذکر آتا ہے۔ عیسیٰ ابن مریم کے نام سے آتا ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اللہ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا کیا۔ قیامت کے روز بھی آپ کو یا عیسیٰ ابن مریم کے لقب سے پکارا جائے گا۔ اور پھر پوچھا جائے گا۔ کہ کیا آپ نے لوگوں کو کھا تھا۔ کہ مجھے معبود بنا لو۔ آپ جواب دیں گے۔ سُبْحَانَكَ اے اللہ تو پاک ہے۔ میں ایسی بات کس طرح کہہ سکتا ہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ میں نے تو انہیں وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ گو یا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا رد کیا گیا ہے۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ سرسید اور پرہیزگار جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ بھی ثابت کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن پاک کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اور اٹھارہ عقیدہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں۔

روح القدس
سے تائید

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہی فرمایا وَإِيْدُنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ ہم نے روح القدس کے ساتھ ان کی تائید فرمائی۔ روح القدس کا معنی عام طور پر جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جدھر بھی جاتے تھے

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تائید اُن کے شامل حال ہوتی تھی۔ حضور علیہ السلام نے یہی بات حضرت حسانؓ کو کہی تھی۔ فرمایا۔ اے حسان! تم مشرکین کو اشعار کے ذریعے جواب دو۔ تمہیں جبرائیل امین کی تائید حاصل ہوگی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک روح القدس کا معنی کچھ اور ہے وہ فرماتے ہیں۔ کہ کائنات کی ہر چیز مشیت الہی کی تابع ہے۔ اور ملاز اعلیٰ کی تمام بزرگ ہستیوں کی توجہ جس طرح ایک طرف لگی رہتی ہے۔ اس کو تائید روح القدس کہا جاتا ہے۔ اور پھر خطیرۃ القدس جیسے پاک مقام سے جو شعائیں ان بزرگوں ہستیوں پر پڑتی ہیں۔ یہ بھی روح القدس کی تائید ہوتی ہے۔

فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ اَكْرَمُ اللَّهُ تَعَالٰی چاہتا۔ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ توبہ کیوں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد نہ لڑتے۔ یعنی اگر مشیت الہی چاہتی۔ تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتی اور وہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَوْ شَاءَ لَهْدَاكُمْ اَجْمَعِينَ۔ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ وَلَآ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ مگر لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی کام پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ خیر و شر کے دونوں راستے دکھا کر انسان کو اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دے دیا۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے ارادے کو سلب نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو انسان کی فضیلت باقی نہ رہتی۔ اس کا امتحان نہ ہو پاتا اور وہ بے جان چیزوں کی طرح مجبور محض قرار پاتا۔ چنانچہ اُن لوگوں نے نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے وَلَٰكِنْ اخْتَلَفُوا انہوں نے اختلاف کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ کہ ان میں کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ اور کچھ دوسروں نے انکار کر دیا۔ اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔ جب اختلاف پیدا ہو گا۔ تو پھر لڑائی بھی ہوگی۔ اہل ایمان اور کفار ایک جگہ اکٹھے نہیں

انسان اپنے
ارادے کا
خود ذمہ دار ہے

ہو سکتے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنا پروگرام نافذ کرنا چاہے گا۔ لہذا ان کے درمیان ضرورتاً
 ہوگی اور یہی جہاد ہے۔ جو اہل اسلام پر فرض کیا گیا ہے۔ کیونکہ جہاد کے بغیر فتنہ و فساد کا
 قلع قمع نہیں ہو سکتا پچھلے درس میں آچکا ہے کہ جہاد کے ذریعے شر و فساد کو مٹانا مقصود
 ہے اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعے نہ مٹاتا تو زمین میں
 فساد برپا رہتا۔ لہذا جہاد لازم قرار دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کو ترک کر دو گے تو یسلط اللہ
 ذلۃ علیکم (البرادری) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور یہ ذلت ختم نہ ہوگی۔
 حتیٰ ترجعوا الی دینکم جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ کر نہ جاؤ گے۔
 فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَتَلُوا اَکْثَرَ الشَّيْءِ مَا تَوْبَهُ لَوْ كَانُوا يَفْقَهُوْنَ
 سب ایک ہی راستے پر ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا۔ مگر حقیقت
 یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل اور قوت عطا کی ہے۔ اُسے اشرف المخلوقات
 بنایا ہے۔ اور پھر اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے جو راستہ چاہے
 اختیار کرے۔ اِنَّا هَدَيْنَاكَ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا یہ اپنے
 ارادے کا خود ذمہ دار ہے جو راستہ اختیار کرے گا اس کے مطابق جزا و جزا کا مستحق
 ہوگا: اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ اور اللہ ایمان پر
 راضی ہوتا ہے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔ اہل ایمان کو نجات دے گا اور ان کو فلاح حاصل
 ہوگی۔

فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ چاہتا تو یہ لوگ اختلاف کا شکار
 نہ ہوتے وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ مگر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا ہے
 جو اس کا اپنا ارادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور اپنے
 بندوں کو آزما کر اس کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ لوگ
 ایمان کا راستہ اختیار کریں۔ اور جو لوگ کفر کے راستے پر چل نکلیں ان کے شر و
 فساد کو مٹانے کے لیے ایمان والے جہاد کریں تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اور اللہ
 کا دین اختیار کرنے والے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ
يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے
اس سے پیشتر کہ وہ دن آجائے۔ جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ اور نہ دوستی ہوگی۔
اور نہ سفارش ہوگی اور جو لوگ کفر کرنے والے ہیں وہی بڑے ظالم ہیں۔

گزشتہ درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے جہاد کا تذکرہ تھا۔
اللہ تعالیٰ نے جہاد کی حکمت بھی واضح فرمائی۔ اس آیت میں اتفاق فی سبیل اللہ کا بیان ہے
اس کا تعلق اس آیت کے ساتھ ہے۔ جس میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ کہ ان کا ایک
گروہ موت کے ڈر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر اللہ نے انہیں راستہ میں موت سے دی
پھر اپنے خاص فضل سے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا
”قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ اللہ کے راستے میں دشمنانِ خدا اور دشمنانِ دین سے
ٹکرا جاؤ۔ اور پھر درمیان میں یہ بھی فرمایا ”مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا“
کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے۔ اور اللہ اسے بڑھا چڑھا کر عطا کرے گا۔ یہ مالِ تسبیح
کے نیکی تر غیب ہو گئی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ بقرہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس میں
مختلف الانواع مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اس سورۃ میں عبادات، معجزات اور معاملات
کا بیان ہے۔ خصوصاً معاملات کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ عالمی قوانین یعنی نکاح
و طلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کی تعمیل نفس پر شاق
گزرتی ہے۔ انسان کا نفس اور اس کی سوچ بوجھل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جان و مال کی

قربانی پیش کرتے وقت بڑی دشواری پیش آتی ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے۔ اور اکثر لوگ جان و مال کی وجہ سے ہی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محبت کسی نفس کی ہو یا مال کی، یہ انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر ابھارتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر جان کو کھپانے کا حکم دیا ہے۔ اور دوسری جگہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو جان کو لگا دینا نسبتاً آسان سمجھتے ہیں۔ مگر مال کے خرچ کرنے میں نخیل واقع ہوتے ہیں یہ ایک روحانی بیماری ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَمَّیْ دَاۤءِیْدُوْ

مَنْ الْبُخْلُ بِخُلِّ سَ بَرْمِی بِمَارِی کون سی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

مگر جان طلبی مذاکرہ نیست

گمہ نذر طلبی سخن دریں جاہست

یعنی اگر جان کا مطالبہ ہے۔ تو اس میں کوئی مذائقہ نہیں، جان حاضر ہے۔ اور اگر مال چاہتے ہو۔ تو یہ بات نہیں بن سکے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے متعلق خصوصی احکام دیے ہیں۔ مال پر بہت سی عبادات موقوف ہیں۔ اگر مال خرچ نہیں کیا جائے گا۔ تو جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، حج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگلے رکوع میں اتفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ بالتفصیل آئے گا۔

الفاق في سبيل الله

چنانچہ یہاں پر بھی ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اے ایمان والو
انْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے۔ مراد اللہ
کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں پر رَزَقْنَاكُمْ خصوصاً توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یہ ہمارا عطا کردہ ہے۔ ہم نے ہی اسباب و
وسائل مہیا کیے تو تمہارے پاس مال آیا وگرنہ انسان اگر اپنی ذاتی کاوش کی بنا پر کچھ حاصل
کرنا چاہتا، تو اُسے کچھ نہ ملتا۔ یہ مال ہم نے ہی تمہیں دیا ہے۔ جس سے خرچ کرنے
کا حکم دے رہے ہیں۔ لہذا اس میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی موضوع
کو سورۃ نور میں بھی بیان فرمایا۔ جہاں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے

وہاں فرمایا **وَاتُوهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اَنْشَکُمْ اللّٰہُ** کے لیے ہوئے مال میں سے ان کو دو، تاکہ وہ مکاتبت کر کے اپنی جان چھڑا سکیں۔ یہاں پر یہ نظریہ واضح کر دیا گیا کہ ایماندار اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کا انعام سمجھتا ہے۔ جو اس نے مہربانی فرما کر عطا کیا۔ کبھی کوئی اسباب پیدا کر دے۔ کہیں مزدوری مل گئی۔ نوکری میسر آگئی، کاروبار میں برکت ڈال دی۔ وراثت سے حصہ مل گیا، کوئی تحفہ مل گیا، یہ سب مالک الملک کے پیدا کردہ اسباب ہیں۔ اس لیے انسان کو جو بھی مال میسر آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ملتا ہے لہذا اس کے راستے میں خیرات، صدقات، زکوٰۃ وغیرہ پر خرچ کرنا کوئی اپنا ذاتی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو فائق پرستوں کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس کا دیا ہوا مال اُس کے حکم کے مطابق خرچ ہوا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو مال خرچ کیا جا رہا ہے وہ آیا کہاں سے ہے۔ کھائی حلال کی ہے یا حرام کی۔ ناجائز طریقے سے مال حاصل کر نیکی کی بھی سخت وعید ہے۔ **وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ** ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ **وَأَجْمَلُوا فِي الطَّلَبِ** طلب کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ حرام کی کھائی سے اجتناب کرو۔ حرام کی کھائی کھانے والے کی نہ عبادت قبول ہوتی ہے نہ صدقہ کسی کام آتا ہے۔ اور یہی چیز مرنے کے بعد جہنم کا توشہ بنے گی۔

اب خرچ کرنے کے متعلق بھی اصول و قواعد ہیں۔ ہر شخص کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا **وَلَا تُسْرِفُوا** اسراف نہ کرو **وَلَا تُبْذِرُوا** فضول خرچی سے بچ جاؤ۔ اللہ کے دیے ہوئے انعام کو صحیح طریقے سے خرچ کرو ہمارے دیے ہوئے مال میں سے اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرو۔ اور پھر حقوق و فرائض اور واجبات کا خیال بھی رکھو۔ جہاد کے لیے خرچ کرو۔ اقامت دین اور تبلیغ دین پر خرچ کرو۔ غریب و مساکین کی اعانت کرو۔ مقروض کا قرضہ ادا کرو۔ تاہم اپنی ذاتی ضرورتیں مقدم ہیں۔ ان کو پہلے پورا کرو۔ یہ بات مستحسن نہیں۔ کہ آدمی سارا مال خرچ کر دے اور خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے لیے تو صدیق اکبرؑ جیسا صبر و رکارہ ہے

خرچ میں
اعتدال کی راہ

ایک صحابی کو کچھ سونا حاصل ہوا، لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا کہ اے اللہ کے رسول میں یہ مال صدقہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا ایسا مت کرو پہلے اپنی ضروریات پورا کرو۔ اس کے بعد صدقہ کرو۔ خود محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو پھر شکوہ کرو گے۔ خاص طور پر جب کہ برداشت کا مادہ بھی نہ ہو۔ لہذا ہر کام میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ پورے کا پورا مال خرچ نہ کر دو۔ بلکہ اپنی جائز ضروریات کیلئے بھی رکھ لو۔

روز قیامت
خرید و فروخت
نہ ہوگی

فرمایا اللہ کے لئے میں خرچ کروں قبل اُن یاتنی یوم لا بیع فیہ پیشتر اس کے کہ وہ دن آجائے جب کوئی خرید و فروخت نہیں ہو سکیگی۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اُس دن اگر کوئی شخص کوئی قیمتی سے قیمتی چیز دیکر بھی ایمان یا کوئی نیکی خریدنا چاہے گا تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ اول تو کسی کے پاس دنیا کا مال و دولت ہو گا ہی نہیں جس سے کوئی چیز خریدی جا سکے۔ دوسرے وہاں کوئی بازار نہیں لگے گا جہاں خرید و فروخت ہو سکے۔ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ یہاں پر انسان اچھے اعمال کے ذریعے، عبادات کے ذریعے، مال خرچ کر کے آخرت کا توشہ خرید سکتا ہے۔ مگر وہاں قیامت کے دن ایسی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی کمی کو خرید و فروخت کے ذریعے پورا کر سکے۔ وہاں خرید و فروخت قطعاً ناممکن ہوگی۔ وہاں نیکی حاصل کر نیکی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اس دارالعمل میں انسان وَالْبَقِيَّاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ مِمَّا كَسَبْتُمْ آخرت کے لیے ذخیرہ بنا سکتا ہے۔ وہ تو دارالجزا ہوگا۔ قیامت کے دن تو کردہ اعمال کا بدلہ ملے گا۔ وہاں نئے سے نئے عمل کر نیکی اجازت نہیں ہوگی۔ نہ وہاں خرید و فروخت ہوگی۔

دوستی کام
نہ آئے گی

فرمایا وَلَا خُلَّةٌ وہاں پر عام دوستی بھی کام نہیں آئے گی۔ جس طرح اس دنیا میں اقربا پروری اور تعلقات کام آتے ہیں وہاں پر ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اَوَّلَ مَا يَوْمَئِذٍ يَكُونُ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ لِّبَعْضٍ دوستی وہ کام آئے گی جس کی بنیاد نیکی اور تقویٰ پر ہوگی اِلَّا الْمُصْطَفَيْنَ اٰہلِ اٰیْمَانٍ کی دوستی وہاں پر قائم رہے گی۔ مگر فاسق و فاجر اور لہو و لعب والی دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہر ایسا دوست

دوسرے سے نفرت کرے گا۔

عام سفارش
نہیں ہوگی

فرمایا جس طرح خرید و فروخت اور عام دوستی نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن
وَلَا شَفَاعَةُ عام سفارش بھی نہیں چلے گی۔ اس دنیا کا دستور ہے کہ بڑے لوگ سفارش
کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن ایسا نہیں
ہوگا۔ وہاں سفارش ہوگی مگر اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت
فرمائیں گے آگے آیت الکرسی آرہی ہے۔ جسے اعظم آیت فی القرآن کہا گیا ہے۔
اس میں مسئلہ سفارش کو واضح کیا گیا ہے۔ مشرک لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبود ہماری سفارش
کر کے ہمیں چھڑالیں گے اور ہمیں درجات بھی دلائیں گے۔ اس قسم کی سفارش قطعاً باطل
ہے۔ کیونکہ وہاں پر شفاعت مشروط ہوگی۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ لَا يَتَكَلَّمُونَ
إِلَّا مَن أذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ اس دن تو کوئی کلام بھی نہ کر سکے گا سوائے
اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ اور وہ بھی اس شرط پر کہ اُس کی بات
ٹھیک ٹھیک ہو۔ غلط بات کہہ نہ سکی تو اجازت ہی نہیں ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے
فرمایا میری شفاعت اُس شخص تک پہنچے گی لیکن لَا يَشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا جو
اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں ملوث نہ ہوا ہو۔ مشرک یا دھریہ یا کسی اور بد عقیدہ کے
کے لیے سفارش کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کر دو، جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لو۔
آج یہ موقع ہے۔ یہ عمل کی دنیا ہے۔ اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ کل کو دارالجزا
میں جا کر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہاں تو بدلہ دیا جائے گا۔ اُس روز نہ کوئی شخص
نیکی خرید سکے گا۔ نہ کوئی دوستی کام آئیگی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی یہ سب کچھ
بتلا دیا۔ مزید شرائط اگلی آیت میں آئیں گی۔

کفار ہی ظالم ہیں

فرمایا وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کفر کرنے والے ہی سب سے بڑے ظالم
ہیں انہوں نے اللہ کے احکام، اس کی کتاب اور اس کے انبیاء کا انکار کیا۔ یہ انسان کے
بدبخت ہونے کی واضح نشانی ہے۔ مشرک کے بارے میں واضح حکم ہے إِنَّ الشِّرْكَ

لَظْلُمٌ عَظِيمٌ شُرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ اگر شرک جیسے ظلم
 سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ نے جہاد کا حکم بھی دیا ہے اس کے ذریعے کفر و
 شرک کی بنیخ کنی کی جائے گی۔ اور اس کام کے لیے جہاں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے
 وہاں مال بھی لگانا پڑتا ہے۔ اور یہی اتفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آگے دور کوع کے
 دوران اتفاق فی سبیل اللہ کا ذکر مزید تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکم دہ (۱۱۰)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۵۵

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ط
 لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ
 إِلَّا بِإِذْنِهِ ط يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ط وَلَا
 يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ط وَسِعَ كُرْسِيُّهُ
 السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ ط وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ط وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۲۵۵

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، مگر وہی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ قائم
 رکھنے والا ہے۔ نہیں پگھلتی اس کو اونگھ اور نہ نیند، اُسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے
 اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے۔ جو اس کے سامنے سفارش کر سکے بغیر اس کی
 اجازت کے، جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے
 اور نہیں احاطہ کرتے کسی چیز کا اس کے علم میں سے مگر بقنا وہ چاہے وسیع ہے
 اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے اور نہیں تھکاتی اس کو حفاظت ان کی اور وہ بلند تر

اور عظمت والا ہے ۲۵۵

پہلے دور کو ع میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کا ذکر فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ
 بیان کر کے جہاد کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ اور پھر نظام اسلام کی نشان دہی کی ہے۔ کہ امیر کیا
 ہونا چاہیئے۔ سپاہی اور لشکر کی صفات کیا ہوں جہاد ہی کے سلسلہ میں جان و مال کی قربانی
 کا خصوصی ذکر فرمایا ہے۔ پھر اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ کہ جہاد کرنا نبیوں کا کام
 نہیں۔ فلسفہ جہاد بیان کیا ہے۔ کہ اگر جہاد کا حکم نہ ہو، تو فساد ہی لوگ زمین میں فساد برپا
 کریں گے۔ لہذا سوسائٹی کو درندہ صفت لوگوں سے محفوظ کرنے کے لیے

ربط آیات

جہاد ضروری ہے۔

اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور توحید کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اور اس کا ربط پہلی آیتوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ہے جہاد کے سلسلہ میں جان و مال کھپانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ مگر ان دو چیزوں کی قربانی اُسی وقت قبول ہوگی جب ایمان صحیح ہو اور انسان کا عقیدہ توحید پر ہو۔ اعمال کا دار و مدار عقیدہ پر ہے۔ اگر عقیدہ درست نہیں ہوگا، تو کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ عقیدہ توحید کے بغیر پاڑ جتنے اعمال بھی بے سود محض ہوں گے۔ اُن کی حیثیت راکھ اور غبار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لہذا مسئلہ توحید کو مسئلہ جہاد کے ساتھ یہ ربط ہے۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں نظام خلافت بھی سمجھا دیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اقتدار کا حقیقی مالک خلیفہ نہیں ہوتا جو اپنی من مانی کرنا پھرے، بلکہ اقتدار کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ خلیفہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے جو نظام خلافت کو چلاتا ہے۔ اس سورۃ کے آخری حصہ میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ خلیفہ اقتدار کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو امین ہوتا ہے۔ اور دین اور شریعت کو جاری کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جماعت ہوتی ہے۔ جو نفاذ شریعت میں اسکی مدد کرتی ہے۔ اُسے مجلس شوریٰ کہ لیں یا کچھ اور۔ وہ بہر حال وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کے تابع ہوتی ہے۔ تو گویا نظام خلافت کا صحیح طور پر قائم کرنا بھی عقیدہ توحید پر موقوف ہے لہذا اس لحاظ سے بھی آیت زیر درس کو سابقہ آیات کے ساتھ ربط ہے۔

یہ آیت ایک لمبی آیت ہے اور آیت اکہمسی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کمرسی کا ذکر ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ حدیث شریف میں اس آیت پاک کی بڑی فضیلت آئی ہے حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔ تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلیٰ یعنی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ، قرآن پاک میں بہتر آیت کون سی ہے۔ انہوں نے پھر عرض کیا۔ اللہ اور اس کا

آیت کمرسی
کی فضیلت

رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر بنی کریم نے حضرت ابی ثعلبہؓ پر ہاتھ مار کر وہی سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا حضور! اعظم آیت فی القرآن اللہ لا الہ الا هو
 الْحَقُّ الْقَيُّومُ یعنی قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یہ آیت الحکمی ہے تاہم اس
 آیت کا یہ اعزاز الفاظ یا کلمات کے اعتبار سے نہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے
 اسے سب سے بڑی آیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ جو شخص فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ
 آیت الحکمی پڑھیں گا، وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا۔ حضور بنی کریم
 رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ جو کوئی فرض نماز کے بعد اخلاص
 کے ساتھ آیت الحکمی پڑھیں گا۔ موت کے سوا اس کے دخول جنت میں کوئی چیز مانع
 نہیں ہوگی۔ یعنی جنت میں داخلے کے لیے صرف موت ہی درمیان میں رکاوٹ
 ہے۔ جو نہی اس کی موت واقع ہوگی، وہ شخص جنت میں داخل ہو جائیگا۔ گویا یہ آیت
 کرمیہ تلاوت کرنے والا جنت کا مستحق ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں اس آیت اور سورہ مومن کی چند ابتدائی آیات کی مزید
 فضیلت آئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں مگر فضیلت کے لحاظ سے ان کو کمال
 درجہ حاصل ہے۔ ح۔ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ
 غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا
 هُوَ إِلَهُ الْمَصِيرِ حضور نے فرمایا جو شخص آیت الحکمی اور سورہ مومن
 یا غافر کی یہ تین آیتیں رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے
 صبح تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ اور جو کوئی صبح کے وقت یہ آیتیں تلاوت
 کرے گا، وہ رات تک اللہ کی امان میں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور بنی علیہ السلام نے فرمایا کہ سورہ بقرہ
 میں ایک ایسی آیت ہے۔ جو فضیلت کے لحاظ سے سب سے بڑی آیت ہے
 جس گھر میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ وہاں شیطان نہیں بٹھہر سکتا۔ بلکہ وہاں سے

بھاگ جاتا ہے۔ اس آیت کا اتنا عظیم اثر ہے۔ صحیحین میں صدقہ الفطر کے اناج کی حفاظت والی حدیث آتی ہے کہ اُس اناج کی حفاظت حضرت ابو ہریرہؓ کے ذمہ تھی۔ آپ رات کو پہرہ پر تھے کہ شیطان نے اس اناج میں سے کچھ لینا چاہا۔ مگر صحابی رسول نے اسے پکڑ لیا۔ مگر اس کے منت خوشامد کہ نے پھوٹ دیا۔ پھر دوسری رات آئی۔ تو یہی واقعہ پیش آیا آپ نے شیطان کو دبوچ لیا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس دفعہ چھوڑ دیا جائے پھر نہیں آئیگا۔ آپ نے پھر اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ کم نحت تیسری رات پھر آگیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے پھر اُس کو پکڑ لیا۔ اور فرمایا میں آج تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بلکہ حضور کے پاس لے چلوں گا۔ شیطان نے پھر منت سماجت کی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جس کا تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا کہ اگر تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، تو شیطان تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ تمہاری حفاظت ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے تیسری رات بھی شیطان کو چھوڑ دیا۔ اور صبح کو سارا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے ابو ہریرہؓ! شیطان ہے تو جھوٹا، مگر بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان کے ساتھ اس آیت کی تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و نگہبان ہوگا۔

الغرض! اس آیت پاک کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لہذا ہر مسلمان کو اسے در روز بان بنالینا چاہیے۔ ہر نماز کے بعد اس کی تلاوت کی جائے۔ صبح و شام کو اسے پڑھا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے مامون فرمائے گا اور آخرت میں جنت میں داخلے کی ضمانت ہوگی۔ تاہم مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ہر دُعا اور ذکر کی قبولیت کے لیے بعض شرائط ہیں۔ ہر دُعا اور ہر ذکر محض پڑھ لینے سے درجہ قبولیت تک نہیں پہنچ جاتی۔ قبولیت دُعا کے لیے ضروری ہے کہ دُعا کو فرائض سے خالی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز، روزہ، فرائض کیا ہے۔ تو ان کا تارک نہ ہو۔ بلکہ انہیں پورا کرے۔ اور پھر اس کا رزق بھی جلیل ہو۔ اس کا کھانا، پینا اور پہننا حرام سے پاک ہو۔ اور یہ بھی قبولیت کی شرط ہے کہ انسان حتی الامکان امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔ تہ مذی شریف کی حدیث — میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ دُعَاءَ عَنِ قَلْبٍ غَافِلٍ۔ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دُعا قبول نہیں کرتا۔ جب کوئی دُعا کرے۔ تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دُعا کرنے چاہیے۔ خدا کی بارگاہ میں ایسی دُعا قبول نہیں۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے کی بجائے محض زبان کی حرکت تک محدود ہو۔

یہ آیت پاک پچاس الفاظ پر مشتمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گیارہ دلائل موجود ہیں۔ یہ آیت گویا مجموعہ دلائل ہے۔ اس آیت کی فضیلت ان معانی میں ہے۔ کہ کسی چیز کا علم یا اس کا ذکر اس کے معلوم یا مذکور کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی جو درجہ اور فضیلت کسی مذکور معلوم کو حاصل ہوگا، وہی اس کے علم یا ذکر کو حاصل ہوگا۔ اب قرآن پاک میں تو تمام چیزوں کا ذکر ہے۔ کہیں خود قرآن پاک کے متعلق آتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ ہدایت ہے۔ کہیں اللہ کے نبیوں کا ذکر ہے۔ کہیں بڑے آدمیوں کا ذکر ہے۔ کہیں فرعون و قارون کا واقعہ بیان ہوا ہے کہیں صاحبین کا ذکر ہے۔ کہیں احکام ہیں کہیں نواہی ہیں۔ انسان کی تہذیب کا بیان ہے۔ اس کے نفس اور روح کی کیفیت کا ذکر ہے۔ اسی طرح قرآن میں خود خدا تعالیٰ کی ذات اور اسکی توحید کا ذکر ہے، کہیں اس کی صفات کمال اور کہیں صفات جلال و جمال کا ذکر ہے۔ تو یہ جو اللہ کا ذاتی ذکر ہے۔ یہ تمام اذکار سے افضل ہے۔ لہذا جن آیات اور جملوں میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا، وہ آیات باقی آیات سے افضل ہوں گی۔ اس لحاظ سے چونکہ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکی صفات کا ذکر ہے۔ لہذا یہ آیت پاک بھی باقی آیات سے افضل ہے۔

اس عظیم آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللّٰهُ وَہی ہے۔ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا، نہ عارضی نہ مستقل، نہ باپ نہ بیٹا کوئی بھی معبود نہیں۔ معبود وہی اور صرف وہی ہے۔ جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی معبود مانتا ہے، تو اس کا عقیدہ قطعاً باطل ہے۔ وہ تو ایسی ذات ہے الْحَيُّ جو

توحید باری تعالیٰ

زندہ ہے۔ اس کی حیات ابدی اور سرمدی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی زندگیاں ہیں، سب جزوی اور عارضی ہیں۔ کسی کو دائمی حیات حاصل نہیں۔ زندگی کا سرچشمہ خدا کی ذات وحدہ لا شریک ہے۔ یہ اُس کی مشیت ہے جس کو جتنی زندگی چاہے دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔

وہ اَلْقَيُّوْمُ بھی ہے۔ یعنی خود قائم ہے۔ اور کائنات کی باقی چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے وہ عالم بالا سے لے کر ذرہ ذرہ تک کا محافظ اور نگہبان ہے۔ وہی پیدا کر نیوالا ہے وہی جتنا عرصہ چاہے قائم رکھنے والا ہے اور پھر وہی فنا کرنے والا بھی ہے لوگوں نے کئی قسم کے باطل عقیدے بنائے ہیں۔ عیسائیوں نے باپ، بیٹا اور روح القدس کا نظریہ قائم کیا ہوا ہے۔ تین خدا ہیں۔ کیا ایک خدا کافی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پیدا کرنے والا بڑھما ہے۔ تھامنے والا وشنو ہے اور فنا کرنے والا شواجی مہاراج ہے۔ ان کے بھی تین خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے باطل نظریات کی تردید فرمائی۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وہی ہے۔ پیدا بھی وہی کرتا ہے۔ پرورش بھی وہی کرتا ہے قائم بھی وہی رکھتا ہے اور پھر فنا بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے عقیدے ہیں سب باطل ہیں۔

اور پھر اُس مالک الملک کی ہر چیز پر نگرانی اور حفاظت بھی اس طور ہے کہ لَا تَأْخُذُہٗ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اونگھ اور نیند تو غفلت کی علامت ہے اور اُس کو آتی ہے جس کو تھکاوٹ ہو جائے اور آرام کی ضرورت ہو۔ مگر اللہ کی ذات تو پاک ہے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو نا تو اہل انسان ہے جو کچھ مشقت کرنے کے بعد تھک جاتا ہے۔ اور پھر اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نیند جیسی نعمت تیار کی ہے۔

اللہ نے اس کو سُبَاتَا کہا ہے یعنی نیند انسان کے

لیے آرام کا ذکر کیا تاکہ جب محنت کرنے کے بعد تھک جا جائے تو کچھ دیر آرام کر کے پھر سے تازہ دم ہو جائے۔ اور دوبارہ کام کاج اور عبادت میں مصروف ہو جائے۔ یہ تھکان، کمزوری اور پھر آرام کی ضرورت اللہ تعالیٰ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک اور منزہ ہے۔ بلکہ درحقیقت لہ ما فی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ زمین و آسمان کی ہر شے اسی کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اُس کی مطیع ہے، ہر چیز پر اُسی کا تصرف ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ ذات ہے جو یُصَوِّفُ الْأَمْرَ کَیْفَ یَشَاءُ جس طرح چاہے تصرف کرتا ہے۔ کسی چیز کا گھٹانا، بڑھانا، بلندی، پستی، زندہ کرنا اور مارنا سب اُس کے اختیار میں ہے ہر چیز پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔

مسئلہ شفاعت فرمایا جب قادرِ مطلق وہ ذات ہے۔ تو مَنْ ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ کون ہے جو اُس کے سامنے سفارش کرنے کا دم مار سکے بغیر اسکی اجازت کے۔ مشرکوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کے معبود اُن کی سفارش کریں گے، اللہ تعالیٰ خواہ راضی ہو یا ناراض یہ ہماری سفارش کر کے خدا کو ضرور ہی منالیں گے۔ یہودیوں اور نصاریوں کا بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ جبری اور قہری سفارش کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے کہ اس دن نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئیگی وَلَا شَفَاعَةٌ اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش کرنے کی اجازت ہوگی۔ اشرف المخلوقات میں سب سے افضل انسان حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں رب الحکیم کے سامنے آؤں گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور لمبا سجدہ کروں گا پھر حکم ہو گا یا محمد ارفع راسک، اے محمد! آپ اپنا سر اٹھائیں۔ آپ بات کریں آپ کی بات سنی جائے گی۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا یہ سجدہ دس برس کے وقفہ کے برابر لمبا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیں گے۔ بغیر اجازت کے کوئی سفارش نہیں ہوگی اور اجازت بھی اس شخص کے

لیے دی جائیگی جس کا عقیدہ توحید پر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ وَلَا يَدْرِي لِعِبَادِهِ
 الْكُفْرُ اللّٰهُ تَعَالٰی کفر والے عقیدہ، شرک والے عقیدہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کفر کرنے کی توفیق
 تو دے دیتا ہے۔ کافر کی رسی تو دراز کر دیتا ہے۔ مگر ان سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس
 کے نزدیک "وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ" کافر لوگ ہی اصل ظالم ہیں۔ نیز یہ کہ
 "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ لہذا قیامت کے دن
 سفارش دوشطروں سے مشروط ہوگی۔ اور حق سفارش ایسا شخص ہوگا۔ مَنْ لَا يُشْرِكْ
 بِاللّٰهِ شَيْئًا جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ بغیر اجازت کے
 سفارش نہ ہوگی۔ جب اجازت ہوگی تو انبیاء ملائکہ، اولیاء شہداء اور مومن سفارش کریں گے
 صحیحین کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سجدہ ریز ہوں گے۔ اور
 اللہ تعالیٰ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے۔ یہ سفارش مختلف قسم کے لوگوں کے لیے
 ہوگی۔ ایک دفعہ اجازت ہوگی کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق سفارش کریں۔ آپ
 سفارش کر کے اُن لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ پھر سجدہ کریں گے پھر اجازت
 ہوگی، اب ایسے لوگوں کی سفارش کریں۔ آپ اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات
 دلوائیں گے اور اس طرح آپ بار بار سجدہ کریں گے اور اللہ بار بار سفارش کی اجازت
 دیں گے۔ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور علیہ السلام کی شفاعت نصیب فرمائے۔

علم غیب خاصہ خدائی

جس طرح اللہ تعالیٰ مختار مطلق اور قادر مطلق ہے اور جس طرح وہ الہ بحق ہے
 اسی طرح وہ علیم کل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اس کی صفت خاصہ ہے۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
 أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ ماضی کو بھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی واقف
 ہے۔ اس دنیا کے تمام امور کا بھی مکمل طور پر عالم ہے اور آخرت کے جہان یعنی برزخ
 اور قیامت کے حال کے ذرہ ذرہ سے بھی واقف ہے۔ یہ ماضی حال مستقبل
 وغیرہ انسانوں کی نسبت سے ہے وگرنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کوئی چیز غائب
 نہیں وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ تَرَىٰ رَبَّكَ کوئی ذرہ
 برابر چیز بھی غائب نہیں۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ

عِلْمُهُ إِلَّا بِمَا شَاءَ مخلوق میں سے خواہ انسان، جن یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق ہو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہاں جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے، وہ کسی کو اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ خدا کا علم غیر محدود ہے۔ اور غیر متناہی ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں مگر مخلوق کا علم محدود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی روایت موجود ہے۔ کہ ایک چڑیا نے پانی میں چوہنچ ماری اور جتنا پانی لے سکتی تھتی لے لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا، اے موسیٰ! تیرا اور میرا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس چڑیا کی چوہنچ کی مانند ہے۔ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں سے اتنا حصہ بھی حاصل نہیں کیا۔ جتنا اس چڑیا نے سمندر سے پانی لیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ میں بڑا عالم ہوں۔ بھلا ہمارے علم اور اللہ تعالیٰ کے علم میں کیا نسبت ہے۔ تاہم یہ ایک مثال ہے وگرنہ اللہ کا علم اور قدرت تو اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ حتیٰ کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب جو لوگ دوسروں کے متعلق گمان رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہر چیز کو جانتے ہیں انکو کیا کہا جائے۔ بعض لوگ اولیاء اللہ اور بعض انبیاء کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہماری سب باتوں کو جانتے ہیں۔ بھائی! یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ہاں إِلَّا بِمَا شَاءَ جس قدر اللہ تبارک و تعالیٰ چاہے، اتنا ہی جانتے ہیں۔ یہ معبود بہ حق ہی جانتا ہے کہ کسی کو کیا دکھ اور کیا تکلیف ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ اس کو رفع کرنے پر قادر ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے کسی کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے مصیبت اور پریشانی کو دور کر دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں بیچارے فلسطینی کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ فلپائن مسلمان کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ افغانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان کس قدر بے بس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے۔ کون ہے۔ جو ان کو مشکلات سے نکالے۔ ان کی کشتی کو گرداب سے نکالنا تو درکار اللہ کے سوا کون ہے جو ان کے حال سے بھی واقف ہو۔

تمام انسانی برادری میں سے انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے، وہ عالم الغیب نہیں ہوتے عالم الغیب والشہادت صرف ذات خداوندی ہے۔ اُسی کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ اس کے علاوہ کسی اور کا علم ہر شے پر محیط نہیں ہے۔

عرش اور کرسی

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کی کرسی آسمان و زمین سے وسیع ہے عرش اور کرسی کا ذکر قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مگر اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان اشیاء کی موجودگی پر ایمان لے آئیں۔ عرش اور کرسی کا حجم کیا ہے۔ ان کی ساخت کیا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے احاطہ علم میں نہیں آسکتیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ساتوں زمینیں اور آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں۔ جیسے کسی بہت بڑے میدان میں کھڑا سا ہو۔ اسی طرح عرش کے مقابلے میں کرسی کی ایسی ہی نسبت ہے۔ عرش اتنا بڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کو عرشِ عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ کرسی سے مراد علم اور قدرت ہے جو ہر چیز پر وسیع ہے۔ ”الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اُسْتَوٰی“ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ کس کیفیت کے ساتھ، جیسا اسکی شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہمارے فہم و فراست میں نہیں آسکتی۔ اور نہ ہم اپنے ذہن سے اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ بس ان چیزوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

وَلَا يَؤُودُهُ حِفْظُهُمَا اِن چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی۔ انسان تو مسلسل کچھ عرصہ کام کر کے تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر آرام چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی مسلسل نگرانی کے باوجود تھکتا نہیں۔ وہ ازل سے لے کر ابد اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کام میں مصروف ہے۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِیُّ اور وہ باعتبار ذات بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے تصور و ہم

اور خیال سے بلند تر ہے۔ اس کے علاوہ وہ العظیم بھی ہے۔ یعنی اس کی صفات بہت عظمت والی ہیں۔ وہ کمال عظمت کا مالک ہے۔ وہ ذات کے لحاظ سے بلند ہے تو صفات کے لحاظ سے عظیم ہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ اس بلند مرتبہ آیت کو در زبان بتائے تاکہ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ آیت اس کے لئے بخشش و مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد یازده (۱۱۱)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷

لَا رُكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ
 يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
 الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ اللَّهُ وَلِيُّ
 الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ
 كَفَرُوا أُولَئِهِمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى
 الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

۲۵۷

ترجمہ :- دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں تحقیق ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے
 پس جو شخص طاغوت کے ساتھ کفر کرے گا۔ اور اللہ پر ایمان لائے گا۔ پس اس نے مضبوط
 کمرہ پکڑ لیا ہے جس کے لیے ٹوٹنا نہیں اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے ﴿۲۵۶﴾
 اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا کامرہ ہے، جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف
 نکالتا ہے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا۔ ان کے دوست اور ساتھی طاغوت
 ہیں۔ وہ ان کو روشنیوں سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ میں بہنے
 والے ہیں وہ اس کے اندر ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

گزشتہ درس میں آیت الکہسی کا ذکر تھا۔ اور اس کی فضیلت بیان ہوئی تھی۔ یہ آیت ربط آیت
 فضیلت کے اعتبار سے قرآن حکیم میں سب سے بڑی آیت ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق توحید
 باری تعالیٰ سے ہے۔ حضور علیہ السلام کا وعدہ ہے کہ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ
 آیت الکہسی کی تلاوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں مقام عطا فرمائیں گے۔ آج
 کے درس میں اسی موضوع کو آگے چلایا گیا ہے۔ کہ دین اسلام کی قبولیت اور پھر
 اس میں خلوص نیت انسان کا اپنا فعل ہے۔ جس قسم کا عقیدہ اور عمل ہوگا اس کے مطابق

جزا و سزا ہوگی۔ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کا اپنا انتخاب ہے۔
 فرمایا لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے۔ کسی کو زبردستی
 دین میں داخل کر نیکی قطعاً اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ
 مِنَ الْغَيِّ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں
 رہا۔ نیکی اور بدی کا امتیاز کھل کر سامنے آ گیا ہے لہذا جو شخص اپنی مرضی سے اسلام میں
 داخل ہونا چاہے، بلا جھجک اسلام قبول کر لے۔ اور جس کا دل نہیں مانتا۔ وہ ایمان نہیں
 لاتا تو بیشک نہ لائے۔ اُسے زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جائیگا۔

اس آیت کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”جبر نیست بمائے دین“
 یعنی دین اسلام میں داخلے کے لیے کسی شخص پر جبر روا نہیں ہے۔ تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر
 موجود ہے۔ اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔
 مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے۔ جبر کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حدود کا قیام ہے
 کوئی مجرم خوشی سے سزا قبول نہیں کرتا، اُسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے
 زانی کو سنگ سار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو کوڑے مانے جاتے ہیں
 وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔ البتہ کسی غیر مسلم
 کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ اسلامی تعلیم کے منافی
 ہے۔ اسی لیے فرمایا لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک عیسائی بڑھیا
 محض۔ امیر المؤمنین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس عورت کو کہو کہ اسلام قبول کر لے
 جب اس کو یہ پیغام ملا، تو کہنے لگی، میری عمر کا بیشتر حصہ عیسائی مذہب پر گزر رہا ہے
 عمر کے آخری حصہ میں میرا دل نہیں چاہتا کہ اُس مذہب کو چھوڑ دوں جس پر زندگی
 گزاری ہے۔ مجھے یہ بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس بڑھیا کو اس
 کے حال پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے۔

امام ابو بکر جصاصؒ نے ”احکام القرآن“ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”ازالۃ الخفاء“

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا وثیق نامی رومی غلام تھا۔ مدت تک آپ کی خدمت کرتا رہا۔ اُس نے آخر عمر تک اسلام قبول نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام کو بلا کر کہا کہ تو بڑا قابل آدمی ہے۔ خاص طور پر یہ حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ فرمایا اگر اسلام میں جبر و اہوتا تو میں تمہیں زبردستی مسلمان بنا لیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر تم مسلمان ہو جاتے تو تمہاری قابلیت کی بنا پر کوئی اچھا عمدہ دیتا۔ اب میں یہی کرتا ہوں کہ تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔

تاریخ آل عثمان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ تہ کی کے سلطان سلیم خان کے زمانہ میں یہودی اور عیسائی بڑی سازشیں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین اُن سے بڑے تنگ آئے اور آخر حکم جاری کر دیا۔ کہ جو بھی عیسائی اور یہودی ملے اُسے زبردستی اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ جب یہ خبر اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو پہنچی۔ تو وہ فوراً سلطان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے تم نے کوئی ایسا حکم جاری کیا ہے سلطان نے اقرار کیا۔ کہ ہاں میں نے ایسا سرکلر جاری کیا ہے۔ کہ تمام عیسائی اور یہودیوں کو زبردستی مسلمان بنا لیا جائے۔ ان کے عبادت خانے موقوف کر دیے جائیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی سازشوں کی وجہ سے سلطنت میں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا اے خلیفہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا حکم ہے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔ آپ ایسا حکم جاری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے فوری طور پر یہ حکم واپس لے لیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق انگریزوں نے بڑا پرہیزگار کیا۔ کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اورنگ زیب نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر وہ واقعی زبردستی اسلام میں داخل کرتا، تو کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ کہیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ جبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا فروغ تبلیغ کے ذریعے ہوا ہے۔ تلوار کے ذریعے نہیں ہوا۔ برصغیر میں مسلمان

آٹھ سو سال تک حکمران رہے ہیں۔ مگر کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی ترجمانی ضرور کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کتنے غیر مسلم رہا کرتے تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے یہ تو اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ کیونکہ لَا اِکْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں ہے۔

شان نزول

حضرت علیہ السلام کے ورودِ مدینہ سے پہلے مدینہ طیبہ میں دو قسم کے لوگ تھے ایک تو یہودی تھے۔ جو بڑھے لکھے اور مالدار لوگ تھے۔ دوسرے عرب تھے۔ جو عام طور پر ان بڑھے اور غریب لوگ تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہی لوگ انصارِ مدینہ کہلائے۔ چونکہ یہ لوگ پسماندہ تھے۔ اس لیے یہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے انہیں یہودیوں کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد جب یہودی قبائل بنو نضیر اور بنو قینقاع کو مدینہ سے نکالا گیا۔ تو اس وقت ایک انصاری ابو حصین کے دو بیٹے یہودیوں کی تحویل میں تھے۔ اور انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب وہ مدینہ سے جانے لگے تو انصارِ می نے چاہا کہ اپنے بیٹوں کو زبردستی اسلام میں داخل کر کے انہیں اپنے پاس رکھ لے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لَا اِکْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں ہے۔ لڑکے جوان ہیں۔ انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے۔ اب اگر وہ اپنی مرضی سے جاسے ہیں تو مسلمانوں کو ان کے روکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ابوداؤد اور دیگر کتبِ احادیث میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبل از اسلام انصارِ مدینہ کی عورتیں اولاد کی تمنا کرتیں تو یہ منت مانتیں کہ اگر اللہ نے انہیں لڑکا عطا کیا۔ تو وہ اُسے یہودی کر دیں گی۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتیں جس کی وجہ سے کئی بچے یہودیوں کی تحویل میں چلے گئے۔ جب اسلام آیا تو اس وقت کچھ بچے بنو نضیر کی تحویل میں تھے جب انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ تو وہ لڑکے بھی ان کے ساتھ جاسے تھے۔ اُس وقت انصارِ مدینہ کی خواہش ہوئی کہ اپنے بچوں کو اسلام میں داخل کر کے یہودیوں کے ساتھ

جانے سے ردک لیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ حق اور باطل واضح ہو چکے اب جس کا جی چاہے حق کو قبول کرے۔ اور جو چاہے باطل پر اڑے۔

حق اور باطل کو واضح کرنے کے بعد فرمایا فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ مضبوط کٹا جس نے طاغوت کا انکار کیا۔ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ اور اللہ پر ایمان لایا فَقَدْ اسْتَمْسَكَ مضبوط کٹا پکڑ لیا۔ لَا الْفِصَامَ لَهَا جو ٹوٹ نہیں سکتا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گویا ایسی مضبوط جگہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر وہ محفوظ ہو گیا۔ اب اس کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ ایسا مضبوط مقام ہے۔ جو کمزور ہو کر ٹوٹ بھی نہیں سکتا بلکہ یہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں طاغوت کا لفظ (آٹھ مرتبہ) استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ طغیان اور طغوا کے مادہ سے ہے جسے سرکشی پر محمول کرتے ہیں۔ عام طور پر اس کا ترجمہ شیطان کیا جاتا ہے۔ مگر شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ ”ہڑونگا“ کیا ہے۔ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش چھوڑ دو۔ ہڑونگا کا لفظ اس پر بولا جاتا ہے۔ جو بنو ہمدان بن جلعن اور لوگوں سے زبردستی اطاعت کرائے۔

چونکہ شیطان کا بھی یہی کام ہے۔ لہذا اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ كُلُّ مَا يُشْغَلُكَ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَّاغُوتُكَ جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہے۔ وہ تمہارے لیے طاغوت ہے۔ گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو یا انسان، مال ہو یا اولاد سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل راستے پر چلانے والے ماں باپ اور غلط طرف لیجانے والے پیر بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ غرضیکہ جو بھی کسی کو حق سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، وہ اس کے لیے طاغوت ہے۔

عردہ کا معنی کھڑا اور وثقی کا معنی مضبوط ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اونچے ستون پر چڑھ گئے۔ اُس کے آخری سکر پہ ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ جسے آپ نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ صبح اُٹھے اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اس خواب کی تعبیر یہ ہے۔ اَنْتَ تَمُوتُ عَلَى الْاِسْلَامِ تمہاری موت اسلام پہ آئیگی۔ یعنی تم تے دم تک تم اسلام کا دامن پکڑے رکھو گے۔ لَا اِنْصَامَ لَهَا کا یہی مطلب ہے کہ وہ مضبوط کڑا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ کڑا ہاتھ سے چھوٹ تو سکتا ہے۔ مثلاً آدمی گمراہ ہو جائے اور اسلام کا دامن چھوڑ دے۔ مگر یہ حلقہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس کو تقاضے والا آدمی محفوظ ہو جائے۔ فرمایا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ ہر شے کو سنتا اور جانتا ہے۔ وہ انسان کے ارادے تک سے واقف ہے۔ کہ وہ کوئی کام نیک نیتی سے کر رہا ہے یا بد نیتی سے۔ وہ ہر ایک کی پکار کو سنتا ہے۔

نورِ ظلمت

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو طے والے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو شخص دین اسلام کے ساتھ وابستہ ہو گیا اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو گیا۔ اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست، رفیق، کارساز، مددگار یا ولی ہے۔ جو ایمان لائے۔ لفظ ولی میں یہ سب معنی پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اَنْتَ وَلِيْنَا فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ دنیا اور آخرت میں تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ تو وہ جواب دیں گے۔ اے مولیٰ کریم! اَنْتَ وَلِيْنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ ہم لوگوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ انہوں نے تو خواہ مخواہ شیطان کی بات مانی ہے۔ بہر حال فرمایا، اللہ تعالیٰ ہی مومنوں کا مددگار ہے اور وہ اُن کی مدد اس طریقہ سے کرتا ہے یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ یہاں پر لور کو مفرد استعمال کیا ہے۔ اور ظلمات جمع ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ توحید اور

ایمان تو ایک ہی چیز ہے۔ جب کہ کفر اور شرک بہت سے ہیں۔ کوئی ستاروں کو پوج رہا ہے۔ کوئی انسانوں کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی جنات کو حاجت روا سمجھتا ہے اور کوئی بتوں کے آگے سجدہ رہتا ہے۔ یہ سب ظلمت کی قسمیں ہیں۔ الغرض کہیں کفر شرک کی ظلمت ہے۔ کہیں گناہ اور نفاق کی ظلمت ہے اور کوئی شک کی ظلمت میں مبتلا ہے مگر ان سب کے مقابلے ایمان اور توحید واحد نظر یہ ہے۔ لہذا یہاں پہلے نور صیغہ واحد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ تو اس نے اپنے نبی بھیجے ہیں۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ جن کے ذریعے اہل ایمان کے دلوں کو منور کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِذِي سُلَٰمٍ اللّٰهُ تعالیٰ جس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پہنچتا ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی واضح راستہ نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔ اِنْ تَسْقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا اگر اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہر تاریکی میں راستہ پیدا کر دیگا۔ تمہارے راستے کو روشن کر دیگا۔ مشکلات کو حل کر دیگا۔ اور تمہارے تمام امور میں آسانی پیدا کر دیگا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اہل ایمان دوسرے لوگوں کے درمیان روشنی میں چلے گا۔ جس نے ایمان کا راستہ نہیں پکڑا وہ اندھیروں میں بھٹک گیا۔ اس کے لیے تمام معاملات میں اندھیر ہی اندھیر ہے۔ مگر اہل ایمان ایسی روشنی سے منور رہے۔ جو اُسے بہ نزع میں بھی کام آئیگی۔ اور اس کی قبر بھی روشن ہو جائیگی۔ حضور نے فرمایا نماز مومن کے لیے قبر میں روشنی پیدا کریگی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

فرمایا وَالَّذِينَ كَفَرُوا جَهَنَّمُ لَهُمْ اُولٰٓئِهِمُ الطَّاغُوتُ
اُن کے سامنے طاغوت ہیں۔ اور اُن کا کام کیا ہے یُخْرِجُوهُمْ مِّنَ النَّوْرِ

طاغوت کی
دستی

رَالِیَ الظُّلُمَاتِ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب شیاطین کے ہتھتے چمڑھ جاتے ہیں۔ تو کوئی انہیں کفر کی طرف لے جاتا ہے کوئی شرک کی طرف اور کوئی بدعت کی طرف۔ اور کوئی ترغیب دلا کر معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہر حال دین و ایمان کی روشنی سے نکل کر اندھیروں کی طرف ہی جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ دین میں جبر نہیں۔ اب ایمان اور کفر کا تقابلی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ روشنی سے نکل کر اندھیرے کی طرف جائیں گے۔ ان کا انجام یہ ہے۔ کہ اُولَئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ہي لوگ اہل دوزخ ہیں۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ یہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں ہی جلتے رہیں گے۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی امید ہوگی كُلَّمَا ارَادُوْا اَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا اَعِيْدُوْا فِيْهَا جب کبھی وہاں سے نکلنا چاہیں گے واپس دھکیل دیے جائیں گے۔ ان کے مقابلے میں جو اہل ایمان ہیں، وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جنت ہوگا۔ وہ دائمی عیش و راحت میں ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے دین اسلام کے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ اور پھر اس گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أَحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ اُس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہی دی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تو وہ شخص کہنے لگا، میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی جانب سے لاتا ہے۔ تم اس کو مغرب کی جانب سے لاؤ۔ پس وہ شخص حیران ہو گیا جس نے کفر کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والی قوم کو راہ نہیں دکھاتا ﴿۲۵۸﴾

ربط آیت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور کفار کا ذکر فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کا کار ساز ہے۔ اُن کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے ساتھی طاغوت یا شیطان ہیں، جو انہیں ایمان کی روشنی سے نکال کر کفر کے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا دو قسم کے گمراہوں کا ذکر ہوا۔ ایک اولیاء الرحمن یعنی وہ لوگ جن کا ولی اللہ تعالیٰ خود ہے۔ وہ رحمن کے دوست ہیں۔ اور دوسرا گمراہ اولیاء الشیطان کا ہے۔ جنہوں نے طاغوت کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔

آج کے درس سے شروع ہونے والے رکوع میں بھی اللہ جل جلالہ نے

انہیں دو قسم کے گروہوں کے متعلق بات کی وضاحت کے لیے تین مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں مسئلہ توحید، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ نے اپنی قدرت اور صنعت کو سمجھایا ہے۔ اور ساتھ توحید خالص کی وضاحت فرمائی ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اور توحید کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح ان آیات کو پہلی آیات کے ساتھ ربط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اور
نمرود میں مناظرہ

آج کے درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہے، جو انہوں نے بادشاہ وقت نمرود کے ساتھ کیا تھا۔ اور جس میں آپ نے توحید باری تعالیٰ کے متعلق دلائل دیے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ الْحَوْتَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔

الْحَوْتَ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے واقعے میں بھی آچکا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ روایت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بصری اور دوسری قلبی یا علمی۔ روایت بصری وہ ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اور پھر واقعہ بیان کیا جائے۔ اور روایت علمی وہ ہے جو علم کے ذریعے حاصل ہو۔ کسی واقعہ کو آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا یہ واقعہ بھی حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اس لیے روایت بصری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا مشاہدہ علم کے ذریعہ کرایا۔ اور اس کو اس طرح یاد کرایا۔ الْحَوْتَ کیا آپ نے نہیں دیکھا یا آپ کو نہیں معلوم مطلب یہ کہ آپ کو اچھی طرح اس واقعہ کا علم ہے کہ کس طرح اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے مکالمہ کیا۔ اور وہ شخص کون تھا۔ اَنَّ اِنَّتَ اِنَّتَ اَللّٰهُ اَلْمَلِكُ جسے اللہ تعالیٰ نے ملک یعنی حکومت عطا کی ہوئی تھی۔ وہ وقت کا بادشاہ تھا۔

نمرود کا
شجرہ نسب

اس شخص کے متعلق مختلف تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے۔ کہ اُس کا نام

نمرود تھا۔ اُس کے باپ کا نام کنعان بن کوش تھا۔ لہذا وہ نمرود ابن کنعان کہلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے اپنے دادا کی طرف منسوب کر کے نمرود بن کوش بھی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ شخص حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں عام، سام اور یافت میں عام کی نسل میں سے تھا۔ اور اس کا پایہ تخت عراق میں بابل کے مقام پر تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑا مشہور و معروف شہر تھا۔ جو موجودہ بغداد سے ستر یا سو میل کے فاصلے پر تھا اس شہر سے بہت سی تہذیبیں وابستہ ہیں۔ نمرود، کلدانی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے چار سو سال تک حکومت کی تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ نسل کے اعتبار سے یہ شخص ٹھیک نہیں تھا۔ تاہم یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سر پر تاج شاہی رکھا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ چار شخص ایسے گنہگار ہیں جن کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کافر۔ مسلمانوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں۔ جن کا واقعہ سورۃ کہف میں ملتا ہے۔ کفار میں ایک نمرود اور دوسرا نحت نصر تھا۔ جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ اس شخص نے بنی اسرائیل کو بالکل بہ بادور ذلیل کر دیا تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ منظرہ کب ہوا ان کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا یا اس کے بعد۔ بعض مفسرین کہہ رہے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے جو بنی ابراہیم علیہ السلام جوان ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تبلیغ شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ادنیٰ عمر سے ہی رشد و ہدایت عطا کی تھی۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ابتداء سے ہی رشد و ہدایت دی۔ آپ کے والد اور سرکاری ملازم تھے۔ اس کے علاوہ وہ اُس بڑے بہت خاندان کے انچارج تھے، جسے بادشاہ کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ اس وقت ہوا۔ اس کے بعد آپ کو آگ میں ڈالا گیا۔ بعض دوسرے مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تفسیر ابن کثیر ص ۳۱۳ و قرطبی ص ۲۸۴ ۲۸۵ تفسیر کبیر ص ۲۳ (فیاض)

کے اگلے جانے کے بعد ہوا ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ رہنے کا معجزہ دیکھ کر بھی درہ
آپ پر ایمان لائے "فَإِنَّ لَهُ لُوطًا حَظَرَ لُوطًا عَلَيْهِ السَّلَامُ" کے سو کسی نے آپ کی تصریح کی البتہ گھر میں آپ کی
بیوی سارہ تھی۔ جسے ایمان کی دولت حاصل تھی۔ اُن ایام میں یہ مناظرہ ہوا۔ آخر وہ وقت
بھی آیا جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا وطن بابل بھی چھوڑنا پڑا۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ
حضرت لوط اور آپ کی بیوی تھے۔ آپ عراق سے چل کر فلسطین پہنچے۔ وہاں اپنے
بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو تبلیغی مشن پر بحر لوط کے کنارے متعین کیا۔ پھر آپ مصر
پہنچے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچ کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اپنے فرزند اسماعیل
کو وہاں چھوڑا۔ آپ واپس فلسطین آگئے۔ اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دو سر
بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نے وہاں کے تبلیغی فرائض سنبھالے۔

مناظرے کا
پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور غرود کے درمیان بحث و مباحثہ کی نوبت
کیوں پیش آئی۔ اس کے متعلق مولانا شیخ الہند اور شاہ عبدالقادر نے اپنی تفاسیر
میں مختصر نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر
کا تذکرہ تھا۔ اُن کے نور اور ظلمت کا بیان تھا۔ اور اب اس آیت میں اُسی سلسلہ
میں بعض نظریں پیش کی گئی ہیں اور اس پہلی نظیر میں غرود اور حضرت ابراہیم کا ذکر ہے
کہ جو کوئی شخص غرود کے دربار میں جاتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اُسے سجدہ کرتا تھا۔ جب
ابراہیم علیہ السلام دربار غرود میں پہنچے۔ تو آپ سے بھی سجدہ کرنے کی توقع کی گئی
مگر آپ نے غرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر مناظرے کی مذکورہ صورت
پیش آئی۔

غرود کا واقعہ تاریخ کی تمام پڑانی کتابوں میں ملتا ہے مگر محض تاریخی روایات
پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تاریخ میں ہر قسم کے واقعات بلا تحقیق نقل کر دیے
جاتے ہیں۔ پرانے مورخین میں ابن خلدون کو اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ آٹھویں صدی
ہجری میں ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے
تاریخ کا ایک ضخیم مقدمہ "قلبنہ" کیا ہے جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات

بیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے پوری دنیا کو تاریخ کا فلسفہ سکھا دیا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے تمام مؤرخین ابن خلدون کے شاگرد ہیں۔ خود قاضی بھی تھے۔ مگر تاریخی روایات کی صحت کے متعلق ان پر بھی مکمل انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ طبری کی تاریخ میں بھی صحیح اور غلط ہر قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ تاریخ دان کسی واقعہ کی پوری تحقیق نہیں کرتے۔ یہ تو محدثین کو شرف حاصل ہے۔ کہ کسی واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے راولوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ہر غلط ملط واقعہ درج نہیں کیا جاتا۔ البتہ امام ابن کثیرؒ نے اس ضمن میں کافی پیش رفت کی ہے۔ آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں میں ہیں۔ آپ نے واقعات کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے۔ روایات پر صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جرح بھی کی ہے۔ آپ کی تاریخ کی کتاب "البدایہ والنہایہ" سولہ جلدوں میں ہے۔ جس میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ بہر حال انہوں نے واقعات کی صحت کا کسی حد تک خیال رکھا ہے۔ آپ نے قرآن پاک کی "تفسیر ابن کثیر" لکھی ہے۔ جو اعلیٰ درجے کی تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔ تاریخی روایات کی صحت کی جانچ پڑتال میں امام مسعود بغویؒ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ امام رازیؒ سے بھی

پہلے پانچویں صدی میں ہوئے ہیں۔ آپ کا وطن خراسان میں بغات ہے۔ آپ اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ آپ کی حدیث کی کتاب "مصابیح" کے نام سے موجود ہے۔ جو علم حدیث کی بلند پایہ کتاب ہے۔ جسے صاحب مشکوٰۃ نے مزید شرح کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر "معالم التنزیل" کے نام سے موجود ہے، جو چار جلدوں میں ہے۔ اور اُس دور کی معتبر تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ بہر حال انہوں نے تاریخی واقعات میں صحت کا کسی قدر زیادہ التزام کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ضرود کے واقعہ کے متعلق امام ابن کثیرؒ اور امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب کہ ملک میں فحط پڑ گیا اور لوگ بھوکوں

مرنے لگے، اس وقت فرود کے پاس غلے کا ذخیرہ موجود تھا۔ لوگ اُس کے پاس غلے لینے کے لیے جاتے تھے۔ اور دربار میں پہنچ کر سب سے پہلے سجدہ کرتے اور پھر اپنا مدعا بیان کرتے۔

اصل مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فرود کے دربار میں پہنچے مگر آپ نے اُسے سجدہ نہ کیا۔ اُس نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ نہیں کرتا۔ فرود نے کہا کہ رب تو میں ہوں لہذا مجھے سجدہ کر دو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تم تو محض حاکم وقت ہو، رب نہیں ہو۔ رب وہ ذات ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارے اختیار میں یہ چیز نہیں ہے۔ لہذا تم رب نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پاک میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ یعنی میرا رب ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے اور مارتا ہے نَمُوتُ فرود فوراً بولا قَالَ أَنَا أَحْيِي وَأُمِيتُ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ چنانچہ اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لیے اس نے دو قیدی منگوائے۔ جو بے گناہ تھے اُس کو قتل کر دیا۔ اور جو مجرم تھا اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو میں نے جس کو چاہا زندگی دے دی اور جسے چاہا موت کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ شخص عقل کا ایسا اندھا ہے کہ موت و حیات کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ گنہگار کو چھوڑ دینے اور بے گناہ کو قتل کر دینے کو زندگی اور موت سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کا مالک تو وہ ہے جو بے جان چیزیں جان ڈال دے اور جاندار کی جان اپنے اختیار سے قبض کر لے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے فرود کو بیوقوف سمجھتے ہوئے اس نکتہ پر مزید بحث نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری دلیل سے سمجھایا۔ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے فَأْتِي بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اب اُس کے حواس درست ہوئے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسا سوال کیا ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواب

نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ نمرود حیران ہو گیا گویا اللہ نے اس کی مستاری دی۔ وہ لا جواب ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے مزید بحث نہ کی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام سے مزید مناظرہ کیا۔ تو بات بالکل بگڑ جائیگی اور وہ جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ لہذا وہ خاموش ہو گیا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر مزید بحث و تمحیص ہو سکتی تھی فرض کرو اگر نمرود سورج کے طلوع و غروب کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب دیتا کہ سورج کو مشرق سے تو میں طلوع کرتا ہوں تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکالے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یقیناً ابراہیم علیہ السلام کو سچا کہہ دکھاتا اور سورج کو مغرب سے طلوع کر دیتا۔ مگر نمرود کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ لہذا اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی مصلحت جانی۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا دور ربہ غیر پاک و ہند میں بھی پیش آیا تھا۔ بطل بادشاہ جہانگیر بھی اپنے آپ کو سجدہ کرتا تھا۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے۔ مخلوق میں سے کسی کے لائق نہیں کہ اُسے سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سجدہ کی علی الاعلان مخالفت کی۔ بہر حال یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کہ جہانگیر جیسا اکھڑ مزاج بادشاہ بھی اس فعل سے تائب ہو گیا۔ اور اس کا عقیدہ درست ہو گیا۔ البتہ اسکی بیوی رافضیہ تھی۔ مگر وہ رافضیوں کا طرفدار نہیں بنا۔ اور صحیح دین اسلام پر قائم رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ جہانگیر کے بعد شاہجہان مزید دین کی طرف راغب ہوا۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر جیسا خوفِ خدا رکھنے والا بادشاہ بھی پیدا ہوا جس نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

ابراہیم علیہ السلام کا سجدہ

بہر حال جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اُس نے آپ کو غلہ مینے سے انکار کر دیا۔

اور آپ کو خالی والپس آنا پڑا۔ واپسی پر دل میں خیال آیا۔ کہ گھر والوں کو خالی لوٹنے کا کیا جواب دوں گا۔ آپ نے راستے میں اپنا تھیلہ ریت سے بھر لیا۔ تاکہ گھر والوں

کو معلوم ہو کہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئے۔ گھڑ بچہ کو تھیلہ گھر میں کھا اور خود سو گئے بیوی نے سمجھا کہ آٹے آئے ہیں چنانچہ وہ اٹھی تاکہ تھیلے میں سے آٹا لیکر روٹی تیار کرے تھیلہ کو کھولا تو اس میں واقعی آٹا تھا کھانا تیار کرنے کے بعد ابوہریرہ علیہ السلام کو جب گایا کہ کھانا کھالیں آپ نے پوچھا روٹی کس چیز سے پکائی ہے۔ بیوی نے عرض کیا، اُس آٹے سے جو آپ لائے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی کی ہے۔ اور ریت کا آٹا بن جانا ایک معجزہ ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ اس کی صفت اس کے فعل سے سمجھ میں آتی ہے۔ جب کوئی عجیب و غریب فعل سرزد ہوتا ہے۔ تو پھر پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اور حجب یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ تو پھر اس کی توجیہ کی پہچان ہوتی ہے۔ کہ ایسی صفت کا مالک اور کمال قدرت اور کمال صفت کا مالک صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ گویا اس سارے واقعہ سے یہ بات نکلی کہ موت و حیات کا مالک اور نظام شمسی کو چلانے والا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ چاہے قمر بڑے سے بڑے سرکش کو لا جواب کر دے۔ اور چاہے توریت کو غلہ میں تبدیل کر دے۔ یہ سب اس کی کمال قدرت کے کرشمے ہیں۔ جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ظالم ہدایت
سے محروم ہیں

فرمایا اللہ تعالیٰ کی صفات کو گھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، تو پھر وہ پرلے درجے کا ظالم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا یعنی ان کی راہنمائی نہیں کرتا پہلی آیت میں بھی آچکا ہے۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کہ کافر لوگ ہی ظالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ مشرک ہیں اور شرک کی حقیقت یہ ہے۔ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور اس کے مرتکب ظالم لوگ ہیں۔ جو لوگ شرک جیسے ظلم عظیم میں پھنس جاتے ہیں۔ اللہ ان کو راہِ راست کی طرف راہنمائی نہیں کرتا۔ یہ اللہ کا عام قانون ہے۔ کہ جب تک کوئی

ظلم سے ناسب نہیں ہوگا، اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

الغرض گزشتہ درس میں بیان ہونے والے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی مثال

اس درس میں آگئی۔ فرود طاغوت کا پرستار تھا۔ اور ابوبکر صدیق علیہ السلام حق پر قائم تھے۔ اللہ

تعالیٰ نے حق کو فتح نصیب فرمائی۔ اور اپنی صفت کے ذریعے اپنی ذات کی پہچان کرائی۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا
 قَالَ أَلَا يَحْيَىٰ مَذْهَبَ اللَّهِ بَعْدَ مَوْتِهِمَا فَاَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ
 عَامٍ ثُمَّ بَثَّنَّهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
 قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ
 لَمْ يَسْنَخْهُ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنُجْعَلَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ
 إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوها لَحْمًا فَلَمَّا
 تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾

توجہ فرمائیے: کیا نہیں دیکھا آپ نے اس شخص کو جو ایک بستی پر گزرا، جو کہ اپنے
 چھتوں پر گھری ہوئی تھی۔ اُس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا۔
 اس کے دیدار ہونے کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اُس شخص پر موت طاری کر دی
 سو سال تک۔ پھر اُسے اٹھایا۔ اور کہا کہ تو یہاں کتنی دیر تک رہا ہے۔ اُس نے
 کہا، میں یہاں ایک دین یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
 نہیں بلکہ تو سو سال بھر رہے۔ پس دیکھ اپنے کھانے اور مشروب کی طرف، وہ متغیر نہیں
 ہوا۔ اور دیکھ اپنی سواری کے گدھے کی طرف اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی
 بنادیں۔ اور دیکھ ٹیلوں کی طرف، کس طرح ہم ان کو ابھارتے ہیں۔ پھر ان کو گوشت پہناتے
 ہیں۔ جب اُس شخص پر بات واضح ہو گئی، تو وہ کہنے لگا، میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ

ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ﴿۲۵۹﴾

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء الرحمن اور اولیاء الشیطان کی مثال بیان فرمائی۔
 ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام اولیاء الرحمن کا نمونہ ہیں۔ اور دوسری طرف سرور

اولیاء الشیطان کی مثال ہے دونوں کا مناظرہ و مباحثہ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دلائل و براہین کی رو سے غالب آجانا اور کافر کا حیران و پریشان ہو جانا یہ سب بیان ہو چکا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دشگیری فرمائی اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ اللہ ولی الذین امنوا یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا کارساز ہے۔ اس مثال سے شیطان کی شیطنت بھی سمجھ میں آئی کہ فرود کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی عطا کی تھی مگر اس انعام کا شکر گزار ہونے کی بجائے وہ شیطان کے پیچھے لگ گیا اور خود خدائی کا دعویدار بن گیا۔ اس نے انعام الہی سے غلط فائدہ اٹھایا اور سرکشی اختیار کی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اسے صراط مستقیم دکھانا چاہا تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔

آج کے درس والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال کے ذریعے اپنی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ یہ مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات معارف الہیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر انسان کا روز قیامت پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ لہذا خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسے واقعات کی تشریح کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

متعلقہ شخص
کون تھا

اس آیت کی ابتداء آؤ کالذین سے کی گئی ہے یعنی اس شخص کا واقعہ جس کا گزرا ایک تباہ شدہ بستی پر ہوا۔ اور اس نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ ایسی پامال شدہ بستی کو کیسے دوبارہ آباد کرے گا۔ یہاں پر اس شخص کا تعارف نہیں کر لیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ حدیث پاک میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ بائبل، تفسیری روایات اور تاریخ سے اس شخص کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں مفسرین کے اقوال میں سے ایک قول تو یہ ہے کہ یہ شخص سکریسلمان ہی نہیں تھا۔ بلکہ حیات بعد الممات کا منکر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی آنکھوں سے دوبارہ جی اٹھنے کا مشاہدہ کر لیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شخص نہ صرف

مومن تھا بلکہ اللہ کا نبی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ کون سا نبی تھا، تو بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ یرمیاہ نبی تھے جن کا ذکر تورات میں موجود ہے۔ اور زیادہ مشہور قول یہ ہے۔ کہ آپ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور اسی عجیب و غریب واقعہ کی بنا پر اسرائیلی آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيزٌ ابْنُ اللَّهِ" یعنی یہودیوں نے کہا۔ کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

تاریخی
پس منظر

یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ جب بنی اسرائیل میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اور وہ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اس وقت بابل پر بخت نصر جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ غرور کی طرح بخت نصر نے بھی پوری دنیا پر حکومت کی۔ چنانچہ اس نے شام و فلسطین پر حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ اور یہوشلم اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بیشمار بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا۔ اور لاتعداد لوگوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے ساتھ عراق لے گیا بنی اسرائیل کی تمام کتابیں تورات سمیت جلا ڈالیں۔ حتیٰ کہ تورات کا ایک نسخہ بھی سلاکت نہ بچا۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ قید ہونے والوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ قید سے رہا ہو کر واپس اپنے وطن آئے تھے تو یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔ اس وقوعہ کے مقام کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ راستے میں کوئی شہر یا بستی تھی۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ خود یہوشلم کا شہر تھا۔ بہر حال اس کی حالت یہ تھی۔ کہ مکانات کی چھتیں اور دیواریں زمین بوس ہو چکی تھیں اور وہاں کوئی شخص زندہ سلامت موجود نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ کسی زلزلے میں یہ ایک پُر رونق اور آباد شہر تھا۔ مگر اُس وقت کھنڈرات کا ڈھیر بن چکا تھا

واقعہ پر
سطحی نظر

کہتے ہیں۔ کہ حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار آئے تھے۔ آپ کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان بھی تھا۔ ایک برتن میں پھلوں کا کچھ شیرہ تھا۔ اور ایک ٹوکری میں انجیر تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ بہر حال آپ کا اس

اجڑے ہوئے شہر پہ گزر ہوا۔ کھنڈرات کو عبور کرتے ہوئے ایک مقام پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیا یہ اجڑا ہوا شہر بھی کبھی آباد ہوگا؟ اسی سوچ و بچار میں کھنڈرات کے درمیان ایک مقام پر اترے، گدھے کو بانڈھا، کھانے کا کچھ حصہ کھایا اور باقی پاس رکھ لیا۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ اور پھر اسے سوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک سلائے رکھا۔ جس وقت سوئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور جب بیدار ہوئے تو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اٹھنے کے بعد ان سے سوال و جواب ہوئے کہ کتنا عرصہ سوئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ سو سال تک سوتے رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے کرشمہ کے طور پر انہیں دکھایا کہ اس سو سال کے عرصہ میں ان کا کھانا بالکل تازہ تھا خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ ان کا گدھا مر چکا تھا اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے گدھے کو زندہ کیا۔

جب عزیر علیہ السلام موت کی نیند سو رہے تھے۔ تو اس دوران بخت نصر مر گیا، ایران کے بادشاہ خسرو نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے اپنے زیرِ نگیں کر لیا، اور بنی اسرائیلیوں کو آزاد کر دیا۔ اور انہیں فلسطین کو دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے تیس سال کے مختصر عرصہ میں اس اجڑے شہر کو دوبارہ آباد کر لیا۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شہر کبھی دیران ہوا ہی نہیں۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں آبادی اور بربادی کی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مگر جنگ کے خاتمہ سے چند سال کے اندر اندر جرمنی اس طرح آباد ہو گیا۔ کہ گویا وہاں کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں۔ فیکٹریاں، کاروباری مراکز پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ معرضِ وجود میں آ گئے۔

اسی طرح تیس سال کے عرصہ میں وہ شہر لوری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ آباد ہو گیا۔ اور جب عزیر علیہ السلام اپنی موت کے سو سال پورے ہونے

پر دوبارہ اٹھائے گئے تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ میلوں تک پھیلے ہوئے کھنڈرات
ہنستے بستے شہر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بطور نمونہ دکھا دیا۔ کہ
مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا طور ہے۔

تباہ شدہ
بستی

ارشاد ہوتا ہے۔ اَوْكَالُ ذِي مَرٍّ عَلَى قَرِيْبَةٍ کیا آپ کے علم میں
یہ بات نہیں آئی۔ کہ وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا۔ یہ بستی پر وٹم تھا یا کوئی اور نگر ہی تھی۔

وہی خاویکے علی عروشا تھا اور اس بستی کی حالت یہ تھی کہ اپنی چھتوں
پر گڑھی پڑی تھی۔ تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ نہ کوئی دیوار سالم تھی اور نہ کسی مکان کی چھت باقی
تھی بلکہ پوری بستی بلے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ وہاں کوئی زندہ سلامت آدمی موجود نہیں
تھا۔ اگرچہ عام خیال یہی ہے۔ کہ یہ بستی بخت نصر بادشاہ نے تباہ کر دی تھی مگر کہتے
ہیں۔ کہ یہ کسی حادثہ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ جب زبردست قسم کا زلزلہ آتا ہے۔ تو

سینکڑوں میل تک تباہی پھیل جاتی ہے۔ بذرتہ کی بستی میں زلزلے نے وہ تباہی
مچائی کہ رات کے محوڑے سے حصہ میں دس بارہ ہزار کی آبادی میں سے کوئی بھی
زندہ نہ بچا۔ ۱۹۲۳ء میں جاپان میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ہزاروں میل زمین میں لمبے
لمبے شکاف پڑ گئے تھے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہلاکت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ قیامت

صغریٰ کا نمونہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ جیسا آباد شہر آفانائے بلے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں
جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بہر حال اللہ کے نبی نے بستی کی بربادی کو دیکھ کر تعجب کے ساتھ
کہا قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا الَّذِي بَعْدَ مَوْثِقَا اس قدر تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ

اس بستی کو کیسے زندہ کریگا۔ یہاں پر حیات اور موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر
ہذا سے مراد وہ بستی ہے۔ تو اس کا معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی

بستی کو دوبارہ کیسے آباد کرے گا۔ اور اگر اس سے مراد اس بستی کے لوگ ہیں جو بستی کی
تباہی کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں چلے گئے تھے تو اس کا معنی یہ ہو گا۔ کہ اللہ تعالیٰ

قیامت کے دن ان کو کیسے زندہ کرے گا، جب کہ ان پر موت طاری ہو چکی ہے
حضرت عزیر علیہ السلام کے اس تعجب خیز سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے

موت و حیات
کا منظر

اس طرح دیا کہ فَأَمَّا تِلْكَ الْمَائَةُ عَامٍ آپ پر سو سال تک کے لیے موت طاری
 کر دی۔ ثُمَّ بَعَثْنَاهُ پھر آپ کو اٹھایا۔ اور کہا قَالَ كَعْرِيبَتْ تَمُوتُ تم کتنی دیر
 ٹھہرے یعنی اس حالت میں کتنا عرصہ ہے، ذرا بہاد تو سی۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ عرض کیا، ایک دن یا دن سے کچھ کم ٹھہرا ہوں۔ اللَّهُ تَعَالَى
 نے فرمایا۔ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ بلکہ تم ایک سو سال تک ٹھہرے
 اور آپ کو باور کرانے کے لیے فرمایا فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرِبِكَ
لَمْ يَتَسَنَّهْ ذرا اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو، وہ متغیر نہیں ہوا یعنی
 اتنا عرصہ گزرنے کے بعد گل سٹر کر خراب نہیں ہوا نہ اس کی شکل تبدیل ہوئی ہے۔ نہ ذائقہ اور نہ
 رنگ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے۔ کہ جلد خراب ہو جانے والی چیز کو اتنے لمبے
 عرصے تک محفوظ رکھا۔ اور دوسری طرف خود عزیز علیہ السلام ہیں۔ ان کا جسم سو سال تک
 کھنڈرات کے درمیان پڑا رہا مگر بالکل صحیح سلامت اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ
 اس کا گوشت گلا سٹرا اور نہ ہڈیاں علیحدہ ہوئیں۔ جس طرح اس مالک الملک نے اصحاب کعبہ
 کو تین سو نو سال تک ایک غار میں محفوظ رکھا، اسی طرح حضرت عزیز علیہ السلام کے
 جسم کو ایک سو سال تک آنچ نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنی حکمت کے
 ساتھ ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے۔ پورا شہر آباد ہو گیا۔ مگر جس جگہ عزیز علیہ السلام آرام
 فرماتے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ آج لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دجال
 کہاں مقید ہے۔ آج دنیا کا کوئی حصہ نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ آخر وہ کہاں چھپا
 ہوا ہے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے اُسے لوگوں کی نظروں سے مخفی کر دیا ہے۔ جب
 اُس کا حکم ہو گا، ظاہر ہو جائے گا۔ یا جوج ماجوج کی قوم بھی ایسی ہی ہے۔ وہ بھی کسی
 کو نظر نہیں آتے۔ انگریزوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے پوری دنیا کا کونہ کونہ چھان
 مارا ہے مگر یا جوج ماجوج کہیں نظر نہیں آئے۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی
 حکمت سے چھپا رکھا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ جب اس کا حکم ہو گا، یہ قوم
 پہاڑوں سے نکل کر ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے خود اپنے ساتھ اور کھانے کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا۔ اب انکے گدھے کا انجام دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو گدھے کی سواری کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا، مگر اس زمانے میں یہ ایک علیحدہ سواری شمار ہوتی تھی۔ بڑے خوبصورت اور طاقتور گدھے ہوتے تھے، خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے کی سواری کی ہے۔ آپ بالکل تکلف نہیں فرماتے تھے۔ جو سواری میسر آئے، استعمال میں لے آتے تھے جب آپ بنو قریظہ سے جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ تو آپ کے پاس یہی سواری تھی۔ اور اسپر پالان بھی نہیں تھا۔ مگر آپ نے اسی حالت میں اُس پر سفر کیا۔ آپ نے اونٹ اور گھوڑے پر بھی سفر کیا، اور اگر کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے، حضرت جابرؓ بیمار ہو گئے۔ آپ کا گھر مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حضور علیہ السلام بیمار پرسی کے لیے جانا چاہتے تھے، کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور تشریف لائے۔ تو آپ پر گمر دو غبار پڑا ہوا تھا۔ بہر حال گدھے کی سواری کو محبوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔ کہ اُس کا کیا حشر ہوا ہے۔ فرمایا یہ سب واقعات پیش کرنے کا کوئی مقصد ہے۔ وَلِيَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لیے نمونہ بنا دیں۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے موت طاری کرنے کے بعد پھر کس طرح زندہ کر دیا۔ اب دیکھو گدھا کس طرح زندہ ہوتا ہے۔ فرمایا وَانْظُرْ إِلَى الْعِظْمِ۔ ان ہڈیوں کی طرف نگاہ کرو۔ گدھا مر چکا ہے۔ گوشت گل شتر کو ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ فرمایا ان کی طرف دیکھو كَيْفَ نُنْشِئُهَا ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ شتر کا معنی ہوتا ہے، ابھارنا، اٹھانا وغیرہ ناشترہ اس عورت کو کہتے ہیں، جو خاوند کی نافرمان ہو اور مقابلے میں اٹھ کھڑی ہو۔ فرمایا دیکھو! ہم ان ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ہڈیاں

ابھریں، ان کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ پھر ان پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ زندہ ہو کر لوہے لگا۔

ہر ذی جان کا جسم ہڈیوں پر قائم ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جب انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کے جسم کی تمام کٹافیتیں گل سڑ جاتی ہیں۔ صرف دم کی ہڈی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتی ہے۔ قیامت کے دن اسی ہڈی سے پورا ڈھانچہ اور پھر پورا جسم اٹھایا جائے گا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے گدھے پر وار د کیا اور پھر حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے گدھے کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

وارد ہونے والی موت کے اس سو سالہ عرصہ کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جب کوئی انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز دوبارہ جی اٹھنے تک برزخی زندگی کھلاتی ہے۔ اس عرصہ میں انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ کہ وہ کتنا عرصہ برزخ میں رہا ہے جیسا کہ سورۃ یٰسین میں آتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو کہیں گے "مَنْ بُعِثْنَا مِنْ مَّوْتِنَا هٰذَا اَنْهٰمِمْ ہمارے خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا۔ ان کو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص رات کو یا دن کے وقت کچھ دیر کے لیے سوتا ہے۔ اور پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہی چیز حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ سو سال تک سوئے ہوئے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

عالم برزخ میں وقت کا احساس تو نہیں ہوتا۔ مگر راحت اور تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ جب کسی شخص کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر منکر نکیر اس سے سوال و جواب کرتے ہیں اس ابتدائی امتحان میں اگر وہ شخص کامیاب ہوا ہے۔ تو اس کو میٹھی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے راحت کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ناکام ہو گیا ہے۔ سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ تو پھر قیامت تک کے لیے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے تکلیف کا احساس تو ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہیں ہوتا۔

مرنے کے بعد ایک عام انسان کے جسم کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ قانون قدرت کے مطابق مردہ جسم گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قبروں کی کھدائی کے دوران بعض اوقات چھوٹی موٹی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ملتیں۔ البتہ اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبر میں بھی محفوظ رہتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلٰی الْمَرَضِ اَنْ تَاْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا۔ کہ وہ بیویوں کے جسموں کو کھا سکے۔ ہاں شہداء کے متعلق مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض شہداء کے جسم بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بعض شہداء کو شہید ہونے پچاس سال گزر چکے تھے۔ بارش اور سیلاب کی وجہ سے ان کی قبروں میں شگاف پڑ گئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم ویسے ہی محفوظ تھے جیسا وہ دفن کیے گئے۔ ابھی پچھلے دنوں اس بات کا اٹکٹاف ہوا ہے کہ جو لوگ چھ سو سال پہلے تاتاریوں کے علاقے میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے، ان کے جسم بالکل محفوظ برآمد ہوئے تھے۔

یقین کے
تین مدارج

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ جَبَّ يَه تَمَامُ حَيْرِيں حضرت عزیز علیہ السلام پر واضح ہو گئیں ان کے سوال کا جواب مل گیا۔ انہوں نے حیرانگی کے انداز میں سوال کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ کہ اُس نے نہ صرف پورے شہر کو آباد کر دیا بلکہ خود ان کو اور ان کے گھر کو سو سال کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ تو عزیز علیہ السلام نے کہا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ میں جان گیا ہوں اور مجھے علم ہو گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آباد کو برباد اور اجڑے دیار کو پھر سے آباد کر سکتا ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

کسی چیز کو تسلیم کر لینے یا اس پر یقین کر لینے کے تین درجے ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم کسی دوسرے ثقہ شخص کی معرفت ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسی چیز کا اور اک علم کے ذریعے ہوا ہے۔ اور اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ

دیکھ لے۔ تو اے عین الیقین کہتے ہیں۔ اور یقین کا تیسرا درجہ حق الیقین ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی واقعہ خود اپنے ساتھ پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے اوپر وارد ہوئی ہو۔ اور اس کی کیفیت خود اپنے اوپر طاری ہوئی ہو۔ اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور یہی چیز کو تسلیم کر لینے کا آخری درجہ یعنی حق الیقین ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ عین الیقین بھی ہے اور حق الیقین بھی عین الیقین اس لحاظ سے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے خود اپنی آنکھوں سے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں سے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر ان پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ آواز دینے لگا۔ یہ واقعہ حق الیقین کے درجے میں اس لحاظ سے ہے کہ یہ معاملہ خود عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ خود سو سال تک موت کی آغوش میں ہے۔ اور پھر زندہ ہو گئے۔ جہاں تک پہلے درجے علم الیقین کا متعلق ہے۔ تو حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی چاہی تھا۔ کیونکہ آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ مومن تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے دن دوبارہ جی اٹھنے پر علمی لحاظ سے بھی یقین تھا۔

اگلی آیت میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار اور علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ ہے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۶۰

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد چارودہ (۱۱۴)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ط قَالَ أَوَلَمْ
تُؤْمِنُ ط قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ط قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْلِدْ عَلَىٰ
كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً ثُمَّ اذْعُنَّهُنَّ بِأَنتِنَاكَ سَعْيًا ط
وَأَعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

۵۳۶

ترجمہ: اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے
کہا کہ مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیا تم یقین نہیں
رکھتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں میں یقین رکھتا ہوں لیکن یہ اس لیے تاکہ میرا
دل تسکین پکڑے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، چار پرندے پکڑ لو اور پھر انہیں اپنے پاس بازو کھینچو
(یا اپنے پاس ٹکڑے ٹکڑے کر دو) پھر ہر پاڑ پر ان میں سے ایک ایک جزو رکھ دو۔
پھر ان کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے (۲۶۰)

توحید باری تعالیٰ، اُس کی کمال قدرت اور بعث بعد الموت کے متعلق اس
رکوع میں دو واقعات آچکے ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں حضرت ابراہیم
علیہ السلام اور فرود کے مناظرے کی تفصیلات بیان ہوئی تھیں۔

تمہید

اور گزشتہ درس میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا۔ جس میں انہوں نے موت
وحیات کے منظر کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اطمینان قلب حاصل کیا۔ آج
کے درس میں اسی قسم کا تیسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ اس میں بھی بعث بعد الموت
کا بیان ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں

مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرایا جائے تاکہ ان کا ایمان عین یقین کے درجے تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ اور حکم دیا کہ چار پہنڈے لے کر ذبح کرو۔ ان کے گوشت آپس میں ملا دو۔ پھر ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ اس کے بعد ہر ایک پہنڈے کو اُس کا نام لے کر بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے مردہ پہنڈوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اطمینان قلب حاصل کیا۔

بعض مفسرین کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے اس سوال کے پس منظر میں یہ بات بیان کرتے ہیں کہ موت اور زندگی سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا غرور کے ساتھ مکالمہ ہو چکا تھا۔ جس میں آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ مگر غرور اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور اس نے بے گناہ کو قتل کر دیا اور مجرم کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اُس کی اس احمقانہ حرکت پر موضوع سخن بدل کر طلوع شمس کی دلیل پیش کر دی جس سے غرور عاجز آگیا تو مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کو پورا پورا یقین تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ مگر ان کے دل میں موت و حیات کا منظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کی سکی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دکھا دیا۔ کہ کس طرح پہنڈے زندہ ہو گئے۔

بعض دوسرے مفسرین اس پس منظر میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریا کے کنارے پر ایک مردہ جانور پڑا دیکھا۔ جب دریا میں مد آتی اور پانی کناروں سے باہر نکلتا تو دریائی جانور مردہ جانور کا گوشت کھاتے اور جب پانی پیچھے ہٹ جاتا۔ تو خشکی کے جانور اُس مردار کا گوشت کھاتے اور اوپر سے پہنڈے بھی آکر گوشت کھا جاتے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس مردار کا گوشت خشکی، پانی اور فضا کے جانور کھا رہے ہیں۔ یہ گوشت کتنے مختلف پیٹوں میں جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے مختلف اجزاء کس کس جگہ سے

کیسے اکٹھے کر کے اس کو دوبارہ زندہ کر لگا۔ لہذا ان کو خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں وہ کیفیت مشاہدہ کرائے جس طرح وہ قیامت کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کر لگا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ وَإِذْ قَالَ رَبُّهُمْ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ أَخْيِ الْمَوْتَىٰ اے مولا کریم! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کر لگا۔ اللہ تعالیٰ جواب دیا قَالَ أَوَلَمْ تَوُثِّقْ بِمَا تَمَهِیں یَقین نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ کیا تمہیں اس معاملے میں کوئی شک ہے۔ قَالَ بَلٰی ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں، میں یقین رکھتا ہوں مگر سوال کرنے کا مقصد یہ ہے۔ وَالۡیٰکُنَّ لَیۡطَمَۡیۡنَ قُلُوبِیْ کہ میں اس معاملے میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔

انبیاء شک سے پاک ہیں

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کسی شک کی بنا پر تھا کہ واقعی کوئی شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس معاملہ میں تو کسی عام مومن کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے انہیں یہ شک کیسے ہو سکتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوَلَمْ تَوُثِّقْ بِمَا تَمَهِیں تو یقین نہیں رکھتا کہ مرے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کا جواب تھا بَلٰی کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟ اے اللہ کریم! مجھے تو یقین کامل ہے۔ مگر میں محض تسکین قلب کے لیے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا وہاں پر شک کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ مَخَّنَ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اَبۡوَاهِمَ یعنی اگر ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کا شک یا تمہ دو ہوتا تو ہم ان کی نسبت شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کبھی شک ہوا اور نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا ہے۔ انبیاء ہمیشہ شک سے پاک ہوتے ہیں۔ اطمینان قلب کے لیے کسی چیز کا مطالبہ کرنا کمال یقین کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ تسکین قلب ایمان سے زائد چیز ہے۔ سورۃ فتح میں حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب صحابہ کرام درخت کے نیچے بیٹھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے دست مبارک پر بیعت رضوان کر رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ — اُن کے دلوں کی بات کو جانتا تھا فَانْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ اور اُن پر تسکین نازل فرمائی۔ نبی کریم اور تمام صحابہ کرام کو تسکین قلب حاصل ہو گئی۔ بعض دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ تو بہر حال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہی بات سمجھائی۔ کہ مردوں کو زندہ کرنے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کسی بھی معاملے میں کسی نبی کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب میں کسی معاملہ میں شک نہیں کرتا، تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شک کر سکتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے لَوْ كُشِفَ الْفُطَاءُ مَا زِدْتُ يَقِيْنًا یعنی اگر غیب کا پردہ بھی کھول دیا جائے۔ تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اس قول سے بعض لوگوں نے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ حضرت علیؑ کا علم الیقین اتنا پختہ ہے۔ کہ عین الیقین سے ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اطمینان قلب کے لیے خود عین الیقین کا مطالبہ کر رہے ہیں لہذا بقول ان کے اس سے حضرت علیؑ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بھائی! یہ بات نہیں ہے۔ حضرت علیؑ تو اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں۔ ان کے مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک ولی کا عین الیقین بھی نبی کے علم الیقین تک نہیں پہنچ سکتا، نبی کا اصل یقین ہی اتنا بلند ہے کہ ولی کی دہاں تک رسائی نہیں۔ چہ جائیکہ نبی کے طمانینت قلب والے یقین تک پہنچ جائے وہ تو اور بھی بلند ہوتا ہے۔ لہذا ولی کی نبی پر فضیلت تو کجا، وہ تو انبیاء کی گروہ تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے، حضرت علیؑ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایمان کی حد تک ان کا یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ اس میں مزید اضافے کی گنجائش نہیں اگرچہ درمیان سے غیب کا پردہ بھی اٹھ جائے اپنے اطمینان قلب کی بات نہیں کی۔ یقین اور طمانینت قلب دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔ کہ مولا کریم! تیری قدرت پر مجھے پورا پورا

یقین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میں دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ جو کہ اس سے اگلا درجہ ہے۔ مجھے میری آنکھوں سے مشاہدہ کرانے کے مرنے کے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔

چار پرندے

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى نَفَرًا فَاخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ چار پرندے پکڑ لو۔
فَصِرْ هَٰذَا لَيْكَ اَنكُومَانُوسُ کر لو۔ اپنی طرف مائل کر لو۔ بعض اُسے ص کی زیر کے ساتھ
فَصِرْ هَٰذَا پڑھتے ہیں۔ صَارَ يَصِيرُ کا معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ
سے معنی یہ ہوگا۔ کہ چار پرندے لو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ بہر حال یہ لفظ دونوں
معنوں میں آتا ہے۔ اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ یا ذبح کر کے بوٹی بوٹی کر دو۔ بعض مفسرین
کہتے ہیں کہ پرندوں کو محض مانوس کیا گیا تھا، ذبح نہیں کیا گیا تھا۔ مگر یہ تفسیر مردود ہے
اصل بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پر اُتار
دیے اور ان کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دیا۔ خلط ملط کر دیا۔ جیسے
گوشت کا قیمہ کیا جاتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ چار جانور کون کون سے تھے۔ قرآن پاک میں تو اسکی
تفصیل نہیں ہے۔ البتہ تفسیروں میں آتا ہے۔ کہ یہ چار جانور، مرغ، کوا، کبوتر،
اور مور تھے۔ اور ان پرندوں کا انتخاب اس وجہ سے تھا۔ کہ ان میں کوئی نہ کوئی انسانی
صفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مرغ میں شہوت کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اور یہی چیز انسان
میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی وجہ سے بڑے ہنگامے، جنگیں اور پھرتیا ہی ہوتی ہے
کوئے میں حرص کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض انسان بھی حرص و ہوا میں بہت
آگے ہوتے ہیں۔ کبوتر میں دنیا کی محبت بیکرد ہوتی ہے اور بعض دنیا دار انسان بھی اسی
مرض میں مبتلا ہوتے تھے۔ چوتھا جانور مور ہے۔ اس میں تکبر کی فراوانی ہوتی ہے
جب خوش ہوتا ہے۔ تو ناچنے لگتا ہے۔ اور اپنے خوبصورت پر پھیلا دیتا ہے۔
اُسے اپنے حسن و جمال پر بڑا فخر ہوتا ہے۔ مگر جب اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے
تو شرمسار ہو جاتا ہے۔ اور پر گرا دیتا ہے۔ یہی حال حضرت انسان کا بھی ہے ذرا آسودگی
ملتی ہے۔ تو غرور و تکبر کرتا ہے۔ بات بات پر اکڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ

کی پختہ آتی ہے۔ تو ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے کوئے کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے وہ بھی کھانے کا بڑا لالچی ہوتا ہے۔ جب کہ اکثر انسان بھی کھانے پینے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ انسان میں پائے جانے والے ان چار اوصاف یعنی حرص، شہوت، حب دنیا اور تکبر کے علاوہ ہر انسان کے بعض اپنے اپنے خواص بھی ہیں۔ جن میں خون، سودا، بلغم اور صفر شامل ہیں۔ بہر حال ان چار اوصاف والے پرندوں کے انتخاب سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان کو ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان بھی اگر ان اوصاف قبیحہ کو کچل ڈالے، تو محال تک پہنچ جائے گا۔ جب تک یہ گندے اوصاف انسان میں موجود رہیں۔ وہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

بہر حال قرآن پاک یا حضور علیہ السلام نے ان پرندوں کی تفصیل نہیں بتائی۔ اس قسم کی باتیں تفسیری روایات میں آتی ہیں۔ اس قسم کی حکمت کی باتیں مفسرین کرام سمجھا دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چاروں پرندوں کو ذبح کیا۔ ان کے پر علیحدہ کر دیے۔ پھر ان کے گوشت کا قیمہ کر کے آپس میں ملا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً پھر ہر پہاڑ پر اُس ملے جلے گوشت کا ایک جزو رکھ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم کیا۔ اُس قیمہ کے چار حصے کیے اور چار مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے۔

پھر ارشاد ہوا۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ پھر انہیں بلاؤ تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے باری باری ہر ایک پرندے کا نام لے کر بلایا۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ يَا قَيْنِكَ سَعِيًّا تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ نے مرغ کو آواز دی تو فضا میں اس کی ہڈیاں نمودار ہوئیں۔ پھر اس کے گوشت کا جو جو حصہ جس جس پہاڑ پر تھا وہاں سے فوراً آیا اور ہڈیوں پر چڑھ گیا۔ پھر مرغ کے پر اکڑ لگ گئے اور مکمل مرغ بن کر زندہ ہو گیا۔ اس طرح دوسرے پرندے بھی زندہ سلامت ہو گئے۔ جس طرح عزیز علیہ السلام کے گدھے کی ہڈیاں اکٹھی ہوئیں ان پر گوشت چڑھا۔ اور پھر وہ مکمل گدھا بن کر آواز دینے لگا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام

پرندوں کی
موت و حیات

کی نظروں کے سامنے ذبح شدہ پرندے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ وہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ یہ جواب تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا ”رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ“ کہ مولا کریم! مجھے مشاہدہ کرائے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

کمال قدرت
کا مشاہدہ

زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک نمونہ ہے اس قسم کے پیشہ مشاہدات انسان اپنی روزمرہ زندگی میں کرتا ہے۔ انسان کی آنکھوں کے سامنے زمین بالکل خشک ہو جاتی ہے۔ کوئی سبزہ نہیں ہوتا۔ پھر بارش ہوتی ہے۔ تو پھر سرسبز ہو جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ ”يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ فرمایا ”كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ“ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا یہ کوئی عجوبہ نہیں جس کا انکار کر دیا جائے۔ اس قسم کی چیزیں تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ہر موسم کی اپنی بہار ہوتی ہے۔ کبھی درخت اور نباتات اپنے جوبن پہ ہوتے ہیں۔ پھر خزاں کا موسم آتا ہے۔ تو درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ اور درخت ٹنڈل ہو جاتے ہیں۔ پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو نئے شکوفے پھوٹتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ ان میں پھل لگتے ہیں۔ پکتے ہیں اور پھر لوگ انہیں اتار لیتے ہیں۔ یہی حال سبزیوں اور فصلوں کا ہے جب موسم آتا ہے۔ تو کسان زمین کو پانی دیتا ہے۔ یا آسمان سے بارش برستی ہے۔ پھر زمین میں ہل چلایا جاتا ہے بیج بویا جاتا ہے۔ پھر فصل اور سبزیاں اُگتی ہیں۔ اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں۔ تو انہیں کاٹ لیا جاتا ہے۔ اور زمین پھر ایک دفعہ میدان ہو جاتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک مردہ کے زندہ ہونے کا واقعہ گنہ چکا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ گائے ذبح کرو۔ اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مردہ کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے گا۔ وہاں یہ بھی یہی الفاظ آئے تھے ”كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ“ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی

آنکھوں کے سامنے ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے جب اس کا حکم ہوگا۔ قیامت برپا ہوگی۔ تو تمام مردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ فرمایا وَاعْلَمُوا اور جان لو، خوب اچھی طرح سمجھ لو، أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ جس طرح چاہے کرے، اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ حکم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ کمال درجہ کی حکمت کا مالک ہے عزیز کا معنی عزت دینے والا بھی ہوتا ہے یہ خدا کی صفت ہے۔ وہ عزت کا مالک بھی ہے۔

معجزہ کرامت

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے تین واقعات آچکے ہیں۔ خصوصاً بعث بعد الموت کے متعلق حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ پرندوں والا واقعہ بالکل واضح ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قسم کا جو عجوبہ ظاہر کرتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات کسی امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو وہ کرامت کہلاتے ہیں۔ قادری سلسلہ کے بزرگوں میں سے یہاں پنجاب میں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے ان کے لیے ثابت ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کیا تھا۔ لکھنؤ میں ایک مردہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ لوگوں نے یہ کرامت بھی دیکھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چچا کے سامنے بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے بھی مردہ کو زندہ کیا تھا الغرض اس قسم کے واقعات کرامت کہلاتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا کام انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کر سکتا ہے لہذا معجزات اور کرامات کے جو سچے واقعات ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ مگر بلا تحقیق ہر بے سرو پا کو کرامت تسلیم کرنا درست نہیں

ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر بہت سی کمالات ظاہر ہوئیں جن کا ثبوت ملتا ہے مگر بارہ سال تک کشتی ڈوبنے والے واقعہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ لہذا یہ قابل تسلیم ہرگز نہیں۔

معجزہ اور کرامت کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جسے استدراج کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کافر کے ہاتھ بھی کوئی عجوبہ ظاہر کر دے مگر یہ عزت والی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ امتحان ہوتا ہے، جس طرح حدیث شریف میں موجود ہے کہ دجال مُردوں کو زندہ کرے گا۔ یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوگا۔

توحید بارہی تعالیٰ اور معاد کے متعلق تین واقعات بیان کرنے کے بعد دئے سخن پھر اتفاق فی سبیل اللہ کی طرف جاتا ہے اگلی آیات کا تعلق پھر اُسی پہلی آیت ”انْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ“ کے ساتھ ہے۔ لہذا اگلے رکوع کا موضوع پھر وہی ہے چلیگا، جہاں کچھ بلا بیان ختم ہوا تھا۔ درمیان میں اس کی تائید کے لیے تین واقعات کا ذکر آگیا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد پانزدہ (۱۱۵)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۶۱ تا ۲۶۳

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ
 حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ
 حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ
 عَلِيمٌ ۚ (۲۶۱) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ
 لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَأْوَلاً وَلَا أَدَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
 رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ (۲۶۲) قَوْلٌ
 مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذَىٰ
 وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۚ (۲۶۳)

ترجمہ: اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔
 اُس دانے جیسی ہے۔ جس نے سات بالیوں کو اُگایا۔ ہر بالی میں سو دانے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ
 دگنا کرتا ہے (بڑھاتا ہے) جس کے لیے چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے اور
 سب کچھ جاننے والا ہے (۲۶۱) جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے
 ہیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے احسان جلانا اور تکلیف دینا نہیں لگاتے
 ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور اُن پر کوئی خوف نہیں
 ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۲۶۲) دستور کے مطابق بات اور درگزر کرنا اُس صدقہ
 سے بہتر ہے۔ جس کے پیچھے تکلیف (ستانا) ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور

بردار ہے (۲۶۳)

رابط آیات
 اتفاق فی سبیل اللہ

آیت النکاح میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان تھا، جو دین کا اصل الاصول اور بنیاد ہے
 اس آیت میں اللہ کی صفات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ گذشتہ رکوع کی تین آیات میں تین

اجر و ثواب
کے درجات

فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَا شَلِ حَبَّةُ اللَّهِ فِي رَأْسِ خَمْرٍ كَمَا نَعَى وَالْوَلَدِ كَمَا
 مَالِ كَمَا مَالِ أَسْ وَنَعَى جَيْسِي هَذَا أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ جَوَارَاتٍ نَخْمَشْ
 الْكَاتِبِ هَذَا فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ أَوْ مِائَةُ خَمْرٍ فِي سَوْدَانِ سَبْعِي

ہوتے ہیں۔ جس طرح زرخیز زمین میں ایک دانہ بویا جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال اور آبیاری کی جائے تو اس سے سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والے ایک پیسہ کا اجر و ثواب سات سو گناہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں ہر نیکی کے اجر و ثواب کے کئی معیار ہیں جن کا ذکر آتا ہے سورۃ النعام میں آتا ہے۔ "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا" ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہے جب کہ حدیث میں سات سو گنا تک بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نیکی کے کام میں جس قدر اخلاص پایا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق اس نیکی کا اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تاہم سورۃ النعام کی آیت پاک کے مطابق ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔ اس کے بعد جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا۔ ثواب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاص پر سات سو گنا تک اجر حاصل ہو گا۔ تاہم مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ جس کے ساتھ دین کی اقامت اور اشاعت والبتہ ہے، اس سلسلہ میں کی گئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی نیکی کا ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے اور پھر جس قدر خلوص بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر اجر و ثواب بھی بڑھتا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک اونٹنی پیش کی جس کو ہمارے لگے ہوئی ٹھٹی اور اس پر کجاوہ کسا ہوا تھا آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا، تم نے بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن ایسی کسے ہوئے کجاوے والی سات سو اونٹنیاں عنایت کرے گا۔ گویا جہاد میں خرچ کیے جانے والے مال کا کم از کم اجر سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ دین کی عزت اور بقا جہاد کی حربہ ہے۔ اور اعلیٰ مرتبے کی کوئی انتہا نہیں ہے اللہ تعالیٰ جتنا چاہے۔ بڑھا چڑھا کر دے دے وہ مالک ہے۔ اسی لیے فرمایا واللہ ۛ یضوئ لمن یشاء اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہے واللہ ۛ واسع علیہ اللہ تعالیٰ بڑی رحمت والا ہے اور سب کچھ جاننے والا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے قدر کی فضیلت کے متعلق دو باتیں بیان فرمادیں پہلی یہ

کہ عام نیکی کا بدلہ دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کا کم از کم اجر سات سو گناہ اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

معیار قبولیت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی قبولیت کا ایک معیار مقرر کیا ہے۔ اور وہ ہے کہ صدقہ محض رضا الہی کے لیے ہو۔ اور وصول کنندہ کو نہ تو احسان جتلا یا جائے۔ اور نہ اُسے صدقہ کے بدلے اذیت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ثُمَّ لَا يُتَّبَعُونَ مِمَّا انْفَقَوْا مَتًّا وَلَا آذًى پھر اُس خرچ کرنے کے پیچھے احسان اور اذیت نہیں لگاتے یعنی وہ کوئی چیز دے کر مستحق کو نہ احسان جتلاتے ہیں۔ کہ میں نے تیری فلاں وقت حاجت پوری کی اور نہ اسکو اذیت پہنچاتے ہیں یعنی سلتے نہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو صدقہ دیا۔ اور پھر اُسے بار بار یاد دلاتے رہے۔ یاد دہندوں کے سامنے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کہ میں نے فلاں آدمی کو زکوٰۃ و خیرات دی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس محتاج کو کوئی چیز عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں اس سے بیگاہ لی جائے۔ جو ظاہر ہے کہ اُسے تنگ کرنے اور ستانے کے مترادف ہوگا۔ کسی کو دھکا دیدیا جائے۔ پٹائی کر دی جائے، گالی نکالی جائے یا طعن و ملامت کی جائے۔ یہ سب ایذا رسانی کی باتیں ہیں۔ فرمایا وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد ایسی بری حرکت سے باز رہتے ہیں۔ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے ہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔ جو انہیں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ایسے لوگوں کو نہ اس دنیا میں کوئی خوف ہوگا۔ اور نہ وہ اگلے جہاں میں غمگین ہوں گے۔ بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو مقامات سے نور جائیں گے اور وہ کامیاب و کامران ہوں گے۔

برخلاف اس کے اگر کسی شخص نے کسی محتاج کی مالی اعانت بھی کی۔ اور اس کو احسان جتلا یا اذیت پہنچائی۔ تو اس کا صدقہ باطل ہوگا۔ اور اس کے بدلے میں

کوئی اجر و ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عتاب کا مستحق ہو جائیگا۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والے شخص کی طرف نظر شفقت سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پاک بھی نہیں فرمائے گا۔ بلکہ ان کے لیے عذاب الیم تیار ہوگا۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنا تہ بند یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔ اس کی طرف نظر شفقت سے نہیں دیکھیگا۔ اور وہ جہنم میں جائیگا۔ حدیث کے الفاظ میں اسفل من الکعبین نفی النار بھی آیا ہے۔ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لٹکانا مکروہ تحریمی اور قابل مؤخذہ ہے۔ بہر حال صدقہ کے متعلق دو چیزوں کی سخت وعید فرمائی۔ کہ صدقہ دینے والا نہ تو احسان جتلائے اور نہ تکلیف دے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو نہ صرف اس کا صدقہ باطل ہو جائے گا۔ بلکہ خود معطلی گنہگار ہوگا۔ اور عذاب کا مستحق ٹھہریگا۔

بعض اوقات سائل لجاجت کرتا ہے۔ منت سماجت کرتا ہے۔ اور اپنے سوال پر اصرار کرتا ہے۔ اس صورت میں فرمایا قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ دستور کے مطابق نرم جواب دینا وَمَغْفِرَةٌ اور درگزر کرنا، اس کے اصرار پر بدزبانی سے پرہیز کرنا حِينَ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبُعُهَا أَذًى اس صدقہ سے بہتر ہے۔ جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے مطلب یہ کہ سائل کے بعد ہونے پر اُسے نرمی کے ساتھ جواب دے دیا جائے تو بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ اُسے کچھ دے بھی دیا جائے۔ اور ساتھ طعن تشنیع اور گالی بھی دے دی جائے۔ یا اُسے دھکے دیکھ نکال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے صدقہ باطل ہو جائے گا۔ لہذا ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے وقت یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے صدقہ و خیرات کی ضرورت ہے۔ نہیں، بلکہ وَاللَّهُ غَنِيٌّ اللہ تعالیٰ تو ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے۔ صدقہ دینے سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اسے تقرب الی اللہ حاصل ہوگا۔ اس کا نفس پاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے۔ بڑا بردبار ہے۔ اکثر اوقات مجرموں کو مہلت دیتا ہے۔ بہت سے

لوگ اللہ کی اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بڑے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔
 مگر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وقت مقرر پر گہرے وقت بھی کر لیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ
وَالْأَذَىٰ ۚ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَتُكَلِّمُ كَكَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ
عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦٤﴾
وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ ۖ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا
وَابِلٌ فَاتَتْ أَكْثُهَا ضَعْفَيْنِ ۚ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطُلَّ ۗ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾ أَيَوَّدُ أَحَدُكُمْ أَنَّ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ
مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ إِنَّ فِيهَا
مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۚ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

۲۶۶

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ احسان جتلا کر اور تکلیف

دے کر۔ اُس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ

اور قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتا۔ پس اُس شخص کی مثال (یعنی اس کے خرچ کردہ)

صاف چٹان یا پتھر کی ہے، جس پر مٹی ہو پس پہنچے اس کو موسلا دھار بارش

اور چھوڑ دے۔ اس کو بالکل خالی اور صاف۔ یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں

ہوں گے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کفر کرنے والی قوم کی رہنمائی نہیں کرتا۔ (۲۶۴) اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے، اور اپنے دلوں کی پختگی کے لیے، ان کی مثال اس باغ جیسی ہے۔ جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ اس کو موسلا دھار بارش پہنچے، پس وہ اپنا پھل دگنا دے۔ پس اگر زوردار بارش نہ پہنچے تو ہلکی بارش بھی اس کے لیے کارآمد ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھتا ہے۔ جو کام تم کرتے ہو (۲۶۵) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ اس کے سامنے نہریں بہتی ہوں۔ اور اس شخص کے لیے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور اس شخص کو بڑھاپا آپہنچے اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ پس اس باغ کو بگولہ پہنچے جس کے اندر آگ ہو اور وہ اس باغ کو جلا ڈالے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ واضح طور پر اپنی آیات بیان فرماتا ہے۔ تاکہ تم غور و فکر کرو (۲۶۶)

ابطال صدقہ کے متعلق دو وجوہات کا ذکر گذشتہ درس میں بھی آچکا ہے۔ آج کے درس میں ان کا تذکرہ دوبارہ آرہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ اے اہل ایمان! اپنے صدقات و خیرات کو احسانِ جلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو۔ یہی دو چیزیں پہلے بھی بیان ہوئی ہیں وہاں فرمایا تھا ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَّا أَذَىٰ لگایا دونوں مقامات پر احسان اور اذیت کو ابطال صدقہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف صدقہ بے مقصد ہو جاتا ہے۔ بلکہ انسان گنہگار ہو کہ عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ گویا یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اتفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے خرچ کرنے کا نام ہے۔ یہ دو باتیں آگئیں۔

ابطال صدقہ
کی پہلی وجہ

ابطال صدقہ کی تیسری وجہ متعلق فرمایا كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ جو شخص لوگوں کے دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اس کا صدقہ بھی اس طرح باطل ہو جاتا ہے۔ جس طرح احسانِ جلا کر اور اذیت پہنچا کر

تیسری وجہ
ریاکاری

ضائع ہوتا ہے۔ ریاکار نہ صرف اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے بلکہ الٹا گناہ گار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُس نے اللہ کی رضا کے لیے خرچ نہیں کیا۔ بلکہ شہرت اور نیک نامی کی خاطر کیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار کو فرمائے گا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس کوئی اجر نہیں۔ تم ایسے صدقہ کا اجر ان سے لو۔ جن کی خوشنودی کی خاطر صدقہ کیا تھا۔ کیونکہ انا اغنی الشوکاء میں شریحوں سے پاک ہوں میرا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی لیے ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں ریا ہلکی قسم کا شرک شمار ہوتا ہے۔

فرمایا ایک تو ایسا شخص دکھائے کہ اس کے لیے خرچ کرتا ہے اور دوسرے وَلَدٌ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ اگر اُسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور بعث بعد الموت کا یقین ہوتا۔ تو پھر دوسروں کو دکھائے کہ اس کے لیے نیکی کا کام نہ کرتا محض رضا الہی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا۔

چٹان کی مثال

فرمایا وَمَثَلٌ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ رِیَاکَارِ کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر مٹی پڑی ہو۔ اور بظاہر یہ نظر آئے کہ اگر اس مٹی میں بیج بویا جائے تو فصل اُگ آئے گی۔ مگر حقیقت میں وہ مٹی نہیں ہوتی بلکہ سخت اور صاف چٹان پر مٹی کی تہ جمی ہوتی ہے۔ فَاصَابَهُ وَابِلٌ جب اُس پر زور کا مینہ برسا، تیز بارش ہوئی فَتَرَكَهُ صَلْدًا تو مٹی نہ گئی اور صاف چٹان باقی رہ گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح چٹان پر بونے گئے بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریاکاری میں خرچ کیے گئے مال کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔ جو بھی صدقہ احسان جلائے، ایذا پہنچانے یا ریاکاری کے لیے دیا جائے گا وہ باطل ہو جائے گا فَرَمٰی لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْکُمْ شَیْءًا مِّمَّا کَسَبْتُمْ اِیَّہِ لَوْ کُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہونگے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یعنی جو صدقہ و خیرات کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ریاکاری کا عنصر شامل ہے لہذا انہیں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

کافر راہنمائی
سے محروم ہیں

فرمایا **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ** اللہ تعالیٰ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ جو لوگ بظاہر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ دھڑا دھڑا مال خرچ کر رہے ہیں۔ مگر نیت میں خرابی ہے۔ کوئی احسان مبتلا رہا ہے۔ کوئی ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور کوئی محض ذاتی شہرت کی خاطر خرچ کر رہا ہے۔ تو ایسے لوگ ہمیشہ غلط راستے پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہِ راست کی طرف راہنمائی نہیں فرمائیں گے۔ یہ ان کے لیے سزا کے طور پر ہے۔ ورنہ اگر ان میں ذرہ بھی نیک نیتی موجود ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف فرمائے۔ مگر جب تک یہ لوگ اپنی بُری حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ کھڑا شرک اور فسق و فجور پر نادم ہو کر اس کو ترک نہیں کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے خود صراطِ مستقیم کی راہنمائی طلب نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب نہیں کرے گا۔

رضا الہی کے
لیے خرچ

ریا کاری کے طور پر خرچ کرنے کی وضاحت کے بعد اب تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ** اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رضا الہی کا حصول بہت بڑی نعمت ہے۔ جس سے اللہ راضی ہو گیا۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا، تو فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں **وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ** اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ ان کا مقصد اصلاحِ نفس بھی ہوتا ہے۔ تاکہ دلِ انفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے۔ اور ان کے دلوں سے بخل کا مادہ دور ہو کہ ان میں فیاضی کا مادہ پیدا ہو جائے۔ فرمایا ایسے لوگوں کی مثال **كَمَثَلِ جَنَّةٍ اَوْ بَوْبَةٍ** اُس باغ جیسی ہے۔ جو اونچی جگہ پر واقع ہو **اَصَابَهَا وَابِلٌ** جب اس باغ پر زوردار بارش ہو، **فَاَنْتَ اُكْلًا ضَعْفَيْنِ** تو وہ دگنا پھل دے۔ **فَاِنْ لَّمْ**

يُصِبُّهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ اور اگر تیز بارش نہ ہو تو اس کے لیے معمولی بارش جیسے اوس، بھی کافی ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یہاں پر تیز بارش سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص فیاضی کا خوب مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں کھل کر خرچ کرتا ہے۔ تو اس مثال کے مطابق وہ کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اور معمولی بارش یعنی کھوڑی مقدار میں خرچ کرتا ہے۔ تو اس کی کامیابی کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو، احسان، ایذا اور ریاکاری سے پاک ہو۔ نیت بمنزلہ زمین کے ہے۔ اگر زمین زرخیز ہے یعنی نیت درست ہے۔ تو کھوڑا خرچ کرنا بھی اس کے لیے مفید ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ اَخْلَصُ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو، تو کھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ لہذا انہی کے ہر کام میں رضا الہی ہمیشہ پیش نظر ہونی چاہیے، قبولیت کا یہی معیار ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ تمہارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اخلاص کے درجے کو جانتا ہے۔ اُس سے کوئی چیز اور جھل نہیں لہذا ہر کام کرتے وقت اپنی نیت کو درست کر لو۔

باغ کی مثال

کسی متوقع نعمت کے ضائع ہو جانے پر کس قدر پریشانی ہوتی ہے۔ اسکی وضاحت چٹان والی مثال میں ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس قسم کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں۔ جس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت پر ہی انسان کا انحصار ہو۔ اور وہ ضائع ہو جائے تو انسان کو کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ اور اس کی امیدوں پر کس طرح پانی پھر جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نیکی کا کام کرنے کے باوجود بعض وجوہ کی بنا پر اس کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ تَحْيِيلٍ وَاعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ کیا تم میں سے کوئی شخص

یہ بات پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ جس کے سامنے
نہیں بہتی ہوں لَہُ فِیْہَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ اس باغ میں ہر قسم کے پھل موجود ہوں
وَاصَابُهُ الْکِبَرُ اور باغ کا مالک بڑھاپے کی عمر میں ہو۔ وَلَہُ ذُرِّیَّةٌ ضَعْفَاءٌ
 اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ یعنی ان کے لیے کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہ ہو۔ تو ایسی صورت
 میں فَاصَابَهَا عَصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ باغ کسی بجولے کی لپیٹ
 میں آجائے جس کے اندر آگ ہو جو باغ کو جلا کر خاک کر ڈالے۔ تو ذرا اندازہ کیجئے، ایسی
 صورت میں اس باغ کے مالک کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا ایک ہی ذریعہ معاش تھا۔
 یہ باغ ہی اس کی کل پونجی تھی۔ جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہ
 ہی جل کر خاکستر ہو گیا۔ تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

فرمایا احسان جیلانے والے، ایذا پہنچانے والے یا ریاکار ہی کے لیے خرچ کمنے
 والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا کبرنی
 کا سہارا تھا۔ اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے
 بیٹھا تھا۔ مگر جب قیامت کا دن ہو گا۔ تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہو جائے
 گا۔ جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے ثمرات سے محروم
 ہو گیا، قیامت کے دن ایسا شخص ایک محتاج اور بالکل قلاش کے طور پر پریشاں پھر
 گا، مگر اس کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز اس کے پاس نہ ہوگی۔

فرمایا كَذٰلِكَ یُنَبِّئُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِہٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے
 احکام یا نشانیاں تمہارے پاس کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم
 غور و فکر کر سکو۔ اچھی اور بُری چیزیں امتیاز کر سکو لہذا آج صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاؤ
 تاکہ کل قیامت کو پریشانی سے بچ جاؤ۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکصد ہفدہ (۱۱۷)

آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا
 أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ
 تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغِشُّوا فِيهِ ظُُلْمًا ۚ
 إِنَّ اللَّهَ غَفِيرٌ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
 وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۚ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً
 مِنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو! وہ پاک چیزیں خرچ کرو، جو تم نے کمائی ہیں۔ اور اس
 میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ تم اس
 سے خرچ کرتے ہو۔ اور خود اس سے لینے والے نہیں، سوائے اس کے کہ تم اس میں
 چشم پوشی کرو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے اور تعریفوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾
 شیطان تم کو فقر کا وعدہ دیتا ہے۔ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 تم کو اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا
 اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۸﴾

ربط آیات

صدقات کی قبولیت کے متعلق تین شرائط کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ
 کسی کو خیرات دے کر نہ تو اس پر احسان جتلا یا جائے۔ نہ اُسے تکلیف پہنچائی جائے
 اور نہ خرچ کرنے میں ریاکاری کا عنصر شامل ہو، یعنی خالص نیک نیتی کے ساتھ
 رضائے الہی مقصود ہو۔ اگر یہ چیزیں موجود ہوں گی، تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔
 اور دینے والا گنہگار ہو کر وٹا و بال میں پڑ جائے گا۔ آج کے درس میں قبولیت کی چوتھی
 شرط مال کی پاکیزگی کا بیان ہے۔

قبولیت کی
جو محقق شرط
پاکیزگی مال

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ
اے ایمان والو! خرچ کرو پاک اور سٹھری چیزیں جو تم نے کمائی ہیں۔ گویا قبولیت صدقہ
کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے۔ کہ صاف سٹھری اور بہتر چیز اللہ کے راستے میں دی
جائے۔ مفسرین کہہ ام نے طیبات کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے
کہ جو مال فی سبیل اللہ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال ہو۔ جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا
ہو۔ حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابل قبول نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص
چوری، ڈاکہ یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہِ ایزدی میں کیسے قبول ہو
گا۔ بلکہ ایسا کرنے سے انسان الٹا گنہگار ہوگا۔ سند احمد کی روایت میں ہے کہ
جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے گا یا لباس پہنے گا۔ نہ اُس کی عبادت قبول ہوگی
اور نہ اُس کا صدقہ خیرات قبول ہوگا۔ اور اگر ایسا شخص مر گیا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا
تو وہی مال اس کے لیے جہنم کا زورہ ہوگا۔ بعض چیزیں تو شرعاً قطعاً حرام ہیں اور
بعض مشتبہ ہوتی ہیں۔ مشتبہ مال کی خیرات بھی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ واضح
حکم موجود ہے۔ "كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا" یعنی حلال اور پاکیزہ
چیزیں کھاؤ۔ حرام سے پرہیز کرو۔

طیب کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز بھی صدقہ میں دی جا رہی ہے۔ وہ اعلیٰ
اور بہتر ہو۔ نہ کہ نجی اور ردی چیز۔ ایسا نہیں ہوتا چاہیے کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ
لی جائے اور کم تر چیز زکوٰۃ و صدقات میں دی جائے۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ حدیث
شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کچھ رکے اچھے گچھے اپنے واسطے
محفوظ کر لیتے ہیں اور کمتر گچھے اصحاب صفہ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ایسی تقسیم سے منع فرمایا ہے۔ جب تم خود ردی چیز کو پسند نہیں کرتے تو
اللہ تعالیٰ اُسے کیسے پسند کرے گا۔ لہذا زکوٰۃ و صدقات میں بہتر چیز دینی چاہیے۔

فرمایا، اے اہل ایمان! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو مَا كَسَبْتُمْ
جو تم نے کمائی ہیں۔ اب کمائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے کمائی کا اولین

ذاتی کمائی
میں سے خرچ

ذریعہ انسان کی ذاتی محنت و مشقت ہے۔ کوئی تجارت کرتا ہے۔ دکاندار ہے۔ ملازم ہے۔ کارخانہ دار ہے۔

یا مزدور ہے۔ یہ سب ذاتی آمدن کے ذرائع ہیں آمدن کے بعض دوسرے ذرائع خطرناک
 ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کی ذاتی مشقت کا دخل نہیں ہوتا، مثلاً کہیں سے ہدیہ مل گیا،
 وصیت کے ذریعے کوئی چیز حاصل ہوگی یا اسے وراثت سے حصہ مل گیا۔ ان ذرائع حاصل
 مال بھی انسان کی ملکیت ہوتا ہے۔ تو پاکیزہ چیزیں خرچ کرنے کا قانون ان تمام ذرائع
 سے حاصل شدہ آمدنی پر ہوگا۔ لہذا حکم ہوا ہے کہ تم جس حلال مال سے بھی خرچ کرنا
 چاہو، اچھی اور بہتر چیز دو۔ اللہ کے راستے میں کم تر چیز دینے کی کوشش نہ کرو۔
 پہلے گزر چکا ہے۔ "الْفُقُوَامَازَاقُكُم" اس میں سے خرچ کرو، جو ہم
 نے تمہیں دیا ہے۔ جب سائے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ تو پھر اسی کے
 نام پر اچھی سے اچھی چیز دینی چاہیے۔ نہ کہ گھٹیا چیز۔ کیونکہ دینے والا تو وہ خود ہی ہے
 براہ راست خود محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا زرعی پیداوار میں ہر قسم کا غلہ مثلاً گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ اور دالیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل اور سبزیاں بھی زرعی پیداوار ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ تو سب سے پہلے جو کچھ فرض ہے، وہ ادا ہونا چاہیے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مد کے دو حصے ہیں۔ بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خود رو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں

نہرعی پیداوار
میں سے خراج

ہے۔ یہ معاف ہیں اگر یہ چیزیں خود کاشت کی جائیں۔ چائے کے لیے گھاس وغیرہ خود بولی جاتے، لکڑی کے لیے درخت لگائیں یا کانے کی کاشت کی جائے، تو پھر ان پر عشر ادا کرنا ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی فتویٰ ہے۔ عشر کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو لازمی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزید خرچ کرے گا۔ تو وہ نوافل میں شمار ہوگا۔ اور موجب اجر و ثواب ہوگا۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث ہے۔
لَيْسَ فِي الْخَضِرَوَاتِ صَدَقَةٌ یعنی سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی زرعی پیداوار ہے۔ اور زمین ہی سے نکلتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ سبزیوں پر عشر بالکل معاف ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سبزیوں کا عشر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی ضرورت نہیں مالک خود اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ سبزیاں جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے سرکاری انتظام میں پہنچتے پہنچتے اور پھر تقسیم ہونے تک اس کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سبزی عشر یعنی دسواں یا بیسواں حصہ مالک کو خود تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر سبزی کے دس گھٹے حاصل ہوئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک اللہ کی راہ میں دے دے۔ یا اگر زمین چاہی یا نہری ہے۔ تو بیس گھٹوں میں سے ایک ادا کر دے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی مسلک قرآن و سنت سے موافقت رکھتا ہے۔

زرعی پیداوار کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے۔ کہ دوسو درہم سے کم مالیت کی زرعی پیداوار پر عشر نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث سے ثابت ہے کہ پانچ وسق سے کم اناج پر عشر نہیں۔ اور پانچ وسق دوسو درہم کا بنتا ہے۔ مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ حدیث تجارتی مال سے متعلق ہے۔ جس شخص کے پاس تجارت کی غرض سے پانچ وسق سے کم اناج ہے وہ زکوٰۃ نہ دے کیونکہ یہ نصاب کو نہیں پہنچتا۔ البتہ زرعی پیداوار کے متعلق فرماتے

ہیں۔ کہ زرعی پیداوار قلیل ہو یا کثیر اس پر عشر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق حدیث میں واضح الفاظ آئے ہیں۔ زمین کے مالک کو زرعی پیداوار کی کم سے کم مقدار پر بھی عشر ادا کرنا ہوگا۔ البتہ یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ عشر کون ادا کرے، مالک اراضی یا کاشتکار یا دونوں۔ بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عشر کی ادائیگی کاشتکار پر لازم آتی ہے۔ مالک اراضی پر نہیں۔ تاہم راجح قول یہ ہے۔ کہ عشر کی ادائیگی کے حصہ رسد ہی دونوں ذمہ دار ہیں۔ انہیں چاہیے کہ کل پیداوار سے پہلے عشر نکالیں اور باقی اناج وغیرہ آپس میں تقسیم کریں۔

زمین کی پیداوار کا ایک اور ذریعہ معدنیات ہیں۔ عام زمین میں اور پہاڑوں میں کانیں پائی جاتی ہیں جن سے تانبہ، نمک، کوئلہ، لوہا، ہونا، چاندی، تیل وغیرہ نکلتے ہیں ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ خمس یعنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ ہے۔ چونکہ ان اشیاء کی پیداوار کے لیے عموماً محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ بیج نہ پانی نہ نسلانی وغیرہ اس لیے اس کی کل آمدنی کا پانچواں یعنی بیس فیصد ادا کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایک مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کہ ان کانوں کا مالک کون ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ کہ کانوں کا مالک وہ شخص ہے جس کی اراضی سے معدنیات برآمد ہو، لہذا خمس بھی وہی ادا کرے گا۔ اگر یہ معدنیات کسی عام جنگل، صحرا یا سمندر سے نکلیں تو ان کی مالک حکومت ہوگی البتہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ کان خواہ کیس بھی نکلے، اس کی مالک حکومت ہے۔ امام مالک صاحبؒ انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

بہر حال فرمایا کہ اگر کھائی تمہاری ذاتی محنت و مشقت کی ہے۔ تو پھر اس میں سے حلال اور طیب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو زمین کی پیداوار ہے اس میں سے بھی اچھی چیز خرچ کرو، وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ اور ردی یا کم تر چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ خبیث سے مراد ردی یا گھصیا چیز ہے۔ اور اس کا اطلاق ناپاک چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں صاف

معدنیات میں سے خرچ

خبیث مال قابل قبول نہیں

تھری چیز دینی چاہیے۔ کیونکہ وَلَسْتُمْ بِالْأَخْذِ يَدُهُ گھٹیا چیز جب تم خود لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی چیز کیوں دیتے ہو۔ گھٹیا چیز قبول کرنے کی ایک صورت ہے کہ إِلَّا أَنْ تَصِفُ صُورًا فِيهِ تم خود چشم پوشی کر لو۔ مگر یہ تم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لہذا اللہ کی راہ میں بھی اچھی سے اچھی خرچ کرو۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ تم ہر گز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اچھی، صاف تھری اور بہتر چیز ہی پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہذا بہتر چیز ہی فی سبیل اللہ بھی ادا کرو۔

پاکیزہ چیز کے سلسلہ میں تہذیبی شرافت کی حدیث ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طَهْوٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُولٍ یعنی طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔ اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا۔ لہذا جس مال کی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ دی جا رہی ہے اس کا حلال اور طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ وَعَلَّمُوا اَچھے طریقے سے جان لو۔ أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ کہ اللہ تعالیٰ بے پروا اور بے نیاز ہے۔ اس کو تمہارے صدقات و خیرات کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے تاکہ تم اس سے آخرت میں مستفید ہو سکو۔ یہ دنیا میں قوم کے غرباء و مساکین کی اعانت کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز تمہارے اپنے اخلاق بھی اس کی وجہ سے برکات والی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حمید یعنی تمام خوبیوں کا مالک خود ہے تم اچھا کام کرو یا بُرا کرو۔ وہ بے نیاز ہے۔ تمہارے اچھے اعمال نہ اس کی خدائی میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ

تمہارے بُرے اعمال اسکی خدائی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اس کا شکریہ ادا کرو، کہ اس نے تمہیں انعام سے نوازا ہے۔

شیطان کا
بہکاوا

فرمایا، دیکھنا اس محلے میں شیطان کے بہکاوے میں نہ آجانا۔ شیطان کی یہ ہمیشہ
کوشش ہوتی ہے کہ وہ طرح طرح کے وسوسے ڈال کر انسان کو نیک عمل سے روکنے
کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اتفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں الشیطان یعد کھو الفقد
شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شیطان انسان پر اس طرح
حملہ آور ہوتا ہے کہ اگر مال تھوڑا ہے۔ تو وہ بہکاتا ہے کہ اگر یہ مال صدقات میں دیدیا
تو پھر تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ تم مفلس ہو کر دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے۔
جب اس قسم کا خیال آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطان دوسوسہ ہے۔ اگر مال
قلیل بھی ہے۔ تو اس میں سے کچھ نہ کچھ دے دو، اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت دیگا۔
فرمایا وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ اِگر خرچ کر دو گے تو اللہ تعالیٰ
اس کی جگہ کسی دوسرے مال سے دیگا۔ لہذا بخل نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ فراخ دلی کا
مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو وافر مال دیا ہے۔ تو پھر شیطان دوسرے طریقے
سے حملہ کرتا ہے وَيَا مُرْكُ بِالْفَحْشَاءِ وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا
ہے مطلب یہ ہے کہ مالدار آدمی کو فحاشی کے کاموں کی طرف لگا دیتا ہے کہ
فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس بہت مال ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔
دنیا میں بار بار نہیں آنا۔ لہذا کھا پیو، عیش کرو۔ یا پھر اس کا مال کھیل تماشے اور فضول
رسم و رواج پر خرچ کرتا ہے کہیں دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ سالگرہ
منائی جا رہی ہے۔ باجے بجائے جاتے ہیں۔ چراغاں کیا جا رہا ہے۔ کہیں عرس
منائے جاتے ہیں۔ اور لاکھوں روپیہ ان فضول رسم و رواج پر ضائع کیا جا رہا ہے
یہ سب شیطان کے بہکاوے ہیں۔

اللہ تعالیٰ
کا وعدہ

فرمایا اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے
وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت
اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق اس کے راستے میں خرچ

کرو گے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرما دیگا۔ دنیا میں بھی برکت عطا کرے گا۔ اور آخرت
 میں اپنے فضل سے جنت میں داخل کر دیگا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ لہذا شیطان کے بہکانے
 میں نہ آنا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کر کے اس کے احکام کی بجا آوری کرو۔ اور
 دائمی فلاح پا جاؤ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا ہی وسعت والا ہے۔
 اس کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں لٹاتا بلکہ انہیں گنا
 چو گنا عطا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ وہ علیم بذات الصدور بھی ہے
 تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ جس قدر اخلاص تمہارے دلوں میں موجود ہو گا
 اللہ تعالیٰ اس کے مطابق بڑھا چڑھا کر تمہیں عطا کریں گے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ

الْبُقَرَةُ ۲

درس پچھد ہشودہ (۱۱۸)

آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
 أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۖ ﴿٢٦٩﴾ وَمَا
 أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۖ ﴿٢٧٠﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عنایت فرماتا ہے اور جس کو حکمت
 دی گئی، اُسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہ
 لوگ جو عقل والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو صدقہ خیرات یا کوئی نذر مانو نذر ماننا
 تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾
 گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کی قبولیت سے متعلق چار شرائط
 کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں خیرات و خیر احسان نہ جملانا، ایذا نہ پہنچانا، ریاکاری سے اجتناب
 اور پاکیزگی مال شامل ہیں۔ باقی شرائط کا ذکر اگلے دروس میں آئے گا۔ یہاں درمیان میں
 اللہ تعالیٰ نے حکمت کی تشریح بیان کی ہے۔ اور اُسے خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے۔
 اس میں نذر ماننے کے متعلق بیان بھی ہے۔ کہ یہ کس حد تک جائز ہے۔

حکمت کا
 مفہوم

ارشاد ربانی ہے۔ يُوْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہے
 حکمت عطا کرتا ہے۔ حکمت کا مادہ احکام سے نکلا ہے، جو پختگی کے معنی میں
 استعمال ہوتا ہے۔ لہذا حکمت سے مراد وہ چیز ہے۔ جو پختہ ہو۔ اور پھر صدقہ کے ساتھ
 اس کے مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ حکمت کا عام معنی فہم اور سمجھ کیا جاتا ہے
 بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں الْعِلْمُ النَّافِعُ الْمُؤَدِّي إِلَى الْعَمَلِ یعنی حکمت
 ایسے علم کو کہا جاتا ہے، جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔
 امام مالکؒ حکمت کا معنی سنت کرتے ہیں۔ حکیم خدا تعالیٰ کی صفت بھی ہے

اور قرآن کریم کو بھی حکمت کہا گیا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی سنت مبارکہ کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سمجھ یا دانائی کی باتیں بھی حکمت میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت لقمانؑ کے نام پر قرآن پاک میں سورۃ موجود ہے۔ آپ نبی نہیں تھے، بلکہ حکیم تھے عربی میں حکیم اُس شخص کو کہتے ہیں مَنِ اتَّقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَوَّعَ لَمْ يَكُنْ حَكِيمًا اور عمل دونوں میں سچتہ ہو۔ علاج معالجہ کرنے والے کو عربی زبان میں حکیم نہیں بلکہ طبیب کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت و دانائی میں حصہ عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی سمجھ بہت بڑی حکمت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ہمیں عام مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز نہیں دی۔ اَوْفَهُمًا اَوْ تَيْكَةً رَجُلًا ہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سمجھ دے دی ہو، تو اُس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ اور خاص طور پر پورے دین کا فہم اور سمجھ حکمت ہے ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق کو دو چیزوں سے محروم رکھا ہے، ایک اچھا اخلاق اور دوسرے دین کی سمجھ۔ بخاری شریف کی روایت میں حضور کا فرمان ہے مَنْ يُسْرِدِ اللّٰهُ بِلَهِّ خَيْرًا يُفْقَهُهُ فِي الدِّينِ اللّٰهُ تَعَالٰی جس کے بارے میں بہتری کا ارادہ فرماتا ہے۔ اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔ پھر جب اس سمجھ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تو ایسا شخص ہی حکیم کہلاتا ہے۔

اس زمانہ میں حکیم کے ہم معنی الفاظ دانشور، علامہ یا ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ استعمال درست نہیں ہے۔ حکیم کے لیے ضروری ہے کہ علم کی پختگی کے ساتھ اس پر عمل بھی ہو۔ موجودہ دور میں بے شک بڑی بڑی ڈگریاں تو حاصل کر لی جاتی ہیں۔ مگر وہ عمل کہاں ہے جو حکمت کی اصل روح ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

حکمت کی جڑ اور بنیاد خوف الہی ہے۔ حکیم وہی ہو سکتا ہے۔ جس کے دل میں خوف خدا ہو۔ وگرنہ محض علم حاصل کرنے سے کوئی شخص حکیم نہیں ہو سکتا۔

انفاق پر
حکمت کا اثر

گذشتہ درس میں گنہ چکا ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ شیطان انسان کو یہ سچی پڑھاتا ہے کہ دیکھو اپنے مال کو خرچ نہ کرنا۔ اگر خرچ کر دیا تو تم مفلس ہو جاؤ گے۔ تمہارے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ تمہارا بڑھاپے کا سہارا ختم ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس شیطانی دوسرے سے وہی شخص بچ سکتا ہے جسے قرآن پاک کا فہم ہوگا۔ فہم قرآنی والا شخص ہی سچے گا کہ انفاق فی سبیل اللہ سے مال کم نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں مزید برکت دینے لے گا۔ اسی چیز کا نام حکمت ہے اسی طرح گویا حکمت انفاق بسبیل اللہ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

حکمت مہنح
حسانت ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے وَمِنْ حُيُوتِ الْحِكْمَةِ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، اُسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا مہنح ہے۔ اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا ہے ہیں۔ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تقریباً سو سو سال سے مصروف کار ہے۔ اس نے ایک صدی کے عرصہ میں چالیس ہزار علماء تیار کیے ہیں، جو صحیح معنوں میں دین کا فہم رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں علم دین کی شمع روشن کی ہے۔ حضرت علیؑ اپنے بیٹوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ انہوں نے شکوے کے طور پر فرمایا بہت سے آدمی شکل و صورت میں انسان نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ جانوروں جیسے ہیں۔ جب مال میں کمی واقع ہوتی ہے۔ تو فوراً سمجھ جاتے ہیں مگر دین سائے کا سارا بھی برباد ہو جائے تو انہیں کچھ پروا نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقل وہ ہے جو ماہر معاشیات ہے۔ معاش میں ذرہ بھر کمی ملیشی آئے، تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ مگر دین

کے معاملے میں بڑے سے بڑا نقصان بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں، بیرسٹروں اور دانشوروں میں یہی خرابی پائی جاتی ہے کہ ان کی عقل معاش تو اعلیٰ درجے کا ہے۔ مگر وہ معاد کے معاملے میں بالکل کوڑے ہیں۔ حقیقت میں کامل شخص وہ ہے جو قیامت اور اپنی بازگشت کے مقام کو سمجھتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے صدقات و خیرات کے ضمن میں یہ آیات نازل فرمائی ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کسب این خیر را بینی بیکر
اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ یہ جس جگہ بھی ملے اس کو اختیار کر لو، تیزی شریف کی روایت میں آئے ہیں کلمۃ الحکمتۃ ضالۃ المؤمن حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اسے جہاں پاتا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔ حکمت ہی ایسی چیز ہے جو مومن کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ لہذا مومن ہمیشہ اس کا متلاشی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اعلیٰ عہدہ منصب یا کسی دوسری قیمتی سے قیمتی چیز کو خیر کثیر سے تعبیر نہیں کیا۔ مگر یہ لقب صرف حکمت کو عطا ہوا، کیونکہ حکمت تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت کی انتہا یہ ہے کہ انسان افضل الاشیا کو افضل العلوم سے معلوم کرے۔ افضل الاشیا خدا تعالیٰ کی ذات، وحدانیت اور اس کی صفات ہیں۔ لہذا جو شخص علم کے ذریعے اس راہ کو پالے گا، وہی صاحب حکمت ہو گا۔ اور پھر علم بھی محض زبانی کلامی نہ ہو، بلکہ اس میں دل کی حضوری اور عقل کا کمال شامل ہو۔ لہذا جسے حکمت عطا کی گئی اُسے گویا بہت بہتری دے دی گئی۔ اور یہی چیز منبع صفات اور ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہے۔

فرمایا وَهَآیْکَ ذَکَرْنَا اَوَّلًا لِّبَابِ یَاوَرَ کَھو نصیحت قبول نہیں کرتے۔ مگر وہ جو عقل والے ہیں۔ اور پھر عقل کو صحیح طور پر استعمال بھی کریں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَللّٰھُمَّ اَلْبِکُمْ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ وہ لوگ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل کو درست طریقے سے استعمال نہیں کرتے

کافروں کی مثال اللہ نے بیان فرمائی کہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں "أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ
بَلْ هُمْ أَضَلُّ" کیونکہ جانور بھی بعض باتیں سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ جانوروں
سے بھی بدتر ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ فرمایا نصیحت کو بھی وہی شخص قبول کرتا
ہے، جس کے اندر دانائی اور عقل ہوگی۔ دوسرے شخص کو نصیحت سے کچھ فائدہ
نہیں پہنچتا۔

النفاق فی سبیل اللہ ہی کے ضمن میں یہاں پر نذر کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ مسئلہ نذر
وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ يَأْكُوفِي نَذْرًا فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یہاں پر نذر کو صدقہ کے مقابلے میں ذکر کیا ہے۔
مفسرین کہہ رہے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ و خیرات تو بلاشبہ حنات میں سے
ہے۔ مگر نذر جانے ہونے کے باوجود خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں
آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو، کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے
نہیں بچا سکتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا يَغْنِي نَذْرٌ عَنْ قَدَرٍ جو کچھ تقدیر میں ہوتا
ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نذر نخیل لوگ مانتے ہیں، مگر نہ فیاض آدمی
شرط نہیں لگاتے۔ وہ تو غیر مشروط طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ گویا
نذر ماننا مشروط عبادت ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنے نوافل ادا کرونگا۔
یا روزے رکھوں گا یا اتنا صدقہ خیرات کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ
شرط — باندھنے والی بات ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ جب وہ کام ہو جائے تو
نذر کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ نذر جائز ہو۔ اور اگر نذر کو پورا نہ کیا تو
انسان گنہگار ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا نَذْرَ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ گناہ کے کام
میں نذر ماننا جائز نہیں۔ اور اگر ایسا کہہ لیا ہے تو پھر اس کا پورا کرنا درست نہیں
بلکہ اس کو توڑ کر نذر کا کفارہ ادا کر دینا چاہیے۔ فقہ کا مسئلہ ہے التَّذَرُّعُ عِبَادَةٌ

- مننت بمنزلہ عبادت ہے۔ اور عبادت بدنی بھی ہو سکتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت کی
 کی مثال نوافل یا روزے ہیں۔ اور مالی عبادت میں صدقہ خیرات یا جانور ذبح کرنا ہے
 اسی لیے فرمایا کہ گناہ کے کام کے لیے یہ عبادت جائزہ نہیں ہے۔ اور اگر نذر غیر اللہ
 کے تقرب کے لیے مانی جائے تو یہ شرک بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ہماری فقہ کی کتابوں
 عالمگیری اور شامی وغیرہ میں موجود ہے فقہائے کرام نے لکھا ہے۔ کہ جو لوگ قبروں
 کا غلاف پکڑتے ہیں اور نذر مانتے ہیں۔ کہ اے بزرگ! اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو تمہارے
 دربار فلاں نذرانہ پیش کروں گا، فرمایا ایسی چیز بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ کیونکہ نذر
 عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ایسی مننت مانے
 کہ اگر فلاں کام ہو گیا۔ تو اسی بزرگ کو ایصال ثواب کے لیے محتاجوں کی یہ خدمت کرونگا
 تو وہ الگ بات ہے۔ اور اگر بزرگ کو ہی حاجت روا سمجھ لیا تو کفر شرک میں مبتلا ہو
 گیا۔ اسی لیے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر سرے سے نذر ہوتی
 ہی نہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ فلاں کام ہونے پر دس آدمیوں کو شراب پلاؤں گا۔ فقہائے
 کرام فرماتے ہیں۔ کہ مزاروں پر تیل چڑھانا، موم بتیاں جلانا، چادریں چڑھانا، بجرے
 چڑھانا یہ سب باطل اور ناجائز مننت میں شامل ہیں۔ اور اگر ایسا کرنے سے مراد
 بزرگ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ تو پھر بھی شرک میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا
 ہے۔ کہ خدا کے علاوہ یہ بھی ہماری حاجات پوری کرتے ہیں، تو بھی کفر ہے۔ اور
 اگر محض مجاوروں کو کھلانا مقصود ہے تو یہ تخصیص بھی غلط ہے۔ اپنے گلی محلے،
 گاؤں شہر کے غریب و مساکین کو کھلاؤ، ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھو۔ مزاروں
 پر تو عموماً اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر نیت درست بھی ہو، تو بھی ایسے
 لوگوں کو کھلانا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ محتاج نہیں بلکہ پیشہ ور گداگر ہیں۔ مزاروں پر موجود
 انتظامی عملہ بھی کھانے پینے میں شریک ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اس کے حقدار نہیں
 ہوتے اگر صاحب نصاب ہے تو مننت کا مال تو خود مننت ماننے والا بھی نہیں کھا
 سکتا۔ جس طرح زکوٰۃ کے حقدار، صرف اس کے مستحقین ہیں۔ اسی طرح نذر کا مال بھی

غریب و مساکین کا حق ہے۔ لہذا نذر کا مال قبروں کے مجاوروں اور دیگر لواحقین کو کھانا کسی طور جائز نہیں۔

تاہم امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر بطور نذر تو ہو جاتی ہے۔ مگر اس کو توڑنا ضروری ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں کَفَّارَةٌ كَفَّارَةٌ الْيَمِينِ اس قسم کی نذر کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کر دو مگر معصیت کی نذر کو پورا نہ کر دو۔ نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا۔ ایک غلام آزاد کرنا، یا تین روزے رکھنا۔ ہاں اگر نذر جائز ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے۔ جیسے مسجد میں چٹائیاں بچھا دے۔ طالب علموں کو کھانا کھلا دے۔ ان کی کتب کا بند و بست کر دے وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جو بھی نذر مانو فِاتِ اللّٰہِ يَعْلَمُہُ تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز۔ تم لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو۔ کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔

ظالم بے یار و
مددگار ہونگے

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنَ الْغَضَائِرِ ظَالِمُونَ کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ لہذا جو کوئی شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ کفر کرتا ہے۔ غیر اللہ کی منت مانتا ہے۔ مستحقین کو نظر انداز کرتا ہے۔ کسی قسم کی زیادتی کرتا ہے، حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرضیکہ جو بھی کوئی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ظلم کریگا، وہ مدد کے قابل نہیں ہے۔ اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا، جنابت کی حالت میں غسل نہیں کرتا، روزہ نہیں رکھتا، گویا اپنے آپ پر ظلم کرتا رہا ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، فرائض کو ترک کرنا، کسی کو تنگ کرنا یہ سب ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے الظلم ظلمات یوم القیامۃ قیامت کے روز اس دنیا میں کیا ہوا ظلم اندھیروں کی صورت

میں سامنے آئے گا اس لیے فرمایا اس دن ظلم کرنے والوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا
 ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے پھنسنے ہوتے ہوں گے مگر ان کی خلاصی کے لیے کوئی مدد
 نہیں پہنچے گی۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ نہ عبادت میں ظلم کا ارتکاب کرے، نہ معاملات
 میں اور نہ حقوق میں غرض کسی چیز میں ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکمہ نوزدہ (۱۱۹)

آیت ۲۴۱ تا ۲۴۲

إِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا
 الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۚ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۲۴۱) لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدُومٌ وَلَكِنَّ
 اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدْكُمْ
 وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ
 يُؤْتِ الْيَتَامَىٰ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝ (۲۴۲)

ترجمہ: اگر تم صدقات کو ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے۔ اور اگر ان کو چھپاؤ اور

(پوشید طور پر) فقرا کو دے دو، تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ

تم سے برائیاں دُور کرے گا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کی خبر رکھتا ہے ۝ (۲۴۱)

آپ کے ذمے نہیں ہے ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا۔ مگر اللہ راہِ راست پر لاتا ہے

جس کو چاہے۔ اور جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے نفسوں کے

لیے ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے۔ اور جو کچھ بھی تم مال

سے خرچ کر دو گے۔ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا ۝ (۲۴۲)

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صدقاتِ خیرات

کے متعلق سات اصول بیان کیے ہیں جن میں سے چار کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا

ہے۔ آج کے درس میں پانچویں بات کا بیان ہے کہ صدقات و خیرات ظاہری

طور پر بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور باطنی پوشیدہ طور پر بھی۔ تاہم خفیہ طور پر دینا زیادہ

بہتر ہے۔ اس کے بعد چھٹی بات کا ذکر ہے کہ صدقہ و خیرات غیر مسلم کو بھی

دیا جاسکتا ہے۔ ساتویں بات کا ذکر آئندہ درس میں آئے گا۔

رابطہ آیات

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صدقہ خیرات سے متعلق سب سے اہم چیز دینے والے کی نیت ہے اگر خدائے تعالیٰ نیت میں فتور آگئی ہے کسی کو اسان جملانے یا ایذا پہنچانے کے لیے یار یا کاری کے طور پر دیا۔ تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔ تاہم نیک نیتی کے ساتھ ظاہر یا باطناً دونوں طرح دینا جائز ہے۔ البتہ اس کی افضلیت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فرض صدقات یعنی زکوٰۃ اور عشر کو ظاہر کر کے دینا چاہیے۔ اور نفلی صدقات کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے۔ بہ خلاف اس کے امام حسن بصریؒ، امام رازیؒ، مولانا شاہ شرف علی تھانیؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقات کی پوشیدہ طور پر ادائیگی کو افضل فرمایا ہے۔ خواہ وہ صدقہ فرض ہو یا نفلی بمفسرین کرام فرماتے ہیں کہ افضلیت اس بنا پر ہے کہ خفیہ دینے سے ایک تو ریا کا امکان باقی نہیں رہتا دوسرے لینے والے کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔

بعض اوقات کسی شخص کے مال کو ظاہر نہ کرنے میں بھی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ ظاہر کر کے دی جائے تو کل مال کا علم ہو جاتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے خفیہ دینا بہتر ہے۔ البتہ ظاہر کر کے دینے میں ایک مصلحت بھی ہے کہ دیکھنے والے کو بھی شوق پیدا ہو کہ وہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر اس نیت سے کھلے طور پر صدقہ خیرات کرے تو یہ مناسب ہو گا۔ بایں ہمہ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خفیہ طور پر خرچ کرنا افضل ہے۔ اس کی تصدیق صحیحین کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جن سات آدمیوں کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن ان کو رب العزت کے عرش کے نیچے جگہ ملے گی، ان میں سے ایک آدمی وہ ہے تَصَدَّقَ بِیَمِیْنِهِ حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے مگر بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ اس قدر خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے۔

الغرض فرمایا اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعْمًا هِيَ، اگر تم صدقات

کو ظاہر کر دے تو یہ اچھی بات ہے۔ کہ اس میں اقتدار کا پہلو نکلتا ہے۔ کہ اس کو دیکھ کر دوسرا
 بھی اتفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائے اور اگر نہ کوۃ ادا نہیں کرتا تو کرنے لگ
 جائے۔ اس کے علاوہ ایسا شخص لوگوں کی طعن و شینع سے بھی بچ جائیگا۔ جب وہ
 لوگوں کے سامنے صدقہ خیرات کرے گا، تو کنجوس کہلوانے سے بچ جائے گا۔ وَلَا تَخْشَوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءُ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقر اکورے دو۔
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اس سے نہ تو ریاکاری لازم
 آئے گی اور نہ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوگی۔ پھر صدقہ و خیرات کی حکمت
 بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ
 اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دیگا۔ تمہارے بعض گناہ معاف
 کر دیگا۔ کیونکہ سارے گناہ صدقہ سے معاف نہیں ہوتے حدیث شریف میں آتا ہے
إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے
 غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ
 اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ احسان جیلانے والے کے متعلق آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ
 کے غضب کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کو لظہر
 شفقت سے نہیں دیکھے گا۔ اور عذاب الیم میں ڈالے گا۔ مگر صدقہ و خیرات
 اللہ تعالیٰ کے میخبط و غضب کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ بسند احمد میں نبی علیہ السلام کا یہ
 فرمان بھی موجود ہے۔ إِنَّ الصَّدَقَةَ ظِلُّ الصُّوْمِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ
 قیامت کے دن صدقہ مومن کے حق میں بہتر لہ سایہ کے ہوگا۔ جب میدان محشر
 میں انتہا درجے کی تپش ہوگی اس وقت صدقہ اپنے دینے والے کے سر پر سایہ کرے گا۔
صدقہ و خیرات کی اس قدر فضیلت ہے۔ اور اس کی اس قدر برکات ہیں۔ واللہ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ اللہ تعالیٰ کو تمہارے تمام اعمال کی خبر ہے۔ وہ خوب
 جانتا ہے۔ کہ تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے پیچھے کیا نیت کا رہا ہے۔ پھر جیسی
 نیت ہوگی۔ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ بدلہ عطا کرے گا۔ بہر حال صدقہ سے متعلق

یہ پانچویں بات بھی آگئی۔

غیر مسلم کے
لیے صدقہ

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صدقہ خیرات غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اس ضمن میں چھٹی بات ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں حضور علیہ السلام نے صرف مسلمانوں کو صدقہ خیرات دینے کا حکم دیا تھا۔ حدیث شریف میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا تَصَدَّقُوا عَلَى أَهْلِ دِينِكُمْ یعنی صرف اہل دین (مسلمانوں) پر صدقہ کیا کرو۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے لَا تَصَدَّقُوا إِلَّا عَلَى أَهْلِ الْإِسْلَام یعنی اہل اسلام کے سوا دوسروں (غیر مسلموں) پر صدقہ نہ کیا کرو۔ اس لیے آپ کے صحابہ کرامؓ غیر مسلموں کو صدقہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ پھر جب لشکر میں کفار مکہ سے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ تو مکے اور مدینے والے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے۔ اس دوران میں حضرت اسماءؓ کی والدہ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوی جو کہ ابھی تک مشرک تھی مدینے آئی۔ تو حضرت اسماءؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! میری ماں آئی ہے۔ وہی مشرک ہے اور وہ مشرک ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں میں اس سے صلہ رحمی کروں۔ وہ محتاج بھی ہے۔ کیا میں اس کو کچھ صدقہ و خیرات دے سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا، ہاں اجازت ہے۔ تو گویا اللہ کے رسول نے غیر مسلموں کو صدقہ خیرات دینے کی اجازت دے دی۔ لہذا ثابت ہوا کہ صدقہ کا مال غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر عطا کرے گا۔ یاد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوی ام رومانؓ تو شروع ہی سے اسلام لے آئی تھیں مگر آپ کی دوسری بیوی یعنی اسماءؓ کی والدہ عقیلہ بنت عبد العزیٰ اسلام نہیں لائی تھیں۔

البتہ زکوٰۃ اور عشر غیر مسلموں کو نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ فرض ہے۔ اور اس کے متعلق بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو دیگر احکامات کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی دیا اور واضح کیا مَنْ أَخْزَبَ يَهُودَ فَسُدَّ عَلَى فَقَرَائِهِمْ

لے تفسیر کبیر ص ۸۲ (فیاض)

یعنی زکوٰۃ مسلمانوں کے اختیار سے وصول کی جائیگی اور انہیں کے فقرا میں تقسیم کی جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ۔ زکوٰۃ و عشر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں نفل صدقہ، صدقہ فطر کفارہ کا صدقہ جیسے نذر، قسم یا طہار کا کفارہ ہے، وہ بھی غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔

حربی غیر مسلم
محروم ہے

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ صدقہ وغیرہ قری غیر مسلم کو تو دیا جاسکتا ہے۔ مگر حربی کافر، مشرک وغیرہ کو دینا جائز نہیں۔ یعنی ایسے غیر مسلم جو اہل اسلام کے ساتھ بے سر پیکار ہوں، وہ اگر محتاج بھی ہوں تو وہ صدقہ کے حق دار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ممتحنہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے: "لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَكُمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْرُوْهُمْ" یعنی جو لوگ تم سے لڑائی نہیں کرتے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے ان کے ساتھ شہمی اور احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرماتے ہیں جو تم سے لڑائی لڑیں اور تمہیں گھروں سے نکال دیں۔ اور جو کوئی ایسے لوگوں سے راہ و رسم بڑھائیگا۔ تو ان کا شمار ظالموں میں ہوگا جہاں تک کفار کو راہ راست پر لانے کا تعلق ہے۔ تو یہ صرف اور صرف مشائے

ہدایت مہندہ
صرف اللہ ہے

ایمہ دمی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔ اے پیغمبر علیہ السلام لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ اِلَيْهِ لَوْ كُنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَهْلِيْ الدِّيْنِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ بَلْكَ جَسَّ اللّٰهُ تَعَالٰی چاہے ہدایت دیدے۔ یہ سراسر اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے۔ حضور علیہ السلام کے چچا ابوطالب نے آپ کی بڑھی خدمت کی۔ ہر مشکل وقت میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ مگر حضور کی انتہائی خواہش کے باوجود ابوطالب کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ اور وہ کفر کی حالت میں مرا۔ حضور علیہ السلام کو اس بات کا بڑا افسوس تھا۔ مگر اس معاملہ میں آپ بھی مجبور تھے کہ ہدایت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ابوطالب کے فرزند حضرت علیؑ کلم سنی میں ایمان

سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے داماد، جلیل القدر صحابہ اور خلفائے راشدینؓ میں سے ہیں۔ مگر باپ کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَن يَّشَاءُ ۚ وَهُوَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ آتا ہے "اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُّؤْمِنِيْنَ" کیا آپ لوگوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔ بلکہ فَاِنَّمَا عَلَيكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ آپ کے ذمے دین کو پہنچانا ہے۔ آپ سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لائے۔ حساب تو ہمارے ذمے ہے۔

پورا پورا بدلہ

فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ اور تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، یہ تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں اجر عطا کریگا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں بنی نوع انسان کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہیں اجر و ثواب سے نوازنا چاہتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر محض رضا الہی کے لیے۔ اس میں کوئی دیگر مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا مقصد ہوگا مثلاً کوئی اپنا مفاد وابستہ ہو۔ ریاکاری پائی جائے یا کسی کو ایذا دینا مقصود ہو تو ایسی صورت میں صدقہ ضائع ہو جائے گا۔ لہذا محض اللہ کی رضا کے لیے صدقہ و خیرات کرنا چاہیئے۔ اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا چاہیئے۔ محتاجوں کی حاجت براری کرنی چاہیئے۔ یہ سب رضا الہی کے ذرائع ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ اور تم جو بھی خرچ کرو گے، نیچے کرو گے، کسی کے ساتھ بھلائی کرو گے۔ يُؤْتِ اِلَيْكُمْ اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان محتاج کو دینے سے پورا اجر ملے اور کافر کو دینے سے کم ملے۔ بلکہ پورا بدلہ دیا جائیگا۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے خالص نیت کے ساتھ جو بھی خرچ کیا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں بڑھا چڑھا کر دیں گے۔ البتہ فضیلت اس بات میں ہے کہ محتاجوں میں سے بہتر محتاج

کو دیا جائے۔ مثلاً ایک نمازی ہے اور دوسرا بے نماز ہے۔ تو نمازی کو دینا زیادہ اجر
 و ثواب کا موجب ہے۔ مگر جہاں مجبوری کا معاملہ ہو۔ وہاں کم تہ آدمی کو بھی دینا
 چاہیے۔ اگر کوئی بے نمازی ٹھیک کام رہا ہے۔ تو اسے پہلے دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ
 ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ وَأَنْتُمْ لَا تظْلَمُونَ اور کسی شخص پر ذرہ بھر
 زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں
 کرتا۔ یہ تو اس کے قانون کے خلاف ہے۔ کہ کسی اور سے اس کی نیکی کو بھی نظر انداز
 کر دے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۴۳

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد و بت (۱۲۰)

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا
تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۴

الْبَقَرَةُ ۲

ترجمہ: (صدقات و خیرات) اُن فقراء کے لیے ہیں جنہیں روک دیا گیا ہے۔ اللہ کے
راستے میں۔ وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں ناواقف آدمی مالدار گمان
کرتا ہے۔ سوال سے بچنے کی۔ جسے تم اُن کو اُن کی نشانیوں سے پہچانو گے
وہ لوگوں سے لجاجت کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔ اور تم مال سے جو کچھ بھی خرچ کرو
اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے (۲۴۳)

رابط آیات

صدقہ و خیرات سے متعلق اس سے پہلے چھ باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ آج کے
درس میں ساتویں اور آخری بات کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں ذکر آچکا ہے۔ اتفاق
فی سبیل اللہ کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ و خیرات دیکر احسان نہ بھلاؤ، دوسری
بات یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ تیسری بات یہ ہے۔ کہ اس
کام میں ریاکاری کو دخل نہ ہو، چوتھی شرط یہ ہے کہ پاکیزہ مال اور اعلیٰ چیز صدقہ میں دی
جائے، پانچویں یہ کہ صدقہ کھلے طور پر بھی دیا جاسکتا ہے، اور پوشیدہ طور پر بھی بشرطیکہ
نیت درست ہو یعنی اتفاق محض رضا الہی کے لیے ہو، چھٹی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ
غیر مسلم مستحق کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمان تک محدود نہیں۔ کیونکہ ہدایت دینے
کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے۔ ہاں
حربی کافر صدقے کا مستحق نہیں، اس کا ذمی ہونا ضروری ہے۔ البتہ عشر اور زکوٰۃ
جو فرائض میں سے ہیں، وہ خالص مسلمانوں کے لیے وقف ہیں۔ لہذا کسی قسم کے

غیر مسلم کو نہیں دیے جاسکتے۔

فقیر اور مسکین

آج کے درس میں ساتویں اور آخری بات یہ ہے۔ کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ صدقات لِلْفُقَرَاءِ فَقِیْرُوں کے لیے ہیں۔ لفظ فقیر اصل میں فقار سے مشتق ہے۔ اور فقار ایسے معذور شخص کو کہتے ہیں جس کا مہرہ ٹوٹا ہوا ہو، اور وہ چلنے پھرنے سے عاجز ہو۔ اسی مناسبت سے عام اصطلاح میں فقیر سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنی جائز ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ ایسے محتاجوں کا ذکر سورۃ حشر اور دیگر کئی صورتوں میں آتا ہے۔ سورۃ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں جن میں فقراء اور مساکین سب سے پہلے آتے ہیں۔ فقہائے کرام نے فقیر اور مسکین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر زیادہ مستحق ہے اور بعض مسکین کو پہلے نمبر پر لاتے ہیں۔ تاہم ان کی عام تعریف کے مطابق وہ فقیر ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو مگر وہ اسکی جائز ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف فقیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق فقراء ہیں۔ جن کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

محصوفقراء

آیت زیر درس میں فقرار میں سے ان خاص فقرار پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو روک دیے گئے ہوں۔ یعنی محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصَوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ صدقات ان فقرار کے لیے ہیں۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ اور زمین میں سفر کر نیکی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک مقام پر پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ احصار کا معنی ہے روک دینا، جیسا کہ حج کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادہ سے نکلیں پھر راستہ میں روک دیے جائیں۔ احرام باندھ چکے ہیں۔ مگر دشمن نے راستہ روک دیا ہے یا کوئی بیمار ہو گیا، کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، تو محصور شخص کو چاہیے۔ کہ وہ قربانی کا جانور دوسرے

شخص کے ہاتھ بھیج دے جسے حرم شریف میں جا کر ذبح کر دیا جائے۔ اہم ابو حنیفہ کے فتویٰ کے مطابق ایسی صورتوں میں محرم الحرام کھول دیگا۔ اور پھر آئندہ موقع پیرج یا عمرہ جیسی بھی صورت ہو اسکی قضا دیگا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صدقہ و خیرات ان لوگوں کا حق ہے۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ اور سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں روک دیے جانے والے لوگوں میں دو قسم کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔ فی سبیل اللہ سے عموماً جہاد مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ اس قدر نادار ہیں کہ جہاد پر محض اس لیے نہیں جاسکتے کہ انہیں ضروریات زندگی کے لیے محنت مزدوری کرتا ہوتی ہے۔ اگر جہاد پر چلے جائیں تو پیچھے ان کے بچوں کی کفالت ممکن نہیں اور اگر کاروبار میں لگے ہوتے ہیں تو جہاد پر نہیں جاسکتے اس طرح وہ جہاد پر جانے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ صدقہ و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔ اگر ان کی اعانت کر دی جائے، تو جہاد کے فریضہ پر جاتے وقت وہ گھر کی کفالت سے بھی بے فکر ہو جائیں گے۔ ان پر خرچ کرنا گویا جہاد کے راستے میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔

محصورین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حصول تعلیم کے لیے وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہذا دیگر کام کاج کرنے سے عاجز ہیں۔ اگر وہ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرنا چاہیں۔ تو ظاہر ہے کسی ایک کام کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ گزراوقات کے لیے محنت، مزدوری، ملازمت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ ہر کام کے لیے پوری توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دینی تعلیم کے لیے بھی پورا وقت درکار ہے جب تک پورا وقت نہیں دے گا، نہ قرآن پاک یاد کر سکتا ہے۔ نہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ ہر وقتی سے دونوں کام ادا ہوئے رہ جائیں گے، اور طالب علم کسی کام میں بھی کامل نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ بعض اوقات اس طرح کا کام نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ "نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان" ایک مشہور مقولہ ہے

ناقص التعليم شخص گمراہی پھیل کر نقصان کا باعث ہی ہوگا۔ لہذا جو شخص دینی تعلیم حاصل کرنا چاہے
اُسے دیگر ضروریات سے بے نیاز بنانے کے لیے اُن پر خرچ کرنا ہوگا۔ مولانا اشرف علی
تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں صدقہ و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق یہی لوگ ہیں۔
آپ فرماتے ہیں۔ کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دین حاصل کرنے والے لوگ نیچے
ہوتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا کام کاج نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے
دیا ہے کہ یہ لوگ اُخْصِیْ وَافِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اللّٰہ کے راستے میں روک دیے گئے
ہیں انہیں برسوں میں دینی تعلیم کے لیے پابند کر دیا گیا ہے۔ دیگر کاروبار کرنے سے
ان کی تعلیم اور صوری رہ جائیگی۔ لہذا یہ لوگ تمہارے صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں

فقر کی پہچان

فرمایا مستحق فقر کی ایک پہچان تو یہ ہے یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِیَٰ کُم مِّنَ
التَّعَفُّفِ ناواقف لوگ ایسے مستحقین کو مالدار سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ سوال
نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ اعانت کے مستحق ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اصحاب صفہ کی
ہے حضور علیہ السلام کی مسجد سے قریب ایک چوترا تھا، اوپر کھجور کے پتوں کی چھت
بھٹی۔ اس مقام پر ایسے لوگ جمع رہتے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کے لیے
وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اوقات چار چار سو آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ حضور
علیہ السلام سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور جہاد میں جانے کی ضرورت پڑتی تو ادھر
چل دیتے۔ کوئی کاروبار نہ کرتے تھے۔ مگر مستحق ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے تھے

حضرت قبیصہؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت! میں
بہت مفروض ہو گیا ہوں، میری مدد فرمائیں یعنی زکوٰۃ و صدقات میں سے کچھ دلا دیں
آپ نے فرمایا۔ کہ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں۔ البتہ تم رک جاؤ، جب
کوئی چیز میسر آئیگی، تو تمہارے معاملے پر غور کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا قبیصہ
إِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَحُلْ یعنی اے قبیصہ! سوال کرنا حلال نہیں۔ سوائے تین قسم
کے آدمیوں کے۔ اول وہ شخص جو ایسے فقیر ہیں مبتلا ہو جائے۔ کہ مٹی میں مل جائے
یعنی اس کے پاس کوئی چیز باقی نہ ہے۔ دوسرا وہ شخص جس پر کوئی تادان پڑ جائے یا

قرضہ دینا ہے۔ اور تیسرا وہ شخص جس کی قوم کے تین مغل منہ آدمی گواہی دیں کہ واقعی یہ شخص بڑا نادار ہے۔ فاقہ کشی کر رہا ہے۔ اور اس کے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا ان تین شخصوں کے علاوہ جو کوئی سوال کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس مال موجود ہو۔ اس کے باوجود وہ سوال کرے، تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوگا کہ اُس کے چہرے پر گوشت ہی نہیں ہوگا۔

اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس خوراک، لباس اور رہنے کے لیے مکان کے علاوہ دوسو درہم کی مقدار میں مال موجود ہو، وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ اہم مالکؒ فرماتے ہیں جس کے پاس چالیس درہم ہوں، وہ بھی سوال نہیں کر سکتا۔ اہم سفیان ثوریؒ پچاس درہم کے مقدار بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جس شخص کے پاس دو وقت کا کھانا موجود ہو، اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض اہل حنفیہ یا پیشہ ور ہوتے ہیں، جنہیں کچھ اوزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس اگر چالیس، پچاس یا دوسو درہم سے کم مال ہو تو ان کے لیے سوال کرنا بھی گنجائش ہے۔ ورنہ سوال کرنا حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ ان کے متعلق ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے منبر اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے جنون کا درورہ پڑ گیا ہے حالانکہ ہاں یہ الا الجموع یہ صرف بھوک کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس قدر زبوں حالی کے باوجود آپ نے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ ان صحابہ کا حال تھا، جنہیں اپنی عزت نفس اس قدر عزیز تھی۔ اس آیت میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے کہ خوش پوش ہونے اور سوال نہ کرنے کی بنا پر ناواقف آدمی سمجھتے ہیں کہ یہ شخص بڑا مالدار ہے۔ حالانکہ وہ اپنی

عزت نفس کی خاطر سوال سے گریزاں ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی چیز کی یوں ترجمانی کی ہے۔

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے۔ کسی پر کیا گزرتی ہے
آج کے ملحدانہ دور میں بھی عزت نفس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ آج تو اشتراکی بھی کہتے ہیں الخبز بالکرامۃ یعنی ہر آدمی کو باعزت روٹی ملنی چاہیے۔ تاکہ اُسے سوال کرنے کے ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ سوال کرنے سے پاک دامن ہیں۔ وہ صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔

مستحق فقرار کی دوسری پہچان یہ فرمائی تَقَرَّفُفُهُمْ بِسِلَاحِهِمْ تم انہیں اُن کی نشانیوں سے پہچانو گے۔ واضح نشانی یہ ہے۔ کہ بھوک کی وجہ سے لاغر ہوں گے، اُن کے چہروں پر زردی چھائی ہوگی مزید برآں لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْخُفَاوَهُ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اگر بہ امر مجبوری سوال کرنا ہی پڑے تو یہ وقار طریقے سے کرتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاریوں کی طرح پیچھے نہیں پڑ جاتے کہ ضرور لے کر ہی چھوڑ بیٹھے اہم البو بکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ الْخُفَاوَةُ سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ لجاجت سے سوال نہیں کرتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر سوال کریں گے تو لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ کہ نادار ہیں۔ مگر وہ تو اپنی ناداری کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیتے۔ اسکی دلیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ کہ سوال نہ کرنے کی وجہ سے تو لوگ انہیں غنی یعنی مالدار تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگ مطلقاً سوال کرتے ہی نہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ پیشہ ور بھکاری فقر کی فہرست میں شامل گدگری حرام نہیں ہیں۔ کیونکہ بھیک مانگنا تو سخت معیوب ہے۔ اور جن ناداروں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ کہ وہ اس قدر خود دار ہیں کہ سخت ضرورت کے باوجود سوال سے گریز کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں عموماً اور ہمارے ہاں خصوصاً لوگ جگہ جگہ

بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ اہم شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح چوری، ڈاکہ، قمار بازی وغیرہ اکساب ضارہ ہیں، اسی طرح گداگری بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یورپ کی عیسائی، یہودی اور دوسرے اقوام میں آپ کو کہیں بھکاری نظر نہیں آئے گا۔ ان کی حکومتیں اپنے ناداروں کی کفالت کرتی ہیں۔ برطانیہ میں تو بے روزگاریوں کو باقاعدہ گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ جب تک کسی شخص کو کام مہیا نہیں کیا جاسکتا، اسے گزراوقات کے لیے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ لہذا وہاں یہ گداگری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال سے بچنے کا اصول تو اسلام نے پیش کیا تھا مگر اسے اغیار نے اپنا لیا اور خود مسلمان اس سے محروم ہو گئے۔ ہم اسے حکمران اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ گداگری بڑی بڑی خصلت ہے اور عزت نفس کے خلاف ہے۔ اس کا سدباب ہونا چاہیے۔

دین کی خدمت

فرمایا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ اے ایمان والو! تم جو کچھ بھی اپنے مال سے خرچ کرو فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ اے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ صدقات سے متعلق احکام میں اللہ نے آخری بات یہ سمجھائی کہ تمہارے صدقات کے سب سے زیادہ حقدار کون ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دین کا کام خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ مگر سوال نہیں کرتے۔ سلف صالحین میں ایسے بزرگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اہم احمد بن حنبلؒ، ان کے استاد عبد اللہ زراقؒ، اہم ابن ہمامؒ، اہم ابو یوسفؒ، اہم شافعیؒ، اہم بخاریؒ وغیرہم ایسے بزرگ ہیں کہ علم دین کی خاطر لمبے لمبے پیدل سفر کیے۔ بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ مگر سوال نہیں کیا۔ اہم ابن جریرؒ کے متعلق آتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے رخصت ہونے لگے تو والدہ نے دو سو کلچہ تیار کر کے ساتھ لے دیا۔ فرماتے ہیں کہ پوسے دو سو دن ان کلچوں پر گزارہ کیا، ہر روز ایک کلچہ کھا کر پانی پی لیتا اور اللہ کا شکر کرتا۔ مگر کسی سے سوال نہیں کیا۔ یہ وہی مفسر قرآن ہیں۔ جنہوں نے قرآن پاک کی سب سے بڑی تفسیر لکھی ہے۔ آپ چالیس سال تک بغداد میں مقیم رہے، ہر روز چالیس ورق لکھتے تھے۔ آپ کی وفات

کے بعد حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے زندگی میں پانچ سو پونڈ سیاہی استعمال کی۔ یہ اُن لوگوں کے کام کی برکات ہیں کہ دین کا قافلہ چل رہا ہے۔ ورنہ اگر اس نے ملنے کے بھکاریوں والی بات ہوتی، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ کس نیت سے خرچ کر رہے ہو اور کس پر خرچ کر رہے ہو۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خرچ کی بہترین مد بھی بیان فرمادی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد و بست و یک (۱۲۱)

الْبُقَرَةُ ۲

آیت ۲۴۲ تا ۲۴۴

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
 فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٤٢﴾ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ
 إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط
 ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ
 وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى
 فَلَهُ مَا سَلَفَ ط وَأَمْرٌ إِلَى اللَّهِ ط وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٤٣﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ
 الصَّدَاقَ ط وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٤٤﴾ إِنَّ
 الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
 وَآتَوْا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
 عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٤٥﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات کے وقت اور دن کے وقت پوشیدہ
 طور پر اور ظاہری طور پر ان کے لیے ان کے رب کے پاس بدلہ ہے۔ اور نہ ان پر خوف ہوگا
 اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۴۳﴾ وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، وہ نہیں کھڑے ہوں گے۔
 مگر اس شخص کی طرح جس کے حواس شیطان متخلل کر دیتا ہے چھٹنے کی وجہ سے۔ یہ
 اس لیے کہ بیشک انہوں نے کہا کہ بیشک سود اگر ہی بھی سود کی مثل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ
 نے سود اگر ہی کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پس جس کے پاس نصیحت

آگئی اسکے رب کی طرف سے، پس وہ رک گیا پس جو کچھ ہو چکا وہ اسکے لیے ہے اور اسکا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جس نے پلٹ کر کیا، پس ہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۷۵﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ناشکر گزار اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۷۶﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اُن پر نہ خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۷﴾

صدقہ بمقابلہ سود

گذشتہ کئی دروس میں صدقہ کا بیان آیا ہے۔ اور گذشتہ درس میں صدقات سے متعلق ساتویں بات یعنی اس کے بہترین مصرف کا ذکر تھا اب آج کے درس میں پہلے صدقات ہی کے ضمن میں ان کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور پھر اس کے مقابلے میں سود کی مذمت ہے، صدقہ و خیرات کرنے سے انسان کے اندر فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور نخل دور ہوتا ہے۔ اس کے سبب انسان کے اندر بنی نوع انسان کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے، مکارم اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور پھر یہی خصائل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سود و خور میں نخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے۔ اور لامحدود پیمانہ پر مال جمع کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی اور فیاضی اٹھ جاتی ہے سود و خور سنگ دل اور ظالم بن جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے اس کا دین تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برپا ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

لَعَنَ اللَّهُ أَكْلَ الرِّبَا وَمَوْكَلَهُ ... الخ اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے اور دینے والے پر، اسکی دستاویز کے کاتب اور گواہان سب پر لعنت کی ہے اور صدقہ و خیرات کرنے والوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں متضاد چیزوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔

صدقہ کے چار مواقع

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خیرات کے چار متحسن مواقع بیان کیے ہیں
الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْإِيلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ لَوْ جُوِئِ

مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات اور دن مِسْقًا وَعَلَانِيَةً چھپا کر اور ظاہر کر کے۔ یعنی اہل ایمان چار حالتوں میں خرچ کرتے ہیں، وقت کے لحاظ سے رات ہوگی یا دن ہوگا اور حالت کے لحاظ سے پوشیدہ طور پر ہوگا یا ظاہر ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام اس آیت کے مکمل مصداق تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے پاس اگر چار درہم آگئے ہیں۔ تو انہوں نے ایک رات خرچ کر دیا، ایک دن کے وقت ایک پوشیدہ طور پر خیرات کر دیا اور ایک کسی عام مجلس کے اندر، اور اس طرح اس آیت کے عین پر پورا پورا عمل کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس چالیس ہزار درہم آئے۔ انہوں نے بھی قرآن پاک کے حکم کے مطابق انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دس ہزار درہم رات میں خرچ کیے، دس ہزار دن میں پھر دس ہزار پوشیدہ طور پر اور دس ہزار علانیہ خرچ کئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بہت بڑے تاجر اور مالدار تھے۔ آپ بھی خرچ کرتے وقت چاروں مواقع کا خیال رکھتے تھے۔

یہاں سے یہ بات اخذ ہوتی ہے۔ کہ صدقہ خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا کوئی خاص جگہ معین نہیں ہے۔ بلکہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں اور ظاہر باطن ہر حالت میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔ وہ ضرور اس اجر سے مستفید ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وہ مستقبل میں پیش آنے والے کسی خطرہ سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ ہی گنہگار ہوں گی زندگی پر انہیں کسی قسم کا افسوس اور غم ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں نیکی اور بھلائی کا کام کیا ہے۔ وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

اس آیت پاک سے واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہیں کیا۔ کہ ضرور فلاں دن اور فلاں وقت پر ہو۔ بلکہ ہر روز اور ہر وقت خیرات ہو سکتی ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کے لیے جمہورت کا روز یا ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ شعبان کی پندرہویں اور رمضان کی ستائیسویں

ایصالِ ثواب
کے لیے تعینِ وقت

تاریخ بھی بطور خاص مقرر کی جاتی ہے۔ یہ چیز اصولاً غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ البتہ جس چیز کی پابندی ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ حشر چ کیا جا رہا ہے، وہ حلال کھائی سے ہو۔ دن رات اور تاریخ کا کوئی تعین نہیں۔ غریباں کی خدمت کرنی ہے۔ تو کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے۔ نیت درست ہونی چاہیے۔ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مردوں کو ایصالِ ثواب کے لیے تیسرا دن، ساتواں، دسواں، یا چالیسواں دن ہی کیوں ضروری ہے۔ اسی طرح مردوں کے ثواب کے لیے جمہورت کی تخصیص بھی ناقابلِ فہم ہے یہ محض ڈھونگ اور غلط طریقہ ہے۔ صدقہ و خیرات کے لیے کوئی تاریخ اور کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود ساختہ شریعت کے احکام ہیں۔

سود خور کی
حالت زار

سود کی مذمت اور حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کا ذکر فرمایا ہے لیکن مراد اس سے لینا دینا ہی ہے، صرف کھانا مراد نہیں۔ یہاں پر کھانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور یہ انسان کی اولین ضروریات میں سے ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی محنت مزدوری، کام کاج کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ پیٹ کی خاطر یہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ آدمی کو دو وقت کی روٹی تو ضرور ملنی چاہیے، باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر کھانے کا ذکر انہی معنوں میں کیا گیا ہے۔ تاہم سود کھانے سے مراد سود کا لینا دینا اور ہر قسم کے استعمال میں لانا ہے فرمایا جو لوگ سود کھاتے ہیں لَا يَقُومُونَ وہ قیامت کے دن نہیں کھڑے

ہونگے اپنی قبروں سے الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چمٹ کر مغبوط الحواس کر دیا ہو جب کسی شخص پر جن اثر ڈالتا ہے۔ جسے جن کا سایہ یا جن کا چمٹنا کہتے ہیں۔ تو وہ شخص اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھے طریقے سے کھڑا نہیں ہو سکتا، طرح طرح کی

حرکتیں کرتا ہے۔ تو فرمایا قیامت کے دن سود خور کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جب وہ قبروں سے اٹھیں گے، تو ان کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوں گے۔ اور ان پر جنوں کی سی کیفیت طاری ہوگی۔ یہ اُن کے لیے سود خوری کی سزا ہوگی۔

جن کا سایہ جن کا انسان کو چمپٹ جانا اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص غلطی کرتا ہے۔ جس سے شیاطین کو تکلیف پہنچتی ہے، تو وہ لوگوں کو چمپٹ کر تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جنات کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے ”ہٰذَا الْمُسْلِمُونَ وَهٰذَا الْقٰسِطُونَ“ جس طرح انسانوں میں مومن اور کافر فاسق وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح جنوں میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ انسانوں کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کا مادہ تخلیق زیادہ لطیف ہے۔ انسانی آبادی کی طرح یہ دنیا جنوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات انسانوں کو چمپٹ جاتے ہیں، مِنَ الصَّسِطِ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں پنجاب میں کچھ مصنوعی اور جعلی کاروبار بھی ہوتا ہے عامل لوگ ایسے واقعات اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اکثر عورتوں کو بعض بیماریاں ہوتی ہیں۔ مگر عاملین اُسے بھی جنات چمٹنے پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ بیماری کا علاج طبی طور پر ہی کرنا چاہیے۔ یہ اعتقاد کی کمزوری اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ دگر نہ حقیقی طور پر جن چمٹنے کی کیفیت تو سب کو معلوم ہی ہے۔ کہ انسان کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اور کس طرح حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

تجارت بمقابلہ سود فرمایا سود خور قیامت کے روز قبر سے حواس باختہ اٹھیں گا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اَسَی کی وجہ یہ ہے کہ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْعِبَادِ انہوں نے کہا تجارت سود کی مانند ہے۔ دونوں چیزوں میں کوئی فرق نہیں۔ لوگ تجارت کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ اور پھر اس میں نفع کھاتے ہیں۔ اس طرح ساہوکار بھی اپنی رقم لگاتا ہے۔ اور اس پر نفع لیتا ہے۔ سود خور کا یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں اُسے سرمایہ جمع کرنے اور حلال حرام میں عدم تمیز کا جنون ہو چکا ہے۔ اسی لیے یہ سود کو تجارت کے برابر قرار دے رہا ہے، حالانکہ منافع کسی مجلس کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ایک شخص کوئی چیز

بیچتا ہے۔ اور اپنی لاگت سے زیادہ وصول کر کے نفع کھاتا ہے۔ مگر سود میں تو کسی چیز کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ سود خوردہ کوئی چیز خریدتا ہے۔ اور نہ اُسے بیچتا ہے۔ بلکہ صرف روپیہ ادھار دیکر اُس پر سود لیتا ہے۔ جو قطعاً حرام ہے۔

سود و شکلوں میں ہوتا ہے، ادھار کی شکل میں یا اجناس کی صورت میں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اور پھر مقررہ مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد بھی لیتا ہے۔ تو یہ صریحاً سود ہے۔ کیونکہ قرض دینے والے نے اس میں محنت کی ہے، نہ وقت دیا اور نہ صلاحیت صرف کی ہے۔ وہ شخص اپنی رقم کے بل بوتے پر مقررہ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو سود ہے۔

جنس کی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شخص جنس کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لیے لے لے اور پھر واپسی پر ادا شدہ جنس سے زیادہ لے۔ یہ بھی سود ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے **الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ** یعنی جب جنس کا لین دین ہو۔ اور ایک جنس کا تبادلہ ہو۔ تو برابر برابر ہونا چاہیے۔ سونے کے بدلے سونا ہو، چاندی کے بدلے چاندی ہو، نمک کے بدلے نمک ہو۔ جو کے بدلے جو ہو، گندم کے عوض میں گندم ہو تو یہ تبادلہ برابر ہی کی بنیاد پر اور دست بدست ہونا چاہیے جو کوئی ایک سیر گندم دیکر دوسرے سیر گندم واپس لے گا تو یہ سود ہو گیا اسی طرح ایک سیر گندم لے کر کچھ مدت کے بعد ایک سیر چاول واپس لے لے تو یہ بھی سود ہوگا۔ ہاں اگر اجناس مختلف ہوں تو شرح تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے میں دوسرے سیر جو لے سکتا ہے، ایک تولہ سونے کے عوض کسی گنا زیادہ چاندی حاصل کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مگر یہاں پر شرط یہی ہے۔ کہ سود دست بدست ہو۔ اگر اس میں ادھار کیا ہے۔ اور اُس مدت کے معاوضہ میں کچھ زیادہ حاصل کر لیا تو یہ سود ہو جائیگا۔

اہم مالک فرماتے۔ کہ جو چیز بطور خوراک استعمال ہو سکتی ہے، جیسے گندم، جو چنا وغیرہ اور وہ اپنی قیمت بھی رکھتی ہے۔ اس میں اگر ادھار کی بنیاد پر کمی بیشی ہو گئی، تو یہ سود ہوگا۔ اہم شافعی اور اہم احمدی بھی خوراک والی اشیاء میں یہی حکم لگاتے

ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسی غنیمت جس کا وزن یا پیمائش ہو سکتی ہے۔ اُس کے تبادلے میں کمی بیشی کمرہ گیا۔ تو سود شمار ہوگا۔ لوہے کا ایک سر یا دیکھ دوسرے نہیں لے سکتا، ایک من چوننا دیکھ ڈیڑھ من وصول نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ ہر وہ چیز جو وزن یا ناپ یا پیمائش میں آسکتی ہے۔ اس کا تبادلہ برابر ہی کی بنیاد پر ہو، تو اجازت ہے۔ اگر زیادہ وصول کیا، تو پھر یہ سود ہوگا۔

فرمایا سود خوردل کا نظریہ یہ ہے۔ کہ تجارت سود کی مثل ہے وَاحِلَ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَسَمَ الرَّبُّو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام کیا ہے تجارت میں کبھی منافع ہوتا ہے اور کبھی نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے جب کہ سود ایک مقرر منافع ہے۔ جو ہر صورت رقم دہندہ کو وصول ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے اندر حضور نبی کریمؐ نے فرمایا، سود بالکل چھوڑ دو، سابقہ تمام سود ختم ہو گئے۔ فرمایا میرے خاندان والے جو سود وصول کرتے تھے، وہ بھی میں نے ختم کر دیا۔ اب کسی کو سود کی رقم لینے کی اجازت نہیں۔ سب سے پہلے حضورؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کا سود ختم کیا، اور فرمایا کہ اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے۔ مگر سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں۔ تمام سود مٹا دیے گئے۔

سابقہ سود کی معافی

فرمایا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آگئی۔ یعنی سود کی حرمت کا حکم پہنچ گیا۔ فانتھی تو اس شخص نے سود لینا چھوڑ دیا۔ فَلَهُ مَا سَلَفَ تو جو کچھ ہو چکا وہ اُس کے لیے ہے۔ یعنی جو سود حاصل کر چکا ہے۔ اُس کا کچھ مواخذہ نہیں یعنی حرمت سود کا قانون آنے سے پہلے سود کی جو رقم لے چکا ہے۔ وہ اس کی ہو گئی، اب اس کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ وَأَمْرٌ إِلَى اللَّهِ اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ وہ اُسے معاف کرنے پر قادر ہے۔ تاہم یہ اس کی نیت پر منحصر ہے۔ کہ اس نے دل سے اللہ کے حکم کو قبول کر لیا ہے۔ یا محض دیکھا دے کے لیے سود لینا بند کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسے شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وَمَنْ عَادَ اور جو کوئی دوبارہ سودی کاروبار شروع کرے گا۔ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ یہی لوگ اہل جہنم ہیں هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد جو شخص سوئی
لین دین سے باز نہ آیا، تو وہ اسی لائق ہے۔ کہ جہنم کے گڑھے میں پھینک دیا جائے۔
جہاں سے کبھی چھٹکار نہ ہو۔ اگر اُس نے سود کو حلال سمجھ کر کھایا ہے۔ تو پھر تو قطعی کافر
ہے۔ اور حلال تو نہیں جانتا مگر کھا رہا ہے۔ تو بھی شدید درجے کا گنہگار ہے اور دوزخ
کا مستحق ہے۔

حرمت سود
کی حکمت

سود کے واضح احکام بیان کرنے کے بعد اسکی حکمت بھی بیان فرمادی۔
يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَاۤىۤا۟ ۖ اللَّهُ تَعَالٰی سود کو مٹاتا ہے۔ سود کا جتنا بھی مال اکٹھا کر لو، مگر
انجام کار اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔ ایسا مال اکثر تعیش کے
کاموں، لہو و لعب، بنیڈ باجے، آتش بازی، بے جافیشن یا غلط رسم و رواج کی نظر
ہو جاتا ہے۔ مال حرام ہو دجائے حرام رفت کے مصداق حرام کے مال سے صحیح
نتائج مرتب نہیں ہو پاتے اس میں خیر و برکت نہیں آتی۔ انسان سچون قلب سے محروم
رہتا ہے، حرص بڑھتی رہتی ہے، باقی لوگ خواہ بھوکوں مر جائیں، اسے مال اکٹھا کرنے
سے غرض ہے، یہ سب نقصان دہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
سود کو مٹاتا ہے۔ وَيُرِي الصَّدَقَاتِ اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات
دینے والے کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے۔ صدقات کا جذبہ بنی نوع انسان
کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے مال میں دنیا میں بھی
اضافہ کرتا ہے۔ اور آخرت میں تو سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی بڑھا چڑھا کر اجر عطا
ہوگا۔ اللہ مالک الملک کھجور کے ایک دانے کو واحد پہاڑ جتنا بڑھا کر معاوضہ دے گا۔
صدقہ و خیرات کی یہ برکات ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَجِبُ
كُلَّ كَفَّارٍ اِشِيْر اللہ تعالیٰ ناشکر گزار اور گنہگار آدمی کو پسند نہیں کرتا جو شخص
اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو چند دین کے لیے کسی کو ادھار نہیں دے سکتا، کسی
غریب و لاچار کی مدد نہیں کر سکتا، کسی بھوکے کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔ اللہ ایسے ناشکر گزار
کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر جو شخص اٹا کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے سود پر قرض

دیسا ہے۔ اس کا خون چوستا ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے۔ اس پر اور مالی بوجھ ڈالتا ہے۔ وہ شخص سخت گنہگار ہے۔ اور اللہ ایسے آدمی کو بھی ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اہل ایمان کے
لیے بشارت

احکام الہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے برخلاف إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال کئے۔ یعنی اولاً وہ اہل ایمان ہیں۔ ان کا عقیدہ صحیح ہے۔ توحید خداوندی پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ بعثت بعد الموت پر یقین ہے۔ کتب سماویہ پر ایمان ہے اور ثانیاً وہ اچھے اور شائستہ کام انجام دیتے ہیں۔ برائی سے بچتے ہیں۔ بالخصوص وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ جو کہ ام العبادۃ المقربہ اللہ کا تقرب دلانے والی چیز ہے۔ اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ وَالْتُوا الزَّكَاةَ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ یعنی بدنی عبادت کے ساتھ ساتھ مالی عبادت بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ بخل سے محفوظ ہیں۔ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر مقرر ہے۔ اُن کے نیک اعمال کا ایک ایک ذرہ محفوظ ہے، اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہے۔ تو اللہ اسے ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کا بدلہ سات سو گنا تک یا اس سے بھی بڑھا چڑھا کر عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی نیکو کار لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ نہ انہیں اس دنیا میں کسی قسم کا خوف ہوگا، وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ ہی آخرت میں وہ کسی غم و فکر میں مبتلا ہوں گے۔ قیامت کا ڈر تو ہر ایک کو ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے مامون ہونگے۔ برخلاف اس کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے سخت مغموم ہوں گے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہونگے، اور کہیں گے يَحْسَبُ لِي عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ افسوس اللہ کی دی ہوئی ہمت سے میں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور آج قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گیا۔ بہر حال ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل لوگوں کو نہ خوف ہوگا۔ اور نہ کسی قسم کا غم ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکصد و بست و دو (۱۲۲)

آیت ۲۷۸ تا ۲۸۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَلِّحُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ فَتُمْ ثَوَفَىٰ كُلِّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر تم (حقیقت میں) ایماندار ہو ﴿۲۷۸﴾ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، پس سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج۔ اور اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارے اصل مال تمہارے ہی ہیں نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائیگا ﴿۲۷۹﴾ اگر وہ شخص تنگ دستی والا مقررہ ہے، پس اس کو مہلت دینی چاہیے اسودگی تک۔ اور یہ کہ تم صدقہ کرو (بخش دو) یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کمایا، اور اُن پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۸۱﴾

ربط آیات

صدقہ و خیرات کی فضیلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت اور مذمت بیان فرمائی۔ گزشتہ درس میں سود و خورد کی قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کی حالت کا تذکرہ تھا۔ کہ وہ اپنی قبروں سے اس طرح منبھوٹا کھواس اٹھیں گے جیسے اُن کو جن چپٹ گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں مال جمع کرنے کی فکر

میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ ان کے نزدیک تجارت اور سود میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ تو گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ ”فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ“ یعنی وعظ و نصیحت کے ذریعے سود خور کو سود سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہو جائے تو بہتر و گمراہی سے لوگ ”أَصْحَابُ النَّارِ“ ہیں۔ ان کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ ”هَٰؤُلَاءِ فِيهَا“ خلدون یہ دائمی جہنمی ہیں۔

سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے جو آج کے درس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے۔ کسی بھی ملک و قوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی لہذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کی لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹائے، اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی، جس کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں طائف میں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے کچھ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ مکہ میں آباد بنو مغیرہ والے بنو ثقیف کے مقروض تھے۔ انہوں نے سود پر روپیہ لے رکھا تھا۔ جب اسلام کی شمع نے خطہ عرب کو منور کیا، تو یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ چونکہ بنو ثقیف کی رقم بنو مغیرہ کی طرف واجب الادا تھی، اول الذکر نے اپنی اصل رقم مجبوراً سود مطالبہ کیا، تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اسلام میں تو سود کا لین دین جائز نہیں ہے۔ لہذا اب تمہارا دعویٰ درست نہیں ہے۔

شانِ نزول

آخر معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر مسئلہ حل کر دیا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو وَذُرُوا صَافِي مِّنَ الرَّبَا اور سود کی بقیہ رقم چھوڑ دو، یعنی مطالبہ نہ کرو۔ اب یہ تمہارے لیے روانہ نہیں ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ اگر تم فی الحقیقت مومن ہو، یعنی اگر سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو، تو سود کا خیال قطعاً دل سے نکال دو۔

سود خوروں کے لیے تعزیر

اس آیت پاک میں سود خوروں کے لیے تعزیر کا بیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سودی کاروبار کو ختم کرنے کا انتظام کرے اور اگر سود خور سود خوری سے باز نہ آئے تو پھر ان کے خلاف جہاد کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی سود لینے سے باز نہ آئے، تو پھر فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا جَحْدٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج سن لو تمہارے خلاف جنگ ہوگی یہاں تک کہ تم اس بقیہ حرکت سے باز آ جاؤ۔ وَإِنْ تَبَيَّنَ پھر اگر تم نے توبہ نہ کی۔ سودی کاروبار کو ختم کر دیا فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ تو تمہارا اصل نہ رہے بل جائے گا۔ اور اس رقم پر جو سود لگایا گیا ہے۔ وہ نہیں ملے گا۔ وہ چھوڑنا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سود خور سے توبہ کرائے کہ آئندہ کے لیے سودی کام سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو معاملہ ختم ہو گیا اور اگر کوئی شخص توبہ سے انکار کرتا ہے، تو حاکم اسے سزا دینے کا پابند ہے، اور یہ سزا سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ جو تابعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر سود خور توبہ نہ کرے تو اسلامی نظام کے تحت ایسے شخص کا سر تلوار سے قلم کر دینا چاہیے۔ اب سود لینے والا دو طرح کا ہو سکتا ہے اگر ایسا شخص جو سود کو حرام نہیں سمجھتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور مرتد سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اسلام کے

ایک قطعی حکم کا انکار کیا ہے۔ لہذا اس کے خلاف جہاد ضروری ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے منکمرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور پھر یہ ہے کہ مرتد نے جو مال اسلام کے دور میں کمایا تھا، وہ اس کے مسلمان ورثا میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور جو مال اس نے ارتداد کے بعد کمایا تھا، وہ اسلامی بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔

سود و خمر کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اُسے حرام تو سمجھتا ہے۔ مگر لے رہا ہے ایسا شخص دین کا باغی ہے۔ اور ایسے شخص کے خلاف بھی جنگ ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں منکمرین زکوٰۃ نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ کا مال بیت المال میں جمع نہیں کرائیں گے۔ بلکہ اپنی مرضی سے اُسے خرچ کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جہاد کیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ سود کو حرام سمجھتے ہوئے بھی اسے وصول کرتے ہیں۔ وہ باغی ہیں۔ اور ایک اسلامی حکومت کو ایسے باغیوں کے خلاف جہاد کا حکم ہے۔ اور پھر باغی کا مال بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو مال واپس لے دیا جائے گا۔ اور اگر تائب نہ ہو، تو اس کا مال حکومت کے حق میں ضبط ہو جائے گا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ارتداد کے لیے صرف فرائض کا انکار ہی ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سنت کا بھی انکار کرے گا۔ تو مرتد ہو جائے گا۔ اہم محمدؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی لہتی کے لوگ اذان دینا ترک کر دیں، تو ان کے خلاف بھی جہاد ہو گا۔ اگرچہ اذان دینا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح اگر بعض مسلمان غثنہ کرنا چھوڑ دیں اور سمجھانے پر بھی اس پر آمادہ نہ ہوں، تو ایسے لوگ بھی باغی سمجھے جائیں گے۔ اور اسلامی قانون کے مطابق ان کے خلاف جہاد ہو گا۔ غثنہ کرنا بھی سنت ہے، فرض واجب نہیں ہے۔ مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے گا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے اعلان فرمادیا کہ جاہلیت کی تمام رسومات کو اللہ تعالیٰ نے میرے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ تمام سودی کاروبار ختم ہو گئے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے لوگوں کے سودی کاروبار ختم کرتا ہوں۔ حضرت عباسؓ کا سودی کاروبار بڑا وسیع تھا۔ آپ نے یکسر ختم کر دیا۔ اور سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں دی فرمایا کہ اپنی اصل رقم لے سکتے ہو تا کہ تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور سود لے کر دوسرے کو بھی نقصان مت پہنچاؤ۔

تنگ دست مقروض
کیلئے مہلت

اس کے بعد مقروض سے متعلق ایک خصوصی مسئلہ بیان کیا گیا ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ أَوْ اِغْرَقَ مَقْرُوضٌ تَنَگَ دَسْتٍ ہے وعدہ کے مطابق قرض واپس نہیں کر سکتا فَنَظَرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ طو اسے آسودگی تک مہلت دینی چاہیے۔ محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آیت کی رو سے تنگ دست کو مہلت دینا واجب ہو جاتا ہے اور اگر مقروض جان بوجھ کر مال مٹول کر رہتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ موجود ہونے کے باوجود مال مٹول کرنا اور قرض کی ادائیگی سے اعراض کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ اور ظالم شخص تعزیر کا مستحق ہوتا ہے۔ لہذا اگر شبہ ہو کہ مقروض کے پاس مال موجود ہے مگر ادا نہیں کرتا تو قرض خواہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اور حاکم ایسے مقروض کو قید میں ڈال سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس مال موجود ہے تو قرضہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے گا اور اگر عدالت کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص قرضہ لوٹانے کے قابل نہیں ہے تو اسے مہلت دی جاسکتی ہے۔

فرمایا وَإِنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر مقروض اس قدر مفلوک الحال ہے کہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔ تو ایسی حالت میں قرضہ بالکل معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ تَقْلَمُونَ اگر تم کچھ جانتے ہو۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ أَنْظَرَ مَعْسِرًا جس نے تنگ دست مقروض کو مہلت دی أَوْ وَضَعَ عَنْهُ یا اسے بالکل معاف ہی کر دیا، تو فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

معاذ دین
بہتر ہے

چیز ہے۔ بہر حال سورہ کے متعلق بعض تفصیلات بیان ہو گئیں، کچھ مزید باتیں سورہ آل عمران اور سورہ روم میں بھی آئیں گی۔

سورہ کے مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کر دو گے۔ آخرت میں مجاہدہ تو واثقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ اُس دن سے ڈر جاؤ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی قیامت کا دن آنے والا ہے۔ وہاں پر ہر شخص کا محاسبہ ہوگا ثُمَّ تُوفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر نفس کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی یہی آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے حضور علیہ السلام کی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر عرۃ اور جمعہ کے دن "الْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" والی آیت نازل ہوئی تھی۔ مگر یہ آیت واثقوا یوماً.... سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد آپ اس دنیا میں ۲۳ دن تک تشریف فرما رہے۔ شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر کے مطابق آپ صرف تین دن بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بہر حال حجۃ الوداع والی آیت کے ذریعہ اللہ نے تکمیل دین کا اعلان فرمایا اور پھر اس آخری آیت میں محاسبہ کی یاد دہانی کر کے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اس آیت کو سورہ بقرہ میں اسی مقام پر رکھنے کا حکم بھی خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّعَيَّنٍ
فَاكْتُبُوهُ ۖ وَلْيَكْتُب بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ
كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا
أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمْلِلَ هُوَ فليُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ

تو جمع ہو: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کرو وقت مقررہ ہو
تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھے کوئی لکھنے والا انصاف کے
ساتھ۔ اور نہ انکار کرے کوئی کاتب (لکھنے والا) اس بات سے کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو
اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ وہ لکھ دے۔ اور چاہیے کہ لکھوائے وہ شخص
جس کے اوپر حق ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرتا ہے جو اس کا پروردگار ہے اور
اس میں سے کسی چیز کو کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے اوپر حق ہے، بے عقل ہے یا
کمزور ہے، یا لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا، پس چاہیے کہ لکھوائے اس کا سرپرست
انصاف کے ساتھ۔

اس سورۃ کے چھتیسویں رکوع سے مالی مسائل بیان ہو رہے ہیں۔ پہلے صدقہ و
خیرات کے متعلق مختلف مسائل کا ذکر ہوا۔ پھر سود کی حرمت اور اس کے احکام بیان
ہوئے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرض یا ادھار کے قوانین نازل فرمائے
ہیں۔ یہ ایک دور کے ساتھ کہیں دین کے معاملات ہیں۔ ان میں تین بنیادی
قوانین ہیں اور ان کے ساتھ کچھ ضمنی مسائل ہیں۔ بنیادی قوانین میں

دستاویز کی
اہمیت

دستاویز کی تیاری، گواہ کا تقرر اور رہن کی تفصیلات شامل ہیں ان کے ذریعے ادھار کے معاملات میں کسی ممکنہ تنازعہ سے بچا جاسکتا ہے۔ آج کے درس میں تحریر یعنی دستاویز کی تیاری کے متعلق احکام ہیں۔ آج کے دور میں تحریر کر لینا ایک معمولی بات نظر آتی ہے۔ کیونکہ تعلیم عام ہے۔ اور یہ کام آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مگر چودہ صدیاں قبل جب کوئی پڑھا لکھا آدمی خال خال ہی نظر آتا تھا، تحریر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اُس وقت لوگ اپنے معاملات عموماً زبانی ہی طے کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے۔ لہذا تحریر کے یہ احکام نازل کیے گئے۔

کسی امر میں تحریر کر لینا کوئی فرض واجب تو نہیں مگر معاملات کی درستگی کیلئے مستحب کے درجہ میں آتا ہے معاملہ طے کر نیچے بعد آدمی بھول بھی سکتا ہے کہ کیا شرط تھیں کتنی مدت مقرر تھی نَسِیْ اَدَمَ قَدِیْتِ ذُرِّیَّتْہِ کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام سے چوک ہوئی تو ان کی اولاد بھی بھول جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات الٹا الٹی جھگڑے تک پہنچتی ہے اگر تحریر موجود ہوگی۔ تو تنازعہ کے وقت کام آئیگی۔ اور کوئی عدالت اس تحریر کی بنا پر فیصلہ کر سکیگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دستاویز کے احکام نازل فرمائے تاکہ معاشرہ میں اس وجہ سے بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیے تاکہ لوگ معاملات کو درست رکھ سکیں۔

تحریر کے مسائل

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا یعنی اے اہل ایمان! إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى جب تم کسی خاص مدت تک ادھار کا معاملہ کرو فَاكْتُبُوهُ پس اس کو لکھ لیا کرو۔ وَلْيَكُتَبْ بَيْنَكُمُ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ کیونکہ قلم کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ بسا اوقات اسکی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے لہذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللہ کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جب کہ اللہ نے اُسے علم دیا ہے۔ فَلْيَكُتَبْ بلکہ چاہیے کہ وہ لکھ دے یعنی جب کسی ان پڑھ شخص کو تحریر کی ضرورت ہو تو پڑھے

لکھے آدمی کو اسکی مدد کرنا چاہیئے۔ اور حسب ضرورت تحریر کر دینی چاہیئے اللہ تعالیٰ نے علم کی جو نعمت اُسے عطا کی ہے۔ اس میں بخل نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اُس نے علم کی دولت دی تو اُسے خدمتِ خلق کا موقع ملا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ مِنَ الصَّدَقَةِ اَنْ تُعَيِّنَ صَانِعًا اَوْ تَصْنَعَ لَهَا خَرَقًا یہ بھی صدقہ میں شامل ہے۔ کہ تو کسی کاریگر کی مدد کر دے یا کسی بے ہنر آدمی کو کوئی چیز بنا کر دے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی شخص ان پڑھ ہے۔ خود لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ تو اس کی فرائش پر تحریر کر دینا بھی صدقہ میں شامل ہے۔ علاوہ انہیں اپنے علم سے دوسروں کو استفیدہ کرنے والوں کے لیے حدیث شریف میں وعید بھی آئی ہے۔ مَنْ سَبَّ اَوْ عِلِمًا يَعْلَمُهُ جَسَسَ كَوْنِي اِیسی بات دریافت کی گئی جسے وہ جانتا ہے فَكُتِمَتْ بِحُجْرَتِهِ اُس نے اُسے چھپایا۔ ایسے شخص کے متعلق فرمایا اَلْجَسَّاسُ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ یَّوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت کے دن ایسے شخص کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ کیونکہ اس نے دانستہ چیز کو چھپا لیا۔ لہذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے علم کے مطابق حق و انصاف کے ساتھ تحریر کر دے۔

البتہ یہ بات ذہن میں ہے۔ کہ کاتب کے لیے تحریر کرنا واجب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مستحب کا درجہ رکھتا ہے مطلب یہ کہ کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کہ وہ ضروری یہ فرائش پوری کرے، اُسے انکار کرنے کا اختیار ہے۔ اور اگر لکھائی کی اجرت لینا چاہے۔ تو مناسب معاوضہ بھی جائز ہے۔ تاہم لکھ دینا بہتر ہے۔ کیونکہ مستحسن بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسکی تعریف دلائی ہے تاکہ ضرورت مند کی خدمت کی جائے کہ یہ بھی خدمتِ خلق کا ایک حصہ ہے۔

قرض اور دین (ادھار) میں قدرے فرق ہے۔ اگرچہ دونوں الفاظ ادھار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ادھار یا دین عام ہے۔ اور قرض خاص ہے قرض صرف رقم کے ادھار پر بولا جاتا ہے۔ جب کہ دین میں ہر قسم کا ادھار شامل ہے خواہ وہ نقد رقم کا لین دین ہو یا کسی چیز کے بدلے میں ادھار ہو۔ قرض کے متعلق

قرض اور دین
میں فرق

پہلے بیان ہو چکا ہے "مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا" جو اللہ کو قرض حسن
 دے۔ یعنی کسی ضرورت مند کو مقررہ مدت کے لیے نقد رقم ادھار پر دے دے اور اس سے
 زائد وصول نہ کرے۔ اگر نقد رقم کی واپسی پر اُس کے ساتھ کچھ زائد وصول کرے گا تو وہ
 سود ہوگا، جسکی حرمت کا بیان آچکا ہے۔ البتہ اگر کسی چیز کے تبادلے کے ضمن میں کوئی
 نقد رقم واجب الادا ہے۔ تو وہ ادھار ہے۔ اس صورت میں چیز بیچنے والا اپنی
 اصل لاگت سے زائد بھی لے سکتا ہے۔ جسے منافع کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس
 آیت کریمہ میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔ کہ جب تم مقررہ مدت کے لیے ادھار کا معاملہ
 کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ کوئی شخص مکان یا زمین بیچتا ہے۔ کوئی جانور فروخت کرتا ہے
 جنس کا سودا ہوتا ہے۔ اور رقم کی ادائیگی کے لیے تاریخ یا دن کا تقرر ہوتا ہے۔ تو مشتری
 کے ذمے دین یعنی ادھار ہے۔ جو وہ مقررہ تاریخ پر ادا کرنے کا پابند ہے۔ عام طور
 پر خرید و فروخت نقد ہوتی ہے۔ مالک کے پاس چیز موجود ہے۔ اور گاہک کے پاس
 رقم موجود ہے۔ تو تبادلہ دست بدست ہو جائیگا۔ اور اگر گاہک قیمت کی ادائیگی کے لیے
 مہلت طلب کرے۔ تو یہ ادھار کہلائے گا۔ ہاں اگر دونوں طرف چیز موجود نہ ہو۔ نہ
 تو مالک کے پاس چیز موجود ہے اور نہ گاہک کے پاس رقم اور سودا طے پا جاتا ہے
 مثلاً زمیندار کہتا ہے کہ آئندہ فصل پر میں فلاں جنس اس بھاؤ پر فروخت کروں گا۔ یا
 کارخانے کی فلاں مہینے کی فلاں پیداوار اتنے دام میں دوں گا، اور گاہک اُسے تسلیم کر
 لیتا ہے۔ تو شرعی اصطلاح میں اُسے "بیع الکالی بالکالی" کہتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے
 نہی عن بیع الکالی بالکالی ایسی خرید و فروخت سے شریعت نے منع کر دیا ہے۔

خرید و فروخت کی باقی دو صورتیں جائز ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ قیمت
 موجود ہے مگر چیز موجود نہیں وہ ادھار ہے۔ اس کو بیع سلم کہتے ہیں حضور علیہ السلام
 کا ارشاد ہے۔ فَلْيُسَلِّمْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوزنٍ مَعْلُومٍ إِلَى أَحَبِلٍ
 یعنی بیع سلم بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب کہ اسکی پیمائش، وزن یا مدت
 معلوم ہو اور جگہ بھی معلوم ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ جنس بھی معلوم ہونی چاہیے

اور بھاؤ طے کر لینا ضروری ہے۔ مثلاً دو فریقوں کے درمیان طے پاتا ہے۔ کہ فلاں چیز یا جنس کا اتنے تول یا ماپ میں فلاں تاریخ کو اس بھاؤ سے لین دین ہوگا۔ چنانچہ قیمت نقد ادا کر کے سودا طے پاتا ہے۔ تو یہ درست ہے۔ چیز کے ماپ تول میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور بھاؤ کے مطابق اس کی کل قیمت میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بیع سلم کے لیے بعض دیگر شرائط بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سوئے کی مدت کم از کم پندرہ دن ہونی چاہیے۔ بعض نے ایک ماہ کا تعین کیا ہے۔ ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کا سودا ہو رہا ہے وہ مارکیٹ سے بالکل معدوم نہ ہو بلکہ معاہدہ طے پاتے وقت بازار میں موجود بھی ہو۔ اس قسم کی بیع میں مدت تبادلہ واضح ہونی چاہیے۔ اگر مدت کا تعین نہیں ہوگا تو بیع درست نہ ہوگی۔ مثلاً اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے۔ کہ جنس کا تبادلہ اس وقت ہوگا جب فصل پکے گی جب کہ فصل پکنے اور کٹنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص یہ سودا کرتا ہے۔ کہ جب جانور بچہ دیگا، اس وقت قیمت ادا کی جائے گی۔ اس قسم کی مجہول مدت قابل قبول نہیں اور ایسی بیع فاسد شمار ہوگی۔ أَجَلٌ مُّسَمًّى کا لفظ وضاحت کر رہا ہے۔ کہ مدت کا تعین لازمی ہے کہ فلاں دن یا فلاں تاریخ کو چیز وصول کی جائے گی۔ اور اگر مدت مجہول ہو تو اسے بیع الغمر کہتے ہیں۔ یہ دھوکے والی بیع ہے۔ اور شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔

بیع سلم کی دوسری صورت یہ ہے۔ کہ چیز موجود ہے، وہ گاہک وصول کر لیتا ہے۔ مگر قیمت فوری طور پر ادا نہیں کرتا بلکہ خاص مدت کے لیے ادھار کر لیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا حضور! آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ فلاں یہودی کے ہاں کپڑا موجود ہے۔ آپ پیغام بھیج کر کپڑا ادھار لے لیں۔ اور مدت مقررہ پر رقم ادا کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے یہودی کو ایسا پیغام بھیجا تھا، مگر اس نے کپڑا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے۔ مدت مقررہ کے قیمت کا ادھار کیا جاسکتا ہے۔

ادائیگی قرض کا
عجیب واقعہ

قرض کی واپسی کس قدر ضروری ہے۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے سابقہ امت کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔ فرماتے ہیں۔ ایک شخص نے دوسرے سے مقررہ مدت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیا۔ قرض خواہ نے کہا۔ کہ کوئی گواہ لاؤ، تو ضرورت مند کہنے لگا۔ میرا گواہ تو اللہ ہی ہے۔ پھر اس نے کہا، کوئی ضامن ہی لاؤ۔ تو وہ کہنے لگا، میرا ضامن بھی اللہ ہی ہے۔ غرض اس نیک دل آدمی نے بغیر گواہ اور ضامن کے ایک ہزار دینار قرض میں دے دیے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا، تو مقرض دریا سے اُس پار سفر پر تھا، تاہم اُسے ادائیگی قرض کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ کنائے پر آیا، مگر کوئی کشتی نہ پائی جو اُسے دوسرے کنائے پر پہنچا دے۔ سخت پریشان تھا، کہ قرض کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے گی۔ اسی سوچ بچار میں اُس نے دونوں ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے اٹھائیے اور عرض کیا، مولاکریم! میں نے فلاں شخص کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اسی رقم فلاں تاریخ کو لوٹا دوں گا۔ رقم موجود ہے۔ مگر دریا کے پار جانے کے لیے سواری موجود نہیں۔ اگر قرض خواہ کو رقم وقت پر نہیں ملتی تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ اے اللہ! اب تو ہی اس کا انتظام فرما۔ آخر اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ایک لکڑی لی۔ اس کو کھوکھلا کر اس میں ایک ہزار دینار اور قرض خواہ کے نام ایک رقم رکھ دیا۔ پھر اس کا منہ اچھی طرح بند کر کے اس کو دریا میں ڈال دیا اور خود پھر ادھر ادھر کشتی تلاش کرنے لگا۔ ادھر قرض خواہ کو یاد آیا کہ آج قرض کی ادائیگی کی تاریخ ہے۔ اور مقرض دریا سے اُس پار گیا ہوا ہے۔ پتہ نہیں آتا ہے یا نہیں۔ اسی خیال میں وہ دریا کے کنائے پہنچا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی کشتی آتی دکھائی نہ دی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ وہ واپس آنے ہی والا تھا۔ کہ اُسے بہتی ہوئی ایک لکڑی نظر آئی۔ اُسے قریب سے لکڑی کو بچھڑایا کہ گھر میں کسی کام آئے گی۔ یا ایندھن کے طور پر ہی استعمال کر لیں گے۔ گھر پہنچ کر جب اس کو توڑا گیا۔ تو اس میں سے ایک ہزار دینار اور مقرض کا رقم ملا۔ وہ شخص اپنا قرض واپس پا کر مطمئن ہو گیا۔

کئی دن بعد مقرض شخص کو کشتی میسر آگئی چنانچہ وہ دریا پار کر کے قرض خواہ کے ہاں پہنچا۔ اور اُسے ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اس کے ساتھ معذرت بھی کی کہ وہ قرض کی رقم مقررہ تاریخ پر نہ لوٹا سکا۔ کیونکہ اُسے کشتی میسر نہیں آئی تھی۔ مگر قرض خواہ نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے رقم واپس مل چکی ہے۔ جب مقرض نے زیادہ اصرار کیا تو قرض خواہ نے کہا کہ تم حلفیہ بیان کرو کہ کیا تم نے ایک ہزار دینار لکڑی میں بند کر کے سمندر میں نہیں بہا دیے تھے۔ آخر کار اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ اُس نے واقعی تاریخ مقررہ پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا۔ یہ واقعہ نبی علیہ السلام سے صحیح سند کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہوتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کر کے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ پکے پکے مسلمانوں کا شیوہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جیسے ان دو مسلمانوں کا تھا۔ کہ قرض دینے والے نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا۔ اور لینے والے نے دوبارہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مگر آج کے مسلمان کا حال یہ ہے۔ کہ مقررہ تاریخ گزر جاتی ہے۔ قرض خواہ پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ اور مقرض ٹال مٹول کرتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے۔ نہ مقرض کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ اور نہ قرض خواہ اسکی مجبوری کو سمجھتا ہے دونوں خود غرضی کا شکار ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جب فریقین نیک نیت ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد فرماتا ہے۔

دستاویز کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ دستاویز کی تیاری کس کا حق ہے۔ یعنی کون فریق اس کو لکھوانے کا حقدار ہے۔ فرمایا وَلْيُحْمِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ كَيْفَ تَحْرِيرِ وَشَخْصِ كَرَّائِي جَعَلِي اَوْ بِرِ حَقِّ هِيَ۔ اور وہ مدیون یا مقرض ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ قرضہ کی شرائط ٹھیک ٹھیک لکھوائے۔ اور اس معاملہ میں کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور اپنے پروردگار سے ڈر جائے۔

تحریر مدیون کا حق ہے

وَلَا يَدْخُسُ مِنْهُ شَيْئًا اور تحریر کرتے وقت کسی چیز کی کمی نہ کرے، بلکہ دستاویز بالکل درست طور پر لکھوائے۔ کہ اتنی رقم یا فلاں چیز قرض پر لی گئی ہے۔ اور یہ فلاں تاریخ کو فلاں جگہ واپس کرنی ہے۔ بعض اوقات لکھاتے وقت بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اور تحریر میں زبانی معاہدے کے برخلاف لکھواتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے اور انصاف کی بجائے ظلم قائم ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لکھوانے والا اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ درست طریقے سے دستاویز تیار کر سکے۔

ایسی صورت کے متعلق فرمایا فَاِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا اَوْ ضَعِيفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيعُ اَنْ يَّعْمَلَ هُوَ يَعْنِي اگر مقروض جسے دستاویز لکھوانے کا حق ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے۔ یا تحریر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مقصد یہ کہ اس میں کوئی ایسی فطری کمزوری ہے جسکی بنا پر وہ درست تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کم عقل ہے۔ کہ معاملے کو سمجھتا نہیں۔ یا بہت کمزور یا بوڑھا ہے کہ جو اس درست نہیں یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے لکھانے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو فرمایا فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ اس کے ترجمان، ولی، سرپرست، نمائندہ یا وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ تحریر مکمل کر دے۔ اور کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے۔ اور ہمارے متعلق باقی دو قوانین یعنی گواہی اور رہن کا ذکر آئندہ دروس میں آئیگا۔

وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا
 رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
 أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا
 يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْعَ سُوءًا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا
 أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ
 وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا
 بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا
 إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفْعَلُوا
 فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ
 شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾

ترجمہ: اور گواہ بنا لو دو گواہ اپنے مردوں میں سے۔ پس اگر نہ ہوں "مرد، تو ایک مرد
 اور دو عورتیں ان میں سے جن کو تم گواہوں میں سے پسند کر سکتے ہو اس وجہ سے کہ
 اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ اور
 گواہ انکار نہ کریں جس وقت ان کو بلایا جائے گواہی کے لیے، اور نہ دیکر ہو اس
 بات سے کہ لکھو تم معاملے کو چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک، یہ بات زیادہ انصاف
 والی ہے اللہ کے نزدیک، اور گواہی کو زیادہ درست سمجھنے والی ہے۔ اور یہ
 زیادہ قریب ہے کہ تم شک نہ کرو مگر یہ کہ درست بدست تجارت ہو جس کو تم اپنے
 درمیان گردش دیتے ہو۔ اور تم پر گناہ نہیں ہے۔ اس بات میں کہ اسے نہ لکھو، اور
 گواہ بنا لو جس وقت تم سودا کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو

اور نہ گواہ کو، اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے اندر فسق اور نافرمانی والی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۲۸۲)

ادھار کے معاملے سے متعلق تین قوانین کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے یعنی دستاویز کی تیاری، گواہی اور رہن۔ ان میں دستاویز یعنی تحریر کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ آج کے درس میں گواہی سے متعلق احکام ہیں اور اس کے ساتھ تحریر کی دوبارہ تاکید آئی ہے۔ البتہ تیسرے اصول یعنی رہن کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آئے گا۔

آپس میں لین دین کرتے وقت یا کوئی دیگر معاملہ طے کرتے وقت فرمایا اِسْتَشْهِدُوا مِثْلَ دَیْنِ مَنْ رَجَالَکُمْ اپنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو۔ گواہی کی ضرورت مختلف معاملات میں پڑتی ہے۔ مثلاً مقدمات میں سے فوجداری مقدمہ اور دیوانی مقدمہ میں گواہی کے معیار مختلف ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات اور نبوی معاملات میں گواہی کی شرائط مختلف ہیں۔ تو جس قسم کا معاملہ درپیش ہوگا اس کے مطابق گواہی کی شرائط عائد ہونگی۔ عام معاملات میں اس آیت کی رو سے کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ مگر حدیث نبوی کی روایت کے متعلق ایک ثقت دہی کی شہادت بھی کافی ہے۔ عام معاملات میں آزاد مرد کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے، غلام کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ روایت کے مسئلہ میں اگر استاد اور شاگرد یہ مجلس میں موجود ہوں تو شاگرد کی روایت مقبول ہے۔ مگر دینی معاملہ میں شہادت علی الشہادۃ اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب اصل موجود ہو، تو فرع کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ یعنی اصل کی موجودگی میں فرع گواہی نہیں دے سکتا۔

اس آیت کریمہ میں جس گواہی کا ذکر ہے، وہ عام معاملات سے متعلق ہے ان میں سے فوجداری مقدمات میں سے حدود و قصاص کے مقدمات میں صرف مردوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ زنا کے مقدمہ میں سورۃ نور میں "بَارِئَعَةً شَہِدَاً" کا ذکر ہے۔ یعنی چار مرد یعنی گواہ

ہونے چاہئیں۔ وہاں پر عورتوں کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ عام طور پر نابالغ بچے کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی، مگر اہم مالک بعض شرائط کے ساتھ بچے کی گواہی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دیگر ائمہ کا موقف یہ ہے کہ گواہی کے سلسلے میں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد بالغ مرد ہے، نہ کہ نابالغ بچہ، اسی طرح مسلمان کی گواہی معتبر ہے۔ مگر کافر کی گواہی قابل قبول نہیں۔ جب کہ وہ مسلمان پر ہو۔ ہاں کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف درست ہے۔ علاوہ ازیں گواہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ فاسق کی گواہی معتبر نہیں۔ جو شخص شرعی حدود کی علی الاعلان خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ فاسق ہے اور ایسے شخص کی گواہی بھی مقبول نہیں۔ پھر گواہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس معاملے کے متعلق گواہی دے رہا ہے۔ اس معاملے کا اسے علم ہو۔ اگر اسے علم ہی نہیں۔ تو پھر اس کی گواہی چہ معنی؟ وہ تو جھوٹا گواہ کہلائے گا۔

شہادت میں گواہ کا ذاتی مفاد نہیں ہونا چاہیے اگر اسے کوئی ذاتی فائدہ پہنچ رہا ہے تو ایسی گواہی مردود ہوگی۔ یا اگر گواہ اس لیے گواہی دے رہا ہے کہ وہ خود کسی نقصان سے بچ جائیگا تو ایسی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اسی طرح گواہ لالچی اور بے شرم نہیں ہونا چاہیے جس کے خلاف گواہی دے رہا ہے اسے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ گواہی باطل ہو جائیگی فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جہاں تمام کا اطلاق ہوتا ہو وہاں بھی گواہی قبول نہیں کی جائیگی مثلاً باپ بیٹے کے بارے میں گواہی دے تو نا منظور ہوگی۔ یا غلام نوکر وغیرہ اپنے مالک کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ محکوم ہے اور لازمًا اپنے حاکم کے حق میں جلدیگا۔

فرمایا معتبر گواہی یہ ہے کہ تم میں سے دوسرے گواہی دیں فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ اور اگر دوسرے گواہ میسر نہ ہوں فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ یعنی دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا۔ اور یہ گواہ ایسے ہوں مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ جو تم میں پسند ہوں۔ ظاہر ہے کہ پسند وہی ہونگے جو نیک اور عادل ہوں گے۔ جن سے ٹھیک ٹھیک گواہی کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ غیر ثقہ اور جھوٹ آدمی سے درست گواہی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

فرمایا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو اکٹھا رکھنے میں حکمت یہ ہے۔ أَنْ تَضِلَّ أَحَدُهُمَا اگر ان میں سے ایک بھول جائے۔ فَتُذَكَّرَ

عورتوں کی گواہی

اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰی تو دوسری اُسکو یاد دلانے کیونکہ عورتیں عام طور پر مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں، ان کے دماغ میں رطوبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اُن سے نسیان زیادہ واقع ہوتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں یہ ایک انسانی فطرت ہے وگرنہ بعض عورتیں بڑھی ذہین ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایک لڑکی امتحان میں لڑنے کے لیے زیادہ نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت بخشی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین ثابت ہوتی ہیں۔ تاہم عام فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون عطا کیا۔ کہ چونکہ عورت کا مزاج اعصابی ہوتا ہے۔ اکثر بھول جاتی ہیں۔ اللہ نے دماغی کیفیت ہی ایسی بنائی ہے۔ لہذا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ خطبہ کے دوران فرمایا کہ عورتیں ناقصات العقل والذہن ہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا کہ ہم ناقص العقل کیوں ہیں۔ ہم میں کیا کمزوری پائی جاتی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا اللہ نے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر نہیں رکھی۔ تو اس نے عرض کیا۔ ہاں حضور الیہا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ عورت میں نسیان یعنی بھول کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ عورتوں میں دین کا نقصان یہ ہے۔ کہ وہ ہر ماہ کئی کئی روز تک نماز نہیں پڑھ سکتیں، روزہ نہیں رکھ سکتیں، یہ دین کا نقصان ہے۔ اگرچہ گناہ نہیں ہے۔ یہ اُن کی مجبوری ہے مگر نقصان تو بہر حال ہے۔

شہادت اور قسم

یہ شہادت کا قانون ضروری ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ دو طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ یا تو فریقین گواہ پیش کریں گے یا فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ قَضٰی بَیِّنٍ وَشَہِدٍ یعنی حضور علیہ السلام نے یا تو گواہوں پر فیصلہ فرمایا یا قسم پر۔ یعنی اگر گواہ موجود نہیں ہیں۔ تو پھر فیصلہ قسم کے ذریعے ہوگا۔ اہم شافعیؒ تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ معاملات میں چونکہ دو گواہ ضروری ہیں۔ اور اگر دو کی بجائے صرف ایک ہی گواہ میسر ہو، تو دوسرے

گواہ کی کبھی قسم اٹھانے سے پوری ہوگی، وگرنہ فیصلہ درست نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں۔ البینۃ علی المدعی والیصین علی من النکر یعنی گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ بہر حال حضورؐ نے بعض اوقات گواہوں پر فیصلہ کیا اور بعض اوقات قسم پر یعنی اگر موقع کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ تو مدعا علیہ کی بیعت کے متعلق اس سے قسم اٹھوائی کہ وہ بے گناہ ہے۔

گواہ کی ذمہ داری

گواہوں کی حاضری کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا اور جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ گواہی کے لیے آنے سے انکار نہ کریں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ کوئی معاملہ الجھ گیا ہے۔ وہ موقع کے گواہ ہیں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک شہادت دیکر معاملہ کا تصفیہ کر دیں۔ یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ تاہم فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ گواہ کا گواہی دینا استجاب کے درجے میں ہے، اسے گواہی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر معاملہ اس پہنچ کا ہے۔ کہ کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک گواہ ہے۔ جو شہادت دینے پر آمادہ نہیں۔ تو ایسی صورت میں اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ کہ وہ گواہی کے لیے حاضر ہو، وہاں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ایسے ہی معاملہ سے متعلق فرمایا۔ کہ جب گواہوں کو شہادت کے لیے طلب کیا جاوے تو وہ انکار نہ کریں۔

جھوٹی گواہی

حضور علیہ السلام نے جھوٹی گواہی (شہادت زور) کو شرک کے برابر قرار دیا، خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں عباد الرحمن کی صفات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے۔ "وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ" کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی دینا سخت گناہ کی بات ہے۔ اس کی وجہ سے ہی جھوٹ کا سچ اور سچ کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ انگریز کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق شہادت خود بنائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں گواہ آزاد نہیں ہوتا۔ کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق

شہادت دے بلکہ وکیل حضرات اور خود پولیس والے گواہ کو سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ کہ اس طرح کنسا ہے۔ اور اس طرح نہیں کہنا۔ یہ چیز دینتاری کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے۔ "أَقِمْ وَ الشَّهَادَةَ لِلَّهِ" اللہ کے لیے بغیر کسی رو رعایت کے گواہی دو۔ کسی امیر غریب، چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ کا لحاظ نہ کر۔ بلکہ صحیح صحیح واقعہ بیان کر دو۔ نہ کسی فریق سے ناجائز امید رکھو اور نہ کسی کے شر کا خوف دل میں لاؤ بلکہ گواہی کو محض اللہ کے لیے قائم کر دو۔ اگر یہ چیز پیدا نہ ہوگی، تو دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ لوگ ذلیل و خوار ہی ہوتے رہیں گے۔ لہذا گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے بغیر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

تحریر کب
ضروری ہے

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کی دوبارہ تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا
وَلَوْ قَسَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَفِيًّا أَوْ كَيْدًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّعَدٍّ سَأَلَهُمْ شَوْاهُ سِوَاهُ سِوَاهُ سِوَاهُ
بڑا معمولی نوعیت کا ہو یا اہم ٹسے لکھنے میں دلگیر نہ ہوں یعنی تحریر میں تساہل نہیں کرنا
چاہیے۔ بلکہ ٹسے مدت مقررہ تک لکھ لینا چاہیے۔ مستدرک امام حاکم کی روایت
ہے جسے امام ابن کثیر نے بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا، کہ تین قسم کے آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ پہلا شخص وہ ہے
جو خود مومن اور عادل ہے۔ مگر اس کی بیوی بد کردار، بد اخلاق اور فاسق ہے وہ
سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتی۔ اگر ایسا شخص بڑی عورت کو طلاق دے کر جدا نہیں
کرتا، تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دوسرا
شخص وہ ہے۔ جو کسی یتیم کا سرپرست ہے مگر یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے
ہی اس کا مال اس کے حوالے کر دیتا ہے اور بچہ مال کو ضائع کر دیتا ہے۔ یا
شخص کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، فرمایا، تیسرا شخص وہ ہے، جو کسی کو قرض دیتا
ہے مگر اسے لکھتا نہیں، یہ شخص بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے
لہذا اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

فرمایا تحریر کر لینا ذلکُمُ اقْسَطُ عِنْدَ اللہِ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ

انصاف والی بات ہے۔ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی چیز ہے۔ وَأَدْنَى الْأَثَرِ تَابُوا اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک و شبہ میں نہ پڑو۔ یہ سب تحریر کے فوائد میں سے ہیں۔ ہاں ایک صورت میں عدم تحریر کی گنجائش ہے إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُوكَ بِئِنَّكُمْ کہ دست بہ دست تجارت ہو جسے تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو۔ یعنی معاملہ ایسا ہو۔ کہ ادھر چیز لی اور ادھر رقم ادا کر دی یعنی سود بالکل نقد ہے۔ اس میں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ إِلَّا أَنْ تَكْتُبُوهَا تو پھر نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تحریر کا مقصد قہر ہے۔ کہ مقرر مدت پر جب لین دین ہوا تو کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ مگر جب ادھار کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ اور تعین مدت کا سوال ہی نہیں تو پھر تنازعہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہذا نقد معاملے میں تحریر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر ایسی صورت میں بھی کوئی لکھنا چاہے۔ تو احسن ہے۔ اگر آئندہ زمانے میں معاملے کی نوعیت معلوم کرنا چاہو، تو تحریر کے ذریعے ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ تاہم ایک عام اصول یہ بتایا کہ لین دین کے معاملہ میں وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ مسودا کرتے وقت گواہ ضرور بنا لو، اگر اس کی تحریر نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر گواہ ضرور بنا لو۔ کہ لین دین کا معاملہ ہے کسی وقت بھی کوئی تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے عہدہ بدل ہونے کے لیے گواہی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں کتابت اور گواہ کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ وہاں کاتب اور گواہ کا تحفظ بھی فرمایا ہے۔ تنازعہ کی صورت میں بعض اوقات فریقین کے ساتھ کاتب اور گواہ کو بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی شخص گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اُسے کتنی دفعہ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ اور اُس کا کتنا وقت ضائع ہوگا۔ اور پھر جس کے خلاف گواہی دیگا۔ وہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اُسے نقصان پہنچائے گا۔ گواہی سے باز رکھنے کے لیے کتنے

کاتب اور
گواہ کا تحفظ

گواہوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے معاملے کے فریقین کو نصیحت فرمائی ہے وَلَا يَضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اگر ان اصحاب کو اور کوئی تکلیف نہ ہو تو کم از کم ان کے وقت کی قدر اور ان کی سواری کا انتظام تو ہونا چاہیے تاکہ کسی دوسرے شخص کی گواہی کے لیے انہیں ذاتی طور پر نقصان نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دو، اُسے نقصان نہ پہنچاؤ۔

فرمایا وَإِنْ تَفْعَلُوا اگر تم ایسا کر دو گے، ان شریف آدمیوں کو نقصان پہنچاؤ گے، ان کا تحفظ نہیں کرو گے۔ فَإِنَّهُ قَسْوَقٌ بِكُمْ یہ فسق ہو گا، خدا کی اطاعت سے باہر نکلنے کے مترادف ہو گا، لہذا جہاں اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہو، وہاں کاتب اور گواہ کی جان و مال کے بھی محافظ بنو، اور انہیں ناجائز تکلیف نہ پہنچاؤ۔

خوف خدا فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا معاملہ لین دین کا ہو یا نکاح طلاق کا، ہر حالت میں خوف خدا کو دل سے نہ نکالنا۔ دنیا کے معاملات کے متعلق ہمیر اچھیری کر کے، دھوکا اور فریب دیکر معاملے کو رفع دفع کر لینے سے بظاہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ یاد کر رہے ہیں۔ کہ یہ معاملہ ایک دین اللہ کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے۔ یہاں تو تم چالاکی کر کے مواخذہ سے بچ جاؤ گے، مگر اس سب سے بڑی عدالت کے سامنے کوئی چال کام نہیں آئیگی۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ لہذا اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس کی عدالت میں بالآخر تمہیں پیش ہونا ہے۔ فرمایا وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ اللہ تمہیں ایسی ہی نیکی اور اچھائی کی باتیں سکھاتا ہے۔ دلیوانی اور فوجداری مقدمات کے معاملات اور ان کے متعلق احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے۔ ان پر عمل کرو گے تو اس دنیا میں بھی چین کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں بھی اسکی گرفت سے بچ جاؤ گے اور یاد رکھو وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ تمہارے حال سے ناواقف ہے بلکہ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے لہذا تم اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے

اپنے اعمال کو ہمیشہ درست رکھو گے، تو فلاح پاؤ گے۔

قرآن پاک کی یہ سب سے لمبی آیت ہے اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے
 بیسیوں مسائل بیان فرمائے ہیں۔ تاہم لہن دین کے معاملے میں دو قوانین یعنی تحریر اور
 گواہ کا بیان آچکا ہے۔ اب اگلی آیت میں تیسرے اہم قانون رہن کا تذکرہ ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَّةُ ۲

درس یکم بابت بیع (۱۲۵)

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ
مَقْبُوضَةً فَإِنْ أَتَى بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي
أُؤْتِمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ
وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ (۲۸۳)

تین چیزیں : اور اگر تم سفر میں ہو، اور کاتب (لکھنے والے) کو نہ پاؤ، پس رہن ہے
قبضہ کیا ہوا۔ پس اگر تمہیں بعض کو بعض پر اعتبار ہو، پس چاہیے کہ وہ شخص ادا کرے
اس چیز کو جس میں اس پر اعتبار کیا گیا ہے اور جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے۔ وہ
اپنی امانت کو ادا کرے اور ڈرتا ہے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور مت چھپاؤ
گواہی کو۔ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائیگا۔ بیشک اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ
جو کچھ تم کام کرتے ہو، اس کو خوب جانتا ہے۔ (۲۸۳)

ربطہ

اس سے پہلے لین دین کے معاملے سے متعلق دو احکام کا بیان آچکا ہے۔
سب سے پہلے اللہ جل شانہ نے تحریر کے متعلق احکام اور اس کی اہمیت بیان
فرمائی۔ پھر ایسے معاملات میں گواہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ذکر فرمایا۔ اب اگلی
آیت میں تیسرے اصول یعنی رہن کے متعلق مسائل کا تذکرہ ہے۔ یعنی جب کسی کو
ادھار دو اس کے بدلے میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو۔ جب قرضہ واپس ہوگا
تو رہن شدہ چیز واپس کر دی جائے گی۔

مسلکہ رہن

رہن وہ چیز ہوتی ہے۔ جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے
اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ
اس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کر لے، اور جو کچھ باقی بچے وہ مقرض کو لوٹائے

اس اصطلاح میں مقروض یا مدیون کو راہن کہتے ہیں کہ اُس نے کوئی چیز راہن رکھی ہے اور جس کے پاس راہن رکھی جاوے وہ سرتن کہلاتا ہے۔ راہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر راہن مکمل نہیں ہوتا۔ فَرِهْن مَقْبُوضَةٌ میں اسی طرف اشارہ ہے راہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جاسکتی ہے مثلاً مکان، زمین، باغ، جانور، زیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ اور اگر تم سفر پر ہو وَلَكُمْ تَجْدُوا كَاتِبًا اور کاتب نہ ملے فَرِهْن مَقْبُوضَةٌ پس راہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں راہن کے لیے سفر کی حالت ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم سفر کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو، مگر فقہائے کرام اور محدثین عظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ راہن حضر یعنی اقامت کی حالت میں بھی درست ہے۔ اور یہاں پر سفر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس عمل کی ضرورت سفر میں زیادہ پڑتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ لکھنے والا میسر نہ ہو تو پھر اس کے بغیر چارہ نہیں کہ سرتن راہن کی کوئی چیز بطور راہن رکھ لے۔ اور جب راہن قرضہ واپس کرے تو اپنی سرتن چیز واپس لے لے۔ اقامت کی حالت میں راہن خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، بخاری اور ترمذی شریف کی صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے اپنے گھریلو اخراجات کے لیے مدینہ کے ایک یہودی (الواشم) سے بیس صاع اور بعض روایات کے مطابق تیس صاع اناج ادھار پر لیا تھا۔

اور اس کے بدلے میں اپنی درع یہودی کے پاس راہن رکھی تھی مگر آپ اسے اپنی حیات مبارکہ میں واپس نہ لے سکے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے قرض ادا کر کے درع واپس لی مقصد یہ کہ راہن آپ نے مدینہ میں قیام کے دوران رکھا تھا۔ لہذا اس آیت میں سفر کی قید اتفاقی ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سرتن راہن تندرہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں مثلاً زیور پہن سکتا ہے یا نہیں، باغ کا پھل یا زمین کی پیداوار حاصل کر سکتا ہے یا کوئی دودھ دینے والا جانور ہے، تو اس کا دودھ پی سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے

راہن شدہ چیز سے
فائدہ اٹھانا جائز
نہیں

ہے۔ کہ اگر امانت واپس نہ کی، تو اس کا ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیگا،

کتمانِ شہادت
گناہ ہے

گواہی کا مسئلہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ گواہ کون ہو اور گواہی کا نصاب کیا ہے یہاں پر شہادت کا ایک دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کسی معاملے کو جانتا ہے۔ اور وہ تنازعہ کے تصفیہ میں معاون ہو سکتا ہے۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ تو پھر شہادت کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا اور جو کوئی شہادت کو چھپائیگا فَانْهَ اِنَّهُ قَلْبُهُ تو اس کا دل گنہگار ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر دل کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ دل جسم انسانی میں ایک اعلیٰ حیثیت کا جزو ہے۔ اگر دل کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور دل کا بگاڑ پورے جسم کا بگاڑ ہے۔ دل مرکزِ اخلاق ہے۔ عقیدہ کی اچھائی یا برائی کا تعلق بھی دل سے ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا۔ حقیقت میں اس کا دل گنہگار ہے۔ اس کے دل میں فتور ہے۔ ورنہ وہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان کے جسم میں ایک ٹوٹھڑا ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے۔ تو سارا جسم ٹھیک ہے۔ اگر وہ بگڑ گیا ہے۔ تو سارا جسم خراب ہے فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ یاد رکھو وہ ٹوٹھڑا دل ہے۔ جس پر سارے جسم کا دار و مدار ہے۔ یہ دل ایسی چیز ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں سزا کا ذکر کیا ہے۔ تو وہاں بھی فرمایا تَطَّلِعُ عَلَى الْافْتِدَةِ جہنم کی آگ کا اثر پہلے دل پر ہوگا۔ پھر جسم پر ہوگا۔ اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب گواہی نہ دینے سے کسی کا حق ضائع ہو رہا ہو تو پھر گواہ کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور گواہی دے۔ گواہ کی یہ ذمہ داری وجوب کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اگر گواہی سے انکار کرتا ہے۔ تو کتمانِ شہادت کا مرتکب ہو کر گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی جھوٹی شہادت دیتا ہے۔ تو وہ بھی کتمانِ شہادت کا مرتکب تصور ہوگا۔ گویا گواہی کو چھپانا جھوٹی گواہی دینا برابر ہے۔

شہادت کا

یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ جب کسی شخص پر کوئی چیز واجب ہو جائے، تو پھر

اس کی عدم ادائیگی گناہ کا باعث ہوگی۔ لہذا اس کے لیے اس کام کا معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر ایسا کرتا ہے تو اس نے واجب کی ادائیگی نہیں کی بلکہ مالی منفعہ کے لیے گواہی دی ہے۔ ہاں اتنی گنجائش موجود ہے کہ گواہی دینے پر گواہ کو بھی کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنی جیب سے گواہی کے لیے جاتا ہے یا اپنی سواری استعمال کرتا ہے، خورد و نوش کا سامان خود کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مالی نقصان ہوگا۔ اگر وہ اسے خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر وہ متعلقہ فرقہ کی سواری استعمال کرے، اس کی طرف سے کھانا کھائے، یا جس قدر اس کا خرچ ہوا، وہ سب لے لے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جائز ہے۔

فَرَمَا بِاللّٰهِ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلَيْهِ تَمَّ جَوَاجِبُ بَیِّنَاتٍ بِمَا تَعْمَلُونَ
 علم میں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے حتیٰ کہ وہ تمہارے ارادوں اور مخفی عزائم سے بھی واقف ہے۔ تم غلط کام کر کے اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیکر انسان کی مزید رہنمائی فرمائی ہے کہ اگر گرفت سے بچنا ہے۔ تو تقویٰ اختیار کرو۔ چلے بہانے سے غلط کام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

البقرة ۲

درس یکصد و شش ۱۲۶

آیت ۲۸۴

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ طَوَّانٌ تَبَدُّوْا
 مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخَفُوْهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهٖ اللّٰهُ طَفِيْغُفِرْلِمَنْ
 يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

تس جہدہ اللہ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے
 اور اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو اللہ تعالیٰ اس
 کا حساب لے گا تم سے۔ پس بخش دے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۸۴﴾

سورۃ بقرہ کے دروس اختتام پذیر ہیں۔ اور آج کے درس سے سورۃ کا چالیسواں
 اور آخری رکوع شروع ہو رہا ہے قرآن پاک کی اس سب سے لمبی سورۃ میں مختلف انواع
 احکام بیان ہوئے ہیں جن میں اصول بھی ہیں اور فرعی مسائل بھی ہیں، عبادات، معاملات
 مالی و جانی جہاد، نکاح و طلاق اور دیگر بے شمار مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے
 اس سورۃ کو تمام القرآن بھی کہا گیا ہے۔ گویا سورۃ مبارکہ قرآن پاک کی کوہان ہے۔ اس
 کو قرآن پاک میں بلند مقام حاصل ہے۔

اختتامی کلمات

سورۃ کے آخری رکوع میں قرآن پاک کو نازل کرنے والے اللہ جلّ جلالہ کی حاکمیت
 اعلیٰ کا بیان ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام احکام و شرائع اسی کی جانب سے ہیں۔ اس کے
 علاوہ اس کی قدرت اور تصرف کا بیان ہے کہ اقتدار اعلیٰ بھی اسی کے پاس ہے
 اور ہر چیز کے تصرف پر بھی اُسی کا حق ہے۔ وہ جس طرح چاہے۔ اپنی پیدا کردہ اشیاء
 کو تصرف میں لائے۔ رکوع کی آخری آیات میں ایمان کی تفصیلات کا تذکرہ ہے۔
 اور پھر بالکل آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ کلمات
 سکھائے گئے ہیں جن کے ذریعے ایک بندے کو اپنے خالق و مالک کے حضور

دست بدعا ہوتا چاہیے، اور اپنے مالک حقیقی سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور اللہ تعالیٰ کی مدد کی درخواست پیش کرنی چاہیے۔

حاکمیت

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان ان الفاظ میں ہوتا ہے۔ **لِلّٰهِ مَا فِي**

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے۔ تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنایا والا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی بدن، مشینری، اوزار بنا رہا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔ خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے جس چیز کا کوئی مالک ہے۔ اُسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہے۔ اور تیسری وجہ حق تصرف ہے۔ جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہے۔ اُس کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی تمام کائنات کے ساتھ تخصیص ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ میں مذکور **بِاَلَاتِنِیْنَ** صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کی بنا پر اُسے کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا۔ **وَهُۥ بِکَدِّیْعِ السَّحٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ہے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والی وہی ذات ہے۔ وہی ہر شے کا صانع ہے **الَّذِیْ اَتَقَنَّ کُلَّ شَیْءٍ** ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ خود انسان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے **وَاَنَّ اللّٰهَ صَانِعُ کُلِّ صَانِعٍ وَصَنَعْتُهُ ہر چیز اور اس کی صنعت کو پیدا کرنے والا اللہ وعدہ لاشریک ہے۔**

چونکہ ان تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُسی نے ہر چیز کو بنایا ہے۔ لہذا ان کا مالک حقیقی بھی وہی ہے **لَهُۥ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** کائنات

کی تمام چیزیں اس کی ملک ہیں۔ اللہ کے علاوہ انسان کو جن چیزوں کی ملکیت حاصل ہے یہ عارضی ہے اور اللہ کے حکم سے ہے۔ حقیقی ملکیت صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی کسی انسان کی ملکیت قائم رہتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی سے حق ملکیت سلب کر لیتا ہے۔ اور پھر نہ ملکیت باقی رہتی ہے اور نہ قبضہ۔ انسان خود فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جن پر ملکیت کا دعویٰ تھا۔ یہیں رہ جاتی ہیں۔ گویا حقیقی مالک بھی ہر چیز کا اللہ ہی ہے۔

تیسری چیز تصرف ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے پر اللہ تعالیٰ ہی کو کامل اور مکمل تصرف حاصل ہے۔ اگر کسی دوسرے کو تصرف کی اجازت ہے۔ تو وہ خاص وقت تک کے لیے اور عارضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو ذاتی تصرف حاصل نہیں۔ چونکہ خلقت، ملکیت اور تصرف کی تینوں صفات اللہ تعالیٰ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا اللہ مَکَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَکَافِی الْاَرْضِ اَسْمَانِ وَزَمِنْ کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حاکمیت اعلیٰ بیان کرنے کے بعد بنی نوع انسان سے فرمایا
وَلَا تُبَدُّوْا مَکَافِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تَخْفَوْْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ جَمِیْعًا
تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو، یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا
یہاں پر یہ بات قابل غور ہے۔ کہ کسی اچھے یا بُرے کام کا مرتکب ہونا اور کسی چیز کا محض دل میں خیال آنا، دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی غلط کام کے کرنے سے مجاہدے کا عمل تو ذہن میں آتا ہے۔ مگر محض دل میں کسی خیال کے آجانے سے مجاہدہ کیا ہو گا جب کہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اس ضمن میں شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے نفس میں جو چیزیں آتی ہیں، وہ پانچ اقسام ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز اعتقاد ہے۔ انسان کا اعتقاد کیا ہے، وہ توحید پر کار بند ہے یا شرک میں ملوث ہے۔ اس کے دل میں اخلاص پایا جاتا ہے۔ یا نفاق سے پڑا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اُسے اللہ تعالیٰ پر سچتہ یقین ہے یا وہ تردد اور شک کا شکار ہے۔ اعتقاد

محاسبہ
ہوگا

سے متعلق جو کچھ بھی اس کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کا محاسبہ ہوگا۔ اگر وہ موعود مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والا ہے۔ تو اللہ کے ہاں جزاء پائیگا اور اگر مشرک، منافق یا متردد ہے۔ تو سزا کا مستحق ہوگا۔ بہر حال ہر انسان کا اعتقاد قابل محاسبہ اور قابل مواخذہ ہے۔ دوسری چیز جس پر محاسبے کا دار و مدار ہے، محبت یا نفرت کا جذبہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْحُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ مُحِبُّنَ اللَّهِ کی خاطر محبت یا نفرت ہونا اچھے اعمال میں سے ہے۔ ایسا شخص اللہ کے ہاں جزا کا حقدار ہے۔ اور جس کے دل میں جذبہ محبت و نفرت اپنی ذاتی اغراض یا غیر اللہ کے لیے ہے۔ وہ لازماً سزا کا مستوجب ہوگا۔ دوسری حدیث میں فرمایا من احب لله وَابْغَضَ لله وَاعْطَى لله وَمَنَعَ لله فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ جس نے اللہ کی خاطر کسی سے محبت کی۔ اُسی کی خاطر نفرت کی۔ اُسی کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر نہ دیا۔ تو اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔ ایک اور روایت میں اَنْكَحَ لله کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو اللہ کے لیے نکاح کر دیا تو وہ کامل ایمان دار بن گیا۔ مقصد یہ ہے کہ دل میں آنے والے محبت یا نفرت کے جذبات اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل محاسبہ ہیں۔

اس ضمن میں تیسری چیز فرمایا نیت اور عزم ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق اچھی یا بُری نیت قابل محاسبہ ہے۔ اگر کوئی شخص اچھائی کا کام کرنے کی محض دل سے نیت کرتا ہے۔ اور ابھی اس پر عمل درآمد شروع نہیں کیا، تو اسکو نیکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب نیک عمل کو کر گزرتا ہے۔ تو دس نیکیوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بُری نیت کا تعلق ہے۔ محض نیت پر مواخذہ نہیں ہے۔ البتہ جب اس نیت یا ارادے کے مطابق عمل کرے گا۔ تو اس کے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی بُرائی لکھی جائیگی، اور وہ قابل محاسبہ ہوگا۔

نفس انسانی میں غیر اختیاری طور پر آنے والی چوتھی چیز اخلاق ہے۔ اور اس میں تقویٰ، زہد، حرص، لالچ وغیرہ آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر جس قدر تقویٰ اور زہد ہوگا

اُسی قدر اُس کے درجات بلند ہوں گے۔ اس کا ہر عمل اُس کے تقویٰ اور زہد کے ساتھ پہنچا جائیگا۔ اور اگر کوئی شخص حرص، لالچ یا دیگر قبیح اشیاء کا شکار ہے۔ تو پھر اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ بہر حال اخلاق بھی قابلِ محاسبہ اور قابلِ مواخذہ ہیں۔ پانچویں چیز جس پر محاسبہ انسانی کا انحصار ہے، وہ خطرات ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان خیالات کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے بعض قابلِ مواخذہ ہیں اور بعض پر کوئی گرفت نہیں۔ پہلی چیز ایسا خیال ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ فلاں غلط کام کرنا چاہیے مگر فزایہ خیال خود بخود چلا جاتا ہے۔ ایسے خیال پر کوئی مواخذہ نہیں اُسے خارج کتے ہیں۔ دوسری قسم کا ایسا خیال ہے جو انسان کے دل و دماغ پر وارد ہو کہ کچھ دیر قائم رہتا ہے اور پھر زائل ہو جاتا ہے اُسے خاطر کتے ہیں اور اس پر بھی کوئی محاسبہ نہیں۔ تیسری قسم کا خیال ایسا ہے کہ چبذیہ آتا ہے تو اس سے انسان لطف اندوز نہ بھی ہوتا ہے، اُسے کو ہم کتے ہیں۔ اور ہماری امت میں ایسے خیال کا بھی کوئی محاسبہ نہیں، چوتھی قسم کا خیال حدیثِ نفس ہے کہ انسان خود اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی قابلِ مواخذہ بات کہتا ہے جس پر عمل نہیں کرتا ایسے خیال پر بھی امت محمدیہ پر کوئی مواخذہ نہیں اگرچہ سابقہ امتیں قابلِ مواخذہ تھیں اس ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول مشہور ہے کہ ایسے خیالات سے بچا کرو۔ کیونکہ جس گھر میں دھواں اٹھتا ہے۔ وہ اگرچہ جلاتا تو نہیں مگر گھر کو سیاہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے خیالات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ پہلی امتیں اس سے مستثنیٰ نہ تھیں تاہم ہماری امت میں اس خیال پر بھی کوئی مواخذہ نہیں۔

فرمایا ان خطرات کی پانچویں قسم وہ عزم اور ارادہ ہے جس کے ذریعے انسان برائی پر عمل درآمد میں سچتہ ہو جاتا ہے۔ ایسے خیالات کا دل میں آنا قابلِ مواخذہ ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم اپنے دل کی بات ظاہر کر دیا چھپاؤ، یُحَاسِبُکُمْ بِمَا لَمْ تَعْلَمُوا سَعَابَ لَیْکَا، تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے۔ اور حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! ہم نماز، روزہ، صدقہ، جہاد وغیرہ کی تکالیف برداشت کر سکتے ہیں

شانِ نزول

مگر اب ایک ایسی چیز کا حکم آیا ہے۔ جو ہمارے بس میں نہیں۔ دل میں خیالات کا آنا ایک ایسی چیز ہے جسے از خود ٹال نہیں سکتے۔ اگر اس پر محاسبہ شروع ہو گیا، تو ہمارے لیے کوئی جائے رفیق نہ ہو گی۔ ہم اللہ کے ہاں کیسے سرخرو ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم اس طرح کے لوگ نہ بنو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی۔ جنہوں نے کہا تھا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے احکام کو سن لیا مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے۔ کہ اللہ مالک الملک کی طرف سے جو بھی حکم آئے اس کے سامنے تسلیم خم کر دو اور اس کیلئے جذبہ اطاعت کا اظہار کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے بخشش کی دعائیں بھی دیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے صحابہ کرام ہر حکم کی تصدیق اس طرح کیا کرتے تھے۔ "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا" یعنی اے ہمارے رب ہم نے تیرا حکم سن لیا۔ اسکی اطاعت کی۔ تو ہمیں معاف فرما دے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے دوسو سوں پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ گرفت ان کی ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آجائیں گے۔ یا ان پر عمل درآمد ہو جائے گا۔ جب تک عمل نہیں ہو گا، ایسے خیالات پر مواخذہ نہیں ہو گا۔

حضرت امیر شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ باطل اعتقادات، برے اخلاق یا فاسد نیت جو دل میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا ایم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اسکی اس طرح توجیہ فرماتی ہیں۔ کہ مواخذہ تو ہر چیز پر ہوتا ہے مگر انسان کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچی رہتی ہیں، وہ ایسے اعمال کا کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان محاسبے سے بچ جاتا ہے۔ حضور کا فرمان ہے۔ کہ جب کسی شخص کو کوئی کانٹا چھب جائے، پھٹ کر لگ جائے۔ یا وہ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اس وجہ سے اس کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ اسکی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اور انسان جب دنیا سے جاتا ہے تو پاک صاف ہوتا ہے۔

فرمایا محاسبے کے اس قانون کے باوجود فیغفر لمن یشاء اللہ تعالیٰ

جسے چاہے معاف کر دے۔ جس شخص میں بخشش حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرمے گا۔ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ اور جو سزا کے قابل ہوگا، اُسے سزا میں مبتلا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ کسی کو ناجائز تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے وَمَا أَرْبُكَ بِظُلْمٍ لِّلْعَبِيدِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ہاں رافی کے ایک دے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی آچکا ہے وَأَنْتُمْ لَا تَظْلِمُونَ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی اور یہ بھی فرمایا ثَوَقِي كُلِّ نَفْسٍ بِرِشْطِهَا ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

فرمایا یہ سزا اور جزا اللہ تعالیٰ کو ہی سزا دہ ہے۔ کیونکہ واللہ علیٰ کلِّ شئٍ قَدِيرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ الغرض گذشتہ دروس میں آنے والے ہزاروں مسائل کا یہ اجتماعی تبصرہ ہے۔ کہ مالک الملک جو چاہے کرے۔ وہ جو بھی حکم دے، بندوں کا فرض ہے کہ اسکی تعمیل کریں۔ اور ہر مشکل حکم پر اس سے آسانی کی دُعا کریں اور اس کے ساتھ بخشش طلب کریں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکصد و بیست و ہفت (۱۲۷)

آیت ۲۸۵

أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ط
 كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ قَدْ لَا يُفَرِّقُ
 بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ قَدْ وَقَالُوا سَبِعْنَا وَاطْعْنَا غُفْرَانَكَ
 رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۲۸۵

ترجمہ: ایمان لایا ہے رسول اُس چیز پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی ہے۔ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں۔ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (اور وہ یہ کہتے ہیں) ہم نہیں تفریق کرتے کسی میں اس کے رسولوں میں سے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے (۲۸۵)

گزشتہ آیت میں محاسبہ کا تذکرہ تھا۔ کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اُس کا حساب لیگا۔ نزول آیت پر صحابہ کرام کو سخت تشویش ہوئی۔ کہ اگر غیر اختیار میں خیالات پر بھی النان کی گرفت ہو گئی، تو نجات مشکل ہو جائے گی۔ صحابہ کرام نے اپنی تشویش کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ تم یہودیوں کی طرح یوں نہ کہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے سن لیا اور انکار کر دیا۔ بلکہ اس قسم کی صورت حال میں یوں کہا کرو۔ سَمِعْنَا وَاطْعْنَا ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے دل کی پوری محبت کے ساتھ کہا "سَمِعْنَا وَاطْعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ"

اس آیت میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی تعریف فرمائی ہے۔ صحابہ کرام

کیونکہ انہوں نے دلی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا۔ اور اس میں کسی قسم کا لیت و لعل نہ کیا۔ بلکہ اللہ کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو صحابہؓ کی ادال پسند آئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کا ذکر مبارک بھی ہے۔ جس کی وجہ سے صحابہؓ کی شان مزید بلند ہو گئی۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ نے صحابہؓ کے ساتھ حضور نبی کریمؐ کا ذکر کر کے یہ بات واضح کی ہے۔ کہ صحابہ کرامؓ بھی حضور کی طرح ایماندار تھے۔ اور ان کے ایمان حضور کے ایمان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اگرچہ پیغمبر کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے۔ اور صحابہ کا ایمان کامل درجے کا۔ مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہ کرامؓ کے درجات کی بلندی کی نشان دہی ہوتی ہے۔
صحابہ کرامؓ کی اس اطاعت گزاری پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَمِنَ الرَّسُولُ
بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ جو چیز رسول کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی۔ رسول اس پر ایمان لایا۔ اور اس کے ساتھ مومن بھی ایمان لائے۔ یہاں پر ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے۔ کہ شریعت نبی پر نازل ہوتی ہے کسی غیر نبی پر نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ صحابہؓ بھی اس چیز پر ایمان لائے جس پر پیغمبر لایا ہے۔ تہیہ صحابہ کرامؓ کی مدح ہو گئی۔ اور ان کی حوصلہ افزائی ٹھہری اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ صحابہؓ نے کمال عاجزی و انکساری کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا۔ اور اپنی لغزشوں کی معافی طلب کی۔

اور آگے ایمان کے ارکان کا بیان ہے كُلٌّ اَمِنَ بِاللّٰهِ سَرِب کے سب صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ بنیادی طور پر ایمان کے پانچ ارکان ہیں جن کی دل سے تصدیق کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ایمان مکمل نہیں ہوگا۔ یہ ارکان سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانا، پھر فرشتوں پر، رسولوں پر، کتابوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ہے۔ شاہ عبد القادر اَمِنَ کا ترجمہ مان لیا کرتے ہیں یعنی دل سے تسلیم کر لیا۔ گو یا دل سے تصدیق کر کے نام ایمان ہے۔ اگرچہ زبان سے اقرار

تصدیق
بالقلب

بھی لازم ہے۔ مگر اس کی تکمیل تصدیق قلبی سے ہی ہوتی ہے۔ اِقْوَادٌ بِاللِّسَانِ
وَتَصْدِيقٌ بِالْقَلْبِ

ایمان باللہ

سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا
کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے۔ نہ صرف اس کا وجود ہے بلکہ وہ واجب الوجود بھی ہے
یعنی اس کا وجود خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ
ہر چیز کا وجود عطا کیا ہوا ہے اور عارضی ہے مگر اللہ ہی ایک واحد ذات ہے
جو واجب الوجود ہے اللہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اور اس لفظ میں یہ چیز پائی جاتی
ہے واجب الوجود المستجمع لجميع صفات کمال واجب الوجود
وہ ذات ہے جس میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں۔ وہ ذات مبدوء عن
النقص والذوال ہے۔ اس ذات میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ کوئی نقصان
والی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ دائم و قائم ہے گا۔ اُسے کبھی زوال
نہیں آئے گا۔ جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ تمام صفات اس میں آ جاتی ہیں۔
فارسی زبان میں جب اللہ کا ترجمہ خدا کیا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی بھی یہی ہے۔ کہ وہ
ہستی جو خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کی محتاج نہیں، گویا یہ لفظ بھی واجب الوجود کا
ہی ہم معنی ہے کہ وہ ذات خود بخود ہے اور جمیع صفات کمال کے ساتھ
متصف ہے۔ وہ ذات نقص و زوال جیسی صفات سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور ان ہی سے
اللہ کی پہچان ہوتی ہے۔ ان صفات میں الرحمن، الرحیم، المالك، القهار، السار
الصمد، الغنی، المحی القيوم وغیرہ ہیں۔ یہ سب وجودی یا مثبت صفات ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ کی بعض منفی صفات ہیں مثلاً "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ" لَمْ
يَخْذْ وَلَدًا، لَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ یعنی نہ اس کی اولاد ہے۔ اور
نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اسکی بیوی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نہ
کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔ "لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ" اس کو نہ اونچھ آتی

ہے اور نہ میند آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام عیب اور نقصان والی صفات سے پاک اور منزہ ہے۔ جب سبحان اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا معنی بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نقصان اور عیب والی صفات سے پاک ہے۔ نہ اس کو تھکاوٹ ہوتی ہے۔ اور نہ اس پر موت طاری ہوتی ہے۔ الحمد للہ کا بھی یہی معنی ہے کہ وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے۔

صفات الہی
پر ایمان

جس طرح اللہ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی لازمی ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتا ہے۔ مگر توحید کو نہیں مانتا، تو وہ ایماندار نہیں ہے۔ یا ایک کی بجائے دو یا تین الہ مانتا ہے جیسے مجوسی یا عیسائی وغیرہ، تو بھی مشرک اور کافر ہو گیا۔ اگر توحید میں کوئی خرابی آئے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خدا کی ہستی کو ماننے کے باوجود کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے لیے رسول نہیں بھیجتا، تو پھر بھی کافر ہے۔ کیونکہ رسول معجوت کرنا اللہ کی صفت ہے جس سے انکار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول بھیجے ہیں اور آخر میں آپ کو مکمل پروگرام دے کر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اب قیامت کا انتظار ہے۔ کوئی نیا پروگرام نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تقدیر بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ جب تک کوئی تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا، خدا کی بارگاہ میں اس کی عبادت مقبول نہیں۔ خواہ وہ اعد ہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے اور تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور مشیت سے ہوتا ہے "وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ" وہی ذات ہے جس نے تمام چیزوں کو مقدر فرمایا ہے لہذا لفظ اللہ میں تقدیر پر ایمان لانا بھی

فرشتوں پر
ایمان

آگیا، کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور اس کی تمام صفات پر ایمان لانا ضروری ہے
فرمایا رسول اور اس کے صحابہ اللہ پر ایمان لائے۔ وَمَلَأَ کِتَابَہٗ اور اس کے
فرشتوں پر بھی ایمان لائے، فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان کا دوسرا رکن ہے جس کے
پہلے فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا ہو گا۔ اور پھر فرشتوں کی بہت سی قسمیں
ہیں۔ جیسے۔ ملائکہ الاعلیٰ اور ملائکہ السافلہ، عرش کے گرد گھومنے والے فرشتے،
علین میں رہنے والے، آسمانوں پر مقیم اور پھر فضا میں رہنے والے، زمین پر رہنے والے
یہ تمام فرشتوں کی مختلف اقسام ہیں۔ اہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ ملائکہ الاعلیٰ
سے ملائکہ السافلہ تک فرشتوں کی سات قسمیں متعین ہیں اور ہر ایک قسم کو اللہ تعالیٰ
نے الگ الگ اور مختلف نوعیت میں پیدا کیا ہے۔ جو فرشتے ملائکہ الاعلیٰ والے
میں وہ اعلیٰ ترین یا نفیس ترین ہیں۔ ویسے فرشتے خواہ اوپر کے ہوں یا نیچے
کے دوسری مخلوق سے لطیف تر ہیں۔ اس نورانی مخلوق میں روح، عقل اور شعور
پایا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ
عبادت الہی سے نہ تھکتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی
کبھی نہیں کرتے۔ لَا یَعْصُونَ اللہَ مَا أَمَرَهُمْ اور اللہ تعالیٰ انہیں
جو کچھ حکم کرتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں وَکَیْفَ عَمَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ
یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو فیضان کائنات میں پہنچتا
ہے وہ انہی فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے فرشتوں کے بعد لطافت کے
لحاظ سے دوسرے درجے کی مخلوق جنات ہیں۔ مگر وہ معصوم نہیں ہیں۔ بنی نوع
النسان میں سے صرف انبیاء کی جماعت معصوم ہے باقی کسی مخلوق کو یہ گارنٹی حاصل
نہیں ہے۔

لطیف مخلوق ہونے کی وجہ سے فرشتے ہمیں اس دنیا میں نظر نہیں آتے
ہاں اگر وہ شکل تبدیل کر لیں تو انسانوں کو بھی نظر آ سکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ
مبارک میں جب جبرائیل علیہ السلام وحیہ کلبیؑ یا کسی مسافر کی صورت میں آتے تھے، تو

نظر آتے تھے۔ عالم بزرگ اس مادی جہاں سے لطیف ہے اور حشر اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ جب انسان اس جہان میں پہنچیں گے، تو ان میں بھی کمال درجے کی لطافت پیدا ہو جائیگی، لہذا سب کو فرشتے نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتی لوگوں کے پاس فرشتے آکر سلام کہیں گے "سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُکُمْ" غرضیکہ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔

کتبوں پر
ایمان

ایمان باللہ اور ایمان بالملائکہ کے بعد فرمایا وَکُتِبَ لَیْحَی حَضْرَہٗ رَسُوْلٍ مَّقْبُوْلٍ اور صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں۔ کتب جمع کا صیغہ ہے۔ کہ کہ اجمالاً تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا اور تفصیلاً قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن پاک کا ہر حکم صحیح، برحق اور واجب التعمیل ہے۔ پہلی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ ان کے تمام احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ نے کل کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ اس بارے میں قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی صحیح روایت میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ ہاں بزرگانِ دین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چار کتابیں تو بڑی ہیں یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک اس کے علاوہ کچھ چھوٹی کتابیں یا صحیفے ہیں۔ اہم شافعی کی روایت کے مطابق ایک سو چار کتابیں اور صحیفے اللہ نے نازل فرمائے۔ ہر نبی کے لیے کتاب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے انبیاء اپنے سے قبل آنے والی کتاب کی ہی پیروی کا درس دیتے رہے۔ مثلاً نزولِ تورات کے بعد جتنے بنی آئے وہ تورات کی ہی تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر وحی آتی تھی، مگر قانونِ تورات کا ہی چلتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح یونس علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء کے صحیفے بھی تھے۔ موجودہ بائبل یعنی تورات کے ساتھ ۹ صحیفے اور انجیل بھی ہے۔ پہلے پانچ باب تورات کے ہیں اور باقی دو سکر بنیوں کے

صحیفے ہیں۔ اس طرح یہ سب غلط ملط ہو چکا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اللہ کی کتابوں میں بہت گڑبڑ کی ہے۔ مگر کچھ چیزیں آج بھی صحیح ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پتینگس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ بہر حال آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ارکان ایمان میں سے ہے۔

رسولوں پر ایمان آگے ایمان کے چوتھے جزو کے متعلق فرمایا وَرُسُلِهِ یعنی اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا۔ تو کافر ہو جائے گا۔ نصاریٰ کو دیکھ لیں۔ سابقہ تمام انبیاء کو مانتے ہیں مگر حضور خاتم النبیین کو تسلیم نہیں کرتے، لہذا کافر ٹھہرے۔

تمام رسولوں پر ایمان لانے کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی لَا تَفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی رسول کو مان لیا اور کسی کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا یہی حال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں۔ حضور خاتم النبیین کو بھی نہیں مانتے، لہذا یہ کافر ہی ہیں۔ جب تک ہر رسول پر ایمان نہ رکھیں خواہ ان کا نام معلوم ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس جس دور میں جس جس نبی کو مبعوث فرمایا۔ وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ اپنی اپنی قوم کے ہادی اور راہنما تھے، ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں وَمَا أُولَئِكَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ کچھ بھی اللہ نے اپنے نبیوں کو دیا ہے سب برحق ہے۔ اور ہمارا ان پر ایمان ہے لَا تَفَرِّقُوا کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے عرض کیا حضور انبیاء کرام کا سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بنی آدم علیہ السلام تھے۔ گویا سب سے پہلے انسان بنی تھے۔ صحابی نے عرض کیا حضور کیا وہ بنی تھے ارشاد فرمایا، ہاں بنی مکلم تھے۔ اللہ نے ان سے کلام فرمایا تھا۔ اور سب سے آخری بنی

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ مجموعی طور پر ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش بنی اور رسول آئے ہیں۔ ان میں سے رسول تین سو تھے تین سو پندرہ اور تین سو پچیس کی روایت بھی آتی ہیں۔ بہر حال یہ سب بہ حق بنی اور رسول تھے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس کو مستقل شریعت ملے، اُسے کتاب کا ملنا ضروری نہیں ہے۔ شریعت ضروری ہے۔ مثلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے رسول تھے مگر اُن پر مستقل کتاب نازل نہیں ہوئی۔

الغرض! تفریق بین الرسل کفر ہے۔ تمام انبیاء اور رسل پر ایمان لانا ضروری ہے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا۔ تو سب کے انکار کے مترادف ہو گا۔ اس آیت میں ایمان کے اجزاء بیان ہو چکے اور ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کے صحابہ کی تعریف بھی بیان ہو گئی۔

وَقَالُوا سَمِعْنَا ان سب نے کہا کہ ہم نے سن لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے۔ وہ ہم تک پہنچ گیا۔ وَاَطَعْنَا اور ہم اس کی دل و جان سے فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اطاعت کرتے ہیں۔ کسی چیز کا انکار نہیں کرتے۔

عَفْوًا لَكَ رَبَّنَا اے پروردگار! ہم تجھ سے بخشش کے طلبگار ہیں۔ ہمیں بخش دے۔ اور ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے۔ عفو ان کا معنی اٹھانپ دینا ہوتا ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ہماری لغزشوں کو اپنی بخشش کے پر دے میں ڈھانپ لے۔ ان پر کوئی باز پرس نہ کرتا۔

بخشش کی
طلب

اب ایمان کے پانچوں جزو کے متعلق فرمایا وَاللَّيْلُ الْمَصِيرُ اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ گویا معاد یعنی قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ ایک وقت آئے گا جب قیامت برپا ہوگی۔ پھر سب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر بھی انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ گویا یہ ایمان کے پانچ جزو ہو گئے، توحید، رسول، ملائکہ، کتب اور قیامت کا دن۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ

قیامت
پر ایمان

وہ آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس جہاں کا آخری دن ہو گا۔ اس کے بعد دوسرے جہان کے ایام شروع ہو جائیں گے۔ اور ان کی نوعیت الگ ہو گی۔

لہذا آخرت کے دن (یوم الحساب) پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب حساب کتاب ہو گا۔ اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ کی منزل یہ حق ہے۔ جب انسان کو محفل بنایا گیا ہے۔ تو پھر اس کے لیے جزا و سزا کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کافر ہو جائے گا۔

جب تک ایمان کے تمام ارکان پر ایمان نہیں لائے گا، گرفت نہیں بچ سکتا۔

یہ وہی اجزائے ایمان ہیں۔ جن کے متعلق سورۃ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔

يَوْمَ نُنَوِّنُ بِالْغَيْبِ یعنی متقین وہ ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں پر اسی چیز کی تشریح ہے۔ کہ وہ کون کون سے امور ہیں۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

تو یہاں پر واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بمع اسکی صفات، ملائکہ، کتابیں رسول اور روز قیامت ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حالانکہ نہ ملائکہ کو دیکھا، نہ رسولوں کو اور نہ قیامت کو دیکھا مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَانَا ج
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ج
وَاعْفُ عَنَّا وَقِفْهُ وَاعْفِرْ لَنَا وَقِفْهُ وَارْحَمْنَا وَقِفْهُ أَنْتَ مَوْلَانَا
فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝۲۸۶

۝۲۸۶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس
نفس کے لیے وہی ہے جو اس نے کیا۔ اور اس کے اوپر وبال بھی اُس چیز کا ہے
جو اس نے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر
جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو
ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ چیز جسکی
ہم طاقت نہیں رکھتے۔ اور درگزر کر دے ہم سے۔ اور بخش دے ہم کو اور ہم پر
رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے۔ پس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ ۝۱۸۶

مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب صحابہ کو تشویش لاحق ہوئی کہ
کہیں دل میں پیدا ہونے والے غیر اختیاری خیالات پر اللہ تعالیٰ کی گمراہی نہ آجائے، تو
نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے برعکس لیوں کہا کہ وَسَمِعْنَا
وَاطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے
دل کی گہرائیوں سے یہ کلمات کہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی تو حضور علیہ السلام نے
نے صحابہ کو تسلی دی کہ غیر اختیاری چیزوں پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ
نے ایک عام قانون بتا دیا کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ

دین آسان
ہے

بھول اور
خطا میں فرق

نیاں یا بھول ایسی غلطی کا نام ہے جس میں نیت یا ارادے کو دخل نہ ہو۔ بلکہ کوئی کام بھول کر ہو جائے اور خطا سے مراد یہ ہے کہ نیت کچھ اور کام کی ہوتی ہے مگر عمل کوئی دوسرا ہو جاتا ہے۔ مثلاً روزے کی حالت میں کھانے کی نیت سے منہ میں پانی ڈالا مگر وہ حلق سے نیچے اتر گیا۔ کسی شخص نے شکار کے جانور کے لیے گولی چلائی مگر وہ کسی انسان یا دوسرے جانور کو لگ گئی، یہ خطا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ البتہ دنیا میں اس کی دیت اور کفارہ دینا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص خطاً قتل ہو گیا ہے۔ تو اس کا خوں بہا بھی دینا پڑیگا اور کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزے بھی سکھنے ہوں گے۔

اور اگر کسی کو عمدہ قتل کیا ہے۔ تو اس کا دنیا میں بھی قصاص ہوگا اور آخرت میں اللہ کے ہاں بھی مواخذہ ہوگا۔ (اگر توبہ نہ کی ہو) بھول اور خطا میں یہ فرق ہے۔
بھول کے متعلق حضور علیہ السلام کی حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ رَفَعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَاۃَ وَالنِّجْيَانَ وَمَا اسْتَكْبَرُوْا عَلَیْهِ اللّٰهُ تَعَالٰی نے میری امت سے ایسے گناہ کو اٹھا دیا ہے۔ جو بھول، خطا یا جبر کی وجہ سے سرزد ہو۔ ایسے عمل پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو مجبور کر کے کوئی کام کرایا جائے تو وہ اگر ایمان آئیگا مثلاً کوئی شخص دوسرے کو مجبور کر دے کہ شراب پی لو یا فلاں کام کر دو ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ تو یہ عمل اکراہا ہوگا۔ اور اللہ کے ہاں اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

بھول اور
خطا پر مواخذہ
نہیں

البتہ دنیا میں ایسے امور کی تلافی کرنا پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے، تو جس وقت اس کو یاد آئے اس وقت ادا کرے۔ اگر ایک دفعہ بھول گیا ہے تو اب بالکل ترک نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعد از وقت بھی ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح روزہ کی حالت میں غلطی سے پانی حلق کے اندر چلا گیا۔ تو اگرچہ عند اللہ اس کا مواخذہ نہیں۔ مگر جو روزہ ضائع ہوا، اس کی قضا دینا ہوگی۔
البتہ روزہ میں بھول کر کھانے پینے کی معافی ہے۔ ایسی صورت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَّاهُ اللّٰهُ نے اس کو کھلایا پلایا۔ اس کا روزہ مکمل

ہو گیا۔ اسے روزہ دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر بھول کر بغیر طہارت کے نماز پڑھ لی، تو اسے ٹوٹنا ہو گی۔ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

چنانچہ اسی نسیان اور خطا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دعائیہ کلمات سکھائے۔ کہ دعائیہ کلمات
اے میرے بندو! جب بھول جاؤ یا خطا ہو جائے تو مجھ سے ان کلمات کے ساتھ معافی
طلب کر لیا کرو رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا اے ہمارے پروردگار
اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مواخذہ نہ کر۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد
فرمایا کہ سورۃ بقرہ کے آخر میں جو دعائیں مذکور ہیں۔ جب بندہ ان کو ادا کرتا ہے۔ تو
ہر دعا کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نَعَمْ قَدْ فَعَلْتَ یعنی اے میرے بندے
ہاں! میں نے ایسا کر دیا، تیری دعا قبول کر لی۔

اس کے بعد دعا کا اگلا حصہ فرمایا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اَصْحٰی اے
ہمارے پروردگار! تو ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِنَا جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالا۔ یہاں پر بوجھ سے مراد وہ
مشکل احکام ہیں۔ جو پہلی امتوں پر وارد ہوئے۔ مفسرین کرام مثال کے طور پر فرماتے
ہیں۔ اسرائیلیوں پر پانچ سے زیادہ نمازیں فرض تھیں لہذا وہ امت محمدی سے زیادہ
مشکل میں تھے۔ بعض امتوں کو ہمیشہ روزے رکھنے کا حکم تھا اور بنی اسرائیل کی شریعت
میں یہ حکم بھی تھا۔ کہ جس کپڑے پر نجاست لگ جاتی تھی وہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا
تھا۔ بلکہ قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی نجاست والی جگہ سے کاٹ ڈالنا پڑتا تھا۔ اسی طرح
بنی اسرائیل حلال جانور کا گوشت تو کھا سکتے تھے مگر اس کی چربی استعمال نہیں کر
سکتے تھے۔ لہذا وہ گوشت سے چربی کو بمشکل علیحدہ کر کے پھر کھاتے تھے اللہ تعالیٰ
نے ان کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ایک دوسرے کو قتل کر دو۔
ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل قتل ہوئے، تب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی اپنے
مال کا چوتھا حصہ انہیں بطور زکوٰۃ ادا کرنا پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔
کہ جو کوئی آدمی گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ تو رات کے وقت فرشتے اس کے دروازے

پر کھڑے تھے۔ جس سے اسکی سخت رسوائی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بوجھ
 سابقہ امتوں پر ڈال رکھے تھے جن کے متعلق یہاں پر دعا کی جا رہی ہے کہ اے پروردگار
 ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے پہلی امتوں پر ڈالا تھا۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا
 طَاقَةَ لَنَا بِهِ اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جسکی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ بعض مفسرین
 کرام فرماتے ہیں کہ تَحْمِلُ عَلَيْنَا سے شرعی احکام کا بوجھ ہے۔ جس کے
 متعلق دعا کی گئی ہے کہ ہم پر مشکل احکام نہ ڈال اور لَا تَحْمِلْنَا سے مراد وہ قدرتی
 آفات و بلیات ہیں جو کسی قوم پر نازل ہو جائیں۔ تو یہاں پر اُن تکوینی مصائب کا ذکر
 کیا گیا ہے۔ کہ مولا کریم! ہم سے ایسے قدرتی مشکلات کا بوجھ بھی نہ اٹھوا کہ جس کی
 ہم طاقت ہی نہیں رکھتے۔ مقصد یہ کہ ہمیں شرعی اور تکوینی ہر دو مشکل امور سے محفوظ رکھو۔
وَاعْفُ عَنَّا اے پروردگار! ہم کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگزر

معافی کی درخواست

فرما۔ وَاعْفُ عَنَّا ہماری کوتاہیوں کو بخش دے۔ عفو کا معنی ڈھانپ دینا ہوتا ہے
 یعنی ہماری تمام لغزشوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ دے۔ وَارْحَمْنَا ہم پر رحم
 فرما۔ ہم پر مہربانی فرما اَنْتَ مَوْلَانَا تو ہی ہمارا مولا ہے۔ جیسا کہ قاموس وائے لکھتے
 ہیں لفظ مولیٰ پچیس معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر مولا کا معنی آقا اور کار گزار
 ہے۔ یعنی ہمارے کاموں کا بنانے والا اور ہماری سرپرستی کرنے والا تو ہی ہے۔

مولا معبود کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس کا معنی اساتھی، صاحب، رفیق وغیرہ
 بھی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر مراد ہمارا آقا ہے۔ متولی امور ہمارے
 کاموں کو بنانے والا، ہماری حاجات پوری کرنے والا۔ اے مولا کریم! تو ہی ہے
فَانصِرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ یعنی ہم کو
 غلبہ عطا فرما۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں
 پر غلبے کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اہل دین اپنے دین پر
 قائم رہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا "اَنْتُمْ اَوْلٰوْا عَلٰوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"

غلبہ اسلام

اگر تم صحیح ایمان پر قائم رہو گے، تو تم ہی غالب آؤ گے۔ خالقائے راشدین کا زمانہ اس غلبے کا بہترین ثبوت ہے۔ صفین کے واقعہ تک مسلمان نصف دنیا پر غالب تھے۔ اور باقی دنیا میں بھی کوئی ایسی طاقت نہیں تھی۔ جو اہل ایمان سے ٹکر لے سکے۔ یہ غلبہ صرف پچاس سال تک قائم رہ سکا۔

غرضیکہ اگر دین ملے دین پر قائم رہیں اور عام لوگ ان کے معاون ہوں، اتفاق سے بچتے رہیں۔ بدعت سے بیزار رہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم ہوں، رشتہ سود اور دیگر حرمت سے بچتے رہیں، تو کسی غیر قوم کو مسلمانوں پر تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب مسلمانوں میں یہ قباحتیں پیدا ہو جائیں گی، تو دوسری قومیں ان پر مسلط ہو جائیں گی اور یہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔ اب دیکھ لیجئے یہ تمام لغتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ حرم خمری عام ہے بدعت کا چرچا ہے۔ بلکہ اس کو عین کارِ ثواب سمجھ کر اس پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ بدعت کے علاوہ لوگ شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی حکومت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ زبانی جمع خمر ہو رہا ہے۔ عمل صفر کے برابر ہے۔ منافق کی تمام علامتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ ان حالات میں اسلام کو غلبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور صحیح دین اختیار کر نیکی تو فیق عطا فرمائے۔

سورۃ بقرہ
کی خصوصیت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ بقرہ کو فسطاط القرآن فرمایا ہے۔ یعنی یہ سورۃ قرآن پاک کا بڑا خیمہ ہے جس طرح ایک بڑے خیمے میں بہت سے ساز و سامان رکھنے اور رکائش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کبریٰ کے تمام اصول و فوائد بیان کر دیے ہیں۔ اس سورۃ میں دعوت الی التوحید والہدایت کا بیان ہے۔ قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت بیان کی گئی ہے۔ فرائض خمسہ کے علاوہ جہاد، نظام سلطنت اور بے شمار مثالیں اور حکمت کی باتیں اس سورۃ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے اسے فسطاط القرآن کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سورۃ کو تمام القرآن یعنی قرآن کی کوٹمان سے تعبیر

کیا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کی کوبان سے بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں یہ سورۃ بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی آخری دو آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج کے موقع پر عطا ہوئی تھیں۔ اَمِنْ الرَّسُوْلِ سے لیکر قَوْمِ الْكَافِرِيْنَ تک کی آیتیں معراج کا خاص تحفہ ہے۔ پانچ نمازیں بھی معراج کا تحفہ ہے جو حضور امت کے لیے لائے۔ اور تیسرا تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ کہ میری امت کا جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائے گا، اس کی غلطیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ان آیات کی اہمیت اسی امر سے واضح ہے کہ ان میں اسلام کے ارکان خمسہ کا بیان ہے۔ جو سب سے اہم چیز ہیں۔ اور پھر اس میں اللہ کی مناجات ہے اور اس سے دُعا کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

فضائل آیات
آخر سورۃ

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا تجھ کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور خلوص نیت کے ساتھ تلاوت کرے۔ یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں۔ انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔ ایک روایت میں یوں آتا ہے۔ کہ عرش معلیٰ کے نیچے اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے سورۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے اس خزانہ میں سے نازل فرمائی ہیں۔ ان آیات کی اس قدر فضیلت ہے۔ سبحانک اللہم وبحمدک

احکامِ حج

مع زیارات

مکنا المکرمہ و مدینۃ المنورہ

مرتب

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

ملنے کا پتہ: بمکتبہ درس القرآن فاروق گنج گوہر انوارہ۔ صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۷ روپے